

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

PDFBOOKSFREE.PK

احمد اقبال



11



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں
قارئین کے مطالعے اور دعویٰ و اصلاحی مقاصد کے
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی
، قانونی و شرعی جرم ہے۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

گیارہواں حصہ

احمد اقبال

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۷۷۱۲

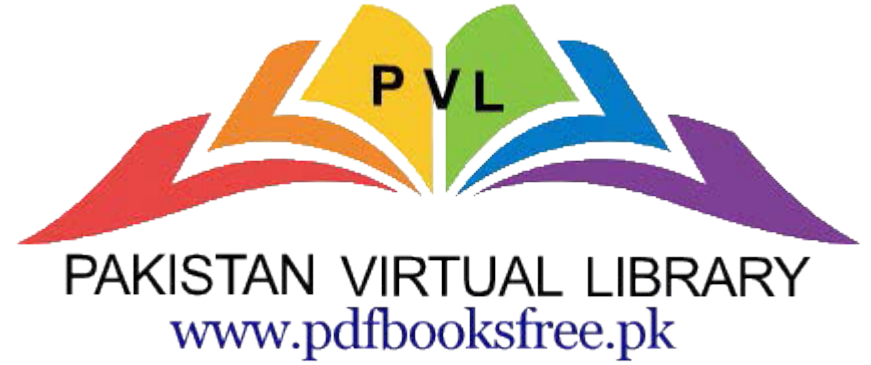
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول _____ ۲۰۰۴ء

مطبع _____ یو این ڈی پرنٹرز لاہور

کیوزنگ _____ صوبہ کیوزنگ سنٹر لاہور

تقریباً _____



ISBN 969-517-186-9

اسٹاکسٹ
علی بابا سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال لاہور

ایک ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے عاقل کے بارنٹ میں پیش آنے والے سامنے کے امکانات پر غور کیا تو مجھے پھر خود پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ لکھوانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ میں نے پولیس کو فون کرتے ہوئے یہ بتا دیا تھا کہ حملہ آوروں کا تعلق نارن بار سے اور جی سے تھا۔ بے شک میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر پولیس بہر حال سمجھ جائے گی کہ گزشتہ حالات کے تناظر میں جی کا ہدف کون ہو سکتا ہے۔ جب عاقل رپورٹ لکھوائے گا تو وہ بھی میری اور جی کی کاروباری رقابت کا حوالہ دے گا اور اس وقت پولیس ضرور سوال کرے گی کہ آخر مسٹر شاہ عالم نے ایک گناہ کال کرنا کیوں کافی سمجھا۔ وہ جی کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں آئے؟ انہیں ڈر کس کا تھا؟ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ عاقل رشتے میں میرا بہنوئی ہو گیا تھا اور میں سالانہ مذاق میں وہ مجھے ایک ٹینک سرکٹ تھا۔ بعد میں پولیس یہ سوال یعنی سے بھی پوچھے گی کہ آخر تمہارے بھائی صاحب اسے برا سراہ کر بیٹے پر کیوں لی سیو کرتے ہیں۔ مجرم اور بد معاش تو پولیس کے سامنے سے بھی دور رہنا چاہتے ہیں مگر شاہ عالم تو مظلوم ہے۔ وہ فریاد سے کیوں ڈرتا ہے اور ظاہر ہے جی کے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں ہوگا۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے عاقل کے بارنٹ میں پیش آنے والے سامنے کے امکانات پر غور کیا تو مجھے پھر خود پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ لکھوانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ میں نے پولیس کو فون کرتے ہوئے یہ بتا دیا تھا کہ حملہ آوروں کا تعلق نارن بار سے اور جی سے تھا۔ بے شک میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر پولیس بہر حال سمجھ جائے گی کہ گزشتہ حالات کے تناظر میں جی کا ہدف کون ہو سکتا ہے۔ جب عاقل رپورٹ لکھوائے گا تو وہ بھی میری اور جی کی کاروباری رقابت کا حوالہ دے گا اور اس وقت پولیس ضرور سوال کرے گی کہ آخر مسٹر شاہ عالم نے ایک گناہ کال کرنا کیوں کافی سمجھا۔ وہ جی کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں آئے؟ انہیں ڈر کس کا تھا؟ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ عاقل رشتے میں میرا بہنوئی ہو گیا تھا اور میں سالانہ مذاق میں وہ مجھے ایک ٹینک سرکٹ تھا۔ بعد میں پولیس یہ سوال یعنی سے بھی پوچھے گی کہ آخر تمہارے بھائی صاحب اسے برا سراہ کر بیٹے پر کیوں لی سیو کرتے ہیں۔ مجرم اور بد معاش تو پولیس کے سامنے سے بھی دور رہنا چاہتے ہیں مگر شاہ عالم تو مظلوم ہے۔ وہ فریاد سے کیوں ڈرتا ہے اور ظاہر ہے جی کے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں ہوگا۔

آدھے راستے سے میں نے ٹیکسی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف کرا لیا۔ خود شک سے محفوظ رہنے اور جی کو محفوظ رکھنے کے لیے میرا نارمل طریقے پر قانونی راستہ اختیار کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں نے سن گلز، رین کوٹ اور فلیٹ ہیٹ ٹیکسی میں ہی چھوڑ دیے مگر میری بد قسمتی کہ پولیس اسٹیشن پر میرا واسطہ ایک انتہائی ٹکی مزاج، متعصب اور خبیث قسم کے افسر سے پڑا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا ”تمہارا نام اتنا فنی کیوں ہے؟“

میں نے کہا ”یہی سوال میں تمہاری صورت کے بارے میں بھی کر سکتا ہوں مگر میں پرسنل ریکارڈس کو اچھا نہیں سمجھتا۔“

”اوہ۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل یہ نام میرے دماغ میں کھنٹی بجا رہا ہے۔ ذرا مجھے چیک کرنے دو“ اس نے ایک کمپیوٹر میں میرا نام ڈالنے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”میرا نام مطلوب مجرموں کی فہرست میں بہر حال نہیں ہوگا۔“

اس نے مانیٹر پر ملنے والی تفصیلات پر غور فرماتے ہوئے سنی بجا کے اپنی حیرت کا اظہار کیا ”تم وہی ہو جس کو تین لاکھ پاؤنڈ جمن جانے کے باوجود دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ تم جی اور لاڈ پرائس۔ یہ ایک برا سراہ ٹکٹ ہے۔ تم اتنے مسٹر

کلین نہیں ہوجتے نظر آتے ہوا غا ہر کرتے ہو؟
 میں نے کہا ”اب اگر تم نے ایک بھی ناجائز ذاتی
 ریمارک دیا تو مجھے تمہارے خلاف ہوم سیکریٹری کو شکایت
 بھیجی پڑے گی۔“
 وہ ہنس پڑا ”ہوم سیکریٹری کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت
 ہے میں سواری کہہ دیتا ہوں۔“
 میں نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے رکھ دیا ”جو تم
 نہیں جانتے وہ جان لو کہ یہ ڈیپلومک پاسپورٹ ہے۔ میں
 پاکستان کی ایک سیاسی جماعت کا لیڈر اور اسمبلی کا ممبر تھا۔
 چنانچہ ہوم سیکریٹری سے میرا بات کرنا صرف تمہارے لیے
 تکلیف کا سبب بن سکتا ہے۔“
 اس کے بعد وہ محتاط ہو گیا ”آل رائنٹ مسٹر شاعلام۔
 واٹ از یو ری ایلیم؟“
 میں نے کہا ”آج صبح مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔“
 وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے اس کے سامنے کوئی شرابی
 بیٹھا اڑھرا دھڑک رہا ہے۔ ”تیس۔ پھر کیا ہوا؟ تم تو زندہ
 ہو۔“
 میں نے بھٹاکے کہا ”نہیں۔ میں قتل ہو گیا تھا اور اب
 عالم ارواح سے میری روح فریاد لے کر آئی ہے جو میں کہہ رہا
 ہوں وہ میرا قانونی بیان ہے اگر تم لکھو گے میں اور ایسے
 بی ہو کرستے رہو گے جیسے میں بھوک رہا ہوں۔“
 ”نہرو!“ اس نے دراز میں سے چین اور ایک نوٹ بک
 نکالی۔ ایک نیپ ریکارڈر آن کیا اور بولا ”تیس۔ اب بتاؤ؟“
 میں نے اسے سب بتا دیا تو اس نے رپورٹ میرے
 سامنے رکھ دی ”اس پر دستخط کرو۔“
 میں نے دستخط کر دیے ”تھینکس۔ کیا اب میں
 جاؤں؟“
 ”نہیں۔ مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں“ وہ بولا
 ”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے کتنا فون کیوں کیا تھا؟“
 میں نے کہا ”وہ میری غلطی تھی۔“
 ”بڑی سوچی سمجھی غلطی تھی“ وہ بولا ”خیر پھر اب تمہیں
 کس بات نے مجبور کیا کہ تم رپورٹ لکھوانے آگے؟“
 میں نے کہا ”پہلے میں بہت آپ سیٹ تھا۔ جب میری
 عقل ٹھکانے آئی۔“
 اس نے اپنی کھائی کی گھڑی دیکھی ”تمہاری عقل کو
 ٹھکانے آنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ ان دو گھنٹوں میں تم کہاں
 رہے؟“
 ”میں اپنے گھر گیا اور سامان بیک کرنا رہا۔ پھر میں نے

آئے تھے۔ پولیس نے ان سے عاقل کے بارے میں پوچھا تھا
 اور ان میں سے دو افراد نے بتایا تھا کہ جس اپارٹمنٹ میں
 پیٹرول بم سے آگ لگائی گئی اس میں ایک پاکستانی رہتا تھا جو
 کچھ پرورزا اور راکٹرو غیر متعلقین انتہائی معقول اور بے ضرر
 شخص تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کام کرتا ہے
 اور کہاں مل سکتا ہے۔
 مجھے ساتھ لے جانے والے بیان کے ساتھ مجھے
 تفتیشی افسر کے سپرد کر دیا۔ تم اس سے جو پوچھ سکتے ہو پوچھ
 لو۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ آج ہی رات کو وطن واپس
 جا رہا ہے۔
 تفتیشی افسر سارجنٹ اسمتھ انتہائی معقول اور ذہین
 شخص تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”مجھے یقین ہے کہ آپ
 قانون سے تعاون کریں گے۔“
 میں نے کہا ”اگر میں چاہتا تو خاموشی سے بھی پرواز
 کر سکتا تھا۔“
 ”دونوں ملزمان پولیس کی تحویل میں ہیں۔ ایک زندہ
 اور ایک مردہ۔ کیا تم ہمارے ساتھ چل کے انہیں شناخت
 کر سکتے ہو؟“
 پولیس اسٹیشن پر ایک بار پھر سوال جواب کا سلسلہ
 شروع ہوا۔ ایک سینئر سرانگ رسائی ٹینپن آجرتے نے مجھ سے
 پوچھا ”مسٹر شاعلام، آپ ایک تعلیم یافتہ اور ذمے دار
 شخص ہیں۔ آخر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اتنی ہمداری سے
 مجرموں کو جانے واردات پر روک کے آپ خود بھاگ گئے؟“
 میں نے کہا ”دراصل۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پولیس
 کے چکر میں نہ پڑوں۔ مجھے آج رات کی فلائٹ سے ہر حال
 میں واپس جانا تھا۔ میں خاموشی سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن پھر
 مجھے خیال آیا کہ پولیس میری بہن اور اس کے شوہر سے ہر
 بات معلوم کر لے گی۔ ہو سکتا ہے میرے جانے سے ان کے
 لیے قانونی مسائل کی الجھن بڑھ جائے۔ جی خواہ مخواہ ان کا
 دشمن ہو جائے۔“
 ”اب میں آتا ہوں بنیادی مسئلے کی طرف۔ آخر جی کے
 اور آپ کے درمیان کاروباری اختلافات دشمنی کی اس انتہا
 تک کیسے آگئے کہ اس نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی؟“
 میں نے کہا ”اس کی وجہ کاروباری اختلاف نہیں ہے۔
 یو سی، ہم پرانے بزنس پارٹنر تھے۔ حال ہی میں نامعلوم
 مجرموں نے ہم سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے تھے۔ اس رقم
 کی ادائیگی مجھے لارڈ پرائس نے کی تھی۔ میں نے جی کی
 معرفت اسے تقریباً چھ لاکھ پاؤنڈز مالیت کے نوادرات

کی۔ اور کتنی ناقابل یقین سی بات ہے کہ خود جی کی بیوی نے سب دیکار کر کے رکھ لیا اور بعد میں پولیس کے حوالے کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے وہ شوہر سے چمکارا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں تھی۔“

”سوال پھر وہی ہے کہ کیوں؟“

”کیونکہ جولی نے پیسے کی خاطر جی سے شادی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جی زیادہ دن نہیں جیے گا۔ وہ مر جائے گا یا مار دیا جائے گا۔ پوس اس کا بچلا دھڑکل طور پر مفلوج ہے۔ وہ عورت کے قابل نہیں ہے۔ یہ بات جولی جانتی تھی مگر لالچ میں اس نے خود پر جبر کیا۔“

”یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟“

میں نے کہا ”مجھے یہ سب جولی نے بتایا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ جی نے اسے بتا دیا تھا کہ کبھی اس نے یہ راز فاش کیا یا اس کو وجہ بتانے کے غلطیہ ہونے کی کوشش کی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ چنانچہ جولی نے خود جی کو الگ کر دیا۔ اس نے جی کے خلاف تحقیقات کرنے والوں کو ٹیکس چوری عورتیں ناجائز طور پر اسکل کرنے اور ان سے زبردستی پیش کرانے کے ثبوت بھی فراہم کر دیے تاکہ وہ طویل عرصے کے لیے جیل کی سزاؤں کے پیچھے چلا جائے۔“

”ایک منٹ“ کیپٹن اسمتھ بولا ”کیا یہ تمہارا قانونی بیان ہے؟“

میں نے کہا ”آف کورس۔ میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کے سامنے جو بھی کہا جائے اس کی حیثیت قانونی بیان کی ہو جاتی ہے۔“

”اوکے۔ تم وہ سب پھر بتاؤ جو ابھی بتایا۔“ اس نے ایک نوٹ شیٹ اور پین نکالا اور ایک کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا۔

میں نے ساری باتیں دہرائیں۔

سب سننے اور لکھنے کے بعد اسمتھ نے سوال کیا ”مسٹر شاہ علام۔ جولی جانتی تھی کہ اس نے اپنا راز کسی پر افشا کیا اور یہ بات جی تک پہنچ گئی تو وہ ماری جائے گی۔ اس کے باوجود جولی نے ہمیں اپنی پلاننگ تک بتادی۔ آخر کیوں؟“

”یہ اس کی بے وقوفی تھی لیکن اس بے وقوفی کی وجہ تھی محبت۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔“

”آئی سی۔ اور تم۔ کیا تم بھی؟“

میں نے کہا ”نہ۔ یہ میں نے اس کے عزائم دیکھتے ہوئے شروع میں ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔“

”یہ ایک عام سی لوائسٹری گتی ہے جس میں ناموشوہر نے حسد اور احساس محرومی کا انتقام لینے کے لیے بیرو کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ کیا بیروئن کی باتوں سے یا اس کے رویے سے دلن شوہر کو شک ہو گیا تھا کہ بیوی اس سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے؟“

”نہیں۔ ایسا ہی ہوا تھا غالباً جی مجھ سے بیٹس ہو گیا تھا اور دشمنی پر اتر آیا تھا۔ لیکن معاملات اب اس سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین ہو گئے ہیں۔ وہ جولی کو بھی قتل کرنا چاہتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا کام شروع کر چکا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

میں نے جواب میں اسے جی سے ہونے والی پوری گفتگو بتادی اور یہ بھی کہ میں نے بیک گراؤنڈ میں چلانے والی جولی سے کیا سنا تھا۔ ”مجھے یہ شک بلکہ یقین ہے کہ اس نے جولی کو بھی اسی خانے میں پینچا دیا ہو گا۔ جہاں پہلے سے دو ڈھانچے موجود ہیں۔ اس کی پہلی بیوی اور اس کے آشنا کے۔“

”او مائی گاڈ! تم یہ سب کچھ جانتے تھے اور اس کے باوجود تم نے کچھ نہیں کیا“ کیپٹن اسمتھ نے برہمی سے کہا ”تم ایک بار میرے لکھے آدی ہو۔ خود کو اسمبلی کا ممبر اور ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ کہتے ہو۔ تم قانون کو نہیں سمجھتے اپنی قانونی ذمہ داری نہیں جانتے؟“

میں نے کہا ”اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ جس دن مجھے جولی نے یہ سب باتیں بتائی تھیں۔ مجھے اسی دن پولیس کو رپورٹ کرنا چاہیے تھا۔ تو میرا جواب ہے کیپٹن کہ میرے ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ آج بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے جولی نے میری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ایک دردناک کہانی سنائی ہو۔ خود جولی کہ جس تک قابل اعتبار ہے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ اپنے فائدے کے لیے وہ کسی بھی اتنا تک جاسکتی ہے۔ لیکن جو بات اہم ہے وہ میرا سامنا تھا۔ میں نے دیر سے سہی مگر بالآخر پولیس کو سب بتا دیا۔ جیسے جولی نے بتایا انت بھلا سو بھلا۔ اب تم میرا بیان لینے کے مگر بالآخر بعد مجھے بھی فرد جرم تھماؤ گے یا جولی کو بچانے کے لیے اور اس کے قابل شوہر کو گرفتار کرنے کے لیے اگلا قدم اٹھاؤ گے۔“

اس نے کہا ”کیا تم جانتے ہو کہ۔۔۔ وہ خانہ کہاں ہے؟“

”نہیں میں گیس بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن پولیس بہر حال اس کا سراغ لگا سکتی ہے۔“

”آل رائٹ! ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پانچ منٹ بعد میں پولیس کی ایک چھاپا مار پارٹی کے ساتھ جا رہا تھا۔ یہ چھاپا مار پارٹی چار افراد پر مشتمل تھی جو سراغ رسی کے اپنے اپنے شعبے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ دو گاڑیاں تھیں جو بالکل نئے ماڈل کی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خصوصی آلات بھی لے گئے تھے مگر ریڈیو کنٹیکٹ پر انہوں نے خصوصی کیرے منکوا لیے تھے جن سے سو نو گرائی ممکن تھی اور کسی خانے، سرنگ یا پوشیدہ خلا کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ ان کی مدد کے لیے ایک پولیس ڈاگ بھی طلب کیا گیا تھا جو کپڑوں کی بو سے گندہ شخص کا پتا چلا سکتا تھا شرطیکہ جو زیادہ پرانی نہ ہو۔ ایسویٹس کے ساتھ ایک ڈاکٹر الگ بلایا گیا تھا۔

ان انتظامات کے مکمل اور موثر ہونے کی حقیقت نے پھر مجھے خود اپنی نظر میں شرمسار کیا کیونکہ میرے اپنے ملک میں اول تو پولیس کسی کے مفروضے، شک یا خیالی امکان پر حرکت میں ہی نہیں آتی۔ حرکت میں آئے تو مشترکہ مفادات کے مسائل پہلے طے کرتی ہے پھر سواری کا مسئلہ ہوتا ہے اور پولیس کی نظری کے مستجاب ہونے کا۔ اگر ”ڈباؤ“ زیادہ ہو تو کوئی ایک یا دو پھول والا تھانے دار ساکس سے سوال کرتا ہے کہ سواری ہے؟ نہیں ہے تو لاؤ۔ اور اس کی ذاتی کار یا بیگار میں کوئی تنگیسی بچو کے چھاپا مار جائے وادرات پر پہنچتے ہیں تو واحد کارروائی یہ ہوتی ہے کہ جتنے بھی بندے ہاتھ آئیں سب کو پکڑا لیتے ہیں۔ تفتیش کا مکمل تھانے میں بذریعہ ”آلات تفتیش“ شروع ہوتا ہے تو طرز خود بتا دیتا ہے کہ اس نے پیدا ہونے سے اب تک کتنے جرائم کیے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو کام برطانوی پولیس نے جدید آلات اور عقل و ذہانت کی مدد سے کیا وہی کام اگر صرف تیرہ نمبر کے پچھترے لیا جاتا ہے جی بتا دیتا کہ اس نے جولی کو کہاں قید کیا ہے اور کیوں؟ مگر اس کا کیا علاج کہ گورے مشکل مگر قانونی طریقہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پولیس نے ٹارنن بار کا محاصرہ نہیں کیا۔ انہوں نے داخلے کے راستے پر زبرد رنگ کی ایک پنی باندھ دی جس کا مطلب ہوتا ہے ”داخلہ منع ہے“ اور دو آڑے کے باہر ایک کانسیل کو نامور کر دیا۔ نہ وہاں کوئی سنسنی پھیلی نہ مجمع لگا اور نہ کسی نے دخل اندازی کی۔

ٹارنن بار کے اندر دوپہر کا مظہر وہی تھا جو میں اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ صفائی کا عمل اپنے کام میں مشغول تھا اور انہوں نے پولیس کو واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

میں گھر کا بھیدی تھا اور لگا ڈھانے آیا تھا۔ میں نے اس بچے کے پیچھے والے راستے پر پولیس کی راہنمائی کی۔ ہر قدم پر موجود محافظوں نے پولیس کا راستہ اس بے خوفی کے ساتھ روکا جو قانون پر اعتماد سے آتی ہے۔ پوشیدہ کلوز سرکٹ کیمروں نے یہ سارے مناظر پہلے ہی جی تک پینچا دیے ہوں گے۔ ہمارے پہنچنے تک وہ پولیس کا استقبال کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

اس نے بڑی منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”یہ کیا ہے شاعلام؟“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جی نے کیپٹن اسمتھ سے کہا ”کیپٹن۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس اس کارروائی کا کیا جواز ہے؟“

کیپٹن اسمتھ نے قانونی زبان میں ایک مختصر تقریر کی اور جی سے کہا کہ وہ زیر حراست ہے اور اب جو بھی وہ کہے گا اس کے خلاف قانونی عدالت میں استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے قانونی مشیر کو بلوا سکتا ہے۔

جی نے فون اٹھ کر ایک نمبر ملایا اور بولا ”ہنری۔ تم

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز مکتوبات

جلد اول میں شامل

ماہر جاوید مغل

250

عزتیں بے رنگ، عزت جلد و زلف و زینت کے ساتھ

عالمی دستانہ سائنس و کائنات

7247414

عزتیں بے رنگ، عزت جلد و زلف و زینت کے ساتھ

عالمی دستانہ سائنس و کائنات

7247414

عزتیں بے رنگ، عزت جلد و زلف و زینت کے ساتھ

عالمی دستانہ سائنس و کائنات

7247414

کہاں ہو۔ یہاں پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ وجہ میں نہیں جانتا مگر وہ کہتے ہیں کہ تم زیر حراست ہو۔ تم فوراً یہاں آ سکتے ہو؟ ٹھیکس!

کیپٹن نے کرسی پر بیٹھ کے کہا "مسٹر جیمس پونڈ۔ جولی آپ کو واقف کا نام ہے؟"

"ہیں!"

"یہاں میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

جی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "وہ مجھے جاکے نہیں مانی۔"

اسمتمہ نے میری طرف اشارہ کیا "مسٹر شاعلام کا کہنا ہے کہ آج صبح جب تم نے انہیں فون کیا تو پیچھے کیس ہمارا بیوی بیچ کر کمرہ رہی تھی کہ تم اسے قتل کرنے جا رہے ہو؟"

"یہ مسٹر شاعلام کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ اس کے کان ہی نہیں دماغ میں بھی خرابی معلوم ہوتی ہے۔"

کیپٹن اسمتمہ نے اسے ایک کاغذ تھموا "میں شک کی بنا پر اس جگہ کی تلاش لیتا چاہتا ہوں۔"

جی کا پاس چہرہ کچھ پیکا پڑ گیا۔ "جولی کو براہ آمد کرنے کے لیے آیا اس کی لاش۔"

"یہ ہم دیکھیں گے کہ کیا ملتا ہے۔" کیپٹن اسمتمہ نے کہا اور ساتھ آنے والوں کو اپنا کام شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اپنے آلات کے ساتھ ادھر ادھر پھیل گئے۔

کیپٹن اسمتمہ نے گلوڑ سرکٹ کیلی وژن "ڈبل سرکٹ پیغام رسانی کے آلات اور الیکٹرانک سیکیورٹی سسٹم کو شک آمیز دیکھی کے ساتھ دیکھا "مسٹر جیمس! یہ صرف ایک بار اور ٹائٹ کلب ہے؟"

"تمہیں اور کیا لگتا ہے؟"

"سیکیورٹی سے یہ سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر لگتا ہے؟"

طرح چھپاتا رہا "ایک بات اور ہو سکتی ہے۔ تم نے دنیا میں دوست کم بنائے ہیں، دشمن زیادہ اور یہ دشمن طاقتور بھی ہیں تم ان سے ڈرتے ہو۔"

"کیا تمہارے دشمن نہیں ہیں؟" جی بولا۔

"بہت ہیں۔ تم جیسے میرا تو واسطہ دن رات ایسے ہی لوگوں سے پڑتا ہے۔ میرا مقصد اپنے کارناموں سے تم کو متاثر کرنا نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انڈر گر اوڈن ورلڈ میں میری دہشت ہے۔ میں نے ایسے بہت سے گینگ BUST کیے ہیں جو بہت طاقتور تھے۔ اس کے باوجود میں عام لوگوں کی طرح رہتا ہوں عام لوگوں کی طرح پھرتا ہوں۔"

"تم ہمارا آدمی ہو؟" جی نے پھر طنز کیا۔

"ہاں۔ تمہارے مقابلے میں۔" اسمتمہ ایک دم پلٹا "تم بڑول ہو کیونکہ تم خود نہیں ہو۔"

"شٹ اپ!" جی چیخا۔

"میں۔ خود تمہاری بیوی ایسا کہتی ہے۔ پوچھو اس جنٹلمین سے؟"

"جنٹلمین! جی ازاے باسٹرو۔ اس نے میری بیوی کو درغلائیا۔ تم اس کے کالے کرتوتوں سے واقف نہیں ہو۔"

"مگر تمہارے کالے کرتوتوں سے واقف ہوں میں۔"

اسمتمہ نے دھاڑ کے کہا "کتنے مقدمات ہیں اس وقت تمہارے خلاف؟ اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہر کیس میں پولیس کو جو ثبوت فراہم کیے تمہاری بیوی نے کیے؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" جی پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ "وہ ایسا کہی نہیں سکتی۔ وہ ایک وفادار عورت ہے۔ وہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔"

اسمتمہ نے افسوس سے سر ہلایا "تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

جی جھکے ہوئے لیجے میں تردید کی "میں نے اسے قتل نہیں کیا؟"

"پھر تم نے اسے کیا سزا دی؟ کسی نے خانے میں ڈال دیا زنجیروں سے باندھ کے تاکہ وہ بھوک پیاس سے مرے زرب کے مرجائے۔"

وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔

"اس نے تم سے قانونی شادی کی تھی؟"

"ہیں۔ غیر قانونی شادی کون سی ہوتی ہے؟"

"پھر اس نے قانونی طور پر طلاق کیوں نہیں لی۔ وہ تم سے خاصی دولت وصول کر سکتی تھی۔ کہیں وہ بھی تو اسی خانے میں نہیں۔ اپنے آشنا کے ساتھ؟"

جی نے کہا "کون سا؟ خانہ؟" مگر اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"اگر تم خود بتا دیتے تو اچھا تھا، خیر۔ ہم تلاش کر لیں گے۔ یہ دروازہ کہاں کھلتا ہے؟"

"یہ۔ میرا پرائیویٹ بینڈ روم ہے۔"

کیپٹن اسمتمہ اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

جی نے مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا "شاعلام! اب میری زندگی کا واحد مقصد تمہیں قتل کرنا رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اب تمہاری زندگی جو پہلے ہی اس آدمے دھڑکی وجہ سے آگئی تھی، ختم ہو رہی ہے۔"

"اگر تم میں بچ بولنے کا حوصلہ ہے تو بتاؤ۔ کیا تم میری بیوی سے محبت کرتے تھے؟"

"بچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی" میں نے کہا۔ "بھوکو موت کہتے تمہارے اس کے ساتھ ناجائز مراسم تھے۔"

کیپٹن اسمتمہ اندر سے نمودار ہوا "یہ لباس تمہاری بیوی کا ہے؟"

"نہیں۔" جی نے جھوٹ بولا۔

ایسا لگتا تھا کہ وہاں پہلے چار میک اپ روم تھے۔ بعد میں آخری کیبن کو واش روم میں تبدیل کر دیا گیا جو سازشیں قدرے چھوٹا تھا لیکن پولیس نے اس تبدیلی کے نظر فریب پر دے کے پیچھے حقیقت دیکھ لی تھی۔ واش روم اس لیے چھوٹا لگتا تھا کہ میک اپ روم بہرہ ور واش روم کی درمیانی دیوار ایک طرف سے ڈھل گئی۔ پہلے ڈرنک روم میں ایک اور دیوار اٹھانے کا نتیجہ لگتا تھا کہ اس کی چوڑائی کم ہو گئی تھی اور یہ اس قابل نہ رہا تھا کہ میک اپ کے لیے استعمال ہو سکے چنانچہ کچھ ضرورت کے تحت لیکن اصل میں ایک بھیاک حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے اسے واش روم بنا دیا گیا تھا۔

درمیانی ڈھل دیوار کے وجود کا کسی کو احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ غالباً ڈرنک روم کو واش روم بنانے کے خرچے اور تعمیری عمل کے دوران میں اسے بند رکھا گیا تھا اور "کارنگر" اندر اطمینان سے اپنا کام کرتے رہے تھے جب دوبارہ اسے فنکاروں کے استعمال کے لیے کھولا گیا تو کسی نے یہ نوٹ نہیں کیا کہ پرائیویٹ ڈرنک روم جب واش روم بنا تو چوڑائی میں ڈیڑھ فٹ کم کیسے ہو گیا۔ واش روم کی خشکری وجہ سے یہ فرق چھپ گیا تھا۔

تاہم پولیس کے ایکس رے کرنے والے سوئوگر تک

☆ 9 ☆ گیارہواں حصہ

مداری ☆ 8 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 9 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 8 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 9 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 8 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 9 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 8 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 9 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 8 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 9 ☆ گیارہواں حصہ

کیرے نے ایک بھانک حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھایا تھا۔ دہری دیوار کے درمیان ایک ڈھانچا سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ کیرے نے اس کا عکس اسکرین پر ایسے دکھایا جیسے سیاہ ایکس رے فلم پر پڑوں کا بچہ دکھائی دیتا ہے۔ کیپٹن اسمتھ تجربہ کار آدمی تھا اور اس نے FORENSIC سائنس میں اسٹیکس کو رس کیا تھا۔ اس نے کیرے کا عکس دیکھتے ہی بتا دیا کہ ڈھانچا کسی نوجوان لڑکی کا ہے۔ اس بد قسمت لڑکی کو جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دو سال قبل اتار کلی کی طرح دیوار میں زندہ یا مرنے کے بعد چن دیا گیا تھا۔

اسمٹھ ابھی اس مدفون رقاہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک ساتھ دو جاندار بھونکتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک پولیس کا سراغ رساں تھا، دوسرا جی کا وکیل۔ دونوں ایک جیسا شور کر رہے تھے۔ ”میں پوچھتا ہوں یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ وکیل نے کہا۔ اسمٹھ ایسے وکیلوں کے چار حانہ طرز عمل کا عادی تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”ہم ایک تاریخی ڈھانچا دیکھ رہے ہیں جو بہت جلد کھدائی میں برآمد ہوگا۔“ وکیل رک گیا ”واٹ انڈس؟“

اسمٹھ نے کہا ”میری ناقص عقل یہ کہتی ہے کہ ڈھانچا ایک لڑکی کا ہے، صحیح فیصلہ ماہرین کا ہوگا لیکن یہ بہت واضح ہے کہ اس قل کا الزام براہ راست تمہارے موکل پر آئے گا۔“ وکیل نے زبردستی بحث کی ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے یہ ڈھانچا پرانا ہو۔ جب یہ عمارت میرے موکل کی ملکیت نہیں تھی۔“

اسمٹھ نے اس سے اتفاق کیا ”اگر ماہرین یہ کہیں گے کہ عمارت ڈھائی سو یا ڈھائی ہزار سال پرانی ہے تو بلاشبہ اس کا الزام سکندر اعظم کے زمانے کے کسی قاتل پر آئے گا۔ لیکن ایک تو تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ تاریخی بار کو خود جی نے نئے نقشے کے مطابق ڈیزائن کرا کے بنوایا تھا۔ دوسرے میڈیکل رپورٹ سے اس لڑکی کی صحیح تاریخ وفات بھی معلوم ہو جائے گی۔ اور یہ بھی کہ اسے کیسے مارا گیا تھا؟“

وکیل نے ہاتھ کے اشارے سے ایسے ظاہر کیا جیسے اسمٹھ کی بات محض افسانہ طرازی یا خیال آرائی ہے ”جی کہاں ہے؟“ ”آئی ڈونٹ نو۔ یادہ مردہ خانے میں ہو گیا اسپتال میں؟“

جب اسے ایسولیس میں لے جایا گیا تو وہ ہارٹ انیک ہو جانے سے بے ہوش تھا۔ ”اس کے ذمے دار تم ہو۔“ اس نے دھمکی کے انداز میں اپنا مکا لرایا۔ ”میں پولیس پر ہرجانے کا کیس کھدوں گا۔ تم سب ایک شریف اور قانون پسند شہری کو اذیت دے کر مار ڈالنا چاہتے ہو۔“ اسمٹھ کے ایک ماتحت نے کہا ”ہمیں ایک اور اہم سراغ ملا ہے۔ ایک دارڈوب کے پیچھے خلا تھا۔ وہاں ہم نے دروازہ دریافت کر لیا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے یہ خانہ ہوگا۔“

”جو اندر جائے وہ محتاط رہے۔ اس کا واسطہ مسلح محافظوں سے ہو سکتا ہے؟“ کیپٹن نے کہا۔ میں نے کہا ”میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جولی اسی یہ خانے میں ہوگی۔“ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں“ وہ بولا۔ ”ہم نے کتے کو جولی کے کپڑے سوگھنے کے لیے دیے تھے“ ماتحت نے میرے خیال کی تائید کی ”وہ بھی وارڈوب میں گھسنے کے لیے زور لگا رہا ہے۔“ ”پھر تو شک کی گنجائش ہی نہیں“ کیپٹن نے کہا ”اسے جولی کی خوشبو آ رہی ہوگی۔“

دو مسلح پولیس مین ہاتھ میں گن لیے غار کرنے کے لیے تیار اور محتاط انداز میں اندر داخل ہوئے۔ آگے وہ پولیس مین تھا جس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ کتا بھونکتا شور مچاتا پوری قوت سے زنجیر کو کھینچ رہا تھا۔ وہ یقیناً یہ خانے میں جولی کی بو کا سراغ لگا چکا تھا۔

میں سب کے پیچھے کپڑوں کی اس الماری میں گھسا جو آفس کے پیچھے والے بند روم کی ایک دیوار میں بنی ہوئی تھی۔ بظاہر اس میں شک پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ سامنے والے نصف حصے میں جی کے اور جولی کے کچھ پریس کیے ہوئے ڈریس بگزر میں لٹکے ہوئے تھے۔ بائیں طرف کے دو خانے جوتوں کے لیے مخصوص تھے۔ ایک خانے میں اعلیٰ قسم کی شرابوں کا ذخیرہ تھا جو وہ اپنی اور مہمانوں کی تواضع کے لیے استعمال کرتا تھا۔

دارڈوب کا پچھلا حصہ بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ اس کے انتہائی دائیں جانب ایک لاک تھا جو نظر نہیں آتا تھا۔ لاک کھولنے کے بعد پورا پچھلا حصہ عین مرکز پر محسوس جاتا تھا۔ نمودار ہونے والے خلا سے گزر کے میں نے خود کو ایک دسینے پر پایا۔ دو دسینے اترنے کے بعد ایک اور دروازہ تھا

جو مضبوطی سے بند تھا مگر پولیس والوں نے ٹکرس مار مار کے اس کے قبضے ڈھیلے کر دیے اور بالآخر اسے کھولنے میں کامیاب رہے۔

دروازہ تھوڑے آواز کے ساتھ پیچھے جاگرا۔ یہ خانے کے خلا میں اس کے دھماکے سے گونج سی پیدا ہوئی۔ آگے تاریکی تھی مگر پولیس والوں نے لائٹ کے سوچ تلاش کر لیے۔ میرے سامنے ایک پورا زینہ آگیا جو نیچے تیسرے دروازے تک جا رہا تھا۔

پولیس نے آخری دروازے کو بھی کرا دیا اور یہ خانے میں داخل ہو گئے۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے جولی کو دیکھا۔ وہ سر تپا ہرمنہ اور ایک ذخیرے کے ساتھ بندھی ہوئی بے ہوش پڑی تھی۔ جی نے اس کے ہاتھوں کو رسی سے کمر کے پیچھے باندھ دیا تھا اور ذخیرے کو بیروں میں ڈال کے اس کا دوسرا سرا اس فولادی بچھرے کے ساتھ مقفل کر دیا تھا جس میں پہلے سے دو محبت کے مجرموں کے ڈھانچے مقید تھے۔

اگرچہ جولی نے مجھے سب کچھ بتا رکھا تھا مگر اس کے باوجود میرے جسم کو خوف کی سرد لرزے مفلوج کر دیا۔ یہ خانے میں ایک کم طاقت والے لیب کی زرد تیار روشنی اس ماحول کو جزئیات میں زندہ بنا رہی تھی۔ وہاں ایک عجیب سی ڈراؤنی بو تھی اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ برسوں پہلے ڈی کیو زہونے والی دو لاشوں کی بو ہے جو ابھی تک اس یہ خانے میں ٹھہری ہوئی ہے۔

آدھا انچ چوڑے چوکور سر پہ سے بنا ہوا بچھرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی پانچ فٹ تھی اور اونچائی اس سے بھی کم۔ اس بچھرے کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جی کی پہلی بے وقافیوں اور اس کے چاہنے والے کو اسی درمیانی دیوار کی سلاخوں کے ساتھ باندھ کے زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا اور وہ اسی حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا لگ آگک پیٹھے ہوئے مر گئے ہوں گے۔

میں نے ان کی موت سے پہلے کی اذیت کا تصور کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کیا کیا ہوگا۔ کیا باتیں کی ہوں گی۔ وہ ایک دوسرے کو جھوٹی تسلی دیتے رہے ہوں گے کہ کوئی ان کی مدد کے لیے ضرور آئے گا۔ پولیس پہنچ جائے گی یا ممکن ہے خود جی کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ بالکل مایوس ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔ یہ عند کیا ہوگا کہ وہ چار کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے جان دیں گے۔ ان کے ہاتھوں کی ایک ”سرسے تک رسائی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو چھو سکتے تھے

شاید سلاخوں کی موجودگی کے باوجود ان کے لب بھی مل سکتے تھے۔

لیکن موت بڑی سفاک اور بھانک چیز ہے۔ بالآخر موت کی اذیت کے ساتھ خوف نے انہیں مغلوب کر لیا ہوگا اور بچھتاوے تھے۔ انہیں بہت دیر سے احساس ہوا ہوگا کہ ایسی خطر محبت کا جان لیوا اٹھیل کھیلنا ان کی کتنی بڑی جذباتی حماقت تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر دھکی ہوئے مگر زندہ تو رہ سکتے تھے اور جانی کا صدمہ بھی انجام کار ایک زخم کی طرح مندمل ہو جاتا ہے جس کا داغ بھی نہ رہے۔ کوئی اور مرد کوئی دوسری عورت سب کو مل جاتی ہے۔

شاید آخری وقت میں عورت خوف سے پاگل ہو گئی ہو۔ مرد کو غصے اور بے بسی کے خیال نے عورت سے نفرت پر مجبور کر دیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے قریب رہ کے بھی بہت دور ہو گئے ہوں۔

لیکن ان ڈھانچوں کی جسمانی قوت اور موت کے وقت یکجائی سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک عہد وفا میں پراستقامت رہے۔

کیپٹن نے میرے کندھے کو چھوا ”مسٹر شاہ علام!“ میں چونک پڑا ”آئی ایم سوری!“

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ محبت ایک ذہنی صدمے کی شدت کو ظاہر کرتی ہے مگر ہم یہاں ایسے نہیں کھڑے رہ سکتے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ جی زنجیروں کے تالوں کی چابی کہاں رکھتا تھا؟ اپنے پاس یا کہیں اور۔ جولی نے کچھ بتایا تھا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا ”نو۔ اس بارے میں جولی کچھ نہیں جانتی تھی۔“

پھر تو ہمیں تالے توڑنے پڑیں گے۔ فی الحال ہم جولی کو آزاد کراتے ہیں تاکہ اسے اسپتال شفٹ کیا جائے“ کیپٹن نے کہا۔

سراغ رساں کتے کی مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ پولیس کے سراغ رساؤں نے اپنی مہارت اور سونو گرافی سے دیواروں کے اندر مہر جھانک کے سب دیکھ لیا تھا اور یہ سارا کام صرف آدھے گھنٹے میں مکمل کر لیا گیا تھا۔ پولیس ایک ڈسپین کے ساتھ ترجیح کی بنیاد پر اس کام کو آگے بڑھا رہی تھی۔ انہوں نے اینٹیج کی دیوار کے پیچھے دیوار صود کے ڈھانچا برآمد کرنے کے کام کو موخر کر دیا تھا۔ ایسے ہی انہوں نے بچھروں میں قید ڈھانچوں کو فوری طور پر آزادی دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ برسوں پرانے اہل

امبولینس کے ساتھ آنے والی میڈیکل ٹیم کے دو ارکان ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ جہاں اس پر کسی لاش کی طرح بڑی ہوئی تھی۔
ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے ڈاکٹر سے پوچھا: کیا یہ

لکھت، ظلم اور بربریت کی بے وردی سے معذور گزر جانے والے وقت کا وہ بدہیت اور قابلِ نفرت حصہ میرے تصور میں ابھر آیا جب بھی کے جلاؤ صفت حکم کے

نیکین تیسرے دن نے بساط پھر الٹ دی اور مستقبل کے خواب کی تعبیر پالنے کی سرمست خوشی کو اچانک عذاب الہی میں اور افسانہ ناک موت کا عنوان کر دیا۔

یعنی نے کہا ”اور اب آپ کے گلے پڑ گئے ہیں۔ بات تو یہی ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں“ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں تمہیں پریشانی ہو۔ اگر میں ایک دو دن کے لیے پاکستان جانا سو خرکروں کا تو قیامت نہیں آجائے گی۔“

”وہ تو آپ اگر یہاں جولی سے شادی کر لیں تب بھی نہیں آئے گی۔ مگر بھیا! اس عورت کے جنجال سے نکل آؤ۔“

میں نے کہا ”جیسا آپ کا حکم خاتون! کیا اب آپ عاقل کو بلائیں گی؟“

”ہرگز نہیں۔ میں اسے اسپتال بھیج دیتی ہوں“ یعنی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے ہموک لگ رہی تھی۔ میں نے ہتال کے کیے ٹیرا کا راستہ معلوم کیا۔ وہاں کافی کے ساتھ بندوچ کھائے اور واپس آیا تو عاقل اندر آ رہا تھا۔ ہم ایک گھرے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

عاقل نے کہا ”یعنی نے تمہوڑا بہت مجھے بتایا مگر وہ بہت غصے میں تھی۔ کہنے لگی کہ میرا سرمٹ کھاؤ۔ اسپتال جا کے بیاسے پوچھ لو۔“

میں نے کہا ”یعنی کا خفا ہونا بھی بے جا نہیں۔ میں.... تو اعزاء کے مسائل میں الجھ جاتا ہوں۔ نہ چاہنے کے باوجود۔“

”یہ جولی کا کیا چکر ہے؟“ عاقل بولا۔

”یہ تقدیر کا چکر ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھی جو میں نے ابھی تک چھپا رکھا تھا لیکن عاقل واقعی عاقل اور بہت پرینیکل تھا۔ اس نے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ فوس مجھے تمہارے گھر کی تباہی کا ہے۔ میں نے کہا۔

عاقل نے سرسری لہجے میں کہا ”اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انشورنس کمپنی سب دے دے گی۔“

”یعنی کو ایک جذباتی صدمہ تو ہو گیا کہ گھر بننے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔“

”حادثات بھی زندگی کا حصہ ہیں؟“ وہ بولا ”اب جی جیل چلا جائے گا تب بھی اس کا ٹینگ باقی رہے گا۔“

میں نے کہا ”نہیں جولی کنٹرول کر لے گی۔ جی کے پاس بد معاشی کی طاقت تھی۔ جولی کے پاس عقل و ذہانت اور حسن و شباب کی زیادہ خطرناک طاقت ہے۔ وہ دلوں پر حکومت کرنا جانتی ہے اور کرتی رہی ہے۔ لوگ جی سے ڈرتے ضرور تھے“ اسے پسند نہیں کرتے تھے جولی کو سب چاہتے ہیں۔“

”تم نے روانگی پھر ملتوی کر دی ہے“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے کہا ”مجبوری ہے۔ پولیس چاہتی ہے کہ میں اپنی

قانونی ذمے داری پوری کیے بغیر کہیں نہ جاؤں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔“

”لیکن تمہاری بنگ تھی آج۔“

میں نے کہا ”بنگ کینسل کراؤ اور برسوں کی لے لو۔ مجھے یقین ہے اس وقت تک ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔“

”اب مجھے بھی کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔“

”تم جانتے ہو کسی وکیل کو؟“

”ہاں۔ ایک سیالکوٹی شیخ صاحب ہیں۔ وہاں قانون کی ڈگری لے کر خزاں پھرتا تھا۔ میں نے اسے یہاں بلوایا۔ اس نے محنت کی اور یہاں کا قانونی امتحان بھی پاس کر لیا۔ اب زیادہ تر غیر قانونی تارکین وطن کے مسائل حل کرتا ہے یا پاکستان سے لندن آنے کے خواہش مندوں کی قانونی راہنمائی کرتا ہے۔ میرا بہت احسان مند ہے۔“

میں نے کہا ”اسان کو رہنے دو۔ زیادہ فیس دے کر کوئی اچھا وکیل کرو۔“

وہ ہنسنے لگا ”میں پیسے بچانے کی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کیس میں مجھے کوئی قانونی مسئلہ درپیش نہیں۔ سیالکوٹی شیخ ذاتی دلچسپی لے گا تو سارے معاملات سے نمٹ لے گا جن میں انشورنس بھی شامل ہے۔“

میں نے کہا ”تمہیں میرے کچھ کام منانے ہیں۔ ہوائی جہاز سے ریڈرویشن کراؤ پیسلے پھر ڈھائی لاکھ پاؤنڈز کی منتقلی کا انتظام کرو۔ اتنی بڑی رقم میں ساتھ لے گیا تو انرپورٹ پر ہی کرنسی اسمگل کرنے کے الزام میں دھر لیا جاؤں گا۔ پچاس ہزار پاؤنڈز کے زیور لڑچیک حاصل کرو۔ امریکن ایکسپریس سے اتنی ہی رقم کے چار بینک ڈرافٹ بنواؤ۔ رئیس ڈاکٹر کمال، قراور چندا کے نام پر۔ ان کے بینک اکاؤنٹ نمبر مجھے یاد نہیں۔ یعنی فون پر پوچھ سکتی ہے۔“

”میرا مشورہ ہے کہ ڈاکٹر کمال کو رہنے دو۔ اس کے اسپتال کا معاملہ ایسا ہے کہ کوئی بدخواہ بلا وجہ کا ایڈیو کڑا کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب غیر ملکی امداد لیتے ہیں اور حکومت سے ایک پیسہ وصول نہ کرنے کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔“

میں نے کہا ”یو آر رائٹ! ڈاکٹر کمال کی جگہ نلیمر کا اکاؤنٹ نمبر لے لو۔ پھر میرے جانے کے بعد ان نوادرات کو بھجواتا ہے۔“

”وہ بہت دور کی بات ہے۔ میں کروں گا سب بندو بست۔“

ایک نرس نے مجھے دور سے اشارہ کیا ”مسٹر شاہ غلام!“

میں نے کہا ”نہیں۔ جولی کیسی ہے؟“

”تم خود جا کے دیکھ سکتے ہو“ وہ مسکرائی۔

”میں اب چلتا ہوں سرہی!“ عاقل بولا ”آپ بھی ایڑی ہو جاؤ۔ ایسی کی نیکی ان ننگور کے منہ والے فرنگیوں کی۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

میں نرس کی راہنمائی میں جولی کے کمرے تک گیا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم گردن تک سرخ کھیل کے نیچے تھا۔ اس کے ڈارک براؤن رنگی بال تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔

اس نے سر کھمکے مجھے اجنبی نظروں کی بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔ میں اس کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں شاہ عالم ہوں۔“

شناخت کے جذبات مسکراہٹ بن کے اس کے ہونٹوں پر عیاں ہوئے ”تم واقعی شاہ عالم ہو۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ میں اس کی روح ہوں۔“

وہ آہستہ سے کراہی ”تم بھی عالم ارواح میں پہنچ گئے میرے ساتھ؟“

میں نے ہنس کے کہا ”یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

وہ بولی ”نہیں پہلے تم بتاؤ۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟“

”تمہیں نہیں معلوم؟“

”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں یہاں کیسے آ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تمہیں پولیس لانی ہے۔ میں نے پوچھا کہ پولیس مجھ تک کیسے پہنچی تو اس نے کہا کہ یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ اس سے پوچھ جو نہیں لایا تھا۔“

میں نے کہا ”پولیس کو میں لایا تھا۔“

اس کی آنکھوں میں لکھنئی اتر آئی ”تم سچ کہتے ہو؟“

میں نے کہا ”کیا تم نے آواز نہیں دی تھی مجھے؟“

”اور تم نے سن لی تھی میری آواز؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”دیکھو۔ میں تمہیں رلاتے نہیں آیا ہوں اور تمہیں روٹا دیکھ بھی نہیں سکتا۔ تم مسکراتی رہو گی تو میں بیٹھا رہوں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔“

اس کی آنکھیں آنسوؤں کے ساتھ مسکراتے لگیں ”تم نے مجھے بچایا شاہ غلام۔ ورنہ وہ زندہ مجھے اور پھر تمہیں بھی ہلاک کر دیتا۔“

میں نے کہا ”وہ گیا جیل ساری عمر کے لیے۔ بھول جاؤ

اسے۔“

”شاہ غلام! وہ پھر باہر آجائے گا“ وہ خوف سے کانپنے لگی۔

”نہیں۔ اب اس کا کوئی امکان نہیں۔ پولیس نے یہ خانے سے دونوں ڈھانچے اٹھوا لیے ہوں گے۔ ایک ڈھانچا اسٹیج کے پیچھے واش روم سے ملا تھا دوسرا میں چٹا ہوا۔“

اس کی آنکھیں خوف اور حیرانی سے پھیل گئیں ”دوسرا میں چٹا ہوا؟“

میں نے کہا ”ہاں۔ پولیس نے یہ خانے کا سراغ بھی سونوگرافی کیسروں کی مدد سے لگا لیا تھا۔“

اس نے میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا ”میرا خیال تھا تم مجھ سے ناراض ہو۔“

”ناراض تو واقعی ہوں۔“

”میں بہت بری عورت ہوں شاہ غلام۔ اور تم بہت اچھے آدمی ہو۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟“

”معاف نہ کر کے میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”تم کو زیادہ باتیں نہیں آرام کرنا چاہیے۔“

اس نے میرا ہاتھ چڑکے کھینچا اور پھر مجھے بٹھالیا ”میں جانتی ہوں کہ تم گئے تو پھر بھی نہیں آؤ گے۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

میں پھر بیٹھ گیا۔ ”مجھے بھی کچھ کہنا ہے تم سے۔ جولی دیکھو جو کام جی کر رہا تھا شاید وہ تمہارے بس کا نہ ہو۔ کیونکہ تم ایک عورت ہو۔“

”عورتیں دنیا میں کون سا کام نہیں کر رہی ہیں؟ حالانکہ یہ تمہاری دنیا ہے۔ مردوں کی۔“

”میں اس وقت یہ ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ عورت برتر ہے مرد سے یا کمتر۔ اصل بات یہ ہے کہ جی کے سارے دھندے غیر شرفانہ تھے۔ وہ بد معاش تھا۔“

”میں بھی بد معاشی میں کم تو نہیں ہوں“ وہ مجھے آنکھ مار کے مسکرائی۔

”کیا ضرورت ہے تمہیں آخر بد معاشی کرنے کی۔ تم اتنی حسین ہو تو جوان ہو اور ذہین ہو۔ چلو مانا کہ تم جی کے کاروبار کو کنٹرول کر سکتی ہو۔ تم ان بد معاشوں سے بھی نمٹ سکتی ہو جو جی کے اشاروں کے غلام تھے۔ لیکن کیا فائدہ ایسے غیر قانونی غیر شرفانہ اور غیر اخلاقی کام سے دولت کمانے کا“

کیا اس میں کوئی خوشی ہے، کوئی تحفظ ہے۔

”تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”مجھے یقین تو نہیں کہ تم مانو گی۔ پھر بھی نیک مشورہ

دینا میرا فرض ہے۔ تم پر کا دوبارہ دو۔ اس کی ساری گزروں

یعنی بدنامی کی شہرت کے ساتھ آج تم اس کی اچھی قیمت

وصول کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس اتنا پیسا ہوگا کہ تم کچھ بھی

کر سکتی ہو جس میں خطہ کوئی نہ ہو۔ برائی کا کوئی پھلو نہ ہو۔

قانون کی گرفت کا خوف نہ ہو۔ خود میں نہ وہ سب دھندے

چھوڑ دے۔ جس میں میرا پار نہ تھا۔“

”مگر تم میرا ساتھ دو۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی ”کاش یہ ممکن ہوتا لیکن

ایک دو دن بعد میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ بھی واپس نہ آنے

کے لیے۔ اور اگر آج بھی تو تمہیں نہ میرے آنے کا پتا چلے گا

نہ جانے گا۔“

”میرے کا دوبارہ کے میرے دل کے اور میری زندگی

کے دو بارے میں تمہارے لیے کھلے ہوں گے شاعلم۔“

میں نے کہا ”لیکن میرا دل پاکستان میں ہے۔ میری

زندگی پاکستان کے لیے ہے اور میرا دوبارہ کچھ اور ہے۔“

”تم یہاں بیٹھ ہو سکتے تھے۔“

میں نے کہا ”میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔“

”مگر تم میرا ساتھ دو۔ تو میں تمہارے مشورے پر عمل

کروں گی۔ ہم مل کے دوبارہ کو سنبھالیں گے۔ میرا پیسہ

تمہاری تحویل میں ہوگا۔“

میں نے کہا ”اس فراخ دلائیہ پیشکش کا شکریہ مگر مجھے جانا

ہے۔“

اس نے ایک آہ بھری ”تم میری زندگی بدل سکتے تھے۔“

میں نے کہا ”لیکن میری زندگی کسی اور کی امانت ہے۔“

”تم نے کبھی بتایا نہیں کہ وہ خوش قسمت کون ہے؟“

میں نے کہا ”شاید ابھی میں خود بھی یقین کے ساتھ کچھ

نہیں کہہ سکتا۔ ہمارے اور تمہارے عقیدے میں ایک یقین

مشترک ہے کہ جوڑے آسمانوں میں بنائے جاتے ہیں۔“

”میرا جوڑا HEAVENS میں نہیں HELL میں بنا

ہوگا۔“

میں نے کہا ”ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو۔ آنے

والے اچھے وقت کے لیے اچھی امید رکھو۔ مجھے یقین ہے

ایک دن آنے کا جب تمہیں زندگی کی وہ خوشیاں بھی مل

جائیں گی جو تم سے دور رہا کرتی رہیں۔“

”شاعلم!“ اس نے میرا ہاتھ چوما ”تم میری خوش قسمتی

ہو سکتے تھے۔“

میں بھر کھڑا ہو گیا ”اپنی حفاظت کے خیال سے غافل

مت رہنا۔ بھی کا کوئی خیر خواہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا

ہے۔ ہمارا اب ایک دوسرے پر کوئی قرض باقی نہیں رہا۔ تم

نے جی سے میری گلو خلاصی کرائی۔ میں نے اس سے تمہاری

جان بچائی۔ حساب برابر۔“

”اتنے بے مروت اور اجنبی مت بنو۔ ہم لائف یا

پرنس پارٹنر نہ سہی۔ ایک دوسرے کے اچھے دوست تو رہ

سکتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ایک بار تمہاری دوستی کا فریب کھا چکا

ہوں۔ دوبارہ دھوکا نہیں کھا سکتا۔“

”مگر کبھی میں پاکستان آؤں؟“

میں نے کہا ”شاید میں تمہیں نہ ملوں خدا حافظ!“

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر میں پلٹا اور دوسری بار

اس کی طرف دیکھ کر بغیر ہر نکل گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے

میرے سینے پر ایک بوجھ تھا جو اب نہیں رہا۔ وہ ذخیر جس نے

مجھے شاہ عالم کے ماضی میں محصور کر رکھا تھا ٹوٹ چکی ہے۔

میں نے گھر پہنچا تو بیٹی سر اسٹار فائبر ہاتھ میں چھڑ پونچھ

میں لگی ہوئی تھی اور لینڈ لائیڈ کے ساتھ دیکھی ہی انگلیش بول

رہی تھی جیسی اردو انڈیا آنے والے انگریز حکام بولتے تھے۔

بڑی لی مجھے دیکھ کے خوش ہوئیں ”اب تم ہی اس لڑکی کو

سمجھاؤ۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور یہ میری

بات سمجھنا نہیں چاہتی۔“

میں نے ہنس کے کہا ”کہیں آپ لوگوں کے درمیان

ساس ہو کا رشتہ تو قائم نہیں ہو گیا؟“

”اوہ نو۔ خدا کا شکر ہے۔ میری زندگی اس عذاب سے

معفوف ہے۔ صرف ایک لڑکی کبھی کبھی لٹے آجاتی ہے۔ باقی

کے بارے میں تو مجھے یہ بھی علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ہر سال

مجھے ان کے کرسس کارڈ مل جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا

رہتا ہے کہ آج کل وہ کہاں ہیں اور ان کے کتنے بچے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میرے بڑے بیٹے کے دو لڑکے ہیں۔ اس

سے چھوٹے والے کے چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں، دو لڑکے۔

تیسرے کے بھی چار اولادیں ہیں۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔“

جیسے میرے بچے دیکھا جائے تو میرے دس پوتے پوتیاں

ہیں۔ اگر گیارہ یا بارہ ہو چکے ہیں تو مجھے علم نہیں۔ اب کے

کرسس پر کارڈ پر سننے نام دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ ان سب

کے پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ دن اور وقت تک مجھے

معلوم ہے کیونکہ اس وقت وہ یہاں میرے ساتھ تھے۔ ایک

سال بعد سب چلے گئے۔ ان تینوں کو میں برتھ ڈے کا رڈ بھیج

سکتی ہوں مگر اس لیے نہیں بھیجتی کہ ان کے دوسرے بھائی

بن سوچیں گے، داوی ہم سے پیار نہیں کرتیں۔ بچے ایسے

ہی ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جیلوں ہو جانے والے۔

انہیں کون بتائے۔ ”اچانک انہیں احساس ہوا کہ جذبات

کی رو۔۔۔ میں ہر کے وہ بہت زیادہ بول گئی ہیں ”لو میں بھی

کتنی بے وقوف ہوں۔ اپنا رونا لے کر بیٹھ گئی۔“

میں نے عینی سے کہا ”بڑی لی کو کیا شکایت ہو گئی۔“

وہ بولی ”شکایت کوئی نہیں بھیا۔ میرا خیال تھا کہ بچے

والا بیڈ روم اپنے پاس رکھوں بڑی لی کا خیال ہے۔“

میں نے کہا ”بڑی لی کا خیال ٹھیک ہے۔ تمہیں اوپر ہی

رہنا چاہیے۔ وہ بھی اکیلی ہیں۔ اور تمہیں بھی کسی خیال

رکھنے والے کی ضرورت تو پڑے گی۔“

وہ میری بات کا مطلب سمجھ کے شرمائی ”یہ تو ہے۔“

بڑی لی نے کہا ”یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ میں تمہاری

زبان نہیں سمجھتی۔“

میں نے کہا ”یہ مسئلہ نہیں مجبوری ہے۔ اس لڑکی کو

انگریزی نہیں آتی ورنہ میں اتنا بہتدیب نہیں ہوں۔“

وہ شفقت سے مسکرائی ”شاید ساتھ رہ کے ہم دونوں

ایک دوسرے کے ہم زبان ہو جائیں۔ یہ مجھے ارڈو

سمجھاؤ۔ میں اسے انگلیش بولنا سکھا دوں۔ پڑھنا تو آتی ہوگی

اسے۔“

میں نے کہا ”ویسے تو ماشاء اللہ بڑی عالم فاضل ہے۔

بیزک کیا ہے۔“

یعنی سمجھ گئی۔ اس نے اردو میں کہا ”بھیا۔ آپ مجھے

ایم اے پاس بتاتے تو کیا تھا۔ اردو فارسی میں ایم اے پاس

بھی انگریزی میں بول سکتا۔“

میں نے کہا ”ایم اے کے لیے گریجویٹ ہونے کی شرط

ہے اور گریجویٹ اتنا جاہل نہیں ہوتا جتنی تو ہے۔ خیر چھوڑو یہ

بتا چائے کا کچھ مل سکتا ہے۔“

”ابھی سے کہاں بھیا! میں تو صفائی میں لگی ہوئی ہوں۔

اس گھر میں تو جو تھوڑا بہت سامان تھا سب جل گیا۔ عاقل

کے ساتھ جا کے دیکھوں گی کیا بچا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے

انٹرنس کمپنی سارا نقصان پورے کرے گی۔“

میں نے کہا ”بہت دکھ ہوا ہے مجھے؟“

”دکھ کی بات تو ہے نا بھیا! سارا سامان ہی ناپا تھا۔ پرانا تو

میں نے سب پھینک دیا تھا۔“ وہ بولی ”اب پھر کچھ نہیں گھر لے

لیا ہے سامان نہ اردو۔“

میں نے کہا ”فکرمات کہ تجھے ناپل جائے گا یا ولو ادیا

جائے گا۔“

”نہیں بھیا۔ یہ سب بھی آپ ہی کا تھا۔ اب ہم خود اپنا

گھر بنا لیں گے۔“

میں نے کہا ”میں خود کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ میری نیلم

سے بات ہوئی تھی۔ تو نے بات کی نیلم سے؟“

”کی تو تھی۔“

”مجھ سے اس نے کہا کہ عینی کو جیڑ میری طرف سے دیا

جائے گا۔ چنانچہ تو بس اتنا کر کہ مجھے ایک فکرمات بنا دے

سامان کی کیا کیا چاہیے؟“

”میری فکرمات تو دست لمبی ہے۔“ وہ خوش ہو گئی۔

میں نے کہا ”فکرمات مختصر ہوتی تو میں خود اسے بڑھا لیتا۔

یہ نیلم کے جذبات کا معاملہ ہے۔“

بڑی لی نے دیکھا کہ ہم آپس میں باتیں کرنے میں

مصروف ہیں تو انہوں نے جانے کا فرمانہ سوچ لیا ”میں تم

دونوں کے لیے چائے بناتی ہوں چائے پیو گے یا کافی کا موڈ

ہے؟“

”میں نے کہا۔“

وہ مسکرائی ”تائی بوائے میں کافی لے آتی ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا ”بڑی لی کیا نمونہ

ہیں اس ملک کی تہذیب کا۔ تمام عمر کی ریاضت کا حاصل ہے

ایک مسلسل تنہائی کا آزار۔ حالانکہ عادت و اطوار سب

ایک جہ ہیں۔ مگر بیٹے سب بھول گئے ہیں کہ ان کی ایک ماں بھی

تھی جس کے بغیر وہ ایک لمحہ نہیں جی سکتے تھے۔ آج وہ ان کے

بغیر جینے پر مجبور ہے۔“

”یہ تو اب پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔“ عینی نے کہا

”ساس ہو کی جتنی نہیں اور لڑائی جھگڑے کا انجام پالا خروبی

ہوتا ہے علیحدگی۔“

”لیکن پاکستان میں اولاد ایسے لاقطف تو نہیں ہو جاتی۔

خیر یہ بتاؤ خوش اور مطمئن رہنے کی تا ماعاقل کے ساتھ؟“

وہ حیران ہوئی ”یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اب شادی

کی ہے تو ذمہ داری بھی بھائی ہے۔“

”میرا مطلب تھا۔۔۔ یہاں تو اکیلی ہوگی۔ ایک دوسرے

کا خیال رکھنا۔ اور لڑنا نہیں ورنہ میں کیسے آؤں گا بار بار صلح

کرانے۔ عاقل تو بے چارہ بہت سیدھا ہے۔ مگر تو بہت لڑاکا

ہے مجھے معلوم ہے۔“

”کیا معلوم ہے؟“ وہ منہ پھلا کے بولی۔

”دیکھا۔ سچ کڑوا تھا۔ تجھے کون بہتر سمجھ سکتا ہے مجھ سے زیادہ۔ لیکن اب وہ پہلے والی بات نہیں ہے۔ ہم تو سن لیتے تھے۔“

اس نے میرے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں ”آپ جذباتی ہو رہے ہو بھیا۔ فکر مت کرو۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا کہ میں کتنی بدل گئی ہوں۔ پہلے میں کیا تھی؟ اب کیا ہوں۔ عاقل کو مجھ سے بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ بتاؤ، بولی کیسی ہے؟“

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا ”بس ٹھیک ہے۔ پولیس نے اسے بچالیا۔ آگے اس کی اپنی زندگی ہے۔ جیسے چاہے گزارے۔ میں تو خدا حافظ کہہ کے گیا ہوں۔ صاف بتا دیا ہے کہ اب ہم اجنبی ہیں۔ جیسے پہلے تھے۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا ورنہ اس عورت کا کچھ بھروسا نہیں پاکستان بھی پہنچ جاتی تمہارے پیچھے پیچھے۔“

میں نے ہنس کے کہا ”تجھے بہت خوش قسمتی ہے اپنے بھیا کے بارے میں کہ وہ بڑا پرس چارنگ ہے۔“

”خوش قسمتی کیسی؟“ وہ اتر کے بولی ”یہ تو حقیقت ہے اسے دیکھو روشنی کو خواہ خواہ گلے کا بار ہو رہی تھی۔“

میں نے کہا ”وہ بے چاری تو اسپتال میں ہے۔“

”اوند بے چاری۔“ یعنی نے خالص نندوالے لہجے میں کہا ”شکر کریں کہ مردہ خانے میں نہیں پڑی ہے۔“

میں نے کہا ”تو بڑی سنگدل ہوئی ہے یعنی۔“ تجھے پتا ہے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔“

یعنی نے کہا ”پاگل ہو گئی؟ خاندانی اثر ہے۔ ماں بھی تو تھی۔“

میں نے اسے ڈانٹا ”مت کر ایسی باتیں۔ اس کی یادداشت صرف اس حد تک متاثر ہوئی ہے کہ اسے میری کوئی بات یاد نہیں۔ نہ میرا نام نہ اس وقت کی کوئی بھی بات جو اس نے میرے ساتھ گزارا۔ باقی سب یاد ہے۔“

یعنی ہنسنے لگی ”تم بھی بڑے بھولے ہو بھیا۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ وہ ڈراما کر رہی ہے ڈراما۔ آخر ہے نا ایکٹریس۔“

میں نے برہمی سے کہا ”جس بات کا پتا نہ ہو آدمی کیوں اس کے بارے میں غلط بات کرے خود کو جاہل ثابت کرنے سے قائل نہ۔ مجھے یہ بات ڈاکٹروں نے سمجھائی ہے۔ اسے تو ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں آیا۔“

یعنی کچھ نہیں بولی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف لگتا تھا کہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔

عاقل میرے اور اپنے کاموں کے چکر میں باہر کہیں مصروف تھا۔ بڑی لمبی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی مزے دار کافی پیچھے چپے شام ہونے لگی۔ وہ کافی کے ساتھ بیکٹ اور پمپری قسم کی کوئی چیز بھی لاتی تھیں جسے انہوں نے COOKY کا نام دیا۔

ہمارے آنے سے ان کی تنہائی کے روگ کا علاج ہو گیا تھا۔ چنانچہ جواب میں وہ اپنی ساری شفقت اور عنایت ہم پر بھجوا کر رہی تھیں۔ تجھے اس پر حس آیا۔ بوڑھی عورت جانتی ہے کہ کرائے دار کسی اولاد کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

پھر بھی وہ ان کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ اس کے ساتھ رہ لیں۔ اس کے باوجود کرائے دار بھی نہ کبھی گھر خالی کر جاتے ہیں۔ کسی بڑے گھر میں شفقت ہو جاتی ہے یا اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ وہ پھر تنہا ہو جاتی ہے اور پھر نئے کرائے داروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔

گھر بیٹھ کے عاقل کا انتظار کرتے رہتا لا حاصل تھا۔ میں نے پہلے پولیس اسٹیشن جاکے جی کے کیس کی پروگریس دیکھنے کا سوچا۔ پھر روشنی کو دیکھنے اسپتال چلا گیا۔ شیری مجھے باہری مل گئی۔ وہ سگریٹ پینے کے لیے باہر آئی تھی۔

میں نے کہا ”چلو کیا حال ہے۔“

وہ چونک کے بولی ”حال۔ کس کا۔ میرا یا روشنی کا؟“

میں نے کہا ”چلو پہلے اپنا بتاؤ۔“

”میں ابھی کچھ دیر میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ کل میں نے جذباتی ہو کے ڈے آف لے لیا۔ کسی کو بتائے بغیر۔ خیر روشنی کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔“ اس نے ایک پاؤں پر آمد کی دیوار پر رکھ لیا۔

میں نے کہا ”خدا کے لیے سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔“

وہ ہنسی ”اتنے شرماتے ہو تو ادھر ادھر دیکھتے کیوں ہو؟“

میں نے کہا ”تم روشنی کی دیکھ بھال کیسے کرو گی۔ میرا مطلب ہے تمہاری مصروفیات۔“

وہ بولی ”مجھے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا۔ بس اسے اپنے اپارٹمنٹ میں جگہ دیں۔ میں اپنی روم میٹ کو نکال دوں گی۔ اس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ وہ بالکل تمہارا زمانہ ایڈیشن ہے۔ ہر وقت وعظ اور نصیحت۔ یہ برا ہے۔ یہ گناہ ہے۔ یہ غیر اخلاقی ہے۔ آٹو کی پمپی پہلے ٹھیک تھی۔ آج کل کسی چرچ کے پادری کی سیکرٹری ہے تو خود بھی فن جیتی ہے۔ کسی دن وہ پادری خود۔“

میں نے کہا ”فضول باتیں مت کرو۔“

اس نے سگریٹ بجھا دی ”میرا اپارٹمنٹ دیکھا ہے تم

نے۔ خلاصہ بڑا ہے۔ میں اکیلی اس کا کرایہ ادا نہیں کر سکتی۔ آ رہا کرایہ روشنی دے گی۔ میں نے سمجھا دیا ہے اسے کہ اپنے کام سے کام رکھ تو سب ٹھیک ہے۔ بلا وجہ میری اماں نے بے باکتی میں ایک کیسٹرن کی جگہ ہے چاہے تو نوکری کر لے۔ ضمانت میں دے سکتی ہوں، بس ایک پرائیم ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے جڑواں بچے ہوئے تھے۔ عاشق نبھروں کا خنجر۔“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”ہاں۔ انہیں وہ کسی چرچ میں جھوڑ آئی تھی۔“

”اب اسے نہ جانے کیوں اماں کا دورہ پڑا ہے۔ انہیں واپس لانا چاہتی ہے۔ خود پالنے کے لیے۔ کتنی ہے وہ لوگ انہیں عیسائی بنائیں گے۔“

”اس میں براہم کیا ہے؟“

”براہم کوئی نہیں۔ تم بھی ایسا سمجھتے ہو یعنی وہ عیسائی بنائیں گے۔“

میں نے کہا ”لاحول ولا قوت۔ میرا مطلب تھا کہ اگر وہ اپنے بچوں کو واپس حاصل کرنا چاہتی ہے تو تمہیں کیوں اعتراض ہے؟“

”مجھے ایک نہیں، کئی اعتراضات ہیں۔“ شیری نے کہا ”اول تو دوبارہ اپنے بارگاہ کو اٹھانے کی خواہش کرنا ہی پاگل پن ہے۔ اے بابا مہند پھینک دی تو بس پھینک دی۔ بچوں کا کیا ہے۔ جب چاہو گی جتنے چاہو گی ہو جائیں گے لیکن ان کے لیے اماں بھی پڑی ہے۔ ان بچوں کے باپ کو بھی پکڑو جو ڈے دار ہے ساری خرابی کا۔ اس پر بھی ڈے دار ڈالو۔ اسے کہو کہ انہیں پالنے پوسنے کا خرچہ دے۔ صرف بچوں کے نہیں ماں کے اخراجات بھی برداشت کرے۔“

میں نے کہا ”تم کیسی اصول پرستی کی باتیں کرتی ہو۔ یہاں تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر پاکستان میں ایسی بات کون سنتا ہے۔ وہ مانے گا جو ان بچوں کا باپ تھا؟“

”اس کا تو باپ بھی ماتے گا۔“

”خوش قسمتی ہے تمہاری۔ تم جانتی ہو وہاں صنعت کار یا ہوتا ہے۔ اس کی طاقت کے سامنے قانون سر جھکا تا ہے۔“

”میں سب جانتی ہوں مگر یہاں رہ کے میں نے سارے ڈاکٹر سیکھ لیے ہیں۔ کمزور کے پاس اگر ڈاکٹر پہنچوں تو طاقتور میں گرتا ہے قدموں میں لیوں۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

”ڈراما میں بھی تو سنوں، ایسا کون سا دھوبی پٹنار سکتی ہے روشنی؟“

”ڈی این اے ٹیسٹ۔ آج کل سائنسی کرشمہ۔ پھل خود گواہی دیتا ہے کہ وہ کس درخت میں تھا۔“

”پاکستان میں ڈی این اے کا نام پولیس نے بھی نہیں سنا۔“

”مگر یہاں تو سب ہو سکتا ہے۔ روشنی ایک رپورٹ لکھو اے اس صنعت کار کی اولاد کے خلاف کہ یہ حرام زادہ ان دو بچوں کا باپ ہے۔ ان کے ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ لے لی جائے اور باپ کی رپورٹ پاکستان سے منگوائی جائے یا بچوں کے باپ کو ٹیسٹ کے لیے طلب کیا جائے اگر وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کو لکھے، اخبارات میں دے۔ ہائی کوشن کے آفس کے سامنے مظاہرہ کرے تو ہوگا کہ یہ کیس رجسٹر ہو جائے گا۔ طرم کو نوٹس جاری ہو جائے گا۔ اور وہ نہ آیا تو اس کا نام مطلوب مجرموں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ وہ جب بھی برطانیہ آیا، پکڑا جائے گا۔ وہ بڑس مین ہے۔ برطانیہ اتنا چھوڑ سکتا ہے مگر فرانس، جرمنی، ہالینڈ، امریکا۔ کماں کماں نہیں جائے گا۔ ہر ملک کے ساتھ برطانیہ کا تحویل مجرموں کا معاہدہ ہے۔“

میں نے کہا ”اگر اتنی بہت ہے روشنی میں۔“

شیری نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”کئی تو ساری خرابی ہے کہ وہ خود اب برطانیہ میں بلا اجازت مقیم ہے۔ اس کی اپنی حیثیت غیر قانونی ہو گئی ہے تو وہ خاک قانونی کارروائی کرے گی۔ چنانچہ میرا آخری اعتراض یہ ہے کہ وہ بچوں کو وہیں رہنے دے یا اپنے رہنے کا بندوبست کریں اور کرے۔ تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہو؟“

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا ”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم ان بچوں کو پاکستان لے جاؤ۔“

”کس حیثیت میں؟“

”روشنی تمہیں گارنٹین دے دے یا۔ یا تم کہہ دو میرے بچے ہیں۔“

میں بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ”یا تم پاگل ہو گئی ہو یا مجھے پاگل سمجھتی ہو۔“

”وہاں لے جا کے انہیں کسی یتیم خانے میں داخل کرانا۔“

مجھے جیسے بھڑنے کاٹ لیا ”یتیم خانے میں۔ شیری تمہیں کچھ پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم نے دیکھے ہیں یتیم

خانے؟

”دیکھتے تو نہیں۔“

”اسی لیے یہ بات سوچ رہی ہو۔ لیکن میں نے دیکھے ہیں اور اپنے تجربے۔ میرا مطلب ہے مشاہدے کی بنا پر میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔ انہیں تمام عمر کے لیے ذہنی اور جسمانی عذاب کے جسم میں ڈالنے سے بہتر ہوگا اگر تم خود انہیں اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کے مار ڈالو۔“

وہ تجھے دیکھتی رہی ”لیکن اچھے شہیم خانے بھی تو ہوں گے وہاں؟“

”میرے علم میں کوئی نہیں۔ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ جنم تو خیر سب برے ہوتے ہیں مگر کوئی بہتر جنم بھی ہوگا۔ میری مانو تو ان بچوں کو انہیں گے پاس رہنے دو“

”جرح میں۔“
”روشنی اب کسی قیمت پر ایسا کرنے کو راضی نہیں۔ اس نے بچوں کو واپس لانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ الگ رہنے پر بھی آمادہ ہے۔“

”کیا جرح انہیں اتنی آسانی سے واپس کر دے گا۔“
”نہیں۔ یہ ایک قانونی جنگ ہوگی۔ جس میں بالآخر روشنی جیت جائے گی۔ کیا تم کل صبح دو گھنٹے کے لیے فارغ ہو؟“

”کلام کیا ہے؟“
”ابھی تو میں روشنی کو گھر لے جا رہی ہوں۔ رات کو میرا شو ہوگا۔ اگر تم بارہ ایک بجے کہیں مل جاؤ مجھے تو ہم اس جرح میں جاسکتے ہیں۔ اور کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ہمارا بچہ واپس چاہیے۔“

”ہمارا کیا مطلب؟“ میں نے ہڑبکا کر کہا۔
”یار میں کون سی بچہ کی ماں ہوں۔ تم بھی جمونے باپ بن جاؤ۔“

”شٹ اپ شیریں!“
”ہم صرف ان کا سراغ لگائیں گے۔ دیکھیں جرح والے اب کیا کہتے ہیں۔ پلیز روشنی کے لیے تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“

”روشنی کے لیے مجھے جتنا کرنا تھا کر چکا۔“
”نہیں۔ اس نے وہ سب کیا جو تم چاہتے تھے۔“
”میں نے کہا ”بلا معاوضہ نہیں“ اس کی پوری قیمت وصول کی تھی روشنی نے۔“

”مگر اس کے بعد تم نے اسے دھوکا دیا۔“
”میں نے کہا ”کیا دھوکا دیا میں نے اسے؟“

”تم نے اسے شادی کا پروپوزل دیا تھا۔ دیا تھا یا نہیں اور جب وہ تمہاری محبت کے جال میں پھنس گئی تو تم نے اسے ہری جھنڈی دکھا دی۔ یہ دھوکا نہیں تو اور کیا تھا۔ تم خود بھی جانتے تھے کہ یہ دھوکا ہے۔ شادی تم کسی اور سے کرو گے محبت تم کسی اور سے کرتے ہو۔ بولو کیا یہ غلط ہے؟“

میں خاموش رہا کیونکہ میں مزید جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا۔

”اسے ڈیپریشن میں مبتلا کرنے کے ذمے دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی لیکن ابھی تک میں نے یہ بات کسی نہیں کہی ہے۔“
”میں نے اسے نفرت سے دیکھا ”تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟“

”اس لیے کہ پہلے میں نے درخواست کی تھی جسے تم نے ٹھکرا دیا۔“
”میں نے کہا ”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں ایسے بلیک میل ہونے والا نہیں ہوں شیریں!“

”میں تم پر ہرجائے گا کیس کر سکتی ہوں۔ پولیس کے سامنے میرا ایک بیان تمہیں مشکل میں ڈال سکتا ہے۔“
”تم کچھ بھی ثابت نہیں کیاؤ گی۔ اس معاملے میں کوئی ڈی این اے ٹیسٹ بھی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔“ میں نے حقارت سے کہا۔

”لیکن ایسے لوگ بہت ہیں جن کے سامنے تم نے روشنی کو اپنی بیوی کہا۔ یہ بات کس سے چھپی ہوئی ہے کہ تم ایک ساتھ رہتے تھے۔ تم نے اسے ہاتھ لگایا یا نہیں؟ اس کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ یہ سوچو کہ تمہاری ٹیک ٹائی کتنی متاثر ہوگی۔ تمہارا سیاسی کیریئر خراب ہوگا۔“

میں نے دانت پیس کے کہا ”تم ایک ذلیل بلیک میلر ہو۔“

وہ ہنسی ”شریف بلیک میلر کون ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم خبروں میں بتاتے ہیں کہ سفاکانہ بیماری سے اسٹے لوگ شہید ہو گئے۔ کیا رحمانہ بیماری ہوئی تو وہ بچ جائے۔ میرے ایک بیان سے تم پھنس جاؤ گے۔“

”اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو میں زیادہ پھنس جاؤں گا۔ تم بعد میں یہ بھی بتاؤ گی سب کو کہ میں نے جرح میں باوری کے سامنے کیا کیا تھا لیکن میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں کسی دھمکی سے نہیں ڈرتا۔“

اس نے ایک دم میرے گال کو چٹاخ سے چوم لیا ”اوہ ڈیئر۔ تم واقعی موتی چور کے لڈو ہو۔“
میں نے اسے دھکا دیا ”ایسی بد تمیزی پر میں جھانپنا مار دیتا ہوں۔ بے حیا۔“

وہ ہنسی ”روشنی واقعی بچ کتنی تھی۔ تم میں مردوں والی کوئی بات نہیں ”مرد ہونے کے باوجود تمہارا تو چہرہ لال ہو گیا ہے لڑکیوں کی طرح۔ ارے ہاں یہاں سب چلتا ہے۔ کوئی اسے بے حیائی نہیں سمجھتا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“
”اوکے“ اوکے! آئندہ میں بری نظر سے دیکھوں گی بھی نہیں۔ چلو اب غصہ ٹھوک دو۔ ”آؤ“ اس نے میرا ہاتھ پھڑپھڑایا۔

میں نے اپنا ہاتھ پھڑپھڑایا ”میں جا رہا ہوں۔“
وہ حیرانی سے بولی ”روشنی کا حال پوچھنے آئے تھے۔ سے دیکھے بغیر چلے جاؤ گے؟“
میں نے کہا ”اس کے لیے میں ایک اجنبی ہوں“ میں نے کہا۔

روشنی تکیے کے سہارے نیم درازنی دی پر کوئی پروگرام نہ کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ریگسٹ آٹھائے ٹی وی تک کر دیا تاہم اس کا رویہ نہ مکمل پہچان کا تھا نہ دانستہ نہایت کا۔ وہ اس حد تک معقول تھا جتنا اسپتال کے عملے یا کسی ڈاکٹر کے لیے ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا ”کیسا لگ رہا ہے اب مس روشنی؟“
وہ بولی ”میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر!“
شیریں نے کہا ”یہ ڈاکٹر نہیں ہیں۔ یہ شاہ عالم ہیں۔ تم نے کبھی ان کا نام سنا ہے؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی ”نام سنا ہوا لگتا ہے۔“
”یہ پاکستان کے ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ اسپتال کے ممبر ہیں۔ یہ جی کے جی کے بھی دوست ہیں۔ تم جی کو جانتی ہو؟“
”میں کسی جی کو نہیں جانتی۔“

”ان کی چھوٹی بہن ہے قزاقہ، جن سے سب معنی کہتے ہیں۔ اس کی شادی عاقل سے ہوئی ہے۔“
روشنی کے چہرے پر ابھرنے کے آثار نمودار ہوئے ”یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“

میں نے کہا ”شیریں جب یہ مجھے نہیں پہچان پاری ہیں تو باقی لوگوں کو کیسے پہچان سکتی ہیں۔ مس روشنی تاہم صرف ایک درجے ہیں پہلے۔ ایک تقریب میں البتہ شیریں مجھے جانتی تھیں۔“

”میں کسی کو نہیں جانتی؟“ روشنی نے کہا۔
میں اسے خدا حافظ کہہ کے باہر آ گیا۔ اسپتال کے گیٹ پر بہت سی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ شام اب ڈھلنے لگی تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے کاروں کے شورومز کی طرف سے چلے۔ وہ مجھے ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں نئی پرانی کاروں کے درجنوں شوروم تھے۔ میں نے سب میں جا کر دیکھنے کے بجائے ایک ایسے شوروم کا انتخاب کیا جہاں سیکڑوں کاریں تھیں۔

نظار میں آگے پیچھے کھڑی ہوئی گاڑیوں کے درمیان بہت سے لوگ گھوم پھرنے اپنی پسند کے مطابق گاڑیاں دیکھ رہے تھے۔ شوروم کے مستعد سیکڑے ان کی خدمت پر مامور تھے اور جو خریدار کسی گاڑی میں ٹھوڑی بہت دلچسپی ظاہر کرتا تھا، وہ اسے گاڑی کھول کے اشارت کر کے یا چلا کے بھی دکھاتے تھے۔ ان کی چرب زبانی اور قائل کرنے کی مہارت کے سامنے عام گاہک اتنے بے بس ہو جاتے تھے کہ یا تو کوئی گاڑی خرید لینے تھے یا اتنی مشکل سے جان چھڑا کر نکلتے تھے اور بلاوجہ شرمندہ ہوتے تھے جیسے انہوں نے کار نہ خرید کے اور سیکڑے کا وقت ضائع کر کے بداعظین اخلاق جرم کیا ہے۔ ایک سیکڑے میرے پیچھے بھی لگ گیا تھا مگر میں نے اسے شرافت سے دور رہنے کے لیے کہہ دیا ”اگر مجھے کوئی گاڑی پسند ہوگی تو میں خود نہیں بلاؤں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔ تم بول کے اپنی انزبانی اور میرا نام ضائع مت کرو۔“
اس کا چہرہ اتر گیا۔ ”میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔“

وہاں پرانی ”نئی جیسی پرانی اور بالکل نئی گاڑیاں ہر ماڈل رنگ اور قیمت میں دستیاب تھیں۔ جاپانی کاریں اب پورے یورپ اور امریکا جیسے ممالک کی مارکیٹ پر چھا چکی تھیں۔ ٹویوٹا، ہنڈا اور مٹسوبوشی نے فورڈ اور جنرل موٹرز کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ جاپانی کاریں نہ صرف یہ کہ قیمت میں کم تھیں بلکہ ان کی خوبصورتی اور کارکردگی بھی بہت بہتر تھی۔

عاقل کے پاس ابھی تک ایک فورڈ کورٹنا تھی جو اس نے بہت کم پیسوں میں کسی سے راہ چلتے لے لی تھی۔ گاڑی زیادہ پرانی نہیں تھی اور پٹے میں بھی ٹھیک تھی لیکن اس کے پرانے مالک نے گاڑی کے ساتھ محبت اور توجہ سے کام نہیں لیا تھا۔ جرمن ایک بات کہتے ہیں کہ عورت اور مشینری دونوں کو توجہ اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ گھڑجاتی ہیں۔ عاقل کی گاڑی بھی عدم توجہی کے باعث خراب حالت میں نظر آتی تھی۔

اب میں نے نیلم کے کہنے کے مطابق عاقل کو سلامی میں دینے کے لیے ایک نئی ہنڈا سوک کا انتخاب کیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے سچر سے رجوع کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت میرے پسند کردہ ماڈل میں کیا کیا OPTIONS ہیں۔

میں نے کہا "گاڑی قلی لوڈز چاہیے۔"
"لیس سرب اور رنگ۔" سچر نے مجھے کسی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کرتے ہوئے پوچھا "اس میں پانچ ٹکڑ ہیں۔ اس وقت سفید دستاب نہیں ہے مگر کل مل سکتا ہے۔"
میں نے کہا "میں نے میمون کا انتخاب کیا ہے یہ بتائیں کہ گاڑی کتنی دیر میں ڈیلور ہو جائے گی؟"
"اگر آپ ابھی پے منٹ کر دیتے ہیں تو چابی حاضر ہے۔"

میں نے کہا "کیش پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"
"نوپا بلیم سرا" وہ بولا۔
میں نے کہا "ایک پراہلم اور سب میرے پاس ایک فورڈ کورینا ہے۔ تقریباً چار سال پہلے کی۔ اس کی ظاہری حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں گاڑی کو اس سے ایکس چینج کر لوں۔"
"نوپا بلیم سرا" وہ اٹھ کھڑا ہوا "چلیں" مجھے گاڑی دکھادیں۔

میں نے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا "میں گاڑی اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو ایئر لیس دے دوں۔ آپ گاڑی وہاں بیچواؤں۔ کارینا لے آئیں اور باقی رقم بھی؟"
"نوپا بلیم سرا" میں تقریباً دو گھنٹے لگ جائیں گے؟ وہ بولا۔

"نوں پرائس میں سے کارینا کی قیمت نکال کے آپ مجھے بتادیں" میں وہیں ادائیگی کر دوں گا۔
"DOCUMENTATION کس نام سے ہوگی سرا؟"

اس نے ایک بیڈ اور رقم نکال کے کہا۔
میں نے اسے تفصیلات بتادیں۔ ایک ہزار روپے ڈاؤن ادا کیے جو ایک طرح سے ڈیل کفروم کرنے کے لیے تھے۔ ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے شروع کا ایک شو فرم مجھے باہر لے گیا اور میں نے گاڑی کو چلا کے دیکھا۔ یہ صاف تازہ برق رفتار اور خوش رفتار گاڑی بلاشبہ لا جواب تھی۔ گاڑی کو میں اپنے گھر کی طرف لے گیا اور پھر اسے سوڈو شو فرم کے حوالے کر دیا۔
عاقل کی فورڈ کورینا دروازے کے سامنے موجود تھی۔

وہ اندر جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا۔ "میں ابھی ابھی آیا ہوں" اس نے مجھے مطلع کیا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "سارا دن کیا کرتے رہے؟"
"پہلے تو میں گیا تھا اپنا اجزا ہوا آشیان دیکھنے۔ مگر تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیوں ہو۔ مگر وہ اپنا ہی خراب خانہ تھا۔ ہر چیز بالکل تباہ ہو گئی ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔" وہ افسوس سے سر ہلانے لگا "وہ میرا گھر نہیں، میرا شیوا تھا۔"

میں نے اسے تسلی دی "دیکھو جاپان جاسی کے بعد کیسا بنا ہے۔ خدا نے چاہا تو تمہارا اپنا گھر زیادہ اچھا بنے گا۔"
یعنی فوراً نازل ہو گئی "یہ دیکھو بھیا!" اس نے مجھے چار فل اسکیب ساز کے صفحات پر مشتمل ایک فہرست تصاویر۔
"یہ سب مجھے چاہیے۔"

"یہ کیا ہے؟" عاقل نے حیرانی سے پوچھا۔
"میرا جیوز اور کیا؟" یعنی نے جواب دیا "فرنیچر، فریج، ٹی وی اور ڈیک الیکٹرانک کاسٹ سامان گھر کے استعمال کے برتن گرا کری۔" تائین برودے۔
"تم پائل تو نہیں ہو گئی ہو؟" عاقل بولا۔

"پائل ہوں" مجھے پائل کہنے والے یہ ہمارے گھر کے معاملات ہیں۔ تم سچ میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ جیڑ مجھے دے دی ہیں نیلم بائی۔"

"مگر تم کیوں لے رہی ہو؟" عاقل چلا کے بولا۔
"میری مرضی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے منع کرنے والے؟" یعنی لڑنے کے لیے کمر بستہ رکھ کے کھڑی ہو گئی "ابھی یہ فہرست نامکمل ہے۔ جلدی میں بنائی تھی۔"
عاقل جھڑکنے لگا "جب میں نے منع کر دیا تھا۔"
میں نے کہا "تمہارے منع کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں مانوں گا نہیں۔"

"ادھر لاؤ" مجھے دو یہ فہرست "عاقل بھنا کے بولا۔
میں نے کہا "برخوردار" ذرا صبر اور ضبط سے کام لو۔ یہ مسئلہ ہے ہمارے خاندانی رسم و رواج کا۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے بے ہودہ رسم و رواج پر۔"
میں نے کہا "اس معاملے میں تمہاری ایک نہیں چلے گی۔ جیڑ دیا جاتا ہے لڑکی کو۔"
یعنی قاتحانہ لہجے میں بولی "بڑے کو ملتا ہے ٹھیک۔"
میں نے کہا "نہیں یعنی۔ لڑکے کو سلامی دی جاتی ہے۔ وہ عاقل کو ملے گی۔"

"سوالی پیدا نہیں ہوتا کہ میں لوں۔"

یعنی میرے کندھے سے لگ کر بیٹھ گئی "سلامی کیا دے رہے ہو بھیا!"

میں نے کہا "مجھے کیوں بتاؤں" دوں گا تو کچھ لینا۔ ری بات لینے کی تو عاقل اتنا بد اخلاق بہر حال نہیں ہے کہ میرے ر غلوص کتنے کو میرے منہ پر بار دے۔ وہ مجھے ڈیل نہیں کر سکا کیونکہ وہ خود ڈیل، کینے، آلو کا چھٹا نہیں ہے۔"
عاقل ہنسنے لگا "کالیاں پہلے ہی دے لیں سالے صاحب۔"

میں نے کہا "یہ بتاؤ" آج رات کے کھانے کا کیا ہو گا؟"
یعنی نے کہا "گھر میں کیا ہے جو میں پکاؤں۔ اور کیسے پکاؤں؟ مجھے تو پکانا آتا نہیں۔"

عاقل نے کہا "ڈرامے بازی مت کرو۔ یہ چالاکی سب لڑکیاں کرتی ہیں۔ پہلے ہی اعلان کر دیتی ہیں کہ ہمیں تو کچھ آتا نہیں۔ نہ پکانا، نہ سینا پر دنا، جھانڈو برتن۔ ماں باپ نے بڑے ناز سے رکھا۔ کچھ نہیں کرنے دیا۔ مقصد ہوتا ہے سسرال میں کام سے بچنا۔ یہاں حرام خوری نہیں چلے گی۔"
"کیا مطلب ہے حرام خوری کا؟"

"مطلب یہ کہ کام نہیں آتا تو سیکھو۔ کھانا بھر پکائے تو آنے سے رہا۔ یہاں نوکر نہیں ہیں اور تمہارے ابا نے خانساں نہیں بھیجا ہے ساتھ۔"
"دیکھو اپنا تک مت جاؤ۔"

میں نے کہا "بس" لڑائی بند۔ ہم ابھی باہر جائیں گے کھانے کے لیے۔ دعوت دیکھو ہوگی دولہا کی طرف سے ہم رسم و رواج کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یعنی "تو اوپر جا اور دو کپ چائے بنا۔"

"دو کیوں؟ میں نہ پیوں" وہ جاتے جاتے بولی۔
میں نے کہا "اب تم فراؤ کہ آج کیا مصروفیت رہی۔"
"دو گھنٹے تو پولیس کے ساتھ سرکھپانے میں لگ گئے۔"
میں نے اس سیالگوئی وکیل کو بلایا تھا۔ اس نے جلدی گلو خلاصی کرا دی۔ پھر میں گیا انشورنس کمپنی "وہ پولیس اور انشورنس حکیم کی درودا سنانے لگا۔"

پھر یعنی چائے لے کر گئی "مجھے تو بڑی شرم آتی ہے بار بار انہیں کہتے ہوئے" بھی جائے کبھی کالی!"
عاقل بولا "بھئی یہاں تکلف نہیں چلتا۔ ان سے کہہ دو صاف کہ ہم آپ کا بچن استعمال کریں گے تو معاوضہ ادا کریں گے۔ آخر وہ بے انگ گیسٹ بھی رہتی ہیں۔"
میں نے کہا "کل ٹرینس گے سب انتظام انشاء اللہ۔"

عاقل بولا "آج چیک ڈرافٹ اور پے آرڈر نہیں

ہوا سکا۔" ہم نہیں ملا اور میرے پاس اکاؤنٹ نمبر بھی نہیں تھے۔ یعنی تم نے معلوم کیے؟"

"آج سب سے فون ربات ہوئی۔ اکاؤنٹ نمبر میں نے تمہاری ٹیلی فون ڈائری میں لکھ دیے ہیں۔"
"ٹیلی فون ڈائری میں؟ تم بھی بڑی محنت ہو۔"

"اور کہاں لکھتی" یعنی جیس بہ جیس ہو کے بولی۔
"ہر دیوار پر لکھ دیتیں" مونے مار کر ہے۔ لینڈ لیڈی بہت خوش ہوئی۔ اب یہ ہو گا کہ میں لاہور کسی کو فون کروں گا تو پتا چلے گا اس کا اکاؤنٹ نمبر ملا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "کس کس سے بات ہوئی" یہ بتا۔"
"سب سے پہلے رئیس سے۔ وہ پوچھنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارے جعلی دستخط کرنا سیکھ گئی ہوں۔ جعلی چیک بک بھی بنائی ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ میں سے سارا پیسہ نکالنا ہے۔ تم شک کر رہے ہو مجھ پر۔ وہ بولا کہ تم پر جو شک کرے کافر میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ بھونے منہ شادی کی مبارک باد تو دی نہیں۔ وہ جھڑکنے لگا کہ لو الٹا چور کو تو الٹا کواٹھنے وہاں جا کے چپکے سے شادی کر لی۔ ولایت جاتے ہی میمون کی طرح تمہارا خون بھی سفید ہو گیا، بھول گئیں انہوں کو۔ کل رات سب فون کرتے رہے۔ کہاں مر گئے تھے سب۔ میں نے کہا کہ ہاں ہم کہیں اور چلے گئے تھے۔ بھیا عادت کے مطابق ایک چکر میں بڑ گئے تھے۔ رات بھر ہسپتال میں رہے۔ وہ گھر آیا کہ اسے کیا ہوا ہے۔

میں نے کہا کہ خود انہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بھی پشاور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک انٹرنیشنل مرغ ٹائٹ مقابلہ ہونے والا ہے۔"

"انٹرنیشنل؟" میں نے ہنس کے کہا "کیا غیر ملکی مرغ بھی آ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ انڈیا، بنگلہ دیش کے مرغے ہوں گے۔"
"وہ پھر بڑ گیا اس چکر میں؟"

"اس نے رئیس خاندان، بلکہ اس کا لمبہ بچا دیا ہے" یعنی بولی۔
"اور خود کہاں رہتا ہے؟"

"آج کل نیلم کے ساتھ ہے۔ اس کا جو سیکرٹری تھا" اسے نیلم نے نکال دیا ہے۔ نیلم سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ موصوف نے پانچ لاکھ کا نہیں کیا تھا۔ ویسے بہت بھروسے کا آدمی تھا۔ دس سال سے نیلم کے ساتھ تھا اور لوگ جانتے تھے کہ ایڈوائس یا معاوضے کی رقم دی وصول کرتا ہے اور نیلم کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیتا ہے۔ کبھی ایک پیسے کی

ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔
”پھر ایمان کیوں خراب ہو گیا؟“ عاقل بولا۔
”میں نے کہا“ بعض اوقات ضرورت انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔“

”وہ بڑھے تھے ایک ایک ٹکڑا کے پکڑ میں۔ اسے دلا سے دیتے رہے کہ نیلم سے تمہارے انشاء اللہ تمہیں کسی قسم میں بڑا مول دلا دوں گا۔“ خیر یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ایک شراذ کو سب ہی استعمال کرتے ہیں۔“

”EXPLOIT کرتے ہیں“ عاقل بولا۔
”وہ لڑکی ذرا ہوشیار اور پروفیشنل ثابت ہوئی۔ سیکرٹری صاحب نے اس پر دل ہی نہیں لٹایا، اپنا اور پھر نیلم کا مال بھی لٹانے لگے۔ بات تک چچی رہ سکتی تھی“ یعنی نے کہا۔
”نیلم نے بہت صحیح فیصلہ کیا۔ رئیس سے بہتر اسے کون مل سکتا تھا۔“

”خود رئیس کو ایک ٹھکانا مل گیا۔“ یعنی نے کہا۔ ”نیلم باقی تو بہت خوش بھی تھیں اور اداس بھی۔ بہت دعائیں دیں اور کہنے لگیں کہ میں آؤں گی انشاء اللہ اسی ہفتے تم سے اور تمہارے دو ٹھکانوں سے ملنے کر نہیں کے ساتھ۔“

عاقل بولا ”جی کمال کا دھوا اور کسی دلہن۔ ملاحظہ ہو آج ہماری شادی کا دو سارا دن ہے۔ پاکستان میں شادی سے اگلے دن ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ لڑکی والے باضابطہ جلوس مانگے دلہن کو لینے آتے ہیں۔ دھوا کے گھر میں دیکھنے کا ہنگامہ ہوتا ہے۔ مہمان بھرے پڑے ہوتے ہیں گھر میں۔ یہاں دلہن گھر میں پہنچی بنی پھر رہی ہے۔ دھوا باہر جھک مارتا پھر رہا ہے تھانہ پکڑی کے پکڑ میں۔ اور جھل مڑی جل کے راکھ ہو گیا ہے۔“

”میں نے کہا“ عاقل۔ بہتر یہی ہے کہ تم اب ساری رقم کے دو چیک ڈرافٹ بنوا لو اور انہیں دونوں کے نام بھیج دو۔ رئیس اور نیلم کے نام۔ ایک ہی جگہ۔“

باہر سے کسی نے کال تیل بھائی تو میں اٹھ کے گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شورو م والا گاڑی لایا ہو گا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ باہر بیرون گھر کی برائڈ نیو ہونے سوک عاقل کی گاڑی کے پیچھے کڑی جھلک کر رہی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی کے کانڈزات دیے۔ ”یہ وہ بیٹ ہیں۔ ایک نئی گاڑی کے ڈرائیفر بیچ رہے ہیں۔ رجسٹریشن ہم کل کر ادیں گے یہ دوسرے کانڈزات اس گاڑی کے ہیں جو آپ ہمیں دے رہے ہیں۔“ اس نے مجھے بتایا کہ ان کانڈزات پر کہاں کہاں میرے دستخط ہوں گے۔

میں کانڈزات اندر لے گیا اور عاقل کے سامنے رکھ دیے۔ میں نے بین اس کے ہاتھ میں چھوڑا ”یہاں دستخط کرو۔“

اس نے کانڈزات کو بغور دیکھا ”یہ کیا ہے؟“
”سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے“ میں نے کہا۔
اس نے دستخط کر دیے ”میں قائم مقام سر کے آمرانہ اختیارات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے قبول کرتا ہوں۔“
”اب اپنی گاڑی کی چابی لاؤ“ میں نے کہا۔

اس نے چابی میرے حوالے کی تو عاقل نے سمجھ گیا تھا کہ اس کا رویہ الٹی کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ یعنی نے سخت تجسس آمیز بے چینی کا اظہار کیا۔ ”بھیا۔ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی“ آخر چکر کیا ہے؟“

”میں نے اسے ڈانٹا“ جب کہ چکر کی بچی!“ اور کانڈزات کے ساتھ چابی باہر لے کر آیا۔ اس وقت تک عاقل اور یعنی بھی باہر آگئے تھے۔ شورو م کا نمائندہ ان کے سامنے پرانی گاڑی لے کر چلا گیا۔

”میں نے نئی گاڑی کی چابی عاقل کے ہاتھ پر رکھ دی“ یہ ہے تمہاری سلائی!“

وہ حیرت اور فرط جذبات سے ایسا لگتا ہو گیا کہ جب کھڑا مجھے دیکھتا رہا لیکن یعنی ایک بیچ مار کے مجھ سے پلٹ گئی ”اوہ بھیا۔ بھیا۔ بھیا!“
”میں نے کہا“ تجھے کیا ہو گیا، پاگل۔“
”ہاں“ میں پاگل ہو گئی ہوں خوشی سے۔ اتنی شاندار کار

”دس از نو“ عاقل بولا۔
”میں نے کہا“ دیکھو ہماری کچھ تہذیبی روایات ہیں۔ ہم بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ساری عمر کرتے ہیں اور بیشب یہ سمجھتے ہیں کہ کم کیا۔“

عاقل نے ایک لمبی سانس لی ”اپنی دے۔ تھیکس اے لاٹ!“
”یعنی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے تھے“ مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے اپنی خوش قسمتی کی اس انتہا سے۔ مجھے کیا سے کیا بتا رہا ہے آپ نے؟“

”زادہ اقلطون مت بن۔“ میری اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی کسی کے لیے کیا کر سکتا ہے؟“
وہ رات بڑی پرست تھی۔ ہم نئی گاڑی میں ڈنر کے لیے باہر گئے۔ ہم نے بڑی خوشی کی کہ لینڈ لڈی سزیمپس بھی ہمارے ساتھ چلیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ

میں نوجوانوں کی محفل میں شامل ہو کے کباب میں بڑی بنا پسند نہیں کرتی۔ عاقل بھی خوش تھا مگر اس نے کچھ پر تکلف انداز میں جھپٹتے ہوئے نئی گاڑی کو ڈرائیو کیا۔ سونی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اگلا دن بڑی مصروفیت کا تھا۔ ہم نے سارا دن یعنی کی فرسٹ کے مطابق خریداری کی۔ میں بارہ بجے مجھے خیال آیا کہ میں نے شیری کے ساتھ چرچ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسے فون پر مطلع کیا کہ تاگزیر مصروفیت کی بنا پر میں ابھی نہیں آسکتا۔ ”لیکن میں شام چھ سات بجے کے بعد آ جاؤں گا۔“
”شام کو میں قانع نہیں ہوتی“ تم جانتے ہو۔“
”پھر کل صبح۔“

”تم مجھے چکر تو نہیں دے رہے ہو؟“
”میں نے کہا“ کیا میں صاف انکار نہیں کر سکتا، اگر چاہوں؟“

وہ ہنسی ”اس وقت کس کے ساتھ ہو تم اور کہاں ہو؟“
”میں نے کہا“ میں یعنی کے ساتھ شاہنگ کر رہا ہوں۔ کوئی اعتراض؟“

”نہیں“ چلے پیش کرو“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔
لندن میں میں پاکستانی اسٹاکس کا گھر سا کے رہتا تھا ہی آسان ہے جتنا لاہور میں یا پاکستان کے کسی بھی شہر میں مگر چیزیں دروازے پر نہیں ملتیں۔ گلی میں سبزی فروش اور تھان بورے والا آواز لگاتے نہیں آتے اور کچھ چیزیں مخصوص پاکستانی دکانوں سے لینے کے لیے دور بھی جانا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر جگہ گروسری اسٹور ہیں جہاں حلال گوشت بھی مل جاتا ہے اور ہوم سروس اسٹور ہر چیز ایک فون پر گھر لے آتے ہیں۔ تاہم لندن میں گھوڑاری کا سو فیصد پاکستانی تصور نہیں ہے کہ یومی صبح سے شام تک بلکہ رات تک بانڈی جو لٹے کے پکڑ میں پڑی رہے۔ عام طور پر وہاں عورتیں بھی کام کرتی ہیں یا ان کی سوشل مصروفیات ہوتی ہیں چنانچہ ریڈی میڈ کھانے چلنے ہیں یا فاسٹ فوڈ جسے جہاں جو ملا تھا لیا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا مصروفیات کے باعث غیر اہم ہو جاتا ہے۔ ہاں رات کے کھانے میں اہتمام ہوتا ہے۔
ایک دن میں گھر کا اسباب ہی خریدنا تھا۔ چکن کے مرغ سالے اور کھانے پکانے کا سامان، روزمرہ کی خریداری بھی جو یعنی کو خود کرنی تھی۔

عاقل نے کہا ”میرا خیال ہے کوئی چھوٹی موٹی گاڑی یعنی نے لے لوں۔“
”چھوٹی موٹی گاڑی لو اپنے لیے“ میں یہی چلاؤں گی۔“

عاقل ہنسنے لگا ”یعنی اس شاندار کار میں آپ جائیں آلو پناہ لینے۔ میں کام کے سلسلے میں سارے شہر کی خاک چھانوں گا۔“

”خاک دھول جو چاہو چھانو۔“
عاقل نے کہا ”عاقولن“ آپ مجھے حق گوئی دے۔ کی پر مجبور نہ کریں۔ یہ گاڑی آپ کو نہیں ملی۔“
”میری وجہ سے ہی تو ملی ہے“ یعنی خفیف ہونے کے باوجود اپنی بات پر ڈھٹائی سے اڑی رہی ”اور تم کیا میری چیز کی ہر چیز استعمال نہیں کرو گے؟“

”تم بھی بیٹہ جانا گاڑی میں“ ابھی تو تمہیں گاڑی چلائی بھی نہیں آتی۔“
”آجائے گی“ مگر میں کوئی کھانا لے کر نہیں پھروں گی۔
”جیسے وہ تھی تمہاری۔“

عاقل نے آنکھیں نکالیں ”اتنی جلدی دماغ خراب ہو گیا تھی گاڑی ملنے ہی۔ کل تک اسی کھانا سے میں روٹر رائس سمجھ کے پھرتی تھیں۔“
”کل تک تمہیں میرے شوہر کے منصب پر فائز ہونے کا اعزاز بھی حاصل نہیں تھا۔“

”میں نے کہا“ یار عاقل، بھڑا کیا۔ یعنی جیسی گاڑی کے اسے دلا دینا۔“
”یہ تو کس کی مرید پڑا!“

”میں نے اسے آنکھ ماری“ تو مرید پڑا دلا دینا۔“
وہ ہنسنے لگا ”یعنی تمہارے بھیا مجھے آنکھ مار کے یہ سمجھا رہے ہیں کہ اس بے وقوف لڑکی کے ساتھ مغر کھپائی مت کرو“ ابھی بال دو۔“

خلاف توقع یعنی مجھ سے خفا نہیں ہوئی ”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے بھیا نے مرید پڑا کہا ہے تو تمہیں مرید پڑی دلائی پڑے گی۔“

حالات اب خوشگوار انداز میں برسکون ہوتے جا رہے تھے۔ اسی شام میں نے پولیس سے رابطہ کیا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح نو بجے اپنے قانونی معاملات کے سلسلے میں مجھے مقامی جج کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ عاقل کے دوست سا کوئی ٹولکل نے وعدہ کیا کہ وہ میری بیرونی کے لیے عدالت میں حاضر ہو جائے گا۔

”جج بندہ بڑا اخوت ہے۔“ اس نے مجھے مطلع کیا۔
”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ اندر سے نرم باہر سے بڑا سخت۔ اس کی کسی بات پر بحث مت کرنا۔ بس یہی کہتے جانا“ اس یور آنر

ہو؟

”میں نما کے اور کپڑے بدل کے آتی ہوں دس منٹ میں۔“ وہ بولی ”دوشنی تم نے ناشتا کر لیا؟“

”بہت دیر ہوئی۔“

”تو پھر میرے لیے بنا دو برتا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی کافی ملاؤ۔“

”جہن، دوپہر لاؤنج کے ایک حصے میں بنا ہوا تھا۔ دوشنی نے ایکٹرک کیشل لگا دی ”ڈاکٹر صاحب“ آپ پاکستانی ہیں؟“

میں نے کہا ”الحمد للہ۔“

وہ بولی ”کیا آپ پاکستان جاتے رہتے ہیں؟“

میں نے کہا ”ہاں اکثر۔“

”آپ کی فیملی وہاں ہے یا یہاں؟“

”فیملی سے تمہاری مراد ہے پوی نیچے۔ تو وہ نہ یہاں ہیں نہ وہاں۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”در اصل مجھے۔ چار سال ہو گئے ہیں یہاں۔ اور میں اکیلی ہوں۔ ایک ماں بھی جو یہاں مری۔ ایک بھائی تھا وہ افغانستان چلا گیا تھا جہاد کرنے لوٹ کے نہیں آیا۔ میرا پاکستان میں کوئی بھی نہیں۔“

میں نے کہا ”کیا تم پاکستان واپس جانے کی خواہش مند ہو؟“

”نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پاکستان کے جیم خانے بہت خراب ہیں عام طور پر۔“

”ٹھیک سنا ہے آپ نے وہاں جیم بچوں پر بہت علم ہوتا ہے۔ ان سے ہر طرح کا کام لیا جاتا ہے۔ انہیں مارا جاتا جاتا ہے کھانے کو پورا نہیں ملتا۔ ان سے ٹھیک بھی منگوائی جاتی ہے اور بعض اوقات انہیں بچ بھی دیا جاتا ہے۔“

وہ کچھ ہنس بولی ”کیا ایک بھی اچھا جیم خانہ نہیں؟“

میں نے کہا ”ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ لیکن میرے علم میں نہیں۔“

”در اصل دو بچوں کو داخل کروانا تھا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ان کی اسلامی طریقے سے تعلیم و تربیت ہو جائے۔“

میں نے غماط ہو کے پوچھا ”اس وقت دو بچے کہاں ہیں؟“

”یہاں ایک مشنری ادارے میں“ انہیں وہاں سے نکالنا ہے ”وہ بولی۔“

”آپ سے کیا تعلق ہے ان بچوں کا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی ”تعلق۔ تعلق تو کوئی نہیں مگر وہ میری ذمے داری ہیں۔“

”اور ان کے ماں باپ کیا وہ مر گئے ہیں؟“

”نہیں۔ مرے تو نہیں مگر انہوں نے بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں انہیں عیسائی بنادیا جائے گا۔ جبراً نہیں بچے تو ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جن بچوں کی پرورش مسلمانوں میں نہ ہو وہ کیسے مسلمان بنے گا؟“

دوشنی نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بات ڈاکٹر نے مجھے سمجھا دی تھی کہ اس کی میموری سے صرف وہی یادیں ختم ہوئی ہیں جن کا کسی طرح بھی مجھ سے تعلق تھا۔ زندگی کے دیگر واقعات اس کو پوری طرح یاد ہوں گے۔ اسے یہ ابھی طرح یاد ہو گا کہ ان بچوں کا باپ کون تھا اور ماں کون ہے؟

میں نے کہا ”میں نے سنا ہے کہ بہت جلد لاہور میں ایک جیم خانہ قائم ہو رہا ہے جو ایک مثالی ادارہ ہو گا اور جہاں بچوں کو گھر جیسا ماحول، توجہ، تعلیم اور تربیت سب فراہم ہو گا۔“

اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی ”کب قائم ہو گا یہ جیم خانہ۔ کون بنا رہا ہے؟“

میں نے کہا ”کب کا تو مجھے علم نہیں مگر لاہور کے ایک پرنس ہیں ناصر عظیم وہ بنا رہے ہیں۔“

دوشنی نے کافی میرے سامنے رکھ دی ”پلیز“ مجھے اس کے بارے میں ضرور بتائیں۔ میں ان بچوں کو وہاں بھجوا دوں گی۔“

میں نے کہا ”میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“

وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے دانٹوں سے انٹوں کو کترتی رہی اور قاتلین کو پیر کے انگوٹھے سے کریدتی رہی۔ یہ سب اعصابی دباؤ اور کشیدگی کو ظاہر کرنے والی حرکات و سکنات تھیں۔ میں اس کے لیے اچھی تھا لیکن ایک ہمدرد ثابت ہو رہا تھا۔ اس حد تک کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اس کی خیر خبر لینے کمر باندھ گیا تھا۔ میری یہ غیر معمولی دلچسپی اس کی ذات میں امید کے نئے شگونے کھلا رہی تھی اور لا شعور سے بھی نیچے

تحت الشعور میں خوابیدہ حسرتیں اور میرے لیے پسندیدگی کے جذبات پھر بیدار ہو رہے تھے مگر وہ اس بے چینی اور خلش کو کوئی نام دیتے سے قاصر تھی۔

شیری دس منٹ میں تیار ہو کے آگئی۔ اس نے پانچ منٹ میں کھڑے کھڑے ناشتا کیا اور میرے ساتھ چل پڑی

”کم آن۔ لیٹ اس مگر۔“

میں نے کہا ”تمہیں یاد ہے وہ جگہ؟“

”یاد کیوں نہیں ہوگی۔“ وہ بولی ”دوشنی بعد میں بھی وہاں جاتی رہی ہے۔ چوری چھپے بچوں کو دیکھنے۔ اور مجھے اس

کے ساتھ جانا پڑتا تھا لیکن بچے اسے دوبارہ دکھائی نہیں دے۔“

میں نے کہا ”وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔“

شیری نے میری بات کاٹ دی ”میں سب سن رہی تھی۔“

وہ کل بھی مجھ سے تمہارے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں الجھن ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شیری ہسپتال میں اس ڈاکٹر کو دیکھ کے ایسا کیوں لگتا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ آج جہیں اپنے گھر میں دیکھ کر اس کا ذہنی غلطکار اور بڑھ گیا ہو گا۔“

میں نے کہا ”یادداشت اسی طرح رفتہ رفتہ بحال ہوتی ہے۔ پرانی یادوں کے عکس ذہن میں ملتے جلتے ہیں۔ پہلے پہل تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر روشنی کا وقت طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے اور پہچان کے ٹکڑے آپس میں فٹ بیٹھنے لگتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے تمہارے جانے کے بعد اسے سب یاد آنے لگے۔“

”مغرب تک میں جا چکا ہوں گا“ میں نے کہا۔

شیری نے ایک آدھ بھری ”تم اس کی یادداشت کی بحالی میں سب سے اہم کردار ادا کر سکتے تھے مگر تم تو پہلے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ جہیں بھول جائے۔ پتا نہیں بعد میں اس کا انجام کیا ہو گا۔ کیا وہ اپنی ماں کی طرح باطل خانے جائے گی۔“

میں نے کہا ”اگر تم جاہو تو وہ ایک نارمل لائف گزار سکتی ہے۔ تم اسے سنبھال سکتی ہو۔“

”میں؟“ وہ سختی سے انہی ”میں خود کو نہیں سنبھال سکتی۔ خود ایک نارمل لائف تو نہیں گزار رہی ہوں۔“

میں نے اس سسٹے پر مزید بات چیت سے گریز کیا۔ ہم ایک ٹیکسی میں ساتھ ساتھ اچھٹی بن کے بیٹھے رہے۔ خلاف معمول شوخ اور بے باک شیری آج خاموش اور افسردہ تھی۔ چرچ کے گرد وسیع و عریض باغ اور احاطہ تھا جس کا گیت لکھا ہوا تھا۔ مرکزی عمارت تک جانے والے راستے پر بہت سی گاڑیوں کے ساتھ ایک عجیب سی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک جو ٹانگ رہا تھا اور ”جسٹ میرٹھ“ لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی شادی ہو رہی ہے۔

ہم ہال میں داخل ہوئے اور شادی میں شریک لوگوں کے پیچھے ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا چرچ تھا۔ صاف ستھرا اور ایک پر تقدس فضا سے معمور۔ ہال میں پادری کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے دس منٹ میں اپنا خطبہ ختم کیا اور لڑکے لڑکی کو میاں بیوی قرار دے دیا۔ دھلکانے

ازدواجی زندگی کی سند پر اپنی پہلی مرتعہ حق یوں ثبت کی کہ جملہ حاضرین کے سامنے دمن کو بیٹے والہانہ اور جذباتی انداز میں پلٹا کے چڑھا۔

جب رات رخصت ہو گئی تو پادری ہماری طرف متوجہ ہوا ”میں آپ دونوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

شیری نے جھکتے ہوئے اپنی آدھ کا مقدمہ بیان کیا۔ وہ غور سے سب سنتا رہا مگر اس نے ہمیں شرمندہ کرنے کے لیے لعن طعن نہیں کی ”میں ان بچوں کی ماں ہوں۔ یہ ان کا باپ ہے۔“

اس نے مجھ سے معافی کیا ”مجھے وہ بچے یاد ہیں۔ اس دن میں ہی صبح کسی کام سے چرچ میں داخل ہوا تو ان دونوں کی نوکیلاں دروازے کے سامنے رکھی تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ انہیں یہاں چھوڑ کر جانے کے اسباب کیا تھے اور اب انہیں واپس لے جانے کی کیا مجبوری ہے۔“

شیری نے کہا ”میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اب ہم نے شادی بھی کر لی ہے۔ بچے ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔“

اس نے کہا ”یہ سب آج کی بے راہ رو زندگی کا شاخسانہ ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی خداوند یسوع مسیح کی اخلاقی تعلیمات کے مطابق گزاریں تو ایسی صورت حال پیدا بھی نہ ہو۔“

میں نے کہا ”فادرب آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہر مذہب کی تعلیم کا سارا زور اخلاقی اقدار پر ہے مگر انسان مادی ضروریات کی دوڑ میں خدا اور اس کے رسول کے احکامات کو بھول گیا ہے۔“

”میرے بچو! وہ چونکا ”تم عیسائی نہیں ہو؟“

میں نے کہا ”ہم مسلمان ہیں۔“

اس کے انداز اور لہجے میں آنے والی تبدیلی کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا ”مجھے افسوس ہے کہ پڑا ہے کہ اب یہ کام اتنا آسان نہیں رہا۔“

”کیا مطلب؟“ شیری نے پوچھا۔

”بچے اب ہمارے پاس نہیں ہیں۔ پوی چرچ میں کوئی نرسری نہیں ہے۔ جہاں ایسے چھوڑے ہوئے بچے پالے جاسیں۔ ہم انہیں عام طور پر ہسپتال والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہاں بے اولاد بھی آتے ہیں“ اکثر اوقات علاج سے اولاد نہیں ملتی۔ پھر وہ کسی بچے کو گود لے لیتے ہیں۔ خود ہسپتال والے انہیں قائل کر سکتے ہیں کہ اس میں ثواب بھی ہے لیکن اس کیس میں معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔“

☆ گیارہواں حصہ

☆ 29 ☆

☆ گیارہواں حصہ

☆ 28 ☆

☆ گیارہواں حصہ

☆ 28 ☆

☆ گیارہواں حصہ

☆ 28 ☆

☆ گیارہواں حصہ

شری نے کہا "کیا انہیں کسی نے گود لے لیا ہے؟"
"صرف گود لیا ہوتا تب بھی تمہارے لیے ایک لمبی
قانونی جنگ لڑے بغیر ان کو واپس حاصل کرنا دشوار ہو جاتا۔
میں تو یہ بھی نہیں کتا کہ ثابت کرو تم ہی ان کے ماں باپ ہو۔
میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں مگر قانونی معاملات میں اعتبار کا سکہ
نہیں چلتا۔"

"آپ اسپتال کا نام بتادیں، ہم ان سے بات کر لیں
گے۔"

"میرے بچے۔ کبھی کبھی مشکلات کا کوئی حل ممکن نہیں
ہوتا۔ کیا ایک خرابی کا علاج دوسری زیادہ بڑی خرابی ہو سکتی
ہے؟ اسپتال والے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "آپ کل کے بات کریں۔"
اس نے قدرے تامل سے کہا "ہم اسپتال میں تبلیغ کے
لئے جاتے ہیں اس لیے مجھے معلوم ہے۔ یہ بالکل اتفاق ہے
اور اسپتال والوں نے بھی جھوٹ بول کے کوئی منہ نہیں کیا
تھا۔ انہوں نے دو زندہ بچوں کو بچایا تھا۔ وہاں ایک عورت نے

مردہ بچے کو جنم دیا۔ اس کے شوہر نے بتایا کہ ان کا یہ بچہ
شادی کے دس سال بعد بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا
تھا۔ انہوں نے سوزر لینڈ جاکے علاج بھی کرایا تھا۔ لیکن
دورانِ حمل ہی ڈاکٹر نے عورت کو بتادیا تھا کہ بچے کی

پیدائش ناممکن نہیں ہوگی اور یہ ہو سکتا ہے کہ آخری وقت
میں بھی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ ڈاکٹر نے شوہر کو صاف
کہہ دیا تھا کہ وہ طے کر لے اگر آخری وقت میں اسے فیصلہ
کرنا پڑا تو وہ کیا کرے گا۔ ماں کو بچانا چاہیے گا یا بچے کو۔ اور

اس فیصلہ مختص نے پہلے سے سب طے کر رکھا تھا۔ اس نے
کہا کہ مجھے اپنی بیوی کی زندگی چاہیے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ
عورت کو مردہ بچے کی پیدائش کے بارے میں بتایا جائے

اور ہمیں کوئی نو ذرا اندہ بچہ دے دیا جائے جسے ہم اپنا بچہ کے
پالیں۔ قدرت کے کہیں نہ والے ہیں۔ جس دن وہ عورت
ڈیوری کے لیے اسپتال پہنچی "اسی دن تم اپنے بچوں کو یہاں

چھوڑ گئے تھے۔ اسپتال کی میٹرن نے شوہر کو بتایا کہ اتفاقاً گویا
خدا کی رحمت کہ آج دو نو ذرا اندہ بچے ہیں۔ شوہر نے ایک
کو لینے پر آمادگی ظاہر کی مگر میٹرن نے کہا کہ خدا نے انہیں
ایک ساتھ دنیا میں بھیجا تھا۔ وہ جڑواں بہن بھائی ہیں۔ تم

دونوں کو لے جاسکتے ہو یا دونوں کو چھوڑ کے جاسکتے ہو۔ شوہر
نے دونوں کو لے لیا۔ یہ سب خداوند یسوع مسیح کا کرشمہ
ہے اس نے دو ضرورت مندوں کو یکجا کر دیا۔ بچوں کو ایک

گھر مل گیا اور والدین مل گئے عورت کی خوشی کا تو ٹھکانا
مت پوچھو۔ جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ آئندہ اس کے
ماں بننے کے امکانات اب صفر ہو گئے ہیں تو اس نے کہا کہ
مجھے یہ دو کیا کم ہیں۔ خدا نے بیٹا بھی دے دیا اور بیٹی بھی دے

دی۔ اب اور کی میں کیا خواہش کروں۔ چنانچہ اب وہ دونوں
بچے اس گھر میں پرورش پا رہے ہیں اور جس محبت سے تم نے
ان کو محروم کرنا چاہا تھا وہ کئی گنا ہو کے ان کو مل رہی ہے۔
مجھے بتاؤ، کیا تم انہیں واپس لے سکو گے۔ قانونی مشکلات کو

چھوڑو، اگر ایسا برا وقت آگیا کہ مجھے ایک تباہ کن جراثیم
میں بولنا پڑا تو میں بائبل پر ہاتھ رکھ کے جھوٹ، ہرجال نہیں
بول سکتا لیکن اس سچ سے ہونے والے ناقابلِ حلفی
تقصانات کا اندازہ کرو۔ اس عورت پر کیا گزرے گی یہ اس

کی ہمت کا قتل ہوگا۔ قتلِ عمد۔ اس کے اور شوہر کے درمیان
علیحدگی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ کسی کے شوہر نے اس سے
اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں
رہوں گا۔"

شری نے کہا "ہولی قادر۔ ہمیں معاف کریں۔ ہم نے
پہلے غلطی کی لیکن دوسری بار اس سے بڑی غلطی کرنے
بار ہے تھے۔"

میں نے کہا "ان بچوں کو اب وہیں رہنا چاہیے۔ وہی
ان کے اصل والدین ہیں جو ان کو پال رہے ہیں۔"
"خدا انہیں خوش رکھے۔ اور تم پھر والدین بنو۔" پادری
نے کہا "آمین!"

ہم خاموشی سے چرچ سے نکل آئے۔ ڈرائیو دے پر
اب صرف ایک ہی گاڑی کھڑی تھی۔ شری کی گاڑی۔ وہ
چپ چاپ ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھ گئی، میں اس کے ساتھ
جا بیٹھا۔

شری نے بالآخر کہا "اب تم کیا کہتے ہو؟"
میں نے کہا "کہنے کو اب کیا بچا ہے۔ تم نے بالکل ٹھیک
فیصلہ کیا۔"

"لیکن ہم روشنی کو کیا بتائیں گے؟"
میں نے کہا "یہ مشکل کام ہوگا۔"
"ہم روشنی کو کچھ نہیں بتا سکتے اور بتا بھی دیں تو وہ اسے
قول نہیں کرے گی۔"

"میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"
اس نے قدرے تامل سے کہا "تم جانتے ہو وہ بچوں کے
اور پیچھے خانے کے بارے میں تم سے کیوں بات کر رہی تھی؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیوں بات کر رہی تھی؟"
"میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ بچے
اب کہاں ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس میں
نے سوچا کہ تمہارے گھر آنے کی کوئی وجہ بتاؤں۔"

"تم نے اسے یہ بھی بتادیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ چرچ
جاؤں گا؟"
شری نے اقرار میں سہلایا "تاہم میں نے اسے قانونی
مشکلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ اندازہ تو مجھے بھی تھا کہ بچوں کو

واپس لینے کے لیے کوئی بھی جائے اسے عدالت میں ثابت
کرنا پڑے گا کہ بچے اسی کے ہیں۔"
"پھر اب تم روشنی سے کیا لوگی؟"
"میں نہیں، ہم اسے بتائیں گے کہ بچے مر گئے۔"

"یہ کیا بے وفائی اور بے رحمی کی بات ہے؟" میں نے
کہا۔
"مجبوری میں سب جا ز ہے۔ ابھی پادری نے کیا ثابت
کیا۔ یہی کہ جان بچانے والا جھوٹ اس سچ سے افضل تر ہے
جو کسی کی جان لے لے۔"

میں لا جواب ہو گیا "وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"
"کیا مگر۔" روشنی چرچ اور اسپتال پر کیس کر سکتی ہے۔
اچانک اسے اپنے بچے واپس حاصل کرنے کا جنون ہو گیا
ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔
میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"
"تم میرے ساتھ روشنی کو یہ بتاؤ گے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں یہاں سے واپس جا رہا ہوں" میں نے
کہا۔
"تم پھر مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تمہیں بلیک میل
کروں۔"

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔"
وہ بولی "میں تمہاری پاکستان روانگی کو ناممکن بنا دوں
گی۔ وقتی طور پر میں ہائی کمیشن کو مطلع کروں گی۔"
میں نے ہاتھ جوڑے "اچھا بابا۔ چلو، میرے اعمال کی

سزا بن گئی ہو تم۔"
اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "شاہ جی۔ سزا تو ملی ہے مجھے
یا میری بہن کو۔ تمہاری زندگی تو بڑی اچھی ہے۔ پر سکون،
باعزت، خوشحال۔ اور صحت مند۔"

میں نے کہا "اپنی زندگی کا راستہ تم نے خود متعین کیا
تھا۔"

"بالکل غلط۔ زندگی کے راستے اور منزل سب تقدیر
طے کرتی ہے جو پہلے سے دستِ قدرت لکھ دیتا ہے۔ اپنے
اختیار میں ہو تو ہر لڑکی کے خواب پورے ہو جائیں۔ وہ ڈاکٹر
بن جائے اسے ایک لازوال حسن و شباب کی گارنٹی حاصل
ہو جائے اور ہر لڑکا شہساز افسر یا ڈپٹی کمشنر بن جائے۔"

"تم کو شش اور صلاحیت کے عنصر کو نظر انداز کر رہی
ہو؟"

وہ بولی "تم یقیناً بہت غما ہو لیکن دیکھو، تم نے روشنی کی
مدد کی۔ غلطی روشنی کی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ کا دوبارہ
نہیں رہی۔ جذباتی ہو گئی۔ تم نے میری ماں کی مدد کی۔ اب تم
میری مدد کر رہے ہو۔ جہاں اتنا کیا ہے وہاں ایک آخری نیکی
اور سہی۔ ایک گھٹنا اور لگے گا تمہیں۔"

میں نے کہا "ایک جھوٹ اور بولنا پڑے گا۔"
"چلو تم کچھ مت بولنا، جھوٹ میں بولوں گی سارا امانہ
میرے سر۔"

میں واقعات اور حادثات کی ایک دلدل میں پھنس گیا
تھا اور اب اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر میری
ہر کوشش ایک نئی مشکل کھڑی کر دیتی تھی۔ شری کے
اپارٹمنٹ چننے تک میں طے کر چکا تھا کہ یہ آخری بار ہے۔
اس کے بعد میں ہر نقصان برداشت کروں مگر بلیک میلنگ کے
دباؤ میں نہیں آؤں گا۔

حسب توقع روشنی کے لیے اپنے بچوں کی موت کی خبر
بھی غم کا ایک ہمارا ثابت ہوئی جو اس پر اچانک ٹوٹ پڑا تھا۔
وہ پہلے بھی غم جاں تھی۔ اس صدمے نے روشنی کے کشیدہ
اعصاب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے چلا چلا کے رونا اور خود
کو کوٹنا شروع کیا۔ پھر وہ دوازے سے سر ٹکرانے لگی۔ میں

نے اسے روکنے اور قابو کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وحشت
اور جنون میں اس کی جسمانی مزاحمت کئی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔
اس نے شری کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرائی تو اسے
چکر آگئے۔

اس جدوجہد میں روشنی کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور
مزید غصہ یہ ہوا کہ پاس پڑوس کے کچھ لوگ یہ دیکھنے آ گئے
کہ یہاں کیا ہو رہا ہے ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو مجھے
بڑی ملامت آمیز نگاہیں بھری نظروں سے گھور رہی تھیں۔
ایک منٹوں بڑھانے تو یہ کہہ دیا کہ میں زبردستی روشنی کی
عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے فوراً پولیس کے

ایم اے راحت کی ایک خوبصورت تحریر

ایک ایسی داستان جو ایک
بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں
چھوڑی جاسکتی۔ ایک نوجوان
جس کے انداز زندگی کا ہر ڈھنگ
نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش
کی بجائے سمندر کی گود میں
پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں
ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

نئی ٹیگن پبلیکیشنز
قیمت ۱۸۰/-
ڈاک خرچ ۳۰/-

ناشر علی میاں پیپل کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۶۲۴۴۱۴

”نکواس مت کہ میں نے اسے گالیاں دیں، تجھے اتنا
پڑے گا۔“
”بے بات کو سمجھا کر بھوتی کے میں سیکرٹری ہوں
اب نیلم کا۔“
”ایسی کی جیسی سیکرٹری کی۔ اور اس کی جس کا تو
سیکرٹری ہے۔ نیلم نے تو اعلان کر دیا تھا کہ وہ فلموں سے
ریٹائر ہو جائے گی۔“
”وہ تو ٹھیک ہے پارے۔ اپنی بھی اس سے یہی کہتے
ہیں کہ یہ کام چھوڑے مگر وہیں زب تکمیل ہیں۔“
”زیر تکمیل۔ جاہل کی اولاد!“
اس نے جینپ کے کما ”اے ہاں وی۔ وہ تو پوری
ہو گئی تھی۔“
میں نے کہا ”تو استعفیٰ دے دے۔ چھوڑے نیلم کی
ذکر۔“

”اے پارے۔ نوکری کہاں ہم تو بادشاہی کر رہے ہیں۔ اتنا
خیال رکھتی ہے وہ میرا۔ کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔ ایک وہ پہلے
والا سیکرٹری تھا، رحمانی۔ سالا پانچ لاکھ کما گیا۔ اس کے ساتھ
جی اچھا سلوک تھا نیلم کا۔ مگر اپنے ساتھ تو وہ ایسے ہی رہی
ہے جیسے تیرے ساتھ۔“
”وہ بڑی نیک اور فراخ دل عورت ہے۔“
”ہاں پارے۔ صبح ناشتا ہم ساتھ کرتے ہیں۔ اسٹوڈیو میں بچ
جی ساتھ کرتے ہیں۔ بڑی باتیں بناتے ہیں لوگ۔ اخبار
والے تو سالے ایک نمبر کے حرامی ہیں۔ پتا نہیں کیا کچھ
چاپ رہے ہیں۔“

میرا ہاتھ اٹھکا ”کیا چھاپ رہے ہیں؟“
”اے بی۔ اوہ رادھر کی۔ بے نکی باتیں کہ ان کے
رسمیوں یہ ہے، وہ ہے۔“
میں نے کہا ”بیٹے۔ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں
آگ ہو۔“
وہ ہنسنے لگا ”آگ کہیں نہیں ہے پارے!“
”جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے۔ کیا دونوں طرف ہے
آگ برابر لگی ہوئی؟“

”دیکھ پارے۔ دونوں طرف کا تو بات نہیں۔ پر اپنا دل
ماتہ میں نہیں رہا۔ اس کی مریاں دیکھ کے دماغ خراب
ہو گیا ہے اپنا۔“ وہ ہنسنے لگا۔
میں نے کہا ”دماغ اچھا کب تھا۔ لیکن تجھے کراچی آنا

ہے۔ ہمیں معاف کر دینا۔“
میں نے اسے ٹھیک کے چکار کے الگ کیا ”مجھے افسوس
ہے کہ میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔“
اس نے اپنے آنسو پچھے اور مسکراتے لگی ”اگر ہمیں
تم جیسا کوئی پاکستانی مرد اپنا لیتا تو خود بھی بوسے فائدے میں
رہتا۔ اور ہم بھی وہ نہ ہوتے جو ہم ہیں۔“
اس شام کا بانی حصہ میں نے جیٹی اور عاقل کے ساتھ
باقی ماندہ شاپنگ میں صرف کیا۔ میں اب بہت خوش اور
مطمئن تھا۔ لندن میں میرے قیام کے سارے مقاصد پورے
ہو چکے تھے۔ ان تمام قانونی مسائل سے جو لندن میں پیش
آئے، مجھے مقامی اخبارات میں مناسب پبلیٹی ملی لیکن
پاکستان میں ختم کی کوشش سے تمام اخباروں نے شاہ عالم کو
نمایاں کو ترجیح دی اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ شاہ عالم نہ
صرف یہ کہ لندن میں موجود ہے بلکہ پھر ایکٹو ہو گیا ہے۔
پاکستان کے کچھ اخباروں نے جن میں ختم کا اخبار پیش
پیش تھا۔ مستقبل میں میرے سیاسی عزائم کا خوب چرچا کیا۔
ختم ایڈیٹر تھی اور اس کے شاہ عالم سے مراسم کی نوعیت بھی
کسی سے پوشیدہ نہ تھی چنانچہ اخبار نویس تو اس پر وہیلنگڈے
کی اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن رائے عامہ بھی دوبارہ شاہ عالم کا
مزکر سن رہی تھی۔ گمنامی میں رہنے والا شاہ عالم پھر پہلے جیسی
شہرت پانے لگا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کے پاکستان پہنچنے پر
سیاسی منظر میں کچھ پھل ضرور پیدا ہوگی۔
ضرورت اب اس بات کی تھی کہ نامہ عظیم کی بھلا کے
لے شاہ عالم کو فٹا کر دیا جائے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ لاہور
جیسے شہر میں شاہ عالم کی سیاسی پارٹی لی ہے انیف کے کارکن
عمدے دار اور ممبر بہت تھے۔ وہاں کسی بھی شخص کو شاہ عالم
قرار دے کر دفن کر دینا تقریباً ناممکن تھا لیکن یہ کام کراچی
میں کیا جاسکتا تھا۔
رات کو میں نے رئیس سے فون پر رابطہ کرنے کی
کوشش کی تو وہ مجھے آدمی رات کے بعد نیلم کے گھر میں ملا۔
”کیا حال ایڈ جال ہے پارے؟ تو ایسا کیا کہ بالکل ہی گودینٹ
گون ہو گیا۔“
میں نے کہا ”بس اب ایک دن کی بات ہے۔ پرسوں میں
پاکستان پہنچ رہا ہوں۔ تو مجھے کراچی میں وصول کر۔“
”کراچی میں کیوں؟“
میں نے کہا ”یہ میں کراچی پہنچ کے بتاؤں گا۔“
”لیکن پارا میں نہیں آسکتا۔“ وہ بولا۔

حوالے کر دینا چاہیے۔ دوسری عورت نے نفلی تعصب کا
مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایسا ہی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان
کے لیے عورت ذاتی پر اپنی یا جنس تجارت ہے انسان نہیں
ہے۔
ایک بار پھر سٹیری نے ایمرینس طلب کی اور میں روشنی
کو دیکھ کے نہیں بیٹھ سکا تھا۔ میں نے اسے ناک ٹوٹ
کر دیا۔ یہ ”وشٹائن“ سلوک دیکھ کے ایک عورت نے جج
باری اور دوسری پولیس کو فون کرنے بھاگ گئی۔ میں ایک نئی
معصیت میں گرفتار ہو گیا۔
جب ایمرینس آئی تو اس کے ساتھ پولیس بھی آئی مگر
وہاں پولیس زبوتی کی کارروائی نہیں ڈالتی۔ سٹیری کی
وضاحت نے پولیس آفیسر کو مطمئن کر دیا اور وہ ایمرینس کے
ساتھ ہی واپس چلے گئے ایک بار پھر روشنی اسپتال پہنچ گئی۔
جب میڈیکل اسٹاف نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تو میں
نے سٹیری سے کہا ”مجھے اب چلنا چاہیے۔“
اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ”ٹھیک پووری جگہ۔ لیکن
ایک آخری مسئلہ۔“
میں نے برہمی سے کہا ”اب کیا ہے؟“
”تم نے روشنی کے لیے اضافی رقم کا وعدہ کیا تھا۔“
میں نے اسے چالیس ہزار کا چیک چھوڑا جو عاقل کے
اکاؤنٹ کا تھا۔ میں بھولا نہیں تھا ”اب مجھے اجازت ہے۔“
”ایک منٹ!“ اس نے کہا اور سر اٹھا کے میرے گال کو
چوم لیا۔ ”پھر تیزی کی ہے میں نے تم نے کہا تھا کہ پھڑ
مادھگ۔“
میں مسکراتے پر مجبور ہو گیا۔ کس کرنا اس سوسائٹی میں
قطعا معیوب نہیں سمجھا جاتا جس کا اثر سٹیری قبول کر چکی تھی
بلکہ بعض اوقات یہ شہر گزاری اور احسان مندی کے
جذبات کے اعتبار کا پسندیدہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم صرف
خاورے کی حد تک ایسا کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے، تمہارا منہ
چوم لوں۔ وہاں عملہ یہی کیا جاتا ہے اور اس میں گالوں کی
تخصیص نہیں۔ زیادہ جذباتی ہو کے کوئی ہونٹوں کو بھی چوم
لے تو اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔
”روشنی ٹھیک ہو جائے گی“ میں نے دوستانہ انداز میں
سٹیری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
وہ بھری بیٹی تھی۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ کے
سکنا شروع کر دیا ”شاہ جی، تم جتنے اچھے بندے ہو۔ ہم اپنی
بی بی ثابت ہو میں لیکن کیا کریں سب کی اپنی اپنی مجبوری

پڑے گا۔

”کتنے دن کے لیے؟“

”ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں۔ مہینہ بھی۔“

”ناممکن۔ اتنی لمبی چھٹی نہیں ملے گی مجھے۔“

میں نے کہا ”فلتہ بیچ چھٹی پر۔ میں جو کمرہ رہا ہوں کہ

استغنی دے کر آج اب میں تجھے اپنا سیکرٹری مقرر کرنا ہوں۔“

”اے نہیں یار۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔“

”پھر تو چھوڑ دے اسے۔ اور نیلم کی فکر مت کر۔ اس

سے میں بات کر لیتا ہوں“ میں نے کہا۔

”یہ بات نہیں پیارے۔ اپنے لیے بھی مشکل ہے۔“

”کیا مشکل ہے؟“

”اتنے دن نیلم سے دور رہنا“ وہ بولا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی

ہے۔ بھوتی گئے۔ تجھے عشق ہو گیا ہے اس سے۔ سالے

صورت دیکھی ہے اپنی؟“

”اے یار۔ محبت کیا صورت دیکھ کے کی جاتی ہے؟“

میں نے کہا ”محبت کے ٹھوڑے۔ پہلے تو وزن دیکھ کے

محبت ہوتی تھی مجھے۔“

وہ ہنسنے لگا ”وہ محبت کہاں تھی پیارے۔ یہ بات اب

مجھ میں آگے۔ بس ایسے ہی دل لگی تھی۔“

میں نے کہا ”کیا نیلم کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“

وہ بولا ”وہ کیا شعر پڑھتا تھا تو۔ کہتے ہیں نیلمے پیار وہ

دماغ کی خرابی ہے۔ تو پیارے“ ایسا ہی ہوتا ہے واقعی۔ صرف

فلوں میں نہیں زندگی میں بھی ہوتا ہے۔“

میرے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ

نیلم جیسی سیر انار جس کا ایک عالم دیوانہ تھا اس نے نہیں

جیسے معمولی شکل و صورت کے بے نسب اور کسی حد تک

بدنام اور جاہل شخص کو پسند کر لیا ہے مگر میں خود مجھے اس

کی اطلاع دے رہا تھا تو یقین کیے بنا چارہ نہ تھا۔ دوسری

طرف مجھے خوشی بھی تھی کیونکہ مجھ سے بہتر نہیں کو بھلا کون

سمجھ سکتا تھا۔ اپنی طبیعت سادگی، نیک نیتی اور فراخ دلی کے

باعث وہ کسی بھی عورت کے لیے مثالی شوہر ثابت ہو سکتا

تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابتدا میں وہ دل لگی کے لیے دل لگاتا

رہا اور دوسرا ڈنڈہ وزن کی ایسی حسیناؤں کے جال میں الجھتا

رہا جن کو وہ مذاق میں رس ملائی ”بھئی“ امرتی اور چٹیلی جیسے نام

دیتا تھا۔

میں نے کہا ”نہیں! میں آخری بار کمرہ رہا ہوں اگر اپنی

پہنچ جاتا۔“

”اے بات سن میری۔ دراصل۔ وہ نیلم کا پروگرام

کچھ اور تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ اچانک لندن پہنچ جائیں۔

اپنی سوتی کو مبارکباد دیں۔“

”اس کا نام اب بھی ہے“ تو کے ہنسنے!“

”اے ہاں وہی، یعنی اور عاقل کی شادی میں شریک نہ

ہونے کا بہت عمدہ تھا نیلم کو۔ ہم کل پرسوں میں روانہ

ہوئے کا سوچ رہے تھے۔“

میں نے کہا ”اگر یہ بات ہے تو ہنسیک ہے۔“

”پیارے تو بھی رک جا دو چار دن اور۔“

میں نے کہا ”میں رک جاتا لیکن مجھے پتا ہے کہ میں پھر

کسی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ میں اب روائگی ملتی نہیں کرنے

والا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم کراچی پہنچو، تم دونوں۔ تو میں

ریسیو کروں۔ پھر تم لندن جا کے واپس کراچی آ جاؤ۔ میں

کراچی میں تمہیں دوبارہ ریسیو کروں۔ تو نیلم سے بات

کر لے۔ اور میری فلائٹ کا نمبر اور ٹائم بھی نوٹ کر لے۔“

یعنی میری توقع کے برعکس ذرا بھی پریشان یا اداس نہیں ہوئی

”پھر کب آؤ گے بھائی!“

”جب تو بلا کے گی“ میں نے کہا۔

”اچھا؟ پھر تم یوں کرو“ کل پاکستان پہنچ کے پرسوں

واپس ”وہ ہنسنے لگی۔“

میں نے کہا ”آ جا تا تو لگا رہے گا بھئی!“

وہ بولی ”صرف تم آؤ گے بھیا۔ میں تو پاکستان جا نہیں

سکتی۔“

عاقل نے ایک کارٹن میرے حوالے کیا ”اس میں

چاکلیٹ ہیں قمر کے لیے، بیئر ڈز سے لایا ہوں منتخب کر کے“

کالی ہیں؟“

”ویسے تو کافی ہیں مگر قمر کو بیشہ ناکافی رہتے ہیں۔“

یعنی نے کہا ”بھیا۔ اس صندوقچی میں کیا ہے؟“

میں نے کہا ”چند اکی امانت ہے۔“

اسپیکر کے چنگ ایڈریس سسٹم پر فلائٹ کی روائگی کا

اعلان ہونے لگا ”مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ ٹرانزٹ

لاؤنج میں چلے جائیں۔“

میں آگے بڑھا اور رک گیا۔ ٹرانزٹ لائونج کے راستے

میں جو مگر کا بھائی برٹ اس کا باپ اور کچھ دوسرے بد معاش

دیوار بنے ہوئے تھے۔

جنہم رسیدہ ہو مگر کے بھائی برٹ اور ان کے صاحبزادی

والدہ ماجد سمیت وہاں پانچ افراد کا ٹولہ اپنی بد معاشی کی طاقت

سے میرا راستہ روکنے کے لیے مستعد تھا۔ معلوم نہیں انہیں

کس طرح یہ علم ہو گیا تھا کہ میں آج اس فلائٹ سے فرار

ہو رہا ہوں اور وہ قتل از وقت میرے ارادے کو ناکام بنانے

کے لیے لندن انرپورٹ پر جمع ہو گئے تھے۔

وہ سب ٹرانزٹ لائونج کو جانے والے راستے کی طرف

منہ کے کھڑے تھے چنانچہ ابھی تک ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی

تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ مجھے دیکھتے ہی وہ شکاری کتوں کی

طرح پلکیں گے اور قانونی یا غیر قانونی طور پر مجھے مجبور کر دیں

گے کہ میں جو مگر کے خون بھائی رقم ادا کروں۔ پھر میں ان کی

طرف سے جنم میں جاؤں یا اپنے وطن۔ یا میں پرواز

چھوڑ دوں اور ان کے ساتھ چل کر فیصلہ کن مذاکرات کروں

کہ مجھے قانون کے مطابق قتل کے الزام کا سامنا کرنا منظور

ہے ان کا مطالبہ مانا یا ان کے ہاتھوں قتل ہوتا۔

قلبی بیہوشی طرح ان سب کو مار مار کے پانچ منٹ میں

لپٹا لٹایا جاسکتا تھا مگر اس کے بعد میرے اس پرواز سے

پاکستان جانے کے امکانات صفر ہو جاتے۔ انرپورٹ پر ہنگامہ

ہوئے ہی قانون ہرست سے صورت حال کو کنٹرول میں کرنے

کے لیے حرکت میں آ جاتا۔ برٹ ایڈ براؤز کینی کے ساتھ

میں بھی گرفتار ہو جاتا اور پھر قانونی طور پر باعزت رہائی سے

پہلے میرے واپس پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

میرے خلاف ہو مگر کے قتل کا الزام ثابت ہونا مشکل ہی

نہیں ناممکن تھا مگر یہ کیس کھلتا تو گویا پنڈورا کا باکس کھل

جاتا۔ گزشتہ دو ماہ میں نہ چاہنے کے باوجود میں کئی بار پولیس

کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہو چکا تھا۔ تازہ ترین واقعہ گزشتہ

روز پیش آیا تھا جب میں شیری کے ساتھ اس کی بہن روشنی

کو اسپتال لے گیا تھا۔ فی الحال میں قتل جیسے سنگین الزام میں

بلاوجہ ملوث ہونے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ قانون سے مدد مانگنے کا

مطلب بھی وہی تھا جو غیر قانونی طور پر اپنا راستہ بنانے کی

کوشش کا ہوتا۔ پولیس بہر صورت داخل انداز ہوتی اور

فریقین کا موقف سن کے یہی فیصلہ کرتی کہ معاملات کی صحیح

صورت حال واضح ہونے تک مجھے روک لیا جائے۔

میں نے عاقل اور عینی کو کچھ دور بلا کے چوبیٹن سمجھائی

”اب میں ٹرانزٹ لائونج تک کیسے جاؤں؟“

یعنی نے مشورہ دیا ”آپ دی آئی پی گیٹ سے اندر چلے

جائیں۔ آخر آپ کے پاس ڈپلومٹک پاسپورٹ ہے اور آپ

ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔“

عاقل نے نفی میں سر ہلایا ”خاتون۔ یہ پاکستان نہیں

ہے۔ یہاں وزیر مشیر بھی عام لوگوں کی طرح رہتے ہیں۔ بس

اور ٹرین میں سفر کرتے ہیں اور یہاں بھی عام راستے سے آتے

جاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”وقت بہت کم ہے ورنہ میں ان سب سے

منٹ لیتا۔“

”کیسے منٹ لیتے آپ؟ سب کا مار مار کے بھر کس نکال

دیتے، مانا کہ آپ بڑے تیس مارخان ہیں مگر یہاں کوئی قلمی

شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے کہ بیہودہ جن مجبور دشمن کو مار کے

مسکراتا ہوا نکل جائے“ عاقل نے خفگی کا اظہار کیا۔

”یار کی تو میں نہیں چاہتا۔ پھر پولیس کے چکر میں پڑا تو

وہ کیس گئے کہ آخر براہیم کیا ہے تمہیں؟“

”وہ تمہیں نفسیاتی معائنے کے لیے بھیج دیں گے کہ یہ

شخص جب تک ماریپیٹ نہ کرے اسے کھانا نہیں

ہوتا۔“

میں نے کہا ”تم تو جانتے ہو کہ معیبت خود میرے گلے

پڑتی ہے۔“

”مگر پولیس یہ بات نہیں جانتی۔“

میں نے کہا ”سکے کا کل سوچا یا ر!“

یعنی نے کہا ”میرا تو خیال ہے کہ تم کو سیدھا پولیس کے

پاس جانا چاہیے۔“

”اور کیا جانا چاہیے انہیں؟“

یعنی بولی ”یہی کہ انرپورٹ پر کچھ خطرناک لوگ موجود

ہیں اور مجھے خطرہ ہے ان سے۔ براہ مہربانی مجھے بحفاظت جہاز

تک پہنچا دیں۔“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”میری بھولی بہن۔ کاش‘

یہ سب انتہائی آسان ہوتا۔ کیا پولیس مجھ سے پوچھے گی نہیں

کہ آخر کون ہیں یہ خطرناک لوگ اور آپ کی جان کے دشمن

کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا جواب دوں گا میں انہیں؟“

عاقل بولا ”اور فرض کرو تمہارے بھائی کی شکایت پر

پولیس نے برٹ کو اس کے باپ کو اور باقی سب لوگوں کو

پکڑ لیا تو ان سے بھی پوچھا جائے گا کہ آخر اس شرف آدمی

نے تمہارا کیا گناہ کیا ہے تم لوگ کیوں اس کا راستہ روکے

کھڑے ہو جائے کیوں نہیں دیتے اسے؟“

میں نے کہا ”ہاں۔ یہی ہے اصل براہیم۔ پولیس میرے

بیان پر انہیں جیل نہیں بھیج سکتی۔ یہ معاملہ پیش ہو گا عدالت

میں۔ مگر اس سے پہلے ہوں گی تحقیقات تو شاہ عالم کا سارا کچا

چھاساٹے آجائے گا۔ ہوگر کے بھائی اور باپ کو ہوگر کے ہلاک ہونے کا اتنا صدمہ نہیں ہے جتنا لاچ ہے کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ وصول کریں۔

”برٹ خود قاتل ہے اپنے بھائی کا“ یعنی بولی۔

”یہ تو تم کہہ رہی ہو۔ سوچو برٹ کیا کہے گا اور ہوگر کا باپ کیا کہے گا۔ انہیں ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ ملنے کی امید نہ رہی تو پھر وہ اتر آئیں گے کھلی دشمنی پر۔ وہ مجھ پر ہوگر کے قتل کا الزام عائد کر دیں گے۔ یہی نہیں برٹ ڈیکٹی کے ذرائع کا سارا راز فاش کر دے گا۔“

”برٹ خود ڈیکٹی میں شامل تھا۔“

عاقل نے کہا ”یار یعنی کیا ضروری ہے سوچے کچھ بغیر ہونا؟“

”میں نے کیا غلط کہا؟“ یعنی بڑے بولی۔

میں نے کہا ”ج تو یہی ہے کہ برٹ بھی واردات میں شریک تھا مگر ایک تو عدالت میں سچ کوئی نہیں بولتا۔ دوسرے یہ سچ کا پھندا بالآخر میرے ہی گٹھ میں پڑے گا۔ برٹ کے گا کہ اس شخص نے میرے بھائی ہوگر کو بے وقوف بنایا۔ اس سے کہا کہ دس ہزار پاؤنڈ وصول کروں گا۔ تم فلاں جگہ جی کی گاڑی روک لو اور یہ گاڑی فلاں جگہ میرے سامنے کے حوالے کر دو۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ گاڑی میں تین لاکھ پاؤنڈ کیش ہے۔ جب یہ بات اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے ہوگر کو معلوم ہوئی تو اسے سخت طیش آیا۔ اس نے شاہ عالم سے کہا کہ مالی خیمت میں سے آدھا خیرتے حوالے کرو۔ شاہ عالم نے انکار کیا۔ اس پر ان کی لڑائی ہوئی جس میں ہوگر مارا گیا۔ ذرا سوچو یہ سب عدالت میں کہا گیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ ان کے پاس تو چشم دید گواہ بھی بہت ہیں۔ سارے کالے جو وہاں رہتے ہیں ہوگر قبلی جیسے ہر شخص بائبل پر ہاتھ رکھ کے کہہ دے گا کہ اس نے خود مجھے لوہے کی سلاخ سے ہوگر پر وار کرتے دیکھا تھا۔“

یعنی شکر و پریشان نظر آنے لگی۔ ”پھر کیا کریں بھیا!“

عاقل نے کچھ سوچ کے کہا ”ایک آئیڈیا ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے کہا۔

”تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاؤ۔“

میں نے اُدھر اُدھر دیکھا ”دھول میاں کہاں ہے برادر ان لا۔“

وہ بولا ”دیکھو“ آدھے گٹھ کے بجائے اگر پون گھنٹا لگ جائے تب بھی تمہیں فلائٹ مل جائے گی۔ تھوڑا بہت تاخیر کا مارجن ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹے بعد بھی میں بورڈنگ کارڈ لے لوں گا۔ میں افطارم کر سکتا ہوں کہ ٹریفک جام میں پھنس گیا ہوں لیکن میں پرواز سے پہلے یہیٹا پہنچ جاؤں گا۔“

”ایک ترکیب ہے میرے ذہن۔ ہم میاں سے نکلے ہیں ایک ساتھ۔ پھر ایک دو گھنٹے کے فاصلے پر میں ایمبولنس طلب کرتا ہوں۔ ہم تھیں میاں لاتے ہیں اسٹریچر لٹا کے پھر شفٹ کر دیں گے وہیل چیئر پر۔ تم کہہ سکتے ہو کہ کمر کی ایک چوٹ کے باعث فی الحال تمہاری ٹانگیں کام نہیں کر رہی ہیں۔ تمہیں اڑلائن کا ترسک اسٹاف خود ٹرانزٹ لائونج سے جنازہ تک پہنچائے گا۔“

”لیکن وہیل چیئر بھی گزرے گی اسی راستے سے۔ جہاں میرے دشمن دیوار بنے کھڑے ہیں۔“

”ایمبولنس میں ہم تھیں چادر سے دھانپ کے لائیں گے۔ وہ چادر تم وہیل چیئر اوڈھ کے بیٹھ سکتے ہو۔ صرف ایگریٹیشن والے تمہیں مجبور کریں گے کہ اپنا چہرہ دکھاؤ۔ اور کوئی یہ مطالبہ نہیں کر سکتا۔ تم دشمنوں کی نظروں کے سامنے سے بحفاظت گزر جاؤ گے۔ انہیں شک بھی نہیں ہو سکتا۔“

میں نے اس پلان پر غور کیا تو کامیابی کے امکانات خاصے روشن نظر آئے۔ وقت کم تھا اور میرے یا یعنی کے ذہن میں کوئی متبادل منصوبہ بھی نہیں تھا چنانچہ میں نے فوری طور پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ”یہ ہے تو مشکل کمزری الحال اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔“

”WE CAN AT LEAST TRY“ عاقل بولا۔

یعنی تذبذب کا شکار رہی ”ٹھیک ہے۔ مگر سوچو! اچھی طرح۔“

”سڑکی وقت کہاں ہے سوچنے کے لیے“ میں نے کہا۔

ہم آخر تقریب میں باہر نکلے۔ لندن کے مشہور انزپورٹ کارپوریشن بھی کئی گھنٹے تک بھلا ہوا ہے۔ وقت کی کمی کے باعث ہمارا باہر جانے کے لیے پارکنگ ایریا تک پہنچنا اور گاڑی لے کر باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ہم نے سب سے پہلے سامنے آجانے والی عیسیٰ کو روک لیا اور انزپورٹ کی حدود کے باہر ایک بس اسٹینڈ پر پہنچ کے کرایہ ادا کر دیا۔ عاقل نے وہیں موجود ایک فون بوتھ سے معلومات حاصل کیں تو بتا چلا کہ ایمبولنس سروس انزپورٹ کے اندر ہی موجود ہے۔ دس منٹ میں ایمبولنس ہمیں ہمارے سامنے آکے رک گئی۔ ایک نرس نے باہر آکے پوچھا ”مریض کون ہے؟“

میں نے بیماروں والی صورت بنالی ”مریض میں ہوں۔ میں چل نہیں سکتا۔“

”پھر تم میاں تک کیسے پہنچے؟“ نرس نے سوال کیا۔

میں نے کہا ”یہ براہم عارضی ہے۔ کبھی کبھی اچانک میرا بخلا دھڑبے جان ہو جاتا ہے۔ میاں تک میں گاڑی خود ڈرائیو کر کے لایا تھا۔“

”تم نے برا خطرہ مول لیا۔ تم کسی حادثے سے دوچار ہو سکتے تھے۔“

میں نے کہا ”دراصل چھ مہینے سے میں بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے ایک بھی فاج کا انیک نہیں ہوا تھا۔ میری کمریں دو سال پہلے چوٹ آئی تھی اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کسی وجہ کے بغیر اچانک ٹانگیں بے جان ہو جاتی تھیں۔ کبھی ہفتے میں ایک بار، کبھی دو بار پھر علاج سے اتنا فائدہ ہوا کہ فاج کا حمل مہینے دو مہینے بعد ہونے لگا۔ اب چھ مہینے گزر گئے تو ڈاکٹر نے بھی کہا کہ تم ٹھیک ہو۔“

”تمہیں اب کہاں جانا ہے؟“ نرس نے کہا ”ہسپتال؟“

”تو۔“ میری فلاٹ ہے ایک گھنٹے میں۔ مجھے انزپورٹ پہنچنا ہے۔ انزپورٹ تو خیر سامنے ہے مجھے جنازہ تک پہنچنا ہے۔“

نرس نے پوچھا ”تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے؟“

میں نے کہا ”نہیں۔ پہلے کئی بار میں اکیلا آیا ہوں۔“

”اور تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

میں نے سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”وہ سامنے۔ اسے میری بیوی لے جائے گی بعد میں۔ لیکن تم اگر اس طرح مدد کے بجائے جرح کرتی رہیں تو میری فلائٹ ضرور مس ہو جائے گی۔“

”دراصل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ خیر یہ اڑلائن والوں کا درد سر ہے کہ وہ تمہیں لے جاسکتے ہیں یا نہیں۔“ وہ بولی۔

اس نے ایمبولنس کے ڈرائیور کو بلایا۔ پھر انجان بن کے ایک طرف کھڑے ہوئے عاقل کو اشارہ کیا ”پلیز“ ان کی مدد کریں۔“

مجھے ایک طرف سے ڈرائیور نے سپورٹ کیا اور دوسری طرف سے عاقل نے۔ وہ مجھے ایمبولنس تک لے گئے اور اندر لٹایا۔ میں نے عاقل سے ہاتھ ملا کے کہا ”تم لوگ اب جاؤ، خدا حافظ!“

مگر عاقل نے کہا ”ہم اس وقت تک دیکھیں گے جب تک تم اندر نہیں چلے جاتے۔“

”واٹ از دس!“ نرس نے برا مان کے کہا ”ابھی تم نے بتایا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔“

میں نے فوراً وضاحت کی ”یہ ابھی مجھے صورت سے اپنا ہم وطن پاکستانی لگا۔ اس لیے میں نے اردو میں شکریہ ادا کر دیا۔“

”اور اس نے جواب میں کیا کہا؟“

”اس نے کہا کہ یہ اس کا اخلاقی فرض تھا جو اس نے پورا کیا۔“

نرس مطمئن ہو گئی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا ”چلو“ اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی ”تمہیں کون سے گیٹ پر جانا ہے؟ ڈرائیور کو بتادو۔“

میں نے کہا ”نمبر نو مینٹی سیون پلیز!“

نرس نے کہا ”تمہیں یقین ہے۔ کہ اس حالت میں تم سفر کر سکتے ہو؟“

میں نے کہا ”یہ اثر وقتی ہوتا ہے ابھی آدھے پونے گھنٹے میں میری حالت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

”تمہیں اڑلائن والوں کو بھی مطمئن کرنا پڑتا ہوگا۔“

میں نے کہا ”وہ جانتے ہیں مجھے۔ ہوسٹی میں ایک ڈپلومیٹ ہوں۔ اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ کیا مجھے ایک چادر مل سکتی ہے اوڑھنے کے لیے۔“

نرس نے مجھے ایک صاف دھلی ہوئی چادر اوڑھادی۔ ”کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟“

”نہیں۔ اس کیفیت میں کچھ سردی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اب اگر میں یہ چادر خریدتا چاہوں؟“

”اوہ تو۔ میں اسے بیچنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ وہ بولی۔

میں نے کہا ”تم میری مدد کرنے کے لیے اتنا تو کہہ سکتی ہو کہ چادر تم سے ہم ہو گئی اور اس کی قیمت جو بھی ہو میری طرف سے ادا کر سکتی ہو۔ یہ کچھ ٹوٹ ہیں۔“

اس نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا ”میں یہ نہیں لے سکتی۔“

میں نے کہا ”لیکن مجھے چادر کی خت ضرورت ہے۔“

وہ کچھ سوچ کے بولی ”آپل رائٹ! ابھی تم چادر رکھ لو۔ آگے جنازہ والے تمہیں کبل بھی فراہم کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیکس!“ میں نے کہا ”جنازہ تک پہنچ کے میں چادر واپس کر دوں گا۔“

ایمبولنس اس راستے کے مقابل جا کھڑی ہوئی جو مریضوں کے آنے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ عاقل کی ترکیب کام کر گئی تھی۔ میں اب اس جگہ سے بہت دور تھا

جہاں برٹ اس کا باب اور ان کے حمایتی میری آمد کے خطر تھے۔ یہ بات میرے لیے ناقابل فہم تھی کہ آخر انہیں میری اس فلاح سے یہ روایتی کا علم کیسے ہوا؟ شاید انہوں نے کسی جان بچان والے کی مدد سے یا ناجائز ذرائع سے پاکستان جانے والی ٹی آئی اسے ہر فلاح کے بارے میں افکار میں حاصل کی ہوگی اور جیسے ہی میرا نام اس فلاح کے مسافروں میں دیکھا ہوگا وہ میرے استقبال کے لیے پہنچ گئے ہوں گے۔

مجھے ڈرائیور نے ایک اور شخص کی مدد سے اتارا اور ایک وکیل جیفر بٹھایا۔ کسی دشواری کے بغیر نرس وکیل جیفر کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں نے چادر کو پورے جسم پر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور چہرے کو بھی پوری طرح چھوڑتے چھپا لیا تھا۔ لوگ خود بخود وکیل جیفر کے لیے راست چھوڑتے جا رہے تھے جیسے جیسے میں داخل دروازے کے قریب پہنچ رہا تھا میرا دل کچھ تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ خوف ایک غلط بن کے مجھے پریشان کرتا تھا کہ کہیں برٹ اینڈ کمپنی نے چادر میں چھپا ہونے کے باوجود میرا چہرہ دیکھ لیا یا انہیں شک بھی ہو گیا تو وہ کیا کریں گے۔

لیکن میرے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ برٹ اور اس کے ساتھی وکیل جیفر دیکھتے ہی اداکار اور ہو گئے۔ میں کسی بردہ دار خاتون کی طرح چادر میں لپیٹا ہوا ان کے درمیان سے گزر گیا۔ اس وقت تک میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ کے پھٹنے لگا تھا۔ خطرے کی حدود سے گزرتے ہی میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور چادر کو اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔ آگے راست صاف اور محفوظ تھا۔ مجھے مطلوب نظر آنے کی اچھی خاصی اداکاری کرنی پڑی لیکن میرے ڈیوٹینگ پاسپورٹ نے میری بہت مدد کی۔ میرا سامان پہلے ہی کلیئر ہو گیا تھا۔ مجھے کسی دشواری کے بغیر پورے ڈنگ کارڈ بھی مل گیا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں پہنچ کے میں نے نرس کا شکریہ ادا کیا اور چادر بھی اسے واپس کر دی۔ آگے مجھے پی آئی اسے کے مستند اسٹاف نے سنبھال لیا اور جہاز میں پہنچا دیا۔

میں نے کہیں پرہیز نہ کیا۔ بحری یا ہوائی جہاز کسی ملک کا نشانہ نہ ہوتا اس کے اندر کی جگہ کو اصل ملک تصور کیا جاتا ہے چنانچہ اپنے وطن کی نمائندہ پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز کے اندر قدم رکھنے کے بعد میں نے تصور میں اپنے وطن کی مانوس فضا کو اس کے وجود کو اور اس احساس کی خوشبو کو محسوس کیا جو پاکستان کے نام سے منسوب اور مننون ہے۔ وہاں بیشتر پاکستانی تھے اور چند ایک کو چھوڑ کے سب پاکستان کی زبانیں بول رہے تھے۔ انگریزوں کے ملک کی

پر تعصب، پر تعصب اور پر تکلف اجنبیت کا ماحول یکفخت ختم ہو گیا تھا۔ میں جیسے لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ سے اچانک لاہور کی گوالہندی یا کراچی کے لالوکیٹ پہنچ گیا تھا جہاں سب اپنے تھے پاکستانی تھے۔

میں ایک نئے فوٹیل پاکستانی جوڑے کے قریب سے گزرا۔ دو گھنٹہ پہلے اپنی ”خ“ پر خوش تھا۔ لندن روایتی انداز میں اپنے مفتوح ہونے کے خیال سے شہراری تھی۔ اس نے گورے ہاتھوں پر کھنی سے ذرا نیچے تک بڑے دلاور انداز میں مندی کے پھول کھلا رکھے تھے اور اس کے ہاتھ پر جھومر یوں چمک رہا تھا جیسے برکھارت میں کسی کھڑے ہوئے دھلے دھلے آسمان پر چودھویں کا چاند۔

میں نے دو صحت مند بچائیوں کو روایتی زندہ دلی اور بے تکلفی کے ساتھ کسی لطیفہ پر قہقہہ مارنے کے شے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے دیکھا۔ میرے پیچھے دو سندھی میاں بیوی شاہ عبداللطیف بھٹائی پر بڑی عالمانہ گفتگو میں مصروف تھے کہیں سے تین چار بچائیوں کے بیک وقت بولنے کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن کچھ لوگ کانٹ کے لیے میں زبان کو تکلیف دے کر انگریزی میں بھی باتیں کر رہے تھے۔

مجھے میری سیٹ تک پہنچانے والے فضائی میزبانوں نے کمال شانستگی کا مظاہرہ کیا ”آپ اب COMFORTABLE ہیں سر!“

میں نے کہا ”لیس۔“ تھینکس۔ میں کچھ دیر میں نارمل ہو جاؤں گا۔“

”ہمارے لیے اور کوئی خدمت؟“

میں نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا اور کھڑکی سے باہر اس لندن کو دیکھنے لگا جس نے مجھے دو مہینے اپنا قیدی بنا کے رکھا تھا۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آخری وقت تک روکنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن میں بالآخر لندن سے بھاگ آیا تھا۔ مجھ سے چند سوئزر کے فاصلے پر اس وقت بھی برٹ اینڈ کمپنی قاتلانہ عزائم کے ساتھ میری راہ دیکھ رہی تھی اور آتے جاتے جہاز میں شاہ عالم کے چہرے کو تلاش کر رہی تھی۔ اس سے بڑے لندن میں کہیں ایک لڑکی روشنی تھی جس نے میرے ساتھ زندگی بھر شریک سفر بننے کے خواب دیکھے تھے مگر اس کے اربابوں کے آشیانوں پر ایسی جلی گری تھی کہ اب نہ راکھ تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا۔ روشنی کے ساتھ ہی دوسری لڑکی شہر تھی۔ بدکردار اور بدنام مگر صاف گو اور نیک دل۔ وہیں لندن کے ایک اسپتال میں جولی

لپٹی ہوئی تھی اور شاید دل ہی دل میں اپنی فحوت کا شمار کر کے سکراری تھی۔ اسے اپنے حسن و شباب کی ایک قیمت وصول کرنی تھی اور اس نے کی۔ اسے اپنے دولت مند مالک و آقا شوہر کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اس نے لگا دیا۔ اسے ایک پاکستانی شاہ عالم کے غور کو شکست دینی تھی کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اس نے دی۔ اب یہ کیا سوچنا کہ ہر جیت کے لیے اس نے اخلاق و کردار کے نکتے ضابطوں کو پامال کیا۔ محبت اور برکت میں سب جانتے ہیں۔

وہیں کہیں دوسرے اسپتال میں لارڈ پرکس لینا ہوا تھا جس نے پچاس سال تک ایک دوست کی امانت کو سنبھال کے رکھا تھا اور بالآخر یہ امانت اس کے وارثوں تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک جیل خانے میں جی بند تھا جس نے زندگی بھر سرب کو اپنی عیاری اور بد معاشی سے دھوکا دیا تھا مگر بالآخر تھپڑ نے اسے دھوکا دیا اور اب وہ ایک پرنس پارنر اور ایک لائف پارنر اعتبار کی سزا کاٹ رہا تھا۔

بالآخر جہاز نے پرواز شروع کی۔ چشمہ تصور سے میں نے دو پیارے چہرے چوں کو دور کی کدھن میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ ان میں ایک چہرہ عاقل کا تھا جس نے عینی کی محبت کے ساتھ میری ذمہ داریوں کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔ دوسرا بچہ کا چہرہ تھا جو اچانک لندن کے بھرے پڑے شہر میں خود کو اکیلا محسوس کر کے رو رہی تھی اور سات سمندروں کی وسعت کے خیال سے دل زدہ تھی جو اس کے اور اسے چاہنے والوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

جہاز کے کچھ مسافروں نے شاہ عالم کو پہچان لیا تھا ان میں میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں بیس سال کی وہ خوش مزاج، خوش اطوار اور خوش شکل خاتون بھی تھی جو بعد میں ایک ڈاکٹر ثابت ہوئی۔ جہاز لندن کے اتر پر پہنچ تو فضائی میزبانوں نے مسافروں کی خاطر تواضع شروع کی۔ مجھے فرمائش پر ایک کافی میسا کی گئی۔ خاتون نے کریم کے ساتھ کافی ل۔ سلسلہ کلام بھی خاتون نے شروع کیا ”اگر میرا خیال غلط نہیں تو آپ عالم شاہ عالم ہیں۔“

میں نے مسکرائے کہا ”میں یقیناً شاہ عالم ہوں۔“

”میرا نام شانہ ہے اور میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں لندن کے ایک اسپتال میں پریکٹس کرتی تھی“ اس نے رٹنا اپنا ہاتھ کے بڑھایا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا ”آپ سے مل کے خوشی ہوئی لیکن یہ کرتی تھی کیا یہ مطلب؟ کیا آپ نے یہ باب چھوڑی ہے؟“

”لیس۔ میں پاکستان جا رہی ہوں“ وہ بولی ”دو سال بعد۔“

”وہاں آپ کو زیادہ اچھی جاب مل گئی ہے؟“

وہ ہنس پڑی ”بہی کچھ سمجھتے۔ میری شادی ہو رہی ہے۔ میں نے اس سے بھر ہاتھ ملایا۔“ میری طرف سے بیشکی مبارکباد۔

”تھینکس!“ وہ کچھ شرمائی۔

میں نے کہا ”اگر اسے آپ پر عمل معاملات میں دخل اندازی نہ سمجھیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے ہونے والے شوہر کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟“

وہ مسکرائی ”یہ اندازہ کیسے کیا آپ نے؟“

میں نے کہا ”عموماً ایسا ہی ہوتا ہے میڈیکل کالج میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں زمانہ طالب علمی کے پانچ سالوں کے دوران میں اپنے اپنے شریک حیات کا انتخاب کر لیتے ہیں۔“

”دراصل انہیں بہت وقت ملتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا۔ وہ صرف کلاس روم میں ہی ساتھ نہیں ہوتے۔ پریکٹس کلسز، اور اسپتال کے مختلف شعبوں میں ڈیوٹی کے دوران میں انہیں دن رات ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے۔ پانچ سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے کسی کوچ کرنے کے لیے اور سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنے کے لیے۔“

میں نے کہا ”گویا آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟“

”لیس۔ پانچ سال تک دن رات ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارنے کے بعد ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہم تمام زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ ہم شادی سے پہلے ہی ایڈ جسٹ ہو گئے تھے۔ ذہنی طور پر لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”چھوڑ دے۔ آپ بھی کہیں گے کہ کیا لڑکی ہے اپنی زندگی کی الف لیلہ کھول کے بیٹھ گئی۔“

میں نے کہا ”ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس مجھے ایک پُر تجسس دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اس بے حد پیکنیکل رومانس میں۔ کوئی اچھی باتیں کرنے والا، مسفر ہو تو سفر آسان ہو جاتا ہے ایک بات ضرور جاننا چاہوں گا میں۔“

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں ”وہ کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”دوران تعلیم پانچ سال تک تم نے یقیناً صبر و حقاقت کا ثبوت دیا لیکن ڈاکٹر بن جانے کے بعد بھی تم نے دو سال گزار دیے؟“

وہ بولی ”دوسال نہیں تین سال۔ ایک سال میں بھی ہاؤس جاب میں لگایا اور عمران نے بھی۔“

”یعنی آٹھ سال ہوگئی اس رومائس کی عمر؟“

”تقریباً، لیکن ہمارے ساتھ بھی وہی قسم کے مسائل تھے۔“ وہ ہنسی ”چچ میں ظالم ساج آگیا تھا۔“

”پھر تو کوئی ولن بھی ہوگا اس لو اسٹوری میں؟“

”وہ بھی تھا ایک مگر اس بے چارے نے کچھ نہیں کیا۔ ایک فلمی مثلث بنی ہوئی تھی۔ لیکن بازی بالآخر عمران نے جیت لی۔ اس کے بعد وہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جن کی ہمارے نزدیک تو کوئی اہمیت نہیں تھی مگر خاندان والوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ ایک تو میں سنی وہ شیعہ۔ دونوں طرف کے علانے فتوے جاری کر دیے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ میرا سیدوں کا خاندان تھا وہ کسی غیر سید کی بیٹی تو لے آتے ہیں مگر اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ بس اسی چچقتش میں گزر گئے تین سال۔ مجھے اسکا رشب مل گئی تھی۔“

دو سال میں انگلنڈ میں رہی۔ ایک ڈپلومالے لیا۔ وہ ہماری ایم بی بی ایس کی ڈگری پر بھاری ہے۔ عمران یہاں لاہور کے ایک سرکاری اسپتال میں ہے۔ شام کو پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتا ہے۔“

”کسی بڑے ڈاکٹر کے ساتھ؟“

”نہیں۔ کلینک اس کا اپنا ہے اتفاق سے اس کو ایک موقع کی جگہ مل گئی۔ وہاں پہلے بھی ایک ڈاکٹر کا کلینک تھا اور اچھا چلتا تھا۔ وہ ڈاکٹر کینڈا چلا گیا اور جاتے جاتے کلینک عمران کو چھ گیا۔ عمران صاحب کا یہ ہے کہ متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق ہے۔ کلینک خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ بینک سے لون لینا چاہتے تھے۔ مجھ سے مدد لینے میں انا بھروسہ ہوتی تھی۔ بہت سمجھایا، بڑی منت سماجت کی کہ چار سال دو سال کی بات ہے۔ جب شادی ہو جائے گی ہماری تو کیا میرا کیا تیرا۔ اسی کلینک میں مجھے بھی بیٹھنا ہے۔ بالآخر بات سمجھ میں آگئی۔“

”اب ظالم ساج نے گلے نیک دیے ہیں؟“

”وہ ہنسی ”عمران نے بڑی مستقل مزاجی سے اکیلے ہی یہ معرکہ سر کیا۔ میں تو بیٹھ گئی تھی انگلنڈ جا کے۔“

”اگر تمہاری عدم موجودگی میں گھر والے تمہارا رشتہ کہیں طے کر دیے؟“

”وہ بولی ”گھر والے جانتے ہیں میرے مزاج کو بہت اچھی طرح۔ آخر ہوں تو انہی کی بیٹی۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہی صورتیں ہیں۔ یا تو میری شادی ہوگی عمران سے ورنہ

نہیں ہوگی۔ میں لندن سے واپس ہی نہیں آؤں گی۔ عمران نے اسے گھر والوں کو راضی کیا۔ پھر میرے والدین کو قائل کیا۔ قائل کماں ہوتا ہے کوئی۔ بس مجبور دیکھتے ہیں خود کو تو عزت بچاتے ہیں اپنی۔“

وہ بہت باتوں لڑکی تھی۔ اس کی ذات میں ایک مٹا کر کرنے والی خود اعتمادی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر تھی اور دوسری یہ کہ وہ دو سال سے برطانیہ میں خود مختاری کی زندگی گزار رہی تھی لیکن تیسری سب سے بڑی وجہ وہ محبت تھی جس پر وہ خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسہ رکھتی تھی۔

کراچی پہنچنے تک نو دس گھنٹے کے سفر میں ہماری شناسائی میں ایک دوستانہ بے تکلفی آئی کہ میں نے اس کے پوچھنے پر اسے چندا کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا اور جھجک کے بارے میں۔ لیکن میری گفتگو میں میرے سیاسی یا کاروباری معاملات کا کوئی حوالہ نہیں آیا۔

ان چند مسافروں میں سے جنہوں نے مجھے شناخت کر لیا تھا ایک کسی اخبار کا سیاسی تجزیہ نگار بھی تھا جو کسی جلا وطنی کی پڑھیش زندگی گزارنے والے لیڈر کا انٹرویو لینے لندن گیا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پہلے انٹرویو سے ان کے ہاتھوں اپنا کارڈ بھجوایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی خوشامداندہ مسکراہٹ اور عاجزی کے ساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب میں سہلا کے کارڈ جیب میں رکھ لیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ وہ کچھ دیر بعد خود آگیا۔

”شاہ عالم صاحب۔“ میں۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی ”آپ کے کارڈ سے تعارف ہو گیا تھا۔“

”جی۔“ محمود۔۔۔ دراصل میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بولا ”اگر آپ کی شریک حیات کچھ دیر کے لیے میری سیٹ پر چلی جائیں۔“

میں نے کہا ”سوچے سمجھے بغیر بولنا بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ ڈاکٹر شائدہ صرف میری شریک سفر ہیں۔“

وہ سخت خفیف ہوا ”آئی ایم سوری ڈاکٹر شائدہ!“

میں نے کہا ”چھابوا کہ غلط قسمی نہیں رفع ہوگئی ورنہ آپ تصویر چھاپ دیتے بعد میں تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا ہو جاتے۔“

اس نے جھپٹ کے کہا ”شاہ صاحب نہ میں ایسا صحافی ہوں اور نہ میرا اخبار اسکینڈلز پر چلتا ہے۔ دراصل آپ لندن سے وطن واپس جا رہے تھے اور آپ کے بارے میں یہ

تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہاں آپ نے تیسری شادی کی تھی لیکن آپ کی تیسری وائف بھی بیلک میں نظر نہیں آئیں۔“

”اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”صحافی کیا چاہے گا؟ ایک ایکس کلو سوانٹرویو۔“

میں نے کہا ”سوری۔ فی الحال میں کسی انٹرویو کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”آپ جیسے پرانے لوگوں کو تیاری کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ ڈھٹائی کے ساتھ کھڑا رہا ”صرف چند سوالات۔“

میں نے کہا ”بڑی مہربانی آپ تشریف لے جائیں۔“

ایسے میرے سر پر سوار نہ ہوں۔ میں ایک سوال کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ لاہور میں جب میری پریس کانفرنس ہوگی تو آپ کے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“

اس نے کچھ سکی محسوس کی کیونکہ وہ ایک بڑے اخبار کا بڑا نامور صحافی تھا۔ ”آپ میری توہن کر رہے ہیں۔“

”توہن کرانے کے لیے آپ خود تشریف لائے تھے میں نے آپ کو زحمت کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ الٹا آپ نے میری پرائیویسی کو ڈسٹرب کیا۔“

وہ سختی سے بولا ”آپ جہاز میں بیٹھے ہیں۔ اپنے بندہ روم میں نہیں ہیں۔“

میں نے کھڑے ہو کے کہا ”اب آپ جانتے ہیں یا میں اسٹورڈ سے کہوں کہ آپ کو راستہ دکھائے۔“

میری اس کی گفتگو بہت لوگوں نے سنی تھی اور کچھ زیر لب مسکرانے لگے تھے۔ صحافی سخت جبر ہوا اور پیر پختا دھمکی دینے کے انداز میں گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ اسے میں نے ہر پریس کانفرنس میں دیکھا تھا۔ وہ سب سے اعلیٰ صف میں ہوتا تھا اور خود کو بڑا طرم خاں سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر شائدہ نے کہا ”اب یہ آپ کے خلاف لکھے گا۔“

”لکھا کرے۔ اس جیسے بہت ہیں جنہوں نے بہت لکھا۔ میرے خلاف مگر کتے بھونکتے رہتے ہیں قافلہ چلتا رہتا ہے۔ اب یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں سیاست کے میدان میں کوئی نو آموز نہیں ہوں۔ میرے مخالفین سے میرے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔“

جہاز کراچی کے ایئر پورٹ پر اترنے لگا تو شائدہ نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور میں نے اسے اپنا ”دیسے تو آپ بہت مصروف ہوں گے انکیشن سر پر ہیں لیکن کبھی ضرورت پڑے خدا نخواستہ ہماری۔“

میں نے کہا ”خدا نخواستہ مت کہیں۔ آپ کی کنبی اچھی رہی۔ اگر میں آیا تو علاج کرانے نہیں آؤں گا۔“

وہ ہنسی ”میں اتنی بڑی ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔ میں نے نیورولوجی میں اسپیشلائز کیا ہے۔“

میں نے کہا ”آپ ڈاکٹر کمال کو ضرور جانتی ہوں گی۔“

”وہ کمال کلینک والے؟“

میں نے کہا ”کمال کلینک اب کمال کا اسپتال ہے۔ کمال میرا بچپن کا دوست ہے اور میں اس کے ساتھ اسپتال کی توسیع کے پروگرام میں پوری طرح شریک ہوں۔ ہم اسے ایک مٹائی اور بہت بڑا وٹلیٹیر اسپتال بنانا چاہتے ہیں۔ میری بہن قمر کی شادی بھی ڈاکٹر کمال سے ہوئی تھی۔ چندا ابھی کمال کے مشن میں شریک ہے۔“

وہ بولی ”خوابش تو میری بھی ہے کہ ایسے ہی کسی پروجیکٹ کے لیے کام کروں لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”شادی کے بعد مجھے عمران کو ESTABLISH کرنے کے لیے اس کے ساتھ کام کرنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں خود مالی دباؤ سے آزاد ہوں۔ میرے والد اچھے بڑے بزنس میں ہیں اور میں ان کی بیٹی ہی نہیں پارٹنر بھی ہوں۔ عمران کا خیال نہ ہوتا تو میں ایک وٹلیٹیر اسپتال میں بلا معاوضہ کام کر سکتی تھی۔“

میں نے کہا ”یہ آپ نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ اسپتال میں جو ڈاکٹر ہیں انہیں ہم کچھ نہیں دیتے۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ ہم انہیں سرکاری اسپتالوں کے گریڈ سترہ اٹھارہ سے زیادہ دی دیتے ہیں اور ان کے پرائیویٹ پریکٹس کرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ اس سے اسپتال کا شیڈول خراب نہ ہو۔ بات یہ ہے مس شائدہ کہ زندگی کے حقائق بالآخر جذباتی انداز فکر پر غالب آجاتے ہیں۔ باعزت طور پر اور آسانش کی زندگی کے لیے پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

اس نے سہلایا ”یہ بات ہے تو میں سوچوں گی۔“

”آپ کو کتنا چاہیے کہ ہم سوچیں گے۔“

وہ مسکرائی ”میں عمران کی بات نہیں کروں گی۔ اس کی سوچ اگک ہے۔ وہ اس بیٹے میں لاکھوں کمانا چاہتا ہے۔ دولت اس کے لیے مقصد حیات۔ منتہائے نظر اور ایک چلیخ ہے۔ تو یہ اس کے حالات کا رد عمل ہے۔ دولت میرے لیے کوئی ضرورت نہیں۔ بس ایک عادت ہے بچپن سے۔ میں ابھی COMMIT نہیں کر رہی ہوں لیکن میں آؤں گی آپ سے ملنے اور کمال کا اسپتال دیکھنے۔“

میں نے اس سے مصافحہ کیا ”ٹائٹل میٹنگ یو۔ ہم

ہسپتال کے توسیعی منصوبے میں تمہیں خوش آمدید کہنے کا انتظار کریں گے۔ تمہاری فلاح کب ہے؟

وہ بولی ”دو گھنٹے بعد۔“

میں نے کہا ”مجھے چھ گھنٹے انتظار کرنا ہے۔ خدا حافظ!“
باہر نکلنے میں مجھے بالکل دیر نہیں لگی۔ ہر غیر اہم مسافر کو قواعد و ضوابط کی مار سے پریشان کرنے اور مشکل میں ڈالنے والے ایگریشن اور سکیم کے حکام پوری طرح مستعد تھے اور مشکل کو آسان بنانے کی پوری قیمت وصول کر رہے تھے لیکن میری پاس فیلڈ تنگ پاسپورٹ تھا۔ میں سارے سامان کے ساتھ گرین چینل سے گزرتا چلا گیا اور کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

باہر آنے والے راستے کے مقابل رنگ کے دونوں طرف سیکڑوں مرد عورتیں اور بچے جمع تھے۔ کچھ لوگ لندن سے آنے والے انجینی مسافروں کو پہچانتے نہیں تھے اور ان کے لیے لے کارڈ اٹھائے کھڑے تھے جن پر مسافروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ یہ زیادہ تر کمپنیوں کے نمائندے اور ہوٹلوں کے ایجنٹ تھے۔

مجھے کسی دوست آشنا کے ملنے کی بالکل امید نہیں چنانچہ میں چشم براہ لوگوں کی قطار کے درمیان سے سیدھا گزرا چلا گیا۔ میں باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک کسی نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا اور میں نے ایک برسوں کی جالی بچپانی آواز میں ایک گالی سن لی۔

”سارے بھوت کی کے۔ کانا ہے یا اندھا؟“

اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو نہیں کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ ”اے بے کو۔“ الو کے مجھے قسم خدا کی میں نے پہچانا نہیں تھا۔ ”میں نے اس کے گلے لگ کے کچھ اور گالیاں دیں۔“

”کیسی ہوتا ہے ولایت سے لوٹ کے آنکھوں میں فرق آجاتا ہے پیارے!“ رئیس بننے لگا ”خون سفید ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”کیو اس مت کہ تیرا تو علیہ بدل گیا ہے۔ یہ سب کیا ہے آخر؟“

رئیس شرمائے لگا ”اے یار۔ بس ایسے ہی ہیں تو جانتا ہی ہے تو۔ کبھی پروا نہیں کی۔ جو ملا پن لیا اور یہ سالہ ولایتی لباس پہننے کا تو بھی خواب میں بھی نہیں سوجھا تھا۔“

میں نے اس کے ایک مکار سید کیا ”لیکن نیلم نے کہا کہ اب یہی پہننا پڑے گا تو پس لیا تو نے کوٹ چلتوں۔ ٹائی بھی باندھ لی۔ وہ کتنی نچے پھوٹا پھرتا تو؟“

اس نے مجھے اپنے ساتھ کھینچ لیا ”یار! کیوں تمنا کرنا رہا

ہے یہاں سب کے بچ میں۔ یہاں سے چل سب لوگ ہنس رہے ہیں۔“

میں نے کہا ”نیلم کہاں ہے؟“

”وہ اوپر بیٹھی ہے ریسٹورنٹ میں۔ یہاں آئی تو مجمع لگ جاتا۔“ رئیس نے سامان کی ٹرائی لے جانے والے پورٹ کو روک لیا۔

میں نے کہا ”چھا میری بات سن۔ میری لاہور کی سکٹ کرنے والی فلاٹ ہے چھ گھنٹے بعد۔ میں ان پورٹ ہوٹل چلتا ہوں۔ یہاں ٹرانزٹ لاڈج میں تو چھ گھنٹے گزار نہیں سکتا تھا اس لیے باہر آ گیا تھا۔ مگر تو مت! تو کیسے آ گیا یہاں؟“

”اے تو نے خودی تو کہا تھا۔“

”مگر میں نے تو کسی کو فلاٹ نہر نہیں بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہ سوئی نے بتا دیا۔“

میں نے اسے گالی دی ”پھر سوئی۔ تو مروا دے گا۔ ابھی وہ یہی ہے قزو العین۔ مسز عاقل!“

”ہمیں ویسے بھی کراچی آنا تھا۔ آج رات کی فلاٹ پکڑنے کے لیے۔“

میں رک گیا ”تم دونوں لندن جا رہے ہو؟“
رئیس نے سر ہلایا ”ہاں یار۔ پروگرام پہلے سے تھا۔ تو رک جاتا وہاں دو چار دن۔“

میں نے کہا ”نہیں رئیس! ایک ایک دن بھاری تھا مجھ پر۔ میں آیا نہیں فرار ہوا ہوں لندن سے ورنہ اندر ہو جاتا بیٹے۔“

وہ بولا ”اچھا تو ٹیل۔ میں، یار کے ساتھ ہوٹل آتا ہوں۔“

میں رئیس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دو مہینے میں اس کی شخصیت ایک ناقابل یقین انقلاب سے دو چار ہوئی تھی۔ اس کی محبت بستر ہو گئی تھی اور رنگ بھی کچھ صاف ہو گیا تھا لیکن سب سے بڑی تبدیلی گیٹ آپ کی تھی۔ اس کو میں نے زندگی میں کبھی چلتوں پہننے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شلوار قمیض بھی بست خراب انداز میں پہنتا تھا مگر اس وقت وہ ٹراپیکل سوٹ میں تھا اور لائٹ براؤن سوٹ کے ساتھ اس نے لائٹ بلو شرٹ پر ڈارک براؤن ٹائی بڑی غصت سے باندھ رکھی تھی۔

اس کی قربت میں ہمیشہ سینگے اور میل کی بو آتی تھی مگر آج وہ شیش ہیرا فائیو کی خوشبو سے مرکب رہا تھا۔

یہ انقلاب بڑا نظر فریب لگتا تھا مگر یہ محبت کا ایک ادنیٰ

ساکر شہ تھا۔ محبت سب کچھ کر سکتی ہے اور کر سکتی ہے۔ وہ فراہ سے ہارڈ کٹ کر دوڑھ کی سرنگھو سکتی ہے تو رئیس کو بھی نہیں میں آپ ٹیوٹس کر سکتی ہے۔ وہ قیس کو خاک بستر بچوں

یا سکتی ہے تو رئیس جیسے گاؤڑی کو جھٹک سکتی ہے۔
جتنی جراتی تھی رئیس کی حالت کے ظاہری تغیر پر تھی

اس سے نہیں زیادہ نیلم کے جذباتی انقلاب پر بھی۔ کہاں وہ عورت جس کے آستانہ حسن پر سجدہ ریز ہونے کے لیے ایک عالم خزاں ہوتا تھا۔ جس کے برستاروں میں ایک سے بڑھ کر ایک جہد و تکلیف صاحب کمال اور دولت مند مرد شامل تھے مگر جس کی نگاہ انتخاب پر ایک بھی پورا نہ اتر پاتا تھا اس کی نظر سے ہٹا کر خسرے پسند کیا۔

نہری حیرت میں حسد کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ افسوس کے جذبات نہیں تھے اور کسی کے لیے ترحم کے احساس کو دخل نہیں تھا۔ یہ بڑی خوش آئند اور پُر مسرت خیالات کی حامل

چہرہ تھی۔ رئیس کے ساتھ میری رفاقت کی عمر کچھ زیادہ تھی لیکن نیلم کو بھی دس سال سے اس طرح جانتا تھا جیسے

اپنے آپ کو۔ دس سال پہلے جب دہرائی اور خود فراموشی کے عالم میں اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا تو میں ایک

دو دن زمانے کا ٹھکرایا ہوا اور بے نام و نمود نوجوان تھا اور وہ وقت بھی قلمی دنیا کا ایک درخشندہ ستارہ ہونے کی وجہ سے

تینوں دلوں پر حکومت کرتی تھی مگر اسے میری بے ریا ہوا اور بے طلب خلوص نے اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے

مجھے بلایا تھا۔ آج برسوں بعد بھی رئیس کے ساتھ ہوا تھا۔

تاہم وہ نے مرتے وقت مجھے وصیت کی تھی کہ میں اسے

بھلا کر نیلم سے شادی کر لوں اور اپنی داستان میں اس نے

میں مستقبل کو بھرپور تحفظ فراہم کرنے کا سہا تھا لیکن

میں جذبات کے دھارے کا رخ بدلنا میرے پس کی بات نہ تھی۔ اور یہ بات نیلم بھی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ نیلم سے

پیارے محبت میں ہوس کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس محبت میں عزت

اور عقیدت تھی۔ میں نے بھی اسے اس نظر سے دیکھا

تھی جس طرح اس نے عورت کو دیکھا ہے اور اس

سے انھوں جاننے والے اسے دیکھتے تھے۔ وہ میرے لیے ایک

مرد دوست تھی۔ غم گسار تھی خیر خواہ تھی۔ باسے پناہ تھی

اور تحفظ کی ضمانت تھی۔ اس کا گھر میرا گھر تھا اور میں کمال

انسان کے ساتھ اس کی ہر چیز کو اپنا سمجھ سکتا تھا۔

میں آج بھی یہ طے کرنے سے قاصر ہوں کہ اگر میں

خوشی خواہش کے احرام میں نیلم سے شادی کی درخواست

کرنا تو اس کا رد عمل کیا ہوتا لیکن وہ مجھے اپنا لیتی تو میری

زندگی میں سکون ہی سکون ہوتا۔ عافیت ہی عافیت ہوتی اور

ایک انمول لازوال اور مکمل محبت ہوتی۔ پھر وہ سب نہ ہوتا

جو میری اس سرگزشت کا باعث ہوا۔

اب اس نے رئیس کو قبول کر لیا تھا تو جیسے مجھے اپنا لیا

تھا۔ میں یہ محسوس کر سکتا تھا کہ نیلم کی زندگی کے اوچھوڑے

پن کی تکمیل رئیس اسی انداز میں کرے گا جیسے رئیس کی

نامکمل شخصیت کی تکمیل نیلم سے ہوگی۔ انہیں دست قدرت

نے ایک دوسرے کے لیے ناگزیر کر دیا تھا مگر آشنائی کے

مراحل سے گزر کے اپنائیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے

انہیں اسی طرح برسوں ساتھ چلنا تھا۔ اس وقت کی طرف جو

بالا خرا نہیں ملانے والا تھا۔ اور وقت کا وہ ناگزیر لمحہ بالآخر

آ گیا تھا۔

مجھے چند گھنٹوں کے لیے ان پورٹ ہوٹل کا ایک کمرہ

دے دیا گیا جہاں میں نماوہو کے آرام کر سکتا تھا اور چچ کر سکتا

تھا۔ ابھی میں نے جوئے اتارے ہی تھے کہ دروازے پر

دستک ہوئی اور نیلم اندر آ گئی۔

میں آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے لگایا ”تم آگے

بالا خرا!“

رئیس مسکراتا رہا ”نہ آتا تو سالہا کہاں جاتا؟“

نیلم نے اسے پلٹ کے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ میں نے

اسے اپنے مقابل ایک صوفے پر بٹھا دیا ”کیسی ہو تم؟“

”تمہیں کیسی لگ رہی ہو؟“ وہ مسکرائی۔

”ہمت اچھی۔ جیسی بیشہ لگتی ہو۔ ویری بیوی فل!“

”مگر تم نے اپنا علیہ کچھ بدل لیا ہے۔ یہ مونچھیں اور یہ

خستہ راڑھی! یہ ہیرا شاکل!“

میں نے کہا ”یہ لندن سے وطن واپس آنے والے شاہ

عالم کا گیٹ اپ ہے۔ مگر جو تم نے کیا ہے وہ واقعی کمال

ہے۔“

وہ حیرانی سے بولی ”میں نے کیا کیا ہے؟“

میں نے رئیس کی طرف اشارہ کیا ”تم نے یہ کیا ہے کہ

اس جانور کو انسان بنادیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم نے

مجھے بنایا تھا۔“

وہ ہنسنے لگی ”رئیس اب میرا سیکرٹری ہے۔“

میں نے شرارت سے پوچھا ”صرف سیکرٹری! سیکرٹری

تو پہلے بھی ایک تھا۔“

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے دھا ”ہاں“ میں نے بتایا تو

تھا تمہیں کہ اس نے کیسے دھوکا دیا مجھے اتنا اعتبار تھا مجھے

اس پر۔“

میں نے کہا "اب تم اس پر اعتماد کی غلطی کر رہی ہو؟"
 ریتیں بننے لگی "میں تو کچھ بھی کہہ لے یا رہے۔ سب
 کے سامنے کچھ مت کہنا اور زیادہ فری بھی مت ہوتا۔ اپن
 گھاس نہیں ڈالتے کسی کو۔"
 نیلم نے کہا "سفر کیا رہا؟"
 میں نے کہا "بہت اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ چائے پیوگی یا
 کافی؟"
 وہ بولی "ریسٹورنٹ میں کافی منگوائی تھی میں نے مگر پی
 نہیں۔"
 میں نے کہا "اچھا تم روم سروس کو آرڈر دو۔ میں ذرا
 نما کے کپڑے بدل لوں۔ بس پانچ منٹ کھانے میں تو ابھی
 دیر ہے۔"
 "مگر مجھے بھوک لگی ہے" ریتیں بولا۔
 میں نے کہا "بھوکا تو میں بھی ہوں۔"
 "میں سینڈویچ منگوا لیتی ہوں" نیلم نے کہا اور فون
 کرنے لگی۔
 میں نے کہا "تم کیوں تکلیف کرتی ہو۔ یہ سیکرٹری حرام
 خور کیا مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے رکھا ہے۔" میں نے
 جاتے جاتے کہا۔
 نیلم نے صوفے پر نیم دراز ریتیں کی طرف دیکھا اور
 زرب لب مٹکانے لگی۔ مگر وہ اک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم تھی
 بہت کچھ کہہ گئی۔ کہ سیکرٹری تو یہ دنیا کے سامنے ہے یہاں
 ریتیں کی حیثیت کیا ہے یہ میرے دل سے پوچھو۔ یہاں وہ
 میری محبت بھی ہے اور میرا محبوب بھی ہے۔ خرد کا نام جنوں
 رکھ دیا جنوں کا خرو۔ یہی تو محبت کی کرشمہ سازی ہے۔
 نماتے ہوئے میں حالات کی اس کوٹ پر حیران ہوتا
 رہا۔ ایک وقت تھا جب ریتیں اسی طرح مجھ پر رشک کرتا تھا
 کیونکہ شادو مجھ سے محبت کرتی تھی جو اس کے لیے مجھ کو نہ
 سہی کسی آسمانی مخلوق سے کم تر نہ تھی۔ اسے یقین نہیں آتا
 تھا کہ شادو جیسی شانزادی مجھ فقیر پر فریفتہ ہے۔ آج صورت
 حال پھر وہی ہے تھی لیکن ریتیں کی جگہ میں نے لے لی تھی۔
 مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک نگاہ التفات کے طلب گار
 سیکڑوں ہزاروں پرستاروں میں جو وصل کی ایک ساعت
 نایاب کے عوض نذرانہ جان دینے کے لیے تیار تھے اسے
 ایک بھی گھٹما خواہوں کا شانزادہ نہ ملا کہ اس نے سب
 میرے موتی ٹھکرا کے سبک راہ جیسے ریتیں کا انتخاب کر لیا مگر
 جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفٹ
 میں نے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ میرے جذبات میں

رشک کا پلو غالب ہے۔ مجھے چننا کی محبت ملی تھی۔ مجھے
 چاہا تھا، جولی بھڑک رہی تھی اور اپنے آپ کو بھولنے لگی
 پہلے روشنی نے مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ لیا تھا مگر
 میں ایک بھی نیلم کی حیثیت، عزت اور شہرت کی ہمسری کا
 دعویٰ نہیں کر سکتی تھی اور پھر خود میں کیا کسی سے کم تھا۔
 ریتیں کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ صورت، نہ سیرت، نہ
 عزت اور رتبہ، نہ تعلیم اور نہ تہذیب مگر اسے نیلم نے محض
 کی کسی دلیل کے بغیر صرف چاہت کی کسوٹی پر رکھا تھا اور
 پسند کر لیا تھا مگر یہ پسند پہلی نظر کا عجز محبت نہیں تھی۔ نیلم
 نے جو کچھ کیا وہ دنیا کے نزدیک ایک جذباتی حماقت ہو سکتی تھی
 مگر خود نیلم کے لیے یہ ایک سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ وہ ریتیں کو
 بھی اس وقت سے جانتی تھی جب سے مجھے اور دوس برس تک
 اسے بہت قریب سے دیکھنے کے بعد اگر نیلم نے خود کو اس
 کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ فیصلہ عقل کی ساری تائید
 رکھتا تھا۔
 ریتیں کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے مجھے اپنے آپ
 سے شرم آتی۔ وہ میرا دوست تھا اور مجھے اس کی دوستی پر ناز
 تھا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ دہریہ میں تمام عمر گھٹتے
 رہنے کے بعد بالآخر اسے اپنے خوابوں کی منزل مل گئی ایک
 زمانہ تھا کہ وہ راہ چلتی جہر دو سو یا ہڈی لڑکی پر ہزار جان سے
 فریفتہ ہو جاتا تھا اور ان کے عشق میں اس مقام تک پہنچ جاتا
 تھا جہاں لگتا تھا کہ وہ جان سے گزر جائے گا لیکن یہ لوکیاں
 جن کے نام وہ دل لگی میں بالوشا، رس ملانی، برنی اور چمچ
 رکھ دیتا تھا کچھ عرصہ اس کی محبت کے عہدے پر فائز رہے
 کے بعد اسی طرح غائب ہو جاتی تھیں جیسے اس کی زندگی میں
 نمودار ہوئی تھیں۔
 صرف سولی وہ واحد لڑکی تھی جس کے عشق میں وہ بے
 حد سنجیدہ ہو گیا تھا اور خود سولی نے جواب یعنی بن چکی تھی
 اس کے جذبات کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی لیکن سولی کی
 زندگی میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے وجود میں ایک بے قرار
 اور تھیں پسند روح رکھتی تھی اور اس کی نظر ستاروں سے آگے
 دیکھتی تھی۔ وہ ہر منزل کو سبک میل کی طرح پیچھے چھوڑ سکتی
 تھی اور عاقل کو پانے تک اسی خیال پر عمل پیرا تھی کہ ابھی
 عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔
 چنانچہ ریتیں کو جو میری طرح لاواٹ اور بے فہم تھا
 اور جو نیم خانے کا پروردہ تھا۔ جو جیب تراش، چور اور جرائم
 پیش رہا تھا۔ جو سڑی شہر تھا اور بد معاشری میں اپنے کام پر فخر
 کرتا تھا۔ جو تہذیب، تعلیم اور شائستگی کے آداب سے

برا واقف تھا۔ جس کی اعلیٰ سوسائٹی میں نہ پہنچ تھی اور نہ
 عزت۔ جو صورت شکل کے معاملے میں بیٹھ احاس کسری کا
 نگار رہا۔ اسے نیلم نے ذلت کی پستی سے اٹھ کے اپنی چاہت
 کے آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ اس نیلم نے جو حسن
 میں بیٹھے روزگار تھی۔ جس کے شاب کی کشش لاکھوں
 دلوں کی دھڑکن کو مگر لاتی تھی، جو فلمی افتخار کا سب سے
 درخشندہ ستارہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق تھی لیکن ایسا تو
 شاید نوشتہ تقدیر تھا اور اہل تھا۔ اور جیسا کہ عقیدہ ہے
 قرآن کا جوڑا آسمانوں پر ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا گیا تھا
 چنانچہ اب دنیا کا دوا بڑا کرنا یا اسکینڈل بنانا اور نیلم کی عقل پر
 غم کرنا اور ریتیں کی قسمت پر حسد محسوس کرنا لاحاصل تھا
 اور یہ سود مگر متوقع تھا۔
 میرے ہاتھ روم سے برآمد ہونے تک کافی اگنی تھی اور
 ریتیں خان نے سینڈویچ کی پلیٹ میں صرف ایک میرے لیے
 چھوڑا تھا۔ اس نے کوٹ ٹائی اور جوتے اتار کے پیچینک
 بیٹے تھے اور اب ایک صوفے کے بازو پر سر رکھ لیٹا ہوا
 تھا۔
 میں نیلم کے سامنے بیٹھ گیا "تم نے کافی نہیں لی۔"
 "میں تمہارا انتظار کر رہی تھی" وہ بولی۔
 میں نے سینڈویچ اٹھایا "تمہاری غلاش کب ہے؟"
 "آج رات بارہ بجے" وہ کافی بنانے لگی۔
 میں نے کہا "اور ٹھہری کہاں ہو تم؟"
 "شیریں میں" اس نے مجھے کافی دی "تم اکیلے آئے
 ہو۔"
 میں نے جانتے بوجھے سرسری لہجے میں کہا "ہاں۔"
 نیلم نے غر سکون رہتے ہوئے کافی کا ایک گھونٹ لیا "تم
 ایک مدد پیو گے ساتھ آ رہے تھے۔"
 میں نے کہا "کیا یقینی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"
 "اے اس نے تو بتایا ہے سالے مگر تو بھی کچھ بول۔"
 ریتیں نے بھٹاکے کہا "بھگ مارنے گیا تھا تو ولایت الو کے
 پیچھے مصیبت ڈال دی سب کو۔"
 نیلم خاموش ہو گئی۔ ہم سب ایک بوجھل خاموشی میں
 غرق رہے اور روشنی کے بارے میں سوچتے رہے۔
 پھر میرے کہا "ناصر یہ۔۔۔ سب اچھا نہیں ہوا۔ جو کچھ
 خدا میں ہوا۔ مجھے اندازہ ہوتا تو میں تمہیں جانے ہی نہ
 دیتا۔"
 میں نے فحش سے کہا "اور مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سب
 لوگ تیرے میں جاتا لیکن میرے جانے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔ تمہیں اب ثابت
 کرنا تھا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور لندن میں ہے۔ خوب ثابت
 کیا تم نے۔"
 میں نے کہا "ٹھکر کر رہی ہو مجھ پر؟"
 وہ بولی "کیا لے گا مجھے تم پر ٹھکر کر کے تمہاری لندن کی
 مصروفیات کا سارا کیا چٹھا یہاں کے اخباروں نے
 بڑھاپا حاکمے شائع کیا۔ میں نے سب پڑھا۔"
 "وہاں جو کچھ بھی ہوا" اس میں میری مرضی کو دخل
 بہر حال نہیں تھا۔"
 ریتیں بولا "یہاں تو ایسا لگتا تھا پیارے جیسے وہاں
 تیرے سوا کوئی ہیرو ہی نہیں، ہر ادوات میں تیرا نام۔ ہر
 جگہ تو موجود!"
 میں نے کہا "ایسی بات نہیں ہے ریتیں۔ لندن میں
 سیکڑوں جرائم ہوتے ہیں روزانہ مگر ان کی خبر پاکستان کے کسی
 اخبار میں شائع نہیں ہوتی۔ ہو بھی نہیں سکتی مگر مجھ سے
 منسوب خبریں وہاں سے بطور خاص ار سال کی جاتی تھیں عاود
 یہاں نشیمن اپنے مراسم کی مدد سے انہیں تمام اخبارات میں
 نمایاں طور پر شائع کرا لیتی تھی۔"
 "بڑی شہرت ہوئی شاہ عالم کے نام کی۔ بدنام اگر ہوں
 گے تو کیا نام نہ ہوگا" نیلم نے کہا۔
 "میں بھی نیک نامی نہیں چاہتا تھا۔ اور بدنامی کی تشہیر
 ہوئی تو برا کیا ہوا۔ اب شاہ عالم پہلے سے زیادہ مردود خلافت
 ہے۔ وہ مرجائے گا تو لوگ کہیں گے خس کم جہاں پاک۔ وہ
 نیک نامی کما کے آتا تو اسے پرانے پارٹی ورکر اور مفاد پرست
 پھر گھیر لیتے اور اس کی سیاست کی دکان پھر چمک اٹھتی لیکن
 اب کوئی اسے کیوں خوش آمدید گے گا۔ انکسٹن سر رہے۔
 اس کے مخالفین شاہ عالم کی بدنامی کو EXPLOIT کر سکتے
 ہیں۔ ملکی سیاست سے وہ پہلے ہی باہر تھا۔ اب اس کے آنے
 سے کوئی بچل پیدا نہیں ہوگی۔"
 "مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بتاؤ اب تم کیا
 کرو گے؟" نیلم نے پوچھا۔
 میں نے کہا "وہی جو پہلے سے طے تھا۔ شاہ عالم کے وجود
 کو لوچ جہاں سے حریف کر کے طرح مٹانے کے بعد باقی رہے
 گا صرف میرا نام ناصر عظیم کے مستقبل کو شاہ عالم کے
 آسیب سے نجات مل جائے گی۔"
 اس نے افسوس سے سہلایا "یہ تو پتا نہیں کہ کیا
 ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ تدبیر کند، بدھ تقدیر کند خندہ۔ مگر ناصر
 خدا کے لیے اب یہ نموس شیطانی کھیل ختم کرو۔ بس ایک

زندگی جو جو تمہاری اپنی ہے۔

میں نے ابھی سے کہا "تم ابھی طرح جانتی ہو کہ میں یہ دہری زندگی اپنی مرضی سے نہیں جی رہا تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اول و آخر۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا شاہ عالم بننے کا۔ لیکن کچھ لوگوں نے میری اور شاہ عالم کی صورتوں میں ایک ناقابل یقین مشابہت دیکھی تو انہوں نے مجھے ڈبلی کیٹ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اغوا اور بلیک میل کیا۔ اپنا مطلب نکالنے کے بعد وہ ڈبلی کیٹ کو ضائع کر دیتے لیکن میری اور ان کی بد قسمتی کہ نقل کے دھوکے میں اصل کو ضائع کر دیا گیا۔ میں شاہ عالم کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہوا تو ناصر عظیم نہ رہا۔ اس سے مجھے دہرا نقصان ہوا۔ میں ایک طرف ان سب حقیقی رشتوں سے محروم ہو گیا جو میرے اپنے تھے اور شاہ عالم کی ساری رسوائیاں اور اس کی زندگی کے سارے خطرات میرا مقدر ہو گئے۔ شاہ عالم مر چکا تھا مگر میں مجبور تھا کہ اسے جھوٹ سے زندہ ثابت کروں۔ کتنا سخت، بے عزت و بے وقت گزارا ہے میں نے۔ کہ ایک طرف خان جی چندا، قمر مجھ سے برکت ہو گئے۔ تو دوسری طرف نہ چاہنے کے باوجود مجھے وہ سب کرنا پڑا جو شاہ عالم کرتا تھا۔ اور میں شاہ عالم کے رول میں اس لیے ناکام رہا کہ میں شاہ عالم نہیں تھا پھر اپنی جان بچانے کے لیے میں نے روپوشی اختیار کی اور یہ مشہور کیا کہ شاہ عالم فرار ہو کے لندن چلا گیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے دوبارہ ناصر عظیم بننے کے لیے کسی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ یہ تم ابھی طرح جانتی ہو۔ یہ قدرت کا کیا عجیب کھیل تھا۔ جب شاہ عالم مار دیا گیا تھا تو ناصر عظیم کو زندہ رہنے کے لیے دنیا کو قائل کرنا پڑا کہ شاہ عالم زندہ ہے ورنہ اسے بھی مار دیا جاتا اور آج جب دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ شاہ عالم مرا نہیں تھا تو مجھے ناصر عظیم کو اپنی زندگی پر سے اس کا تسلط ختم کرنے کے لیے اور اپنی زندگی بے خوف و خطر جینے کے لیے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ شاہ عالم مر گیا ہے لیکن میں پہلے بھی بے بس تھا اور آج بھی مجبور ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو کیا کروں؟ شاہ عالم زندہ رہے گا تو مجھنے والے ناصر عظیم کو بھی شاہ عالم سمجھتے رہیں گے۔ میں کہاں کہاں کس کس کو قائل کروں گا کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔ میں اس کے نام کی رسوائیوں سے اس کے دشمنوں سے اس کے غیر قانونی کاروبار سے اور اس کے باطنی کے سارے رشتوں سے نجات چاہتا ہوں۔ اس کا اور کوئی طریقہ نہیں نیلم۔ سوائے اس کے کہ جس شہود کے ساتھ میں نے خود کو زندہ اور حقیقی شاہ عالم ثابت کیا تھا اس سے زیادہ شور بنگائے کے ساتھ میں شاہ

عالم کو مار دوں۔ ایک بار پھر وفاداروں۔ تاکہ ناصر عظیم کے مستقبل کو تحفظ حاصل ہو جائے پھر کوئی اسے دیکھے تو یہ خیال نہ آئے کہ وہ شاہ عالم ہے۔ دیکھنے والا خود مان لے کر یہ کوئی اور ہے جس کی صورت میں اتفاق سے شاہ عالم کی مشابہت ہے۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد نیلم نے کہا "یہ کام کیسے ہو گا ناصر! میں تو سوچ سوچ کے ریشاں ہو جاتی ہوں۔ یہاں جہنم نے خوب ڈھول پیٹا ہے کہ شاہ عالم واپس پاکستان آ رہا ہے۔ وہ اپنی سیاسی جماعت کو پھر فعال کرے گا۔ انٹیلیجنس لڑے گا اور استیجی میں اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کے ساتھ مل کے حکومت میں شامل ہو جائے گا۔ یہاں تمہارے برائے وفادار ساتھی اور مطلب پرست دوست دونوں ہی تمہاری آمد کے خطرہ ہیں۔"

"مگر یہاں تو مجھے رہیو کرنے کوئی نہیں آیا؟"

"تم لاہور پہنچو گے تو پاگل ہو جاؤ گے اب تمہارے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔ لیکن ناصر کے رہنا۔ پہلے کے مقابلے میں اب تمہارے دشمن بہت ہیں اور زیادہ خطرناک بھی ہیں۔"

میں نے کہا "چند دن میں شاہ عالم کا کھیل ختم ہو جائے گا۔"

"لیکن کیسے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "تم جان کے کیا کرو گی۔ تم جاؤ لندن یعنی سے ملو۔ دیکھو وہ کتنی خوش ہے گھر بسا کے۔ وہ کتنی احسان مند ہے تمہاری کہ تم نے اسے ایک نئے نام کے ساتھ نئی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے۔"

"سب کتنے کی بات ہے۔ مواقع اس کو قدرت نے فراہم کیے۔"

"لیکن قدرت نے وسیلہ تمہیں بتایا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بار تم نے میری دھمکی کی تھی۔"

وہ ہنسنے لگی "کیسے الفاظ استعمال کرتے ہو تم۔ میں کیا دھمکی کروں گی کسی کی۔ ہاں ایک اخلاقی ذمے داری اٹھی تھی مجھ پر۔ خدا نے مجھے نبھانے کی قوتیں دی۔"

میں نے کہا "یہ حقیقت ہے نیلم کہ ایک اس وقت جب شاہو سے جدائی کے غم نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ اور میں تمہاری گاڑی سے نکل آیا تھا اس وقت تم نے مجھے سارا نہ دیا ہوتا تو نہ جانے میرا انجام کیا ہوتا۔ پھر دوسرا موقع اس وقت آیا جب شاہو پیش کے لیے مجھے جھوٹی سمجھی تم نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ اور دس سال بعد تم نے سونی کو وہی تحفظ فراہم کیا۔"

وہ بولی "جھوٹو رانی باتیں ناصر! جو ہونا تھا ہو گیا۔"

میں نے کہا "لیکن تم نے پھر ایک جیم کو گود لے لیا ہے۔"

"میں نے؟"

"ہاں! ایک ہی دوست تھا میرا وہ بھی جیمیں لیا تم نے۔"

وہ مسکرانے لگی "بھئی چھینا کچھ نہیں ہے۔ تمہارا دوست سیکریٹری تو آج بنا ہے میرا لیکن اسے میں جانتی تو دس سال سے تھی۔ جب سے تمہیں جانتی ہوں بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اسے۔"

"یہ کوئی پاگل کتا ہے یا جن بھوت ہے؟"

ریشاں سوئے سوئے اٹھ بیٹھا "یہ ٹھیک ہے بارے۔ جنگلی جانور ہی تو ہیں ہم انسانوں میں رہنا تب نصیب ہوا۔ نہ تیز نہ تہذیب۔ نیلم نے جب مجھ سے کہا کہ وہ خرابی عبدالرحمان بھاگ گیا ہے نہیں کر کے اور تم میرے سیکریٹری بن جاؤ تو قسم اللہ کی میں سمجھا نیلم مذاق کر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔ ہم نے اسکول کالج کی شکل نہیں دیکھی۔ بس یتیم خانے میں پڑھ لیا تھا ساتویں تک۔ روپیٹ کے بعد میں میٹرک کیا۔ ہم یہ کام کیسے کر سکتے ہیں؟"

"میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ یہ کام کر سکتا ہے۔ دراصل تمہارے دوست کی دس عادتیں مگر جی ہوئی ہیں تو دس ایسی خوبیاں بھی ہیں اس کی فطرت میں جو انمول ہیں۔ اس کی ٹیک نیچی اس کا خلوص ایمانداری۔"

"میری اس سے دوستی ہے سب تو نہیں۔"

ریشاں شرمائے لگا "کام تو پیارے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ جب نیلم نے اپنے معاملات ہمارے سپرد کر دیے تو ہم نے بھی کہا کہ بس اب آپ کو کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اندر باہر کے سب کام میں نے سنبھال لیے۔ مگر میں ایک باتو خالہ ہیں۔ نوکر سارے ان کے قابو میں نہیں تھے۔ میں نے ایک ایک کا دماغ درست کر دیا۔ سب ختم ہوئی بھول گئے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے ریشاں نے میرے معاملات کی ذمے داری قبول کی ہے میں بہت پرسکون ہو گئی ہوں۔ آخر کیا فرق ہے تم میں اور ریشاں میں۔ دونوں کی ایک ہی نیچر ہے۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے" میں نے کہا۔

وہ مسکراتی "میں نے کہا کہ جب تم نے اندر باہر کے کام سنبھال لیے تو اب میں تمہیں سنبھالوں گی۔ تمہاری ساری

بڑی عادتیں چھڑا دوں گی۔ تیز تہذیب سب سکھا دوں گی۔ تم نے فرق محسوس کیا۔ کتنے ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا ہے ریشاں۔"

میں نے کہا "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں نے سنا ہے یہ تمہارے ساتھ ہی رہنے لگا ہے۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا "میرے گھر میں تم بھی رہے ہو۔ بھئی بھی رہی ہے اور بھی بہت لوگ ہیں۔ مجھے جگہ کی کمی تو نہیں اور پھر میں پر میں بہت زیادہ اکتھار کرتے لگی ہوں۔ عبدالرحمان صرف ایک سیکریٹری تھا۔"

"اور ریشاں کیا ہے؟"

"ریشاں دوست ہے رانا ساتھی ہے۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ کیا کہیں گے" میں نے کہا۔

ریشاں بولا "یہ بات میں نے بھی کہی تھی۔"

"ایسی بےوقوفی کی بات کی مجھے تم سے امید نہیں تھی۔ لوگ کیا نہیں کہتے میرے بارے میں۔ کوئی بھی ٹکلی رسالہ یا اخبار اٹھا کے دیکھ لو کہ آئے دن مجھ سے بہت کچھ منسوب کر لیا جاتا ہے۔ ان دو ٹکے والے اخباروں کے فلمی رپورٹروں کو چھوڑو ان معززین عالی نسب شرقا و دروی آئی پی قسم کے لوگوں نے میرے بارے میں کیسی کیسی داستانیں مشہور کی ہیں جو میرے آگے پیچھے کتوں کی طرح ڈھمکاتے آتے تھے اور میں انہیں دھکار دیتی تھی۔ میرے اپنے ہم پیش ساتھیوں نے پیچھے پیچھے کیا بکواس نہیں کی۔ اصل جرم میرا صرف یہ ہے کہ میں ایک ٹریس ہوں۔ طے شدہ طور پر میں شریف اور پاکباز نہیں ہو سکتی۔ میں بے حیا اور بد کردار ہوں۔ بیسوا ہوں۔ صرف دولت کے رشتے پر یقین رکھنے والی۔"

میں نے کہا "یہی باتیں میرے سامنے مت کرو۔"

"کیوں؟ تم نے ہی پوچھا تھا کہ دنیا کیا کہے گی۔ میں بتا رہی ہوں کہ دنیا کی زبان نے مجھے کبھی اچھا نہیں کہا۔ تم میرے ساتھ تھے تب بھی بہت کچھ کہا اور لکھا گیا۔ آج ریشاں میرے ساتھ ہے تو پھر داؤلا ہے مگر میں پروا نہیں کرتی۔ جس کا جو چاہے لکھے میں سمجھتی ہوں کتنے بھونک رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تمہاری جتنی عزت کرتا ہوں نیلم، کسی اور کی نہیں کرتا۔ یقین مانو مجھے تمہارے فیصلے سے دلی خوشی ہوئی۔ اگر ریشاں نے تمہارے معاملات اور تم نے ریشاں کے معاملات سنبھالنے کا تہیہ کر لیا ہے تو اس سے

اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری نہیں ہو سکتی۔ لیکن۔۔۔

"لیکن کیا؟"

"تم اسے اپنے ساتھ لندن لے جا رہی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ دن کے لیے اپنا سیکرٹری مجھے دے دو۔ مجھے اس کی اشد ضرورت ہے۔"

رہیں بگڑ گیا۔ "اے کیسے دے جاؤ۔ میں کوئی استعمال کی چیز ہوں۔ پاؤں کی جوتی ہوں جو سب کے پیروں میں فٹ آجائے۔"

"میں نے کہا نا مجھے ضرورت ہے تیری۔"

"بھلا میں گئی تیری ضرورت سالے۔ مجھے بھی نیلم کے ساتھ ولایت جانے کی بڑی ضرورت ہے۔"

"ولایت کا کیا ہے تو جب چاہے جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔ میں نیلم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اور اکیلا رہ بھی نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے۔ تو انتظار کر لے دو چار دن۔"

اس کا جو مطلب تھا وہ میں نے سمجھ لیا۔ خود نیلم اس کی بات پر کچھ زور ہوئی تھی مگر حقیقت نے از خود اپنا وجود تسلیم کر لیا تھا۔ اب مجھے ان کی زبان سے سننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں کتنا آگے نکل چکے ہیں۔ ابھی کوئی موقع نہیں تھا کہ میں واضح الفاظ میں ان کا اعتراف جرم سنوں اور ان سے پوچھوں کہ کون سی منزل پر ہے۔ عشق بلاخیز کا کاروان سخت جاں۔

میں نے کہا "تمہارا پروگرام کتنے دن کا ہے؟"

نیلم نے کہا "جی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس اب وہی فلمیں رہ گئی ہیں جو زیرِ تکمیل ہیں۔ میں نئی فلمیں سامنے نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے علاقے کے عذر پر چند دن کے لیے اپنی ساری ڈشٹ منسوخ کرادی تھیں۔ اس دفعہ خال یہ تھا کہ کچھ آرام کروں گی، کچھ تفریح ہوگی۔ جب کسی فلم پونٹ کے ساتھ جانا ہوتا ہے تو تفریح یا آرام کا کوئی وقت نہیں ملتا۔

میں دوپہر شام پر دوپہر سوچتا ہوں کہ دن رات کے چوبیس گھنٹے کام کر کے شوٹنگ مکمل کر لی جائے۔ اس پر ایک ایک دن کا خرچہ بھاری ہوتا ہے۔"

"یا نیلم! ناصر سے مت چھوڑو ورنہ یہ مارے گا بعد میں۔"

میں چونکا "کیا چھار ہے ہو تم لوگ مجھ سے آخر؟ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں آنکھوں کا اندھا ہوں کہ کچھ دیکھ نہیں سکتا یا عقل کا اندھا ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کیا تم دونوں

نے شادی کر لی ہے؟ ہنسی مون منانے جا رہے ہو لندن؟"

نیلم کا رنگ لال ہو گیا "نہیں بھی ناصر! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"رہیں تم ہی بتاؤ نا۔ نیلم نے بڑی مشکل سے کہا۔

رہیں مجھے دیکھتا رہا "تیرا شک بے بنیاد نہیں۔"

"بے بنیاد۔ اے جاہل کی اولاد بے بنیاد۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "اے ہاں وہی۔ سالی زبان پھسل جاتی ہے۔ ہم لندن اسی لیے جا رہے ہیں شادی کرنے۔"

میں اچھل پڑا "تم دونوں شادی کرنے لندن جا رہے ہو اور اتنی دیر سے بگو اس کر رہے ہو۔ ابھی تک مجھے بتایا نہیں تھا کہ نہیں غیبت۔ تیری تو ایسی کی تھی! میں نے رہیں کو ایک دم اٹھالیا۔

وہ شور مچانے لگا "اے بات سن۔ قسم اللہ کی! افس۔ اے کیا مارا زائے گا نیلم کے دو لہو کو سوار کے بچے۔ نیلم تم دلہن ہو سمجھاؤ اس بھوت کو۔ یا قسم ہے مجھے ہم دونوں کے سواگ کی۔"

میں نے اسے اوپر ہی اور دو پکڑ دیے اور پھر بڑے پردے مارا۔ وہ ہنسنے ہنسنے مجھے گالیاں دیتا رہا "یا بڑا کمینہ ہے تو؟ ہم کیا تجھ سے چھپاتے۔"

نیلم کا چہرہ اب گلزار ہو گیا تھا مگر میرے ہاتھوں رہیں کی درگت مٹی دیکھ کے وہ گھبرا گئی "ناصر۔ بات تو سنو! یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اسے گلے لگا کے محبت سے پیشانی پر چوم لیا۔

"اب کیا رہ گیا ہے سننے کو۔ خدا تمہیں مبارک کرے خدا ہم سب کو مبارک کرے۔"

نیلم کی آنکھوں میں فرط جذبات سے آنسو آگئے وہ میرے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی "تم جانتے ہو۔ میں کتنی اکیلی تھی۔ لاکھوں چاہنے والوں کی بھیڑ سے کتنی خوف زدہ تھی۔ کیونکہ وہ سب بھوکے بھڑے تھے ان میں سے ایک بھی مجھ سے ٹھٹھکی نہیں تھا۔ میں خلوص اور محبت کی ترسی ہوئی بڑی مظلوم عورت ہوں ناصر۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کے آنسو پونچھے "مجھے اندازہ ہے نیلم۔ بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں میں تمہارے دکھ کو۔ ہم سب ایک جیسے مظلوم، ایک جیسے تنہا اور بیمار کے پیاسے لوگ ہیں۔ ہمارا درد مشترک ہے۔"

"میں نے تمہیں بھی بتا دیا تھا۔ رہیں سے بھی کچھ نہیں

چھپا کہ زندگی میں دوبار ایسا ہوا۔ دو مرد ایسے تھے جن کو میں اپنا سنی تھی۔ جو میرے مثالی شوہر کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ جو میری حفاظت کر سکتے تھے اور مجھے اپنی زندگی میں وہ مقام دے سکتے تھے جس کی میں مستحاشی تھی۔ لیکن ان دونوں کے نزدیک میں ان صفات سے محروم تھی جو وہ اپنی مثالی زندگی کے تصور میں دیکھتے تھے۔ وہ میرا آئینہ دل ضرور بنے مگر میں ان کا آئینہ دل نہیں تھی۔ پھر جب میرا سیکرٹری عبد الرحمن بھی ایک ایکسٹرا کے پکر میں مجھے دھوکا دے کر چلا گیا تو میں بہت مایوس ہوئی۔"

میں نے کہا "کیا ان دو مردوں میں سے ایک وہ بھی تھا؟"

"ہاں۔ اسے میں نے کئی سال بہت قریب سے دیکھا۔ بے شک اس کی عمر مجھ سے کافی زیادہ تھی مگر وہ اچھا آدمی تھا۔ میں اس کی بہت قدر کرتی تھی۔ اس نے مجھے میرے قریب ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا اور مجھے وہ عزت دی جو میں چاہتی تھی لیکن اس کا ظاہر اس کے باطن سے بہت مختلف تھا۔ وہ موخرے کی دوا جی سوچ کا قیدی تھا۔ میرے ایما پر بانو خالد نے اس سے پوچھا تھا کہ میان آخر اب تک شادی کیوں نہیں کی تم نے تو اس نے پہلے وہی کہا کہ "مکیا کروں خالد" کوئی اچھی لڑکی ہی نہیں ملی "بانو خالد نے بات کا رخ تھوڑا سا بدلتی طرف موڑا کہ "میاں تمہیں لڑکیوں کی کیا کی۔"

تھوڑے آس پاس لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔ تم سب کو جانتے بھی ہو۔" اس پر وہ بھڑک گیا کہ جانتا ہوں خالد اسی لیے تو ان لڑکیوں کو ملانے والی بے کردار عورتوں کو اس قاتل نہیں سمجھتے۔ کون کتنی فرشتہ ہے اور ظاہر کے پردے میں نظر آنے والی شرافت کے پیچھے کس کے چہرے پر کتنی کالک ہے یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے "بانو خالد نے سمجھنا کہا کہ "بھئی! کون سی نظر کو دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ اب اپنی نیلم کی مثال ہی لے لو۔ میں تو کتنی ہوں بڑے خاندانی گھروں میں مجھے ایسی برصفت لڑکی نظر نہیں آتی "تو کہنے لگا کہ "وہ تو تمہاری بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں میں۔ نیلم کے مزاج اطوار اور انداز کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن خالد ایک تو وہ مجھے اس قاتل کہاں سمجھیں گی۔ ان کے چاہنے والے لاکھ ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک لوگ ہیں جو صورت نظر مرتے اور مقام میں مجھ سے ہزار گنا بہتر ہیں۔ دوسرے تو عمر میں مجھ سے بہت کم ہیں۔ مجھے چاہیے کوئی چالیس سال کا سردار اور عام سی شریف عورت۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی اور واجبی حد تک خوبصورت۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے خالد کہ میں فلمی دنیا کی کسی عورت کو یا وہ کے گھر نہیں

لے جا سکتا خواہ وہ کتنی ہی پارسا اور دنیا جہان کی خوبیوں سے مرصع ہو۔ آخر میری بھی تو کوئی عزت ہے معاشرے میں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں ایک ایکسٹریس نے پھانس لیا بالآخر۔ نو سوچو یہ کھانے والی عورت نے حج نہ کیا نکاح نہ کیا۔"

میں نے غصے میں عبد الرحمن کو گالیاں دیں "حرام زادہ۔ عزت دار کا لطف۔ ایسا ہی شریف زادہ تھا تو ایک ایکسٹرا کے پکر میں کیوں پڑا۔ نہیں کیا ہوا مال اس پر کیوں لٹا یا؟"

"جھوڑا ناصر۔ ایسے ہی مرد ہیں اس معاشرے میں۔ دو غلط میں نے اتنے قریب سے دیکھا اسے اور پھر مجھ اس کی سوچ کو نہ سمجھ سکی۔ اس کے جواب نے مجھے خود اپنی نظر میں بے آبرو کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں جب وہ ایک بہت چالاک اور شکاری عورت کے جال میں پھنسا اور اس نے میرے پانچ لاکھ اس پر اڑائے تو جہاں مجھے دکھ ہوا وہیں کچھ سکون بھی ملا۔ اس خیال سے کہ اچھا ہوا "میں اس کی قید شریف سے بچ گئی۔ ورنہ وہ نہ جانے میرا کیا مشترکہ میرے سامنے تو وہ بچا جاتا تھا اور کتنا بھی تھا کہ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر اس کے جواب نے میری عزت نفس کو سب سے زیادہ مجروح کیا تھا۔ خیر اللہ جانے میری کون سی نیکی میرے کام آگئی۔"

"تم ایک کی بات کرتی ہو۔ بہت نیکیاں ہیں تمہارے نامہ اعمال میں نیلم! میں نے کہا "اور یہ جو فیصلہ کیا ہے نامہ لے یہ سب سے بڑی نیکی ہے مگر یہ لندن میں شادی کرنے کا فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"اس کی روایت تو مجھ نے ڈالی ہے "رہیں بولا۔

"یعنی نے کچھ بھی پلان نہیں کیا تھا۔ یہ بس ایک اتفاق تھا کہ نیلم کا پونٹ وہاں شوٹنگ کے لیے آیا اور اس کا پی آر او تھا عاقل۔ اس کی بیٹی سے ملاقات ہی شادی کا بہانہ بن گئی۔ اس کے علاوہ یعنی پاکستان آ کے شادی نہیں کر سکتی تھی ورنہ اس کی شادی ایسے نہ ہوتی۔ بڑی دھوم دھام سے ہوتی۔"

"دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور میں چاہتی بھی نہیں۔"

"اچھا۔ اب یہ فرما رہی ہیں آپ کیونکہ آپ خود چوری چھپے شادی کر رہی ہیں۔ ورنہ تم نے ہی سب سے زیادہ احتجاج کیا تھا کہ کیا شادی ایسے ہوتی ہے۔ یعنی کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں تم۔"

نیلیم لا جواب ہو گئی "تم بھی تو کچھ بولنا چاہتے ہو۔"
رئیس سرکھانے لگا "دو بار۔ دراصل معاملہ کچھ ایسا
ہے کہ ہم جینی کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اب ہم
نے سوچا کہ چلو انہیں اپنی شادی میں شریک کر لیں۔ شادی
ان کے گھر ہو۔"

"اور وہ سب جو یہاں بیٹھے ہیں، ہم جیسے گدھے؟"
"تو چل ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "ناگل ہوا ہے۔ میں جان بچا کے فرار ہوا
ہوں لندن سے اور تو مجھے واپس لے جانا چاہتا ہے۔"

"بات یہ ہے یا رک کہ ہم شادی کی خبر لندن سے جاری
کریں گے اور پھر آئیں گے اس وقت جب سارا ہنگامہ ختم
ہو جائے گا۔ یہاں آگے ایک دعوت دیں گے جس میں قلم
ایڈیٹری کے خاص خاص لوگوں کو اور سب صحافیوں کو بلا لیں
گے۔"

میں نے کہا "لیکن یا رک یہ شادی کچھ دن کے لیے ملتوی تو
کی جاسکتی ہے۔ تاہم ہفتہ دس دن بعد بھی ہو سکتی ہے۔"

نیلیم نے کہا "میں نے پروڈیوسرز کو پندرہ دن بعد کی ڈیٹس
دی تھیں۔"

"اب دونوں فیصلے کر لے ہیں تم نے۔ فلمی دنیا چھوڑنے
کا اور اپنا گھر بنانے کا تو کوئی مارو پروڈیوسرز کو۔ ان کی کیوں
فکر کرتی ہو۔ اپنے کیریئر کے دوران میں تم نے ہمیشہ سب سے
تعاون کیا اور کسی کو کبھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ اب
اگر پندرہ دن کے بجائے تم ایک مہینے کے لیے غیر حاضر
ہو جاؤ گی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ فلمیں تو انہیں
بہر حال پوری کرانی ہیں تم سے۔"

"کیا ایک ہفتہ بعد تو آجائے گا؟" رئیس نے سوچ کے
کہا۔
"وعدہ تو کر نہیں سکتا مگر ہفتہ دس دن میں شاہ عالم کا کام
تمام ہو جائے گا تو تمہاری شادی میں شریک ہو گا ناصر عظیم۔
اور میں اپنے ساتھ لاؤں گا قمر کو، چندا کو اور ڈاکٹر کمال کو۔"
"اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" رئیس نے کہا "میں
رک جاتا ہوں۔"

نیلیم نے کہا "میں اکیلی جا کے کیا کروں گی۔"
میں نے کہا "دیکھو نیلیم ایک تو ہوتی ہے قریب نکاح۔
اور ایک ہوتی ہے شادی۔ اگر تو تمہیں ڈر ہے کہ پندرہ دن
میں رئیس کا داغ نہ پھر جائے۔ یہ اپنا ارادہ بدل دے یا
کسی اور کے پکر میں نہ پڑ جائے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں
کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔"

نیلیم ہنسنے لگی "کیسی باتیں کرتے ہو۔"
میں نے کہا "تمہارا نکاح تو میں ابھی ایک گھنٹے میں
پڑھا سکتا ہوں۔ رہی شادی یعنی رخصتی وغیرہ تو یہ پروگرام
پندرہ دن بعد یہاں بھی ہو سکتا ہے اور لندن میں بھی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ کیوں نہ میں بھی پندرہ دن
کے لیے رک کے اپنی شوٹنگ ڈیٹس اور شیڈول کے مطابق
جاری رکھوں۔ پندرہ دن بعد ہم سب ایک ساتھ چلے جائیں
نہیں یعنی کو بڑی مایوسی ہوگی۔ کل وہ ہمارا بہت انتظار کرے
گی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ نیلیم باجی جلدی سے آجائے میں
بھیا کے جانے کے بعد بہت اکیلا پن محسوس کر رہی ہوں۔"

"نیلیم بے وقوفی کی بات ہے۔ عاقل کے ہوتے اکیلا
کیوں محسوس کر رہی ہے؟" رئیس بولا۔
میں نے کہا "یار یہ احساس بھی عجیب چیز ہے۔ آدمی
محفل میں تنہا ہوتا ہے۔ مجھے شرمیں آجیں اور اکیلا محسوس
کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اپنے شر سے اپنے ملک سے اور
اپنے سے دور گئی ہے۔ کچھ دن بعد عادی ہو جائے گی لیکن تم
جاؤ۔"

"میں جاؤں؟" اس نے جیسے خود ہیے اور پھر رئیس سے
سوال کیا۔
رئیس نے حکم صادر فرمایا "ہاں تم جاؤ۔ اپنا پروگرام
مت بدلو۔ اب اس سالے کو ضرورت ہے ہماری اور ہم
کہیں کہ ہماری تو شادی ہے اس لیے بھاڑ میں جائے تمہاری
ضرورت۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔"

لیکن نیلیم اپنے ارادے پر قائم رہی "میں جینی سے فون
پر بات کر کے اسے سمجھا دیتی ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ ہی
آئیں گے۔"
"کیا اسے معلوم تھا کہ تم دونوں ایک ساتھ کیوں آ رہے
ہو؟"

نیلیم مسکرائی "نہیں۔ ہم اسے سررازا دیتا چاہتے
تھے۔"
ہم نے دوسرے کھانا ایک ساتھ کھایا اور اس دوران میں
اپنی ہی باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں جن کا تعلق جینی اور عاقل
کے مستقبل سے تھا۔ فلمی دنیا سے علیحدگی کے بعد نیلیم کے
روز و شب کی مصروفیات کی باتیں۔ کمال کے اسپتال، قمر اور
چندیا کی باتیں اور ناصر عظیم کے پروگرام کی باتیں جن کی
تحقیق اس لیے ممکن نہ ہوئی تھی کہ درمیان میں شاہ عالم اپنا
کوئی وجود نہ رکھنے کے بلوچہ جو حال تھا۔

کھانے کے بعد رئیس نے جمائی لی "یار اپن کو آدمی
ہے خند۔"

میں نے کہا "خبردار جو سونے کی کوشش کی۔ فرج میں
سے نکال کے سارا ٹھنڈا پانی اٹھیل دوں گا سر۔"
نیلیم نے بھی کہا "سونے کے لیے وقت کہاں ہے
رئیس۔ تم جا کے ابھی فوراً ریزرویشن کیشل کرواؤ۔"

میں نے کہا "ہاں" اور میری فلائٹ ہے شام چھ بجے۔
اگر اس پر تجھے بھی سیٹ مل جائے تو اچھا ہے ساتھ ہی ٹیلیفون
کے۔"

رئیس نے برا سامنہ بنایا "میں اکیلا جاؤں، تم بھی چلو
ساتھ۔"

نیلیم نے کہا "پندرہ دن بعد کی فلائٹ سے تمہیں بھی تو
جنس بک کرانی ہیں لندن کے لیے۔"

میں شش و پنج میں پڑ گیا "کرائی تو ہیں مگر۔"
"مگر کیا۔ تمہارے وعدے پر ہم نے اپنا پروگرام بدلا
ہے۔" نیلیم بولی۔

"میں ان سے پوچھ تو لوں۔ قمر سے چندا سے اور ڈاکٹر
کمال سے۔"

"ابھی پندرہ دن ہیں۔ ہم انہیں راضی کر لیں گے۔"
رئیس بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ سب ایک ساتھ اسپتال چھوڑ کے جانے
پر راضی نہ ہوں۔ کمال کو میں جانتا ہوں۔ وہ کہے گا کہ یا تو
شادی رکھو پاکستان میں۔ عاقل اور جینی کو بلاؤ۔ ورنہ چندا اور
قمر کو نہ جاؤ۔ اسپتال کو دیکھنے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔"

نیلیم نے کہا "چلو تم شیش بک کرالو۔ کمال نہ مانا تو ہم
ایک سیٹ کیشل کروا دیں گے آج سے جمعہ دو ہفتے بعد پھر
جمعہ ہوگا۔ ہم سنجی کوئی فلائٹ لے سکتے ہیں۔"

مجھے ان کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہم
سرپر کے بعد پی آئی اے کے بنگل آفس گئے جو شیرن کے
قریب ہی تھا۔ میری وجہ سے نیلیم اور رئیس کا پروگرام بھی
توڑ پھوٹ گیا تھا لیکن انہیں واپس لاہور جانے کے لیے اسی
فلائٹ پر جگہ نہ مل سکی جس سے میں جا رہا تھا۔ انہوں نے
ایک گاڑی کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس میں ہم سب پانچ
بیک سیٹ پر پینچ میری فلائٹ چھ بجے تھی۔

سازش سات بجے جہاز لاہور پہنچا۔ آٹھ بجے تک میں
باہر کھڑا تھا۔ خلاف توقع وہاں کسی گاڑی کی صفائی کو موجود
نہا کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم کی سیاسی
اہمیت کا گراف بہت نیچے آ گیا تھا۔ اب اس کی واپسی کی خبر
آئی تو غم اور ہوشیاری کے بیچ بیٹھے ایک کے نائب صدر بھی

اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میری نظرس ابھی چوہوں کے
درمیان جھپک جھپک کر رہی تھیں۔ اسے تو سب معلوم تھا
بلکہ اسی نے شاہ عالم کی واپسی کی خبر سب کو دی ہوگی۔ وہ کیوں
نہیں آئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آٹھ بجے سے ختم کے اخبار
کے دفتر میں پہلی کاپی چھوڑنے کی بجائے شروع ہو جاتی تھی
لیکن اس کے لیے ایک دو گھنٹے کا ٹائمنگ نا ممکن کام نہیں تھا۔
کئی بار اس نے آخری کاپی کی ڈسے داری بھی اپنے معاونین
پر چھوڑ دی تھی۔ اور اب تو خود ابو بکر آزاد صاحب صحت مند
ہو کے مدیر اعلیٰ کی کرسی پر واپس آ بیٹھے تھے۔

میں لاہور اور دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے
میرے گلے میں اپنے بازو حاصل کر دیے۔ میں چونک کے پلٹا
تو مجھے جھپک جھپک چہرہ اپنے مقابل نظر آیا۔

اس کے وجود کی حرارت اور ریشمی لمس کو میں نے اپنے
جسم میں برقی رو کی طرح سنسنی بن کے اتارتا محسوس کیا اور
اس کے قرب کی جانی بچانی خوشبو نشے کی طرح میرے حواس پر
حملہ آور ہوئی۔

میں نے گھبرا کے خود کو اس سے الگ کیا "جھپک۔ یہ
کیا ہے ہو گی ہے۔"

وہ ہنسی "دل والے اس کو محبت کا نام دیتے ہیں۔"
"تمہیں احساس نہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہیں؟"

وہ بولی "لوگوں کو کیا معلوم ہمارے درمیان کیا رشتہ
ہے؟"

"چھوڑے ہوئے میاں بیوی بھی سرعام ایسے نہیں
ملتے۔"

"ہم بھائی تو مل سکتے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے
میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لا حول ولا قوت۔ باہر چلو۔"

"بس یہی ہے تمہارا کل سامان۔ پورز" اس نے آواز
دی "یہ زالی لے کے چلو۔"

قریب کھڑے ہو کے تماشا دیکھنے والے پورز نے زالی
مجھ سے لے لی۔ میں نے جھپک کو غور سے دیکھا۔ دو مہینے میں
اس کی صحت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ وہ دلی نظر آرہی تھی اور
اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہو رہے تھے۔
زیادہ تبدیلی اس کے گیٹ اپ میں آئی تھی۔ اس نے پھر اپنا
پرانا انداز اختیار کر لیا تھا۔ میرے ساتھ رہ کے وہ شرفانہ
طرے سے شلوار کھینچ پینے لگی تھی اور عمل نہ ہونے کے
باوجود دوپٹے کو بھی شانے پر رکھنے لگی تھی مگر اس وقت وہ
جینز پن کے آئی تھی۔ جینز کے اوپر لمبا سیاہ مروانہ

اسٹائل کا کرتہ تھا جس کا اوپر والا بٹن وہ ہمیشہ ایسے کھلا رکھتی تھی کہ یہ بھی بے پروائی کی ایک ادا بن جائے مگر پرشوق لگا ہوں کو اس پر کھلے اس کے شانے پر وہی بیگ تھا جس میں وہ اپنا صحافت کا سامان رکھتی تھی۔ کیمرا، نیپ ریکارڈر، نوٹ بک اور ذاتی استعمال کی کچھ اشیاء۔ ڈائری، لپ اسٹک اور چیو گم وغیرہ۔ نازک اور خوبصورت زنانہ سینڈلوں کے بجائے اس نے جو گرز چمن رکھے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“
میں نے کہا ”تمہاری صحت یہ بتاتی ہے کہ تم بہت محنت کر رہی ہو یا بہت جاگ رہی ہو۔“
وہ مسکرائی ”دونوں باتیں ہیں۔“
”تم بہت کمزور لگ رہی ہو مجھے۔“
”تم تو بڑے شہ زور بن کے لوٹے ہو“ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔

میں نے کہا ”تم نے میرے کارناموں کو خوب پہنچی دی۔“
”میں نے تمہارے جرائم کو کارنامہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔ لوگ اب بہت سیانے ہو گئے ہیں۔ اس پہنچی سے الٹا نقصان ہی ہوا۔“
پورٹر زک گیا ”آپ کی گاڑی سے سیرا نکلی۔“
میں نے جینم کی طرف دیکھا ”تم اپنی کھٹار لالائی ہو؟“
وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے لگی ”ہاں“ اور پارکنگ ایریا کی طرف چلنے لگی ”تمہاری پارٹی اب وہ نہیں رہی۔“
میں نے کہا ”ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ کوئی ورکر یا عہدے دار مجھے ریسو کرنے نہیں آیا۔“

”حالانکہ کچھ لوگوں کو میں نے ذاتی طور پر بتا دیا تھا۔ آج صبح کے اخبار میں بڑی نمایاں جگہ پر ایک باکس بھی لگا دیا تھا۔ لیکن لوگ شاید پی جے ایف کا نام بھول گئے ہیں اور شاہ عالم کو بھی۔“

”اس کا مطلب ہے آنے والے الیکشن میں پارٹی کو ایک بھی سیٹ نہیں ملے گی۔ میں نے تو شمس اور قریبی دونوں سے وعدہ کیا تھا۔“

”ان سے زیادہ موقع شناس کوئی نہیں ہے ان دونوں نے سرکاری سرپرستی رکھنے والی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ دونوں لگتے پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔“
”اور ملک رب نواز؟“

”وہ اپنے آبائی حلقے سے اپنے بیٹے کو کھڑا کر رہا ہے۔ دلواؤ کو“ ان کی سیٹ کچی ہے۔ خود رب نواز شاید پیپلز پارٹی

سے ٹکٹ لینا چاہتا ہے۔“
”ویری گڈ۔ ایک سرکاری پارٹی میں دوسرا حزب اختلاف میں۔ خوب انداز سیاست ہے یہاں بھی۔“
وہ ایک بالکل نئی چمکتی دھنکی مارگلہ سیدان کی ڈکی کھولنے لگی ”رکھو اس میں سامان“ اس نے پورٹر سے کہا۔
میں نے کہا ”یہ گاڑی۔“

”یہ میرا کھٹار ہے“ اس نے ہنس کے کہا۔
”یہ تو تم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔“ میں نے تعریفی نظروں سے گاڑی کو دیکھا۔

”یہ تعریف اور خوشامد سے موم نہیں ہوتی۔ اس کے جملہ حقوق ملکیت میرے نام پر ہیں، تو بیٹھو۔“
میں نے کہا ”تمہاری وہ حق حلال کی کمائی والی ایف ایکس کہاں لگی؟“
”لے گیا اسے بھی کوئی غریب۔“ اس نے گاڑی کو بڑی نزاکت سے نکالا۔

”یعنی تم اب امیر ہو گئی ہو؟“
”امیر ہونے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں۔“ اس نے گاڑی کو ان پورٹ سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔
”کتنے میں خریدی ہے یہ نئی گاڑی؟“
”میں نے؟“ میں نے نہیں خریدی، مجھے کسی نے تحفے میں دی ہے۔“ وہ ہنسی۔

”کون ہے وہ مرہبان؟“ میں نے طنز سے کہا۔
”یہ نہیں پوچھو گے کہ کیوں ہے مرہبان۔“
میں نے کہا ”تم پر کسی کے مرہبان ہونے کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں دیکھ کے کسی کی عقل گھاس چرنے لگی تھی اور تم نے اسے گھاس ڈال دی۔“

”اور دوسری وجہ؟“
”تمہارے مرتبے کا کوئی صحابی اگر بلیک میلر بن جائے تو کار کیا چیز ہے کارخانہ حاصل کر سکتا ہے۔“

وہ ہنسی ”پہلی وجہ پر تمہیں حسد محسوس نہیں ہوتا۔“
میں نے کہا ”نہ تم ملے گی ہونہ میں تمہارا مجھوں۔ نہ تم میری برابری ہو کہ میں اجارہ داری کا حق جتاؤں۔“
”دوئیے تو وہ زمیندار ہے لیکن اس نے فلسا زلی کے میدان میں قدم رکھ کے ایک قلم بنائی تھی۔ شیرداچر۔ تم تو قلاب ہوئی تھی مگر فلسا زکو مزہ آگیا۔ ہیروئن اور سامان ہیروئن کے علاوہ بھی کچھ اچھی صورتیں دیکھنے کو ملیں۔“

”صرف دیکھنے کو؟“
”نہیں۔ مری کاغان میں لوکیشن پر سیرائیڈ تقریباً

ہوا۔ دوسری قلم کے لیڈرول کے لیے مجھے آنفری ہے کیا خیال ہے؟“
”خیال کیا؟ ایک کوٹھی لوڈیفنس میں اور ایک مری منٹ کرلو۔ اپنا ٹاکہ دیکھو“ میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کی۔
”انداز سے تم جل بھی گے کوئلہ ہو گے ہو۔ دھواں اٹھنا صاف محسوس ہو رہا ہے مجھے“ وہ ہنسی۔

میں نے کہا ”فحش ہے چلنے والے پر۔ تم جیسی نہ جانے کتنی ہیں جو اپنے حسن و شباب کے بلیکنک چیک دن رات کیس کر رہی ہیں۔ تم کو اچھا چانس مل رہا ہے۔ کیا رکھا ہے اس صحافت کے خوار کرنے والے پیشے میں۔ مجھے یقین ہے کہ نظروں میں تم قلم کی جگہ لے لو گی۔“

”میں نے سنا ہے وہ فلمی دنیا چھوڑ رہی ہے؟“ وہ بولی۔
”ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

”اس نے میری طرف نظرس اٹھائیں“ تمہارے لیے؟“
میں نے کہا ”نہیں۔ خدمت خلق کے لیے۔“
”خدمت خلق تمہارے ساتھ؟“

میں نے کہا ”ہاں۔ یہ کہہ سکتی ہو تم۔ وہ میرے قیمتی فنانس کے پروجیکٹ میں میرے ساتھ ہو گی۔ اسے فنانس بھی کہہ گی۔ یا کمال کے اسپتال میں کام کرے گی۔“
”سبحان اللہ کیا جذبہ ہے اس ٹیکہ دل خاتون کا اور کیا قربانی ہے؟“ وہ طنزیہ اور پر مسخر لہجے میں بولی ”اگلے پچھلے سارے گناہ صاف ہو جائیں گے۔“

میں نے کہا ”ٹنگی کبھی رانگن نہیں جاتی۔ ویسے گنگار ہم سب ہیں اور ہماری بیٹوں کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ چندا لگی ڈیکسی کام کر رہی ہے۔“
”آخر تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے شاہجی؟“
”کس سے چندا ہے؟“

”نہیں۔ ٹیلیم سے دس سال سے تم اور وہ۔“
میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ تھ دی ریکارڈ ہے۔ وہ نہیں سے شادی کر رہی ہے۔“

اس نے بے دھیانی سے میری بات سنی ”چلو اچھا ہوا۔“
”ڈاکٹر نہیں کے دل کی مراد بر آئی۔ تم نے بتایا تھا مجھے کہ وہ قلمی اہلکار تھے کہ تمہارا اس سے مگر تمہارے آگے اس کی دال نہیں لگی۔“

میں نے کہا ”تم کس خیال میں ہو۔ میں شادی کی بات نہیں کر رہا ہوں اور شادی کو مرے ہوئے زمانہ ہو گیا وہ میری بیوی تھی۔“
”دو چوکی“ چھ۔ کون شادی کر رہا ہے اس سے چندا؟“

میں نے کہا ”تم نہیں سے ٹیلیم سداں ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے جینم کو“ میں سوچ رہا تھا وہ نہیں رہا۔ گاڑی توڑا سا لہرائی اور پھر سیدھی چلتے تو ٹھیک ”کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”مجھ خود ٹیلیم سے تصدیق کر لیتا۔ میرے حوالے سے بات کرنا تو وہ صحیح جواب دے گی۔ لیکن یہ کوئی EXCLUSIVE اسٹوری نہیں ہے تمہارے لیے فی الحال یہ خبر میرے اور تمہارے درمیان راز کی طرح رہے گی۔“
وہ کچھ دیر بے چینی سے مجھے دیکھتی رہی ”کیا ٹیلیم پاگل ہو گئی ہے؟“

میں نے کہا ”خاتون۔ جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی۔ تو آدمی پاگل ہی کہلاتا ہے۔ مجھوں کا مطلب معلوم ہے؟ جسے جنون ہو جائے۔“

اس نے برا سامنا بنایا ”جیسے میری بات کی حیثیت کسی دقتا نوی خیال، کسی احمقانہ مفروضے یا بے بنیاد یقین سے زیادہ نہیں“ کب اور کہاں ہو گی یہ شادی۔“

میں نے کہا ”دو ہفتے بعد۔ لندن میں“ ایک مہینے بعد اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا اور اس وقت میرا وعدہ ہے کہ پہلی خبر تم دو گی۔“
”مجھے کوئی شوق نہیں قلمی اسکینڈل میں پڑنے کا“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو آخر؟“
”اپنی ڈیفنس کی کوٹھی میں اور کہاں۔ تم نے دیکھا میں کتنی محنت ہوں۔ تم نے جو مشورہ دیا تھا میں اس پر پہلے ہی عمل کر چکی تھی۔“
میں نے کہا ”میری طرف سے تم جنم میں جاؤ۔ مجھے جانا ہے پی سی۔“

”آل رائٹ“ اس نے کہا اور گاڑی کو ایک دم پرل کاٹنی ٹینٹل کے گیٹ میں موڑ دیا۔

میں پی سی کے لاؤنج سے گزر کے استقبالیہ پر پہنچا تو ایک اسٹنٹ منیجر نے مجھے خوش آمدید کہا ”وٹیکم ٹوی سی مسٹر شاہ عالم“ اور مجھے ایک چابی پکڑادی ”سوئٹ نمبر ٹو از ریڈی قار یو۔“

میں نے حیرانی سے کہا ”یعنی آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟“

اسٹنٹ منیجر نے میرے پیچھے کھڑی ہوئی جینم کو دیکھا ”ہمیں ہی نہیں سر سارے شہر کو معلوم ہے چاندنی لاؤنج میں آپ کی پریس کانفرنس کے سب انتظامات مکمل ہیں۔“

اسانگل کا کہہ تھا حیرت نہی صاحب وہاں پہلے سے موجود تھی کہ۔
جھمکے چابی لے لی اور زینے کے راستے سوئٹ نمبر دو
ن طرف چل پڑا۔ شبنم مکرراتی ہوئی میرے ساتھ چلتی
ری۔ ”سوچ رہے ہو کیا۔“

بزنس کی طرح چلائیں۔ رہنمائی اداروں کے زسٹ آخر کی
لئے بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ کارخرا کا دائرہ محدود نہ رہے
اب کمال کی مثال لو۔ وہ پہلے ایک کلینک چلا رہا تھا، محدود
وسائل کے ساتھ۔ اب وہ ایک اسپتال چلا رہا ہے جہاں پہلے
سال بھر میں ہزاروں لوگ مستفید ہوتے تھے وہاں اب

وہ مجھ سے بڑے رُجوش انداز میں گلے ملا اور مصافحہ کر کے بولا "میں غل تو نہیں ہوا؟"

میں نے سوچ کے کہا ”وہ ذرا میرا کام ہے۔ میں سوچ رہا تھا کسی پاکستانی ایڈیٹرنسی کے لیے لیکن آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، ہمیں ایکشن تو لڑنا ہے اور پوری تیاری کے ساتھ۔ ہم کل ایک برس سے منیج کر رہے ہیں اور اس کے بعد جملہ عالمی

دخواتین پر بس کے معزز اراکین۔ ایک سال بعد آپ سب سے مل کر بڑی خوش ہو رہی ہے۔ آپ لوگ یقیناً مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہوں گے۔

ایک صحافی نے ہاتھ اٹھایا ”شاہ عالم صاحب، میرا سوال یہ ہے۔“

”قہقہہ سے اسے ٹوک دیا۔“ پہلے شاہ صاحب ایک بیان دیں گے آپ لوگ اس کے بعد سوالات کریں گے۔“

میں نے کہا ”جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں، میں نے ملک سے باہر تقریباً ڈیڑھ سال جلاوطنی میں گزارا ہے۔ وہاں کی وجہ صرف یہ ہے کہ سازشی عناصر نے میرے لیے یہاں رہنا ناممکن کر دیا تھا۔ ان سازشی عناصر میں میرے سیاسی مخالفین تھے۔ میرے کاروباری حریف تھے اور شاہ عالم کے ذاتی دشمن بھی کم نہ تھے لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کا ساتھ پارتی کے کچھ ایسے سینئر عہدے داروں نے دیا جن کو میں اپنا دست راست سمجھتا تھا۔ مزید یہ کہ پی جے ایف کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے ملک کی خفیہ ایجنسیاں سرگرم عمل ہو گئیں۔ پی جے ایف ایک انقلابی جماعت تھی جس کا نعرہ تھا ”امن، انصاف اور آزادی۔“ آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس ملک کے عوام امن پسند ہیں۔ وہ جنگ نہیں چاہتے کیونکہ وہ جنگ کو فائدہ نہیں کر سکتے مگر عالمی طاقتوں کا مفاد اس خطے میں جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے میں ہے۔ بین الاقوامی اسلحہ فروش اپنے ذاتی مفادات کے فروغ کے لیے دنیا میں ہر جگہ جنگ کے لیے حالات پیدا کرتے ہیں۔ پی جے ایف کا امن کا نعرہ ان کے مقاصد کی شکست کا سبب بن سکتا تھا۔ ہم انصاف کی بات کرتے تھے، آئین میں یہ ضرور لکھا ہے کہ امیر غریب ہر ایک کو بلا تفریق انصاف ملے گا مگر کیا عملاً ایسا ہوتا ہے؟ ہم انصاف کے دہرے معیاروں کو ختم کرنا چاہتے تھے اور یہ بات یہاں کے فیوڈل لارڈز اور یوروکریٹس کے مفادات پر ضرب کاری لگاتی تھی۔ پھر ہم آزادی کی بات کرتے تھے۔ کہنے کو ہم نے انیس سو سینتالیس میں آزادی حاصل کر لی تھی مگر کیا واقعی ہم آزاد ہیں۔ کیا آج ہم پر گورے صاحب کی جگہ کالا صاحب زیادہ فرعونیت کے ساتھ حکمرانی نہیں کر رہا ہے؟ ہم اس نظام سے استحصال سے اور طبقاتی تفرقات سے آزادی کی بات کرتے تھے۔ پی جے ایف نے جو چند سال پہلے ایک جمہوری سی جماعت تھی، دیکھتے دیکھتے اتنی مقبولیت اور طاقت حاصل کر لی تھی کہ اس کا وجود اس زمانے کے لیے خطرہ بن گیا تھا جس نے اپنے غیر جمہوری، غیر اسلامی اور غیر اخلاقی

جھکنڈوں سے اس ملک کے بارہ کروڑ عوام کو یہ غلام بنا رکھا ہے۔ چنانچہ وہ سب پی جے ایف کے خلاف متحد ہو گئے جو عوام کو امن، انصاف اور آزادی دینا نہیں چاہتے تھے۔“

ایک صحافی نے بیزاری سے کہا ”سر، یہ سب جانتے ہیں ہم۔“

میں نے کہا ”لیکن اس وقت ان باتوں کو دہرانے کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو عناصر پی جے ایف کی قوت سے خائف تھے، وہ آج بھی اس کے خلاف متحد ہیں۔ کیا آپ کسی ملک کی سیاسی تاریخ میں ایسے گھٹاؤں کی مثال کا تصور کر سکتے ہیں جو میرے خلاف کھیلا گیا۔ میری پارٹی کی مقبولیت سے خوفزدہ سازشی ٹولے نے میرے وجود کو ختم کرنے کے لیے کیا بھیانک کھیل کھیلا تھا۔ انہوں نے ایجنسیوں کی مدد سے میرے ایک ہم شکل کو میری جگہ لانے کی پوری پلاننگ کی۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس ہم شکل کو میری جگہ پارتی کا چیئرمین بنائے اس سے ایسے اقدامات کرائے جائیں جن سے پارتی کا شیرازہ بکھر جائے۔ وہ مجھے مار کے اس جھلساز کو شاہ عالم بنانا چاہتے تھے جس کی صورت مجھ سے تھوڑی بہت ملتی ہوگی مگر میک اپ اور پلاسٹک سرجری سے اسے میرا ڈبلی کیٹ بنادیا گیا تھا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون سمجھے۔ یہ سازش کرنے والے خود اپنی سازش کا شکار ہو گئے۔ میرے بجائے میرے اس ہم شکل کا کام تمام کر دیا گیا اور اسے اصل شاہ عالم قرار دے کر بڑی دھوم دھام سے کسی شہید کی طرح اس کا جنازہ بھی اٹھایا گیا اور اس کا مزار بھی بنادیا گیا۔ یہ بڑی افسوسناک اور لمبی کمانی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ پھر مجھے خود کو شاہ عالم ثابت کرنے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں زندہ ہوں، کتنے پاپز پیٹے۔ جسے جلی شاہ عالم کی لاش کا قبر سے نکال کے پہلا پوسٹ مارٹم کیا گیا پھر دو سرا پوسٹ مارٹم ہوا۔ بالآخر پارتی گورٹ میں یہ ثابت ہو گیا کہ مرنے والا فعلی شاہ عالم تھا۔ اصلی شاہ عالم میں ہوں لیکن اس شرمناک شکست سے مخالف عناصر کے حوصلے کم نہیں ہوئے۔ انہوں نے میری پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ پہلے مجھ پر دہرے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ میرے خلاف پولیس نے خادم مرزا اور خالد عثمان کو قتل کرنے کا مقدمہ درج کیا۔ وہ دونوں میرے کاروباری رفیق تھے یہ سب الزامات جھوٹے ثابت ہوئے لیکن میرے مخالفین اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ پارتی کئی محرومیتوں میں مبتلا ہوئی اور مجھے جان بچانے کے لیے ملک سے نکلنا پڑا۔ اس سے پارتی کی مرکزیت ختم ہوئی اور عوام

سے اس کا موثر رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ میرے دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور انہوں نے لندن میں بھی مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ یہاں کے اخبارات میں میرے خلاف بے بنیاد خبریں شائع کراتے رہے اور وہاں بھی میرے خلاف سازشوں میں مصروف رہے۔ میں اس وقت ان خبروں کی تفصیل میں نہیں جاسکتا جو یہاں کے اخباروں کو فراہم کی گئیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جھوٹ بہر حال جھوٹ ہوتا ہے۔ میرے بارے میں تو یہ بھی مشہور کر دیا گیا تھا کہ میں لندن میں کسی نریٹک حادثے میں ہلاک ہو گیا ہوں۔ بغضِ خدا میں بالکل صحیح سالم اور صحت مند، آپ سب کے سامنے موجود ہوں۔ میرے وہ دشمن اب پہلے سے زیادہ چونکے اور سرگرم عمل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاہ عالم بہت کم وقت میں اپنی پارٹی کو پھر فعال کر سکتا ہے۔ وہ انہیں سے پہلے اتنی طاقت حاصل کر سکتا ہے کہ ان کے بہت سے سیاسی پہلوان ہمارے نئے امیدواروں سے چپ ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر سازشوں کا جال پھیلادیا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند دنوں میں میرے خلاف نئے مقدمات کھڑے کر دیے جائیں۔ مجھے بدنام کرنے اور میری کردار کشی کے لیے مجھے بے بنیاد الزامات میں لوٹ کر دیا جائے یا میرا وجود ہی ختم کرانے کے لیے مجھ پر ایک سے زیادہ قاتلانہ حملے کرائے جائیں۔ میں اپنی جان ہر طرف سے خطرے میں محسوس کرتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس ملک میں سیاسی کشمکش روز کا معمول ہوئی اور جہاں آج تک کوئی قاتل نہ پکڑا گیا ہو وہاں شاہ عالم کا قتل کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔ کوئی تحقیقاتی کمیشن اور کوئی تفتیشی ادارہ اس کو مارا نہیں لگائے گا۔ تمام شہرے پنے ہوئے ہیں دستانے تو پھر دست قاتل کی کیا پہچان۔ لیکن میں ان اندیشوں سے ڈر کے خاموش بیٹھنے والا نہیں ہوں۔ میں اپنی پارٹی کو پھر منظم اور متحد کروں گا اور آنے والے انتخابات میں ہم بھرپور طریقے سے حصہ لیں گے۔“

میری تقریر ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے اندازِ خطابت اور مدلل چیرا یہ اہمکار نے سب کو متوجہ کر لیا ہے اور صرف انجوائے کرنے کے لیے پریس کانفرنس میں آنے والے میری بات بڑے اہمکار سے ان رہے ہیں۔ یہ ایک خالص سیاسی موضوع کی تقریر تھی مگر میں نے اس میں شاہ عالم کی ”مرگ ٹاکاں“ کے امکانات اور اتفاقات کو بھی موثر طریقے سے شامل کر لیا تھا۔ یہ آنے والے وقت کے لیے احتیاطی پیش بندی تھی تاکہ شاہ عالم

اچانک مرجائے تو کم سے کم اخبار والوں کو اس میں کوئی ڈراما نظر نہ آئے۔

آج مجھے کتنے تک حاضری کی قوت برداشت کا امتحان لینے کے بعد میں نے تقریر ختم کی تو قہقہے سے کہا ”اب آپ لوگ سوال کر سکتے ہیں۔“

ایک مشہور اخبار کے کالم نویس اور ایک رپورٹر ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے مگر پھر رپورٹر نے کالم نویس کی سینا بلی کا احترام کیا اور خود بیٹھ گیا۔ کالم نویس نے کہا ”مسٹر شاہ عالم! آج جبکہ انتخابات کے انعقاد کی تاریخ میں پورے دو مہینے بھی نہیں، آپ یہ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ پورے پاکستان میں اپنی پارٹی کو منظم کر لیں گے۔ عملی طور پر تو آپ کی پارٹی ختم ہو چکی ہے۔“

میں نے کہا ”پارتی کے کارکن بڑے سخت جان اور وفادار ہیں۔ وہ آج بھی ملک کے طول و عرض میں ایک خاموش اکثریت رکھتے ہیں۔“

اکثریت کے لفظ پر ایک رپورٹر مسکرایا ”مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ اتنے کم وقت میں آپ کو امیدوار مل سکیں۔“

میں نے کہا ”ہم ہر سیٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے لیکن جس علاقے سے پارتی کے امیدوار پہلے کامیاب ہوئے تھے وہاں ہم ضرور مقابلہ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔“

”کیا آپ کسی انتخابی اتحاد میں شامل ہوں گے؟“

میں نے کہا ”ہم اس کے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کر سکتے۔ ہمارے سیاسی نظریات سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا چنانچہ کسی ہم خیال جماعت کے ساتھ ہمارا انتخابی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔“

رفتہ رفتہ سوالات میں تبدیلی آنے لگی۔ وہاں موجود تمام صحافی اس معاملے میں جائز طور پر متفق تھے کہ پی جے ایف کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہو سکتا مگر بڑی ڈھٹائی سے اپنے موقف کو دہراتا رہا کہ دو مہینے میں پارتی پھر پہلے کی طرح طاقتور ہو جائے گی اور وہ سب سٹیج جیت لے گی جو پہلے اس کے لیے مخصوص تھیں۔ وہ سب پرانے اور تجربہ کار لوگ تھے جو آگے بند کر کے ہر سنی سنائی بات پر تھیں نہیں کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے سوالات کا انداز جارحانہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ایک نے تو مجھے بالواسطہ طور پر چیلنج بھی کیا کہ دیا۔ کچھ لوگ اپنے غیر سنجیدہ رویے پر ہنسنا شروع ہو گئے لیکن میں نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ اس پریس کانفرنس کا سہارا نہیں

اپنے سیاسی عزائم کی کاسیائی کا یقین دلانا ویسے بھی نہیں تھا۔ میں نے جس کتنے پر زیادہ زور دیا تھا وہ شاہ عالم کی زندگی کو لاحق خطرات تھے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ شاہ عالم جان بھیلی پر رکھ کے آیا ہے اور جو لوگ بی بے ایف کو پھر میدان میں دیکھنا نہیں چاہتے وہ اسے ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔

پھر ایک صحافی نے سوال کیا "سر کیا آپ نے لندن میں تیسری شادی کر لی تھی؟" میں نے کہا "میری تین بیویاں نہیں ہیں" اس پر ایک تعجب پڑا۔

"آپ نے دوسری شادی ایک ماڈل سے کی تھی؟" میں نے کہا "میں نے یہ غلطی کی تھی اور اس کی سزا بھی بھگتی۔"

ایک صحافی بولا "سنا ہے آپ کی تیسری بیوی بھی ایکٹریس ہیں؟"

میں نے کہا "روشنی ایکٹریس تھی۔ اس نے کچھ ٹیلی ویژن ڈراموں میں اور چند فلموں میں کام کیا تھا لیکن وہ ایک کیریئر ایکٹریس تھی۔ اس کی اداکاری کا معیار وہی تھا جو انڈیا کی شہانہ اعظمی اور پاکستان میں عظمیٰ گیلانی کا تھا۔ لیکن وہ زیادہ چل نہیں سکی۔"

"وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟" میں نے کہا "وہ لندن میں اپنی بہن کے ساتھ مقیم ہیں۔"

ایک رپورٹر بولا "یہ چھ لاکھ پاؤنڈز کی ڈیکٹی کا کیا قصہ تھا؟"

میں نے کہا "قصہ وہی تھا جو آپ نے پڑھا۔" ایک سینئر صحافی نے کہا "شاہ صاحب پاکستان سے جلا وطنی اختیار کرتے وقت آپ کے خلاف بہت سے مقدمات تھے۔"

"وہ سب جمعوئے تھے؟" میں نے کہا۔ "لیکن وہ سب پھر شروع ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً عمود راز کے قتل کا مقدمہ۔"

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ نگران وزیر اعظم سیاسی بنیادوں پر کسی کے خلاف انتخابی کارروائی نہیں کر سکتے۔ تاہم عمود راز کے قتل کی فائل پھر کھولی گئی تو میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اس کیس میں آپ کو گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا "میں گرفتاری سے نہیں ڈرتا۔"

ایک اخبار کے مدیر نے کہا "آپ نے اپنی پارٹی کے نائب صدر مسٹر جس اور مسٹر قریشی پر الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے آپ کی پارٹی کو ہائی جیک کر لیا ہے لیکن مسٹر قریشی یہاں موجود ہیں؟" میں نے کہا "ہمارے درمیان ہر غلط فہمی رفع ہو گئی ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنے کم وقت میں اپنی پارٹی کے احیا اور اسے ملک بھر میں سیاسی طور پر فعال کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا پلان ہے؟"

میں نے کہا "پلان بہت جلد آپ کے سامنے آجائے گا۔ میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ اب ملاقاتیں ہوتی رہیں گی آپ سے۔ رات بہت ہو گئی ہے اور غالباً بھوک سے آپ کے سوالات بھی کمزور پڑ رہے ہیں اس لیے آئیے کلام کے بعد طعام کی طرف ڈیزازری۔"

چند ایک سے سوا بیشتر صحافیوں کو نہ پریس کانفرنس سے دلچسپی تھی اور نہ شاہ عالم کے مستقبل سے۔ وہ دوسرے درجے اور تیسرے درجے کے کانڈی سیاست دانوں کی پریس کانفرنس میں اس لیے جاتے تھے کہ وہاں کھانے پینے کو بہت کچھ ملتا تھا۔ صاف اول کے سیاست دان ایک کپ چائے پر نرغہ دیتے تھے مگر وہاں جانا صحافت کے تقاضوں میں شامل تھا۔ ان جماعتوں کے سربراہ جو عام اصطلاح میں ٹانگہ پارٹی کہلاتی ہیں (کیونکہ ان کے مجبران اور عمدے دار سب ایک ٹانگے میں ساجاتے ہیں) اور آزاد امیدوار صحافیوں کو کھینچنے کے لیے خاطر تواضع میں زیادہ اہتمام کرتے تھے یہ میری بھی مجبوری تھی۔

میرے اعلان کے ساتھ ہی بھوکے لوگ میزوں کی طرف لپکے جہاں بہترین بونے ڈیز کے لیے انواع و اقسام کی ڈشز بہت دیر سے ان کی فتنہ تھیں۔ پریس کانفرنس کے دوران میں ہی میں نے محسوس کر لیا تھا۔ وہاں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو اپنی دلچسپی سے صحافی نظر آنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر نہ وہ صحافی تھے اور نہ کسی کے ساتھ آئے تھے۔

کھانے کے دوران میں میں ہر صحافی کے پاس گیا اور ان سے رسمی طور پر کہا کہ وہ مختلف نہ کریں اور کھانے کے ساتھ پورا انصاف کریں۔ ایسے ہی گھومتے پھرتے میں نے چار مشتبہ افراد سے بھی بات کی اور ان سے پوچھا کہ وہ کس اخبار کے نمائندے ہیں۔ دو نے پرسکون رہتے ہوئے قدرے اعتماد کے ساتھ دو نام لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے

تھے۔ دو کچھ نروس ہوئے اور انہوں نے دو بڑے اخبارات کا نام لیا جن کے نمائندوں کو میں جانتا تھا۔ میرا شک تقویت حاصل کر گیا۔ میں نے جنم کے پاس جاکے کہا "جنم تم یہاں موجود قدامت صحافیوں کو جانتی ہو؟" "سب کو تو نہیں" کچھ غیر معروف اور نئے لوگ بھی ہیں۔

میں نے کہا "نئے لوگوں میں مجھے کچھ مشکوک افراد نظر آ رہے ہیں جو قطعی صحافی نہیں ہیں۔ ایسے ادھر ادھر مت دیکھو انہیں شک ہو جائے گا۔"

جنم نے سر ہلایا "مجھے بتاؤ کون لوگ ہیں؟" میں نے کہا "ایک تو ارشد صاحب کے پیچھے کھڑا ہے۔ دراز قد اور ٹیکسی مونچھوں والا۔ سفید شلوار قمیض میں۔" "میں نے دیکھ لیا" میں اسے نہیں جانتی۔

"دوسرا قادر صاحب کی ٹیکل پر موجود ہے اور اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ قادر حسین صاحب کے اخبار کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہا ہے۔"

"تمہاری اس سے بات ہوئی؟" میں نے کہا "ہاں۔ وہ سفاری سوٹ میں ہے۔" "میں سمجھ گئی۔ اس ٹیکل پر چار افراد ہیں۔ تین کو میں جانتی ہوں۔"

میں نے باقی دو کی نشاندہی بھی ایسے کی کہ کسی کو شک نہ ہو مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ جنم کے پیچھے سے پہلے ہی ان میں سے دو غائب ہو گئے۔ پریس کانفرنس چاندنی لاؤنج کے ایک حصے میں ہو رہی تھی۔ باقی حصے میں عام پبلک تھی۔ وہ خاموشی سے کھٹک کر پبلک میں شامل ہوئے تو پھر نظر نہیں آئے مگر جنم نے دو کو گھیر لیا۔

"ہوائے وقت کون سا اخبار ہے؟" جنم نے کہا۔ "اگر ہوائے وقت ہو سکتا ہے تو ہوائے وقت کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہ ایک نیا اخبار ہے" وہ بے خوفی سے بولا۔

"تجارتی کاروبار آپ کے پاس اخبار کا؟" "وہ اتفاق سے پرس نہیں رہ گیا۔"

"چلے اپنا نام اور اخبار کا فون نمبر بتائیے" جنم نے تیز لہجے میں کہا۔

"آپ ہوتی کون ہیں یہ سوال کرنے والی؟" وہ ہلکا سا ہنسی بھرا لہجہ میں پوچھا۔ "مگر اتنی دیر میں چند اور صحافی ادھر آ گئے تھے۔ انہوں نے اسے دھکے دے کر نکال دیا۔ چلو اب عزت کے ساتھ دفع ہو جاؤ۔ مفت خورے آجاتے ہیں ہر جگہ۔ جو بے پردہ گے تو بھول جاؤ گے ساری صحافت کو۔"

جنم نے کہا "اے تو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔" دوسرا اس صورت حال سے بچنے کے لیے فرار ہونے لگا تھا کہ جنم نے اسے بھی روک لیا۔ "ایک منٹ میری بات سنئے جرنل صاحب، کس اخبار سے تشریف لائے ہیں آپ؟" "نمائندے وقت سے باصدا اے وقت سے؟"

وہ بولا "جی نہیں۔ میرا نام جمال الدین ہے۔ میں نے اپنا نیا اخبار شروع کیا ہے رفرار زمانہ!" نسبتاً نوجوان صحافیوں کا ایک گروہ اس کے گرو جمع ہو گیا۔ "کب سے شائع ہو رہا ہے یہ اخبار؟" ایک نے کہا "کیا رفرار ہے اس کی نئی زمانہ۔"

"میں نے ابھی اس کا ڈیپیکریشن لیا ہے" وہ بولا۔ "اس کی ڈیپیکریشن یہی ہے؟" جنم نے پوچھا۔ یہ خالص ٹیکنیکل سوال سن کے وہ گھبرا گیا "ڈی!"

ایک رپورٹر نے پلٹ اس کے ہاتھ سے لے لی "تمہیں اس پریس کانفرنس کا دعوت نامہ کس آلو کے پٹھے نے دیا تھا آخر؟"

دوسرے نے اسے دھکا دیا "حرام خور گدھ۔ چلو پھٹو ورنہ میں بلا ہوں پولیس کو۔" جنم نے کہا "فٹو۔ ہوٹل کی سیکورٹی کو بلاؤ۔" میں نے کہا "کچھ لوگ پہلے ہی کھٹک گئے ہیں۔ مجھے یہ صرف مفت خورے نہیں لگتے۔ یہ میرے دشمنوں کے پیچھے ہوئے لگتے ہیں۔"

آخری شخص کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا مگر وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوا اور اطمینان سے یا ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ چند منٹ میں ہوٹل کی سیکورٹی والے آگئے اور اسے ساتھ لے گئے۔ اس نے جاتے جاتے ایک رپورٹر سے کہا "مفت کی تو تم بھی کھا رہے ہو۔ ہم نیچے جا کے کھالیں گے اس سے اچھا۔"

اگر وہ سیکورٹی کی تحویل میں نہ ہوتا تو شاید اس کی اچھی خاصی ٹھکانی ہوتی مگر اس کے اعتماد نے مجھے حیران کیا۔ میں نے جنم سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں اور سیکورٹی والوں کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب نیچے سیکورٹی کے انچارج نے اس کے کانڈات چیک کیے اور پھر بڑے دوستانہ انداز میں مسکرا کے اسے چھوڑ دیا۔ وہ ہال کی ایک ٹیکل پر جا بیٹھا جہاں فرار ہونے والے تینوں صحافی پہلے سے موجود تھے۔ میں دور سے ان کی باتیں تو نہیں سن سکتا تھا مگر انہیں ہنستا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

میں نے سیکورٹی انچارج کے پاس جاکے کہا "تم نے

اس شخص کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔

وہ بولا "سری۔ وہ تو خود پولیس میں ہے۔"

مجھے یقین نہ آیا "تم نے شناختی کارڈ دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا سر وہ اے ایس پی والا در شاہ ہے۔"

میں نے اس کی میز کی طرف دیکھا جہاں وہ اسے ایس پی موجود تھا۔ وہ اب ویٹر کو بلا کے اپنا آرڈر لکھوا رہا تھا۔ اس کے باقی سامنے کھانے میں مصروف تھے۔ میں نے فور سے ان کی صورتوں کو دیکھا۔ وہ شکل سے پولیس والے نہیں لگتے تھے۔ ان میں سے کسی کا ہیز اسٹائل پولیس والا نہیں تھا۔ ان کے لیے لمبے بال تھے جو کانوں کے اوپر آئے ہوئے تھے۔ ایک نے تو یا قاعدہ پیچھے کر رکھے تھے۔ ان کا لباس بھی بہت شرم اور فیشن ایبل تھا مگر میں سیکورٹی انچارج سے بحث نہیں کر سکتا تھا اور کسی وجہ کے بغیر معاملے کو طول نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی تک ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ بن بلائے ایک پریس کانفرنس کے شرکا میں شامل ہو گئے تھے اور سب کے ساتھ دعوت عام میں شریک پائے گئے تھے۔

والہیں میرے پر پہنچے کے میں نے شبنم کو ساری بات بتائی "اس نے پولیس کا جعلی شناختی کارڈ دکھا کے سیکورٹی والوں کو مطمئن کر دیا۔"

شبنم نے کہا "بعض اوقات سیاسی نوعیت کی مینٹگ یا پریس کانفرنس میں پولیس والے سادہ لباس میں رپورٹ لینے آ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم! وہ پولیس والے نہیں ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے تھے۔"

"تم بلا وجہ ڈر رہے ہو۔"

میں نے کہا "اب وہ بچے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟ آخر کس لیے۔"

میں نے کہا "ممکن ہے وہ رب نواز کے آدمی ہوں۔ مجھے انہوں کے ساتھ لے جانا چاہیے ہوں۔"

"اس ہوٹل کے اندر سے انہیں نہیں بچانے کرنے والے تمہیں باہر سے اٹھا سکتے ہیں۔ انہیں بچانے جانے کا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟" شبنم نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا "خاتون! میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میرا شک ہے سب نہیں ہے۔ جو شخص پولیس کا جعلی شناختی کارڈ لے کر کسی فائینانشل ہونٹل میں جانے کی اور پریس کانفرنس میں شریک ہونے کی جرات کر سکتا ہے وہ کوئی

شریف آدمی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر۔"

"اوکے اوکے۔ میں قادر صاحب کو بتا دیتی ہوں" شبنم نے کہا۔

اس وقت تک لوگ کھانا کھا کے فارغ ہو چکے تھے اور رخصت ہو رہے تھے۔ قادر صاحب نے شبنم کی بات واجبی سی دلچسپی کے ساتھ سنی اور پھر کسی جاننے والے پولیس آفیسر کو فون کیا مگر خود انہیں جاننے کی جلدی تھی۔ سب مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے آدھے گھنٹے بعد اس علاقے کے تھانے سے ایک سب انسپکٹر مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اسے ساری صورت حال سمجھائی تو وہ لوٹ کر نیچے ہال میں گیا اور پندرہ منٹ بعد خاصا پریشان اور ناراض لوٹا۔

"آپ نے تو ہمیں مروا دیا تھا سری! یہاں سارے معززین آئے ہیں۔ ویسے ہی کسی پر شک ظاہر کرنا بڑی غلط بات ہے۔"

میں نے کہا "غلط بات کیا ہے۔ خود سیکورٹی انچارج نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا تھا۔"

"سیکورٹی انچارج تو خود مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی جان چھڑائی کہ شاید غلط فہمی ہو گئی ہے کوئی۔ وہ بندہ کوئی اور تھا۔ جن کے پاس آپ نے مجھے بھیجا تھا وہ سب تو کسٹم کے افسران تھے۔"

"کسٹم کے افسران اس طے میں نہیں ہو سکتے۔ وہ سب بد معاش لگتے تھے" میں نے کہا۔

"چلو چھوڑ دو۔ میری تو نوکری خطرے میں ڈال دی آپ نے۔ انہوں نے فحش سے بات کی کہ پولیس یہاں بھی شرفا کو شک کرتی ہے۔ ان میں سے ایک نے تو ڈی آئی جی صاحب سے فون پر بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بڑی مشکل سے معاملہ دفع دفع ہوا" اس نے جاتے جاتے بڑی ناگواری کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسسٹنٹ منیجر سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ وہ میزبان خالی پڑی تھی جس پر میں نے ان چاروں جعلی صحافیوں کو اکٹھا بیٹھے دیکھا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر نے میری بات بڑی توجہ سے سنی "لیکن سر! آپ نے شخص شک کی بنیاد پر پولیس کو بلا کے غلطی کی؟ یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔"

میں نے کہا "شہر بھر کے دو درجن صحافیوں نے ان کو دیکھا تھا۔ وہ صحافی نہیں تھے اور انہوں نے سب کے سامنے جھوٹ بھی بولا تھا۔ بعد میں ایک نے خود کو پولیس کا اے ایس پی ظاہر کیا اور جب پولیس آئی تو وہ کسٹم آفیسر بن گئے۔"

آپ ایسے لوگوں کو شرفا اور معززین میں شمار کرتے ہیں؟"

"شاہ عالم صاحب! یہ ایک ہوٹل ہے۔ یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے خواہ وہ شرافت کی سند رکھتا ہو یا نہیں۔ ہم کسی کو شناخت کے لیے روک نہیں سکتے۔ اگر آپ نے انہیں پریس کانفرنس میں پکڑ لیا تھا تو وہیں پولیس کے آنے تک روکتے۔ ہم ہوٹل کے اندر نہ پولیس کی مداخلت پسند کرتے ہیں اور نہ بلا وجہ کاہنگامہ۔" اسسٹنٹ منیجر نے سپاٹ لمبے میں کہا۔

میں نے کہا "دیکھئے! یہ بات میں نے ابھی پریس کانفرنس میں بھی بتادی ہے کہ میری جان کو خطرہ ہے۔"

"لیکن ہم آپ کو اسٹینڈ سیکورٹی فراہم نہیں کر سکتے۔ آپ اگر ہمارے حفاظتی انتظامات سے مطمئن نہیں ہیں تو پرائیویٹ سیکورٹی لے لیں یا پولیس سے سیکورٹی مانگیں۔" اس نے رکھائی سے کہا اور پلٹ کے اپنے آفس میں چلا گیا۔

انتظامیہ کا موقف غلط نہیں تھا۔ میں نے اپنے سوٹ میں آکے ریٹیکس کرنے کے بعد سوچا۔ لیکن میرا شک بھی بے بنیاد نہیں تھا۔

میں نے شبنم نے پوچھا "تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

وہ صوفے پر جوتے اتار کے دراز ہو گئی "کچھ نہیں؟"

میں نے کہا "آج تمہیں اخبار کی آخری کاپی کی فکر نہیں ہے؟ اس پریس کانفرنس کی رپورٹ بھی فائل نہیں کی تم نے۔"

وہ مسکرائی "تم نے دیکھا نہیں؟ میرے اخبار کا چیف رپورٹر خود یہاں موجود تھا۔ میں بالکل فارغ ہوں۔"

"فارغ ہو تو کھر کاؤ۔ یہاں تمہارے سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

اس نے شوفی سے ڈبل بیڈ کو دیکھا "جگہ تو بہت ہے اگر دل میں جگہ ہو۔"

میں نے کہا "دیکھو میں پہلے ہی اپ سیٹ ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو اور جاؤ شرافت سے۔"

وہ اسی طرح لپٹی رہی "اگر زبردستی نکال سکتے ہو دھکے دے کے تو نکال دو ورنہ میں لپٹی ہوں یہاں تم سو جاؤ اپنے بیڈ پر۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی ہے اور مجھے فون پر سب سے بات کرنی ہے۔" قمر سے اور کمال سے۔

"اور چند اسے۔"

میں نے کہا "ہاں! چند اسے بھی۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں کچھ نہ سنوں تو میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہوں" اس نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

میں نے اپنی ہار مان لی۔ شبنم کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلتی۔ اگر میں اسے زبردستی رخصت کرتا اور وہ جج جج ہنگامہ کر دیتی تو شاید ہوٹل کی انتظامیہ مجھ سے معذرت کر لیتی کہ شاہ عالم صاحب! آپ کی وجہ سے ماحول خراب ہو رہا ہے۔ آپ اپنی رہائش کا انتظام کسی دوسرے ہوٹل میں کر لیں۔ شبنم کو اپنی بدنامی کا کوئی ذر نہیں تھا اور اسے ہنگامہ آرائی سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔

پریس کانفرنس میں چار منگلوک افراد کی موجودگی بظاہر ایک معمولی واقعہ تھی مگر نہ جانے کیوں میری پھٹی حس مجھے خطرے کے وجود سے آگاہ کر رہی تھی۔ میں اس احساس سے نجات پانے میں ناکام تھا کہ وہ چاروں کسی خاص مقصد سے وہاں بھیجے گئے تھے۔ جھگڑا کر کے رخصت ہو جانے کے باوجود وہ ہوٹل کے کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے لیکن میں تقدیر کے لیے باہر جاتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ واپس ہی نہ آؤں۔ وہ مجھے کن پوائنٹ پر اغوا کر کے بھی لے جاسکتے تھے اور شوٹ بھی کر سکتے تھے۔

میں نے پریس کے سامنے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا خوب رونا رویا تھا اور اپنے خدشات کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بوجھا چڑھا کے پیش کیا تھا جبکہ خود میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پاکستان میں میری جان کا دشمن صرف رب نواز ہو سکتا ہے مگر وہ بھی مجھے قتل کر کے اپنا نقصان نہیں کرے گا۔ وہ پہلے مجھ سے معلوم کرنے کا کہ اس کے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات چوری ہو کے کہاں گئے اور جو تین لاکھ پاؤنڈز میں نے وصول کر لئے تھے وہ اس تک کیوں نہیں پہنچے۔ پہلے میں اس کے دو لاکھ پاؤنڈز سے زیادہ کا مقروض تھا۔ اب یہ قرض بڑھ کے پانچ لاکھ پاؤنڈز سے بھی زیادہ کا ہو چکا تھا اور ملک رب نواز اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ پانچ لاکھ پاؤنڈز میں میری جان لے لے۔ وہ مجھے مجبور کرے گا کہ میں اس کا قرض ادا کرنے کے لیے چوری کروں ڈاکا ڈالوں یا اس کے پاس خود کو گروی رکھ کے کاروبار کروں۔ میری جان اس کے لیے بے مصرف تھی۔

چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ رب نواز مجھے اغوا کرے اور پھر مجھ سے پوچھے کہ بتا دیجئے رضا کیا ہے؟ اگر وہ چار آدمی مجھے رب نواز کے پاس لے جانے کے لیے آئے تھے تو انہیں مجھ

سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو زبردستی جائز ہوتی لیکن ابھی تو میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ میں نے ابھی تک رب نواز سے یہ نہیں کہا تھا کہ مستقبل میں اس کے اور میرے کاروباری مراسم نہیں ہوں گے۔ میں نے تو اسے باری کا ٹکٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں لوٹ کے اسی لیے آیا تھا کہ انکیشن میں حصہ لوں۔ دوبارہ منتخب ہونے کی صورت میں میری ذات سے رب نواز کو زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتے تھے۔

سوال پھر یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ چار افراد کون تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس مسئلے پر جھنجھکی راے لیتا، ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ریسپونڈر اٹھا کے کہا ”ہیلو۔“ دوسری طرف سے رب نواز بولا ”شاہ جی۔ فارغ ہو گئے آپ پریس کانفرنس سے۔“

میں نے کہا ”کیا تم نے بھی اپنا نمائندہ بھیجا تھا وہاں؟“ وہ بولا ”جی، ہم تو خود حاضر ہونے کا سوچ رہے تھے مگر اس لیے نہیں آئے کہ جلدی کیا ہے؟“

میں نے کہا ”میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔“ ”ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ اگر کچھ نہیں کر رہے ہو تو آجاؤ۔ یا کوئی مسئلہ ہے تو میں ملے آجاتا ہوں۔“

میں نے کہا ”مسئلہ کوئی نہیں۔ لیکن میں اتنے طویل سفر کے بعد ہمت تھک گیا تھا۔ اس پر آتے ہی پریس کانفرنس گلے پڑ گئی۔“

”اس کے لیے تو تم خود بے تاب ہو گئے۔“ ”ہاں۔ مگر اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ بولا ”کس کے ساتھ؟“ اور پھر ہنسا۔

میں نے کہا ”تمہیں یہ بتانا ضروری ہے؟“ ”نہ بتاؤ یا رہ۔ ہم کیا جانتے نہیں۔ یہ بتاؤ لندن کی صورت حال اب کیا ہے؟“ رب نواز نے کہا۔

میں نے کہا ”لندن کی صورت حال کیا ہو سکتی ہے جو تھی سو ہے۔“ ”وہ جی۔۔۔“ اس نے گالی کی۔

میں نے کہا ”وہ جیل میں ہے اور رہے گا مرے دم تک۔“ وہ مجھ کے بولا ”میرا قرض ادا کرنے سے پہلے وہ کیسے مر سکتا ہے؟“

میں نے کہا ”فرشتہ اجل جان لینے سے پہلے بالکل نہیں پوچھتا کہ بندے دنیا میں تیرے کون سے کام ادا ہو رہے رہ

گئے وہ وقت پر آجاتا ہے۔“

”میں نے سنا ہے اسے دل کا دورہ پڑا تھا؟“ ”ٹھیک سنا ہے تم نے۔ مطلقاً وہ پہلے ہی تھا۔ اسے ہوگی لمبی قید کی سزا اور اتنی سہولت شاید زندگی اسے نہ دے کہ اپنی سزا پوری کرنے کا بے باکی داوے وہ تمہارا مقروض کیسے ہو گیا؟“

”میں نے چھ لاکھ کے نوادرات اسے ہی بھیجے تھے۔“ میں نے کہا ”آہستہ بولو۔ ٹیلی فون پر ایسی باتیں کرنا ویسے بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ اگر کسی نے سن لیا۔“

وہ بولا ”میں کیوں ڈروں۔ جی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس نے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات اسے بھجوائے تھے کہ بیچ کے رقم تمہیں ادا کر دے۔“

میں نے کہا ”ادھی رقم اس نے ادا کر دی تھی بلکہ خریدار یعنی لارڈ پرائس نے ادا کر دی تھی۔ مگر تمہاری بد قسمتی کہ اسے ڈاکو لے اڑے۔ وہ رقم ابھی تک پولیس بھی بازیاب نہیں کر سکی۔ بعد میں نوادرات بھی چوری ہو گئے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ چوری ڈاکے سے مجھے کیا؟“ وہ چلائے لگا ”چھ لاکھ میں سے ایکری منٹ کے مطابق ایک لاکھ تمہارے تھے۔ ایک لاکھ جی کے۔ باقی چار لاکھ مجھے ملے چاہئیں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چار لاکھ پاؤنڈز تم کیسے وصول کر گئے۔ کیا تم جی کے خلاف کیس کر گئے؟ اس کے لیے تمہیں لندن جا کے وکیل بھی کرنا پڑے گا اور تمہیں شاید علم نہیں کہ لندن میں قانونی مقدمات برکنے زیادہ اخراجات ہوتے ہیں۔ وصول تمہیں ایک بیسہ نہیں ہوگا۔ الٹا مقدمہ تمہارے گلے پڑ جائے گا۔ تمہیں جان چیرائی مشکل ہو جائے گی۔“

”میں جی کے اثاثے بکاؤں گا۔“ میں نے کہا ”وہ کیسے۔ اس کے تمام مالی معاملات کی نگرانی ابھی اس کی بیوی جس نے خود اپنے شوہر کو اندر کرایا ہے اور اس کے خلاف تین قسم کے مقدمات درج ہو گئے ہیں۔ ایک غلط آمدنی ظاہر کرنے اور ٹیکس چوری کے دوسرے ناجائز طور پر غیر قانونی تارکین وطن لڑکیوں کو رکھنے کے اور زبردستی ان سے غیر اخلاقی کام کرانے اور تیسرے کم سے کم چار افراد کے قتل عہد کے۔ وہاں سزائے موت کا دواج ہوتا تو جی کی مشکل بہت جلد آسان ہو جاتی۔ اگر تم نے اس کے خلاف کوئی کیس کیا تو خود ہمت سے قانونی معاملات میں الجھ جاؤ گے۔ ان میں سر فرسٹ ہوگا نوادرات کی اسمگلنگ کا جرم۔ ایک مقدمہ تم پر برطانیہ میں قائم ہوگا۔

اس کے بعد وہ سرایا پاکستان میں۔“

”پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں۔“ میں نے کہا ”قانون سے تو علمی کے معذ کو یہاں بھی عدالت قبول نہیں کرتی۔ کیا تم نے پاکستان ANTIQUITIES ایکٹ مجریہ ۱۹۷۷ء کا نام سنا ہے اس کی دفعہ ۳۲ کے تحت پاکستان سے نوادرات کو باہر بھیجنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون کے سب سیکشن ہو کے تحت ملک کے اندر بھی نوادرات کی نقل و حمل ممنوع ہے۔“

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولا ”لگتا ہے تم نے اس سلسلے میں خاصی قانونی معلومات حاصل کی ہیں۔“

میں نے کہا ”اس کے علاوہ یونیسکو کنونشن منعقدہ ۱۹۷۰ء کے آرٹیکل سیون کے تحت ممبر ملکوں کو باندھ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ممالک کے عجائب خانوں میں اسمگل شدہ آثار قدیمہ اور نوادرات نہ آنے دیں اور اگر کسی ملک کے نوادرات بحرانہ طور پر دوسرے ملک پہنچ جائیں تو اس ملک کی وزارت ثقافت کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ چوری ہو کے باہر پہنچ جانے والے نوادرات واپس طلب کر سکے۔“

”میرا ان قوانین سے کوئی تعلق نہیں۔“ ”تعلق کیسے نہیں۔ تم کیسے ثابت کر گئے کہ تم جائز طور پر ان آثار قدیمہ اور نوادرات کے مالک تھے جو پاکستان کی ملکیت ہیں۔“

”میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے وہ سب کسی سے خریدے تھے۔“

”تم سے پوچھا نہیں جائے گا کہ کس سے؟ پھر تم کس کا نام لو گے۔ اس کے علاوہ ان آثار قدیمہ اور نوادرات کی نقل و حرکت تو ملک کے اندر بھی خلاف قانون ہے۔ ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کو صرف حکومت وہاں سے منتقل کر سکتی ہے۔ اسی طرح ہڑپہ اور موہن جو دڑو کے آثار کو ملک کے کسی میوزیم میں رکھنے کے لیے صرف حکومت مجاز ہے۔ تم پھنس جاؤ گے رب نواز اور اگر برطانوی پولیس اور اسکاٹ لینڈیازڈ کے سراغ لگانے میں کامیاب رہے تب بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ سب حکومت پاکستان کے جائز دعوے کے مطابق واپس کر دیے جائیں گے۔ رہی بات جی کے اثاثے بکاؤنے کی تو جی کی زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ جی نے اس کے اثاثوں پر قبضے کے لیے ہی اتنی بڑی قربانی دی تھی کہ اس ادا حورے انسان اور محل ناموسہ شادی کر لی تھی۔ خدا نے اسے موقع دیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے مجازی خدا کو

ٹھکانے لگایا۔ جیل میں وہ خود نہ مرا تو جی اسے حوالے کی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا ”پھر تم نے یہ اندازہ کیسے کر لیا؟“

”اس نے خود میرے سامنے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ جی کے ساتھ اس کی شادی ایک قیدیاشتقت تھی۔ اس نے صرف اس امید میں جی کی بیوی بننا قبول کیا تھا اگر چند سال میں وہ طبی موت نہ مرا تو کسی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ غالباً چھ سات سال جی نے خود پر جبر کر کے گزار دیے لیکن بالآخر اسے موقع مل گیا۔ شوہر کے سارے اثاثے اب اس کے ہیں اور اس سے تم ایک پاؤنڈز قانونی طور پر وصول نہیں کر سکتے۔“

وہ چلائے لگا ”میرے پاس غیر قانونی طریقے بھی ہیں شاہ جی!“

میں نے کہا ”وہ بھی جی کی بیوی تھی۔ اور وہ سارے دھندے جو جی کرتا تھا اب جی چلائے گی۔ تم اسے کوئی معمولی عورت نہ سمجھو۔“

”ایک بات کہوں شاہ عالم!“ ”تمہاری زبان آزاد ہے۔“

وہ بولا ”مجھے اس معاملے میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں اس جرم میں برابر کے شریک ہو۔ ڈیکٹی کا الزام تم نے بھی پہلے لارڈ پرائس پر عائد کیا تھا۔ وہ خاندانی آدمی ہے۔ یہ میں ابھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر پورا ڈاکو نہیں ہو سکتا۔“

”جی خود مجھے لونا چاہتا تھا۔“ ”ہاں۔ مگر اس سے پہلے وہ نامعلوم ڈاکو پہنچ گئے۔“

میں نے کہا ”اس کی بیوی نے ڈیکٹی کے پورے منصوبے کی تفصیلات پولیس کو فراہم کر دی ہیں۔ وہ سودا کرانے میرے ساتھ گیا تھا اور اسی نے نقد ادائیگی پر زور دیا تھا۔ میں اس کی گاڑی میں واپس جا رہا تھا جب ڈاکوؤں نے ہمیں روک لیا۔ اگر ہم خیر عافیت کے ساتھ جی کے آفس پہنچ جاتے تو جی کے منصوبے کے مطابق اس کے اپنے آدمی ڈاکو بن کے پہنچ جاتے اور سب کچھ چھین کر لے جاتے۔“

”مگر جب یہ بات تمہیں معلوم ہوئی تو تم نے جی کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کی۔ جی نے تم سے کہا کہ رب نواز کا سارا مال میرے پاس پڑا ہے۔ ہم مل کے اسے غائب کر دیے ہیں۔ تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز تو مجھے آدھا مال بھی اتنی ہی مالیت کا ہے۔ وہ تم لے لو۔ باقی آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ نقصان ہوگا رب نواز کا تو وہ میٹھا ہے پاکستان میں۔“

وہ ہمارا کیا باز سکتا ہے۔

میں نے کہا ”جب وہ مال برآمد ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ بھی وہ ضرور برآمد ہوگا۔ تو تمہارے سب مفروضات غلط ہو جائیں گے۔“

رب نواز نے کہا ”وہ مال تم نے کھانے لگا دیا۔ اب کہاں سے برآمد ہوگا۔ وہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔“

میں نے کہا ”صدے سے متاثر ہو کے تمہارے ذہن میں ایسے خیالات آنا بالکل فطری ہے۔“

”میرا چھ لاکھ پاؤنڈز کا نقصان معمولی نہیں ہے شاہ عالم!“

”میں تم سے صرف ہمدردی کر سکتا ہوں لیکن نقصان تو میرا بھی ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم پہلے بھی میرے سوا دو لاکھ پاؤنڈز کے مقروض تھے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کے آگے تین لاکھ اس میں اور شامل کرلو۔“ وہ پھر چلائے لگا۔

”تم بالکل ہو گئے ہو رب نواز! مال تم نے میرے حوالے نہیں کیا تھا۔ جی کو بیچا تھا۔“

”میں پیشہ سے ایسا ہی کر رہا تھا۔ میرا مال تم لندن لے جاتے تھے اور جی اسے گاؤں تک پہنچاتا تھا۔“

”لیکن اس دفعہ طریق کار الٹ گیا تھا۔ میں پہلے سے لندن میں تھا اور تم نے مال براہ راست جی کو بھیجا تھا۔ اس نے مجھے دکھایا تھا اور میں نے ایک ایجنٹ کی معرفت لاڈلہ پرائس سے سوا کیا تھا۔ لیکن بعد میں لاڈلہ پرائس نے اس ایجنٹ کو قتل کرا دیا اور گرفتار ہو گیا۔ اب اس کی زندگی کے جو قہوڑے بہت دن بچے ہیں وہ جیل میں ہی گزر رہے گے۔“

”دیکھو شاہ عالم! ہم قتل کے جینیں گے اور کوئی صورت نکالیں گے جس سے تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز کا نقصان بھی پورا ہو جائے اور میرے چھ لاکھ پاؤنڈز کے مال کا گھانا بھی برابر ہو جائے۔ چھ لاکھ میں چار لاکھ تو میرے تھے تمہارا حصہ صرف ایک لاکھ پاؤنڈز کا بٹا تھا اور اتنی جی کا تھا۔“

”اگر وہ تین لاکھ مجھ سے نہ چھینے جاتے تو میں دو لاکھ یقیناً تم تک پہنچا دیتا۔“ میں نے کہا ”باتی دو لاکھ جی دیتا۔“

”چلو تم نے یہ تو مانا کہ دو لاکھ پاؤنڈز میرے تھے اسی طرح تم مجھے سوا چار لاکھ پاؤنڈز دینے کے پابند ہو۔ اخلاقی طور پر اور ہم جو غیر قانونی کام کر رہے تھے اس میں قانونی معاوضے یا قانونی ذمہ داری کی بات بھی نہیں۔ آج کل حالات بہت سازگار ہیں۔ مارکیٹ میں مال بہت ہے اور سستا بھی ہے۔ ظاہر ہے پہلا زیادہ ہوگی تو قیمت گرے گی۔ لیکن میں

الاقوامی مارکیٹ پہلے سے زیادہ تیز جارہی ہے۔ پہلے پانچ کے سولتے تھے تو اب تین کے سوا سو کا ریٹ ہے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا ”ہم فائدہ ضرور اٹھائیں گے لیکن ابھی تو میں تجارت سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں۔“

وہ بولا ”ان دونوں میں فرق ہے کوئی؟“

میں نے کہا ”نہیں مگر آج ہی پریس کانفرنس میں میں نے اپنے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ انتخابات میں دو مہینے باقی ہیں اور یہ وقت اپنی پارٹی کو پوری طرح فعال کرنے کے لیے بہت کم ہے۔“

”میں تو کہتا ہوں شاہ جی کہ اب اپنی ساری توجہ بزنس کو دو۔ سیاست کے بھاری پتھر کو ایک بار پتھر کے چھوڑ دیا ہے تو اسے دوبارہ اٹھانے کی ناکام کوشش سے جگہ بھائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کم سے کم اس انکیشن میں مجھے تمہاری کامیابی کا کوئی چانس نظر نہیں آتا۔“

میں نے کہا ”میں کوشش کیے بغیر میدان چھوڑنے والا نہیں ہوں۔“

”تم شرط لگا لو مجھ سے۔ تمہارے امیدواروں کی ضمانت بھی ضبط ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”دیکھو رب نواز۔ تمہارے لیے ایسا کتنا بہت قتل از وقت ہے۔ انتخابات میں جو سب کے ساتھ ہوتا آیا ہے وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم بارہ سکتے ہیں تو جیت بھی سکتے ہیں۔ اگر ہمارے امیدواروں کی ضمانت ضبط ہو سکتی ہے تو وہ بلا مقابلہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر انکیشن میں SURPRISES بھی بہت ہوتے ہیں۔“

”تجائیں اپنی پارٹی کو دوبارہ زندہ اور فعال کرنے کا مشورہ تمہیں کس فطرت نے دیا تھا؟“

میں نے کہا ”یہ مت بھولو کہ کچھ عرصہ قبل خود تم نے میری پارٹی کا کلٹ بڑی خوشی سے قبول کیا تھا۔“

وہ بولا ”اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کھائے کا سوا کر رہا ہوں۔ میں آزاد ہی بھلا شاہ جی۔ اپنے آبائی حلقے سے میری سیٹ ریڑھ ہے۔“

میں نے کہا ”رب نواز! میں اس وقت سیاسی نظریات اور صورت حالات پر بحث کے موذ میں نہیں ہوں۔“

”مجھے بھی تمہارے سیاسی مستقبل کی نہیں اپنے ساڑھے چار لاکھ پاؤنڈز کی فکر ہے۔ ڈیڑھ کروڑ روپے بٹنے ہیں یہ پاکستانی کرنسی میں جو تم مجھے ادا کرنے کے پابند ہو۔“

میں نے کہا ”میں کہہ چکا ہوں کہ کاروباری معاملات پر بعد میں بات کریں گے۔“

وہ چلائے لگا ”بعد میں کب؟ انتخابات کے بعد۔ تم مجھے ٹال رہے ہو شاہ جی!“

میں نے سخت لہجے میں کہا ”اس وقت میں سونا چاہتا ہوں رب نواز!“

وہ مشتعل ہو گیا ”میری نیندیں حرام کر دی ہیں تم نے اور خود جین سے سونا چاہتے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا شاہ عالم میرے پاس رسید نہیں ہے گواہ نہیں ہیں اور میں ڈیڑھ کروڑ تم سے قانونی طریقے سے عدالت کے ذریعے وصول نہیں کر سکتا مگر قانون سے مدد لینے والے ہوتے ہیں۔“

”اس نے خود کو گالی دی۔“

میں نے کہا ”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”ہاں“ میں دھمکی دے رہا ہوں نہیں۔ میرے ڈیڑھ کروڑ ادا کیے بغیر تم مجھے نہیں سکتے شاہ عالم۔ تم مجھے جانتے ہو۔“ وہ چیخ کے بولا۔

میں نے کہا ”ہاں۔ اور میں ان چاروں کو بھی جانتا ہوں جن کو آج تم نے بھیجا تھا۔ وہ پریس کانفرنس کے دوران ہی پکڑ لیے گئے تھے مگر فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ میرے ملاوہ بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا ان جعلی صحافیوں کو۔“

وہ لہجہ بدل کے بولا ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کسی کو بھی نہیں بھیجا تھا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں شاہ عالم!“

”مجھے چکر دینے کی کوشش مت کرو۔ شاید وہ اس وقت بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے۔“

”نہیں شاہ عالم! تم جس کی قسم کو؟ میں کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کو تمہارے پاس نہیں بھیجا تھا۔“

میں نے کہا ”قسم کھانے سے جھوٹ کبھی جچ نہیں ہوتا۔ ہوئی کی انتظامیہ نے بھی انہیں پکڑ لیا تھا مگر وہ ہنگامہ کر کے نکل گئے۔“

وہ خدا رسول کی قسمیں کھانے لگا۔ مگر میں نے فون کا ریسپونڈ رکھ دیا اور آریکٹر سے کہا کہ وہ مجھے کوئی فون کال نہ دے کیونکہ کچھ لوگ مجھے فون پر قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

”شبنم! اٹھ کر میرے پاس آجی“ ”نیک اٹ ایزی عالی!“

میں نے کہا ”یہ سب کچھ میرے پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جج کچھ لوگ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کریں اور مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ بھی ہو جائے۔“

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

”کیا ہو سکتا ہے؟“

”تم مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملے کا بندوبست کر سکتی ہو؟“

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا ”پلیز عالی! معاملات کو اس انتہا تک مت لے جاؤ۔“

میں نے کہا ”میں آنے والے واقعات کو ایک منطقی انجام کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آج میں نے خطرات کی پیش گوئی کر دی۔ مستند صحافیوں نے چار افراد کو دیکھ لیا جو بدینتی کے ساتھ پریس کانفرنس کے وقت موجود تھے۔ میں نے ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی بتا دیا ہے کہ میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ رب نواز نے صحیح وقت پر دھمکی دی۔ اب ایک قاتلانہ حملے کا ڈر رہا ہو جائے تو تیار رہی۔“

”آئی ایم سوری میں یہ نہیں کر سکتی۔“

”کوئی بات نہیں۔ صبح رکشیں آجائے گا وہ سب کر لے گا۔ ایک ناکام قاتلانہ حملے کے بعد شاہ عالم کسی حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے یا غائب ہو جاتا ہے اور بعد میں اس کی ناقابل شناخت لاش ملتی ہے تو شک کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ شاہ عالم کو اس کے دشمنوں نے مار دیا۔“

اس نے میرے گلے میں ہائیں محاکل کر دیں ”چھوڑو یہ ڈرانے والی باتیں۔ ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں کوئی اپنی بات کرے۔“

میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور اسے نرمی سے دور کرنا چاہا ”یہ باتیں تم دور بچنے کے بھی کر سکتی ہو۔“

وہ مجھ سے اور چپے گئی۔ ”نہیں شاہ عالم! اب اس سے زیادہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ دو مہینے میں نے کیسے گزارے ہیں؟“

میں نے اپنا دفاع جاری رکھا ”شبنم! پلیز! دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا۔“

وہ مجھے دیوانہ وار چوسنے لگی ”تم سمجھتے کیوں نہیں عالی! آئی لو! میں کتنا چاہتی ہوں تمہیں۔“

میں نے اسے دھکا دے کر الگ کر دیا ”دیکھو شبنم! مجھے تمہاری چاہت پر کوئی اعتراض نہیں مگر یہ سب کھیل نہیں چلے گا۔“

وہ دھکی لہجے میں بولی ”تم ایسے کیوں پیش آرہے ہو میرے ساتھ! دو مہینے بعد لوٹے ہو پھر بھی۔ یہ بے رحمی۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔“

میں نے کہا "آخر میں کتنی بار وضاحت کروں کہ شاہ عالم وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہے جو تمہارا استحصال کرتا رہا"۔
بہسائی طور پر۔"

"تمہیں میرے جذبات کا بھی خیال نہیں۔ آخر کیوں عالی! تم جو مجسم الگ تھے، بے حسی کی برف کیوں بن گئے ہو۔ تم چند دن بھی مجھ سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر کیسے تم اس حد تک بے نیاز ہو گئے ہو کہ تمہیں میری ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے نرمی سے کہا۔
"شبنم! میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں، بہت عزت کرتا ہوں۔"

اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیے "نہیں چاہیے مجھے یہ عزت اور تمہاری ایسی قدر دانی۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں گوشت پوست کی بنی ہوئی زندہ عورت ہوں۔ زندگی کی ساری توانائی اور ضرورت، جذبیوں اور احساسات کی ساری تربیت رکھتی ہوں۔"

"لیکن میں تمہیں دل بہلانے کا ایک خوبصورت کھلونا نہیں سمجھتا جیسا کہ شاہ عالم پہلے سمجھتا تھا۔ تم ایک ذہین اور حوصلہ مند عورت ہو۔ مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔" وہ مایوسی کے رد عمل کی نفث کا شکار ہو گئی "آخر بات کیا ہے تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو مجھ سے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حسین ہوں اور میرے شباب کی قوت کتنی زیادہ ہے میرے ایک اشارے پر نہ جانے کتنے سر کٹانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میری ایک نظر کے لیے ترستے ہیں تم جیسے بزدلوں۔ مگر مجھے تمہارے سوا کسی کی ضرورت نہیں، میں بہت مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "سوری شبنم! میں مجبور نہیں ہوں۔" وہ غصے میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی "تم اس طرح مجھے نہیں ٹھکر سکتے۔"

میں نے کہا "تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"نہیں، تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ آخر کیوں عالی! تمہاری خاطر میں نے کیا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اس عورت سے زیادہ محبت دی جو تمہاری بیوی تھی۔ تم نے نہ جانے کتنی بار اس کا اعتراف کیا۔ اب تو وہ بھی نہیں ہے ہمارے بیچ میں۔ پھر تمہیں کس کا ڈر ہے؟"

"ڈر کسی کا نہیں، ڈر بات کو سمجھو۔"

"بات کو تم سمجھو۔ آج ساری دنیا میں تمہارے نام کے

ساتھ میرا نام ایسے آتا ہے جیسے میں ایک صحافی، ایک اخبار کی ایڈیٹر نہیں، کوئی فاحشہ ہوں، تمہاری داشتہ ہوں۔ اور میں ساری رسوائی کو برداشت کرتی ہوں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "جہاں موقع ملتا ہے کوئی مجھ پر کچڑا اچھالنے سے نہیں چوکتا۔ سب بولتے ہیں کہ اب کیا ہے 'اب شاہ عالم' تم سے شادی کیوں نہیں کرتا؟ آزاد صاحب مجھے بے عزت کرتے ہیں کہ تم نے خود کو لٹایا۔ اب کیا رہ گیا ہے تمہارے پاس اسے دینے کے لیے۔ وہ کیوں پروا کرے گا تمہاری۔ وہ مجھے سمجھاتے ہیں کہ اتنے اچھے اچھے لوگ تمہاری ایک نگاہ التفات کے لیے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو پسند کرو۔ میں کیا تاؤں انہیں کہ شبنم کو صرف شاہ عالم چاہیے کوئی اور مرد نہیں۔"

میں نے کہا "شبنم! اگر میں کر سکتا تو تم سے پہلے ہی شادی کر لیتا۔"

"پہلے تم رخصتی سے ڈرتے تھے رخصتی کا کانا ہمارے بیچ سے نکل گیا۔ اب تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتے۔ دیکھو، میں خود کو بالکل بدل لوں گی۔ تم جیسا چاہتے ہو میں ویسی ہی بن جاؤں گی۔ میں یہ صحافت کا پیشہ بھی چھوڑ دوں گی۔ میں صرف تمہاری بیوی بن کے رہوں گی۔ تمہیں وہ سب خوشیاں دوں گی جو رخصتی نہیں دے سکتی۔ جو دنیا کی کوئی عورت تمہیں نہیں دے سکتی۔" وہ میری گود میں سر رکھ کر رونے لگی اور نیچے بیٹھ گئی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ بٹھالیا۔
"شبنم! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، لہذا لیکن میں۔"

"تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے نہ کرو بغیر محبت کے مجھے اپنے دل میں اپنے گھر میں جگہ دے دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"کیوں ناممکن ہے۔ میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں؟"

صرف تھوڑی سی توجہ، تھوڑا سا التفات۔ میں تم پر اجارہ داری نہیں چاہتی۔ یہ نہیں کہتی کہ مجھے اپنانے کے بعد تم کسی اور کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتے، تم جسے چاہو۔"

میں نے کہا "مغضول باتیں مت کرو۔"

اس نے اچانک سر اٹھا کے مجھے دیکھا "عالی۔ تم کسی اور کو چاہتے ہو۔ اگر چاہتے ہو تو اس سے شادی کر لو۔ میں کراؤں گی تمہاری شادی۔ میں اسے دلہن بنا کے لاؤں گی تمہارے لیے۔ اور پھر تمہارے ساتھ ایک خادمہ بن کے رہوں گی۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو شبنم!"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ میں پاگل ہوں۔ لیکن مجھے اور پاگل مت کرو۔ مجھے دیوانگی کی اس انتہا تک مت لے جاؤ جہاں میں کچھ کر سکیں۔ تم مجھے اپنی بیوی بنانا نہیں چاہتے؟ مت بناؤ۔ اپنی داشتہ رکھ لو۔ میں تمہاری بیوی کو مانگوں گی اسے سمجھاؤں گی کہ تصور تمہارے شوہر کا نہیں، میرا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔"

"اس قسم کی خفیا باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں شبنم! تم ایک باعزت، حلیمہ بانو اور کامیاب صحافی ہو۔ تمہاری خود اعتمادی اور عزت نفیس۔"

اس نے میری بات کاٹ کے کہا "تم چندا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"میں جانتی ہوں اس کے سوا کوئی اور لڑکی نہیں ہو سکتی لیکن میں تو خود کہہ رہی ہوں کہ چندا سے شادی کر لو۔ میں نے رخصتی کے سامنے بھی اعتراف جرم کر لیا تھا۔ اپنی بے بسی کو مان لیا تھا اور اس نے بھی میری مجبوری کو تسلیم کر لیا تھا۔ کیا ابھی اس نے تمہیں میرے نام کا قطعہ دیا؟ میں چندا سے بھی کہہ دوں گی۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے شبنم! کوئی اور بات کرو۔ دیکھو، کتنی رات ہو گئی ہے ابھی تک میں نے کمال سے اور غم سے بات نہیں کی۔"

وہ غصے میں پھٹکارتی ہوئی انھی "نہیں، مجھے بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے۔ کیا میں اتنی بد صورت ہوں، اتنی قابل نفرت ہوں، کیا کیا ہے مجھ میں؟"

میں ڈر گیا "شبنم! آہستہ بولو۔"

"کیوں آہستہ بولو۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ ڈرتے ہو تم! اس نے چیخ کے کہا "بتاؤ، کیا میں بوزمی ہوں۔ کوڑھ لگا ہوا ہے میرے جسم پر۔ ایڈ ہے مجھے؟ میرا جسم عورت کا نہیں ہے؟" اس نے اچانک اپنے کپڑے اتار کر پھینکے شروع کر دیے اور میرے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی "دیکھو، کیا یہ جسم اس قابل نہیں ہے کہ کسی کے جذبات جگا سکے، یا نہا کر ہو گئے ہو؟"

میں نے اس کے ایک بھر پر بھانپ کر سہا کر دیا۔ وہ بیڈ پر گر گئی لیکن چلائی رہی "مارو! مارو مجھے۔ لیکن تم سچ کو چندا سے بھی کیسے چھپاؤ گے۔ تم اب مردی نہیں رہے تو اس سے بھی کیسے شادی کرو گے؟" وہ ہنسنے لگی۔ ہسٹیریا کی دیوانگی میں ہنسنے لگے گی۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میرے ہاتھ پر پینہ بند رہا تھا۔ میں نے ایک تویسے سے چرو صاف کیا اور دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔

باہر وہی اسٹنٹ منیجر کھڑا ہوا تھا "اپنی براہم سرا!"
"نہ! براہم ہوگی تو میں تم سے نہیں کہوں گا۔"

"لیکن دو سمانوں نے شکایت کی ہے کہ آپ کے کمرے میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ یو سی سرائوگ سور ہے ہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میری بیوی۔ وہ کچھ زیادہ جی کے ڈوٹ ہو گئی۔ اب ٹھیک ہے۔"

"جس سرائو!" اس نے سعی خیز لہجے میں کہا اور چلا گیا۔

شبنم بند پر پڑی لرز رہی تھی۔ کاپ رہی تھی اور اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "مجھے مردوں کی کیا کمی، میں ہر روز۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "اگر تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں۔"

اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا "کیا کرو گے تم؟"

میں نے اسے چھوڑ دیا "کچھ نہیں۔ پلیز! اپنے کپڑے پہن لو۔ نیا نہ ہو کہ ہو، والے پولیس کو بلا لیں۔"

وہ پھر بیڈ پر اونڈھی گر گئی۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔

اب وہ خاموش ہونے لگی تھی مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ میں نے خود اسے زبردستی کپڑے پہنائے اور اپنے سامان میں سکون اور گولیاں تلاش کیں جو میں کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ شبنم نے مزاحمت نہیں کی اور دو گولیاں کھانے کے بعد سیدھی لیٹ گئی۔

ایک اعصاب شکن حد تک بو بھل اور قابل نفرت خاموشی میں وقت کا ہر لمحہ مجھے شرمسار کرتا ہوا گزرنے لگا۔

میرا ضمیر صاف تھا مگر میرا دل مجھے اس ناخوشگوار صورت حال پر ملامت کر رہا تھا۔ میں نے شبنم کو لیٹ دلا دیا تھا کہ میں زندگی کے پہلے دور میں ناصر عظیم تھا۔ سیاست دان کی حیثیت سے میں شاہ عالم مشہور ہوا لیکن اب میں پھر اپنی اصل زندگی کی طرف لوٹ کے ناصر عظیم بننا چاہتا ہوں اور جو فرق ناصر عظیم کے کردار میں تھا وہی اب شاہ عالم کے کردار میں بھی نظر آئے گا۔ شبنم نے میرے جھوٹ کو دل سے سچ مان لیا تھا اور

زندگی کا ایک نیا دور شروع کرنے میں میری پوری مدد بھی کی تھی مگر وہ اپنے جذبات کو نہیں بدل سکی تھی۔ وہ میرے ساتھ اسی طرح رہنا چاہتی تھی جیسے شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھی لیکن میں اس سے تعلق کے معاملے میں اپنے مضابطہ اخلاق کے اصولوں کو پامال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میری بدلی ہوئی

شخصیت کے رویے کو دیکھتی رہی اور مجبوراً برداشت بھی کرتی رہی مگر آج جذبات کی آتش فشاں نے شرم و حیا کی زنجیریں توڑ کے اسے دیوانگی کی اس سرحد تک دھکیل دیا جہاں وہ ایک صحابی، ایک معزز تعلیم یافتہ عورت اور ایک ایڈیٹری انسانی سطح سے مگر کرشم کی بھوک کے جذبات سے مغلوب حیوان رہ گئی تھی۔

دیوانگی کے اس دورے سے گزرتے ہی اعصابی کمزوری اس پر غالب آگئی تھی۔ وہ چند منٹ کے اندر اندر ہر سکون ہو کے سو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب وہ سو کر اٹھے گی تو اس پر اس دورے کے وقوع عمل کی پشیمانی اور ملامت کے جذبات کا دورہ پڑے گا اور وہ اپنے آپ سے اتنی شرمسار ہوگی کہ میرا سامنا نہیں کر پائے گی۔

جب مجھے پورا یقین آگیا کہ وہ بے ہوشی کی گہری نیند میں گم ہو چکی ہے تو میں نے صوفے پر لیٹ کے فون کو اپنے قریب کیا اور فکر کے گھر کا فون نہر لایا۔

گھنٹی بانچ پانچ بار بجی، پھر قمر نے غصہ کی میس کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "آجی، السلام علیکم!"

قمر نے ایک چیخ ماری "یہ تم بول رہے ہو بھائی!"

میں نے کہا "تمہیں۔۔۔ تمہارے کان بج رہے ہیں۔"

وہ چلائی "کہاں ہو تم بھائی! جب سے لندن گئے ہو ایک بار فون کیا تھا۔ وہ بھی ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔ مصروفیت میں بہن کو بالکل بھلا دیا۔"

میں نے آہ بھری "مصروفیت کا مت پوچھ بہنا!"

"بہت دس دن کا کہہ گئے تھے تم بھائی اور جب چندا آئی تھی واپس تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے بھائی بھی لوٹ آئیں گے دو چار دن میں۔"

میں نے کہا "شاید دو چار ہفتے کہا ہو گا۔ اور دیکھ میں آگیا۔"

اس نے ایک اور چیخ ماری "کیا؟ تم آگئے ہو بھائی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر اگلی پرواز سے واپس جا رہا ہوں۔"

وہ ہنس گئی "ارے نہیں بھائی۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تو بھول ہی گئی ہوں چاکلیٹ کھانا!" اس نے ایک ٹھنڈی

سانس لی۔

میں نے کہا "ارے اُداس کیوں ہوتی ہے؟ تیرا بھائی سب کچھ بھول سکتا ہے۔ چاکلیٹ نہیں بھول سکتا وہ الو کا چھا تو مرا پڑا ہو گا۔"

وہ ہنسی "نہیں بھائی، جاگ رہے ہیں اور گھور رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی آواز آئی "خیر سے بدھو گھر لوٹ آئے؟"

میں نے کہا "ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے ہمیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے۔"

"اور اب فون کرنے کا خیال آیا ہے، آدمی رات کے بعد۔"

میں نے کہا "یار وہ ایک پریس کانفرنس تھی۔"

"میں نے دیکھ لیا تھا تیرا پروگرام اخبار میں۔ اس وقت کہاں سے بول رہا ہے تو؟"

"بیشک کی طرح اپنے منہ سے۔ اور منہ دیکھا جا سکتا ہے جی سی کے وی آئی بی سوئٹ نمبر دو میں۔"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟"

میں نے ایک نظر گہری نیند میں سوئی ہوئی شبنم کو دیکھا "یار کیا بتاؤں؟ شرم آتی ہے جاتے ہوئے۔ ویسے تو بھائی ہوتی ہے رشتے میں قمر کی۔ مگر یار ہے خالص ولایتی مال۔ فرنگی حسینہ ہے۔"

"تو میم لے آیا ہے؟"

میں نے کہا "اے نہیں یار۔ میم مجھے لے کر آئی ہے پاکستان۔ اتنی محبت کرتی ہے مجھ سے کہ کہہ رہی تھی تمہیں پاکستانی بیوی بن کے دکھا دوں گی۔ شش ٹاک برقع پہنوں گی۔ ہر سال کم سے کم ایک بچہ دوں گی۔ تمہارے پاؤں دھو دھو کے پیوں گی۔ روز سواری دال پکاؤں گی اور کونوں کی یہ منہ اور سواری دال۔ کیا نصیب نہیں میرے۔"

وہ ہنسنے لگا "اب لے آیا ہے کسی میم کو تو قمر کیا کر سکتی ہے؟"

فورا ہی قمر کی آواز آئی "یہ کیا بھائی، تم نے کسی میم سے شادی کر لی ہے۔ کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کر رہے تھے؟"

"نہیں قمر۔ مذاق تو تقدیر نے کیا ہے میرے ساتھ۔ میں نے دردناک لہجہ بنا کے کہا "وہ کیا کہا ہے مگر علی نے گستاخ اکھیاں کھتے جالڑیاں۔ نصیب میں جو لکھا ہو وہ ہو کے رہتا ہے۔ یہ ہے تو میم مگر تو دیکھ گی تو خوش ہو جائے گی۔"

وہ مجھ کے بولی "مجھے کوئی شوق نہیں بھائی، آپ کو ہی مبارک ہو وہ امپورٹڈ ولایتی بیوی۔ رتبہ کئے ہوں گے سفید چڑی پر۔"

میں نے کہا "ارے نہیں قمر۔ بے شک وہ ولایتی چیز ہے مگر رنگ اس کا ہے بالکل اس تو نے جیسا جس پر تو روئیاں تھوپتی ہے۔"

"یعنی نیکو ہے وہ۔" قمر پٹا کے بولی۔

"بات رنگ کی نہیں قمر۔ دل آنے کی ہے۔ اب ویسے تو وزن بھی اس کا ہے۔ دو سو بیس پاؤنڈ۔ اور بے کچی کرکچن۔"

"تم نے مسلمان کیے بغیر اس سے شادی کر لی بھائی! قمر رونے کے قریب ہو گئی۔

"بات یہ ہے قمر کہ سارے کھیل نفیب کے ہیں۔ اسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں کیا اس کا دل توڑتا؟ یہ گناہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھ سے شادی کر گئے؟

میں نے کہا کہ میری تو مرضی نہیں ہے۔ وہ بولی چلو تاس کر لیتے ہیں۔ بڑی انصاف پسند ہے وہ۔ کسی معاملے میں میرے ساتھ زبردستی نہیں کرتی۔ تاس سے فیصلہ میں نے قبول کر لیا۔ تاس میں ہار گیا۔ اس کے بعد آیا معاملہ مذہب کا تو میں نے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ وہ پھر بولی کہ تاس کر لیتے ہیں۔ اور اب میں کیا کہوں؟ میں پھر تاس ہار گیا۔ شادی کے بعد میں نے کہا کہ اب ہم ولایت میں نہیں، پاکستان میں رہیں گے تو پھر تاس پر فیصلہ ہوا۔ وہ جیت گئی اور مجھے اس کو ساتھ لے کر آنا پڑا۔

ابھی کل تاس کیا کہ پاکستان پہنچ کے کہاں جائیں گی۔ وہ بولی پی سی اور میں نے کہا کہ میں گھر۔ یہ بھی میں ہار گیا۔ اب تو سی بتا "میں کیا کہوں؟ وہ تو کہہ رہی ہے کہ تاس کر لو، پھر کس کے ہو گا، میرے یا تمہارے؟ اس کے بعد تاس کریں گے کہ لڑکا ہو یا لڑکی؟"

قمر کا ہنسنے پڑے برا حال ہو گیا "آپ پھر ہار جائیں گے بھائی!"

میں نے کہا "اچھا! باقی باتیں ملاقات پر۔ میں صبح آؤں گا۔"

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں بھائی؟"

میں نے کہا "جس آدمی کا کوئی گھر نہ ہو وہ کہاں جائے۔"

"کیوں بھائی، میرا گھر آپ کا نہیں ہے۔"

"افسوس کہ مجھے بھوکنا نہیں آتا۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "تو نے سنا نہیں۔ بہن کے گھر بھائی کتا۔"

ماس کے گھر جو اب کتا۔

"مت کریں ایسی باتیں بھائی۔ یہ آپ کے دوست کا گھر بھی تو ہے۔"

میں نے کہا "اچھا یہ بتا چندا کا کیا حال ہے۔"

"آپ خود پوچھ لیں فون کر کے" وہ بولی "اس کا فون نمبر الگ ہو گیا ہے؟" اس نے مجھے نہر بتا دیا۔

میں نے کہا "اچھا اب تو سو جا۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

چند اخطاف وقوع جاگ رہی تھی۔ میں نے کہا "کیسی ہو تم؟"

وہ بولی "جیسی پہلے تھی، جیسا تھی۔"

اس کی بات میں مجھے طنز کی آمیزش محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بالواسطہ طور پر وہ مجھے یاد دل رہی ہے کہ یہ تم ہی ہو جو ناصر عظیم سے شاہ عالم نے تھے پھر شاہ عالم سے ناصر عظیم سب سے اور آج کل پھر شاہ عالم ہو۔ اس کے بعد تم ناصر عظیم بن کے رہنا چاہتے ہو۔ لیکن دنیا کے باقی لوگ ان کے رشتے ان کے روز و شب سب وہی ہیں۔ میں جیسی تھی، ویسی ہی ہوں اور ویسی ہی رہوں گی۔ آج بھی، کل بھی مجھ سے یا رئیس سے "قمر سے یا کمال سے یہ کیا پوچھنا کہ کیسے ہو؟

میں نے کہا "یہ صرف تمہارا خیال ہے کہ تم ویسی ہی ہو۔"

وہ ہنسی "کیوں؟ تمہیں کیا تبدیلی محسوس ہوئی؟"

میں نے کہا "تمہیں رات کو کھانا کھاتے ہی نیند آنے لگتی تھی۔ سونے کی ماہر تھیں تم۔ تمہیں تو جگانا بھی ایک مرحلہ ہوا تھا۔ لیکن اب تم رات کے ایک بجے بھی جاگ رہی ہو؟"

وہ بولی "تم کب آرہے ہو؟ لندن کے بارے میں صحیح کہتے ہیں لوگ کہ یہ آدمی کو اسیر کر لیتا ہے۔"

میں نے کہا "صرف انہی کو جو اسیر ہونا چاہتے ہیں۔"

"تم شاید بھول گئے کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے سے بہت کچھ کہا تھا۔"

میں نے کہا۔

"چالاک آدمی۔ بات کو گھمانے کی ضرورت نہیں۔ تم دو دن بعد ہی واپس آ رہے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ میں پرسوں روانہ ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا "بعض اوقات تقدیر آدمی کے راستے میں نظر نہ آنے والے جال پھیلا دیتی ہے۔"

"خیر، مجھ تو۔ اب کیا پروگرام ہے تمکب آرہے ہو؟"

میں نے کہا "تم کو تو ابھی پہنچنا ہوا اس وقت!" وہ بھی پہنچ جاؤ۔"

میں نے رسیور رکھا۔ ایک نظر سوتی ہوئی شبنم پر ڈالی اور دروازے کو اپنے پیچھے ہست سے بند کر کے باہر نکل آیا۔ ہوش کا کوریڈور سسنا بڑا تھا لیکن کچھ کمروں میں روشنی تھی اور کچھ بند دروازوں کی تاریکی کے پیچھے سے دہلی دہلی ہنسی اور خود اپنی کمائی کمتی سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں زینے سے اترتا تو مجھے لالی میں اور اس کے آگے کافی شاہیں میں بہت سے لوگ نظر آئے جو بے فکری سے باتیں کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے سگریٹوں کا دھواں ازار ہے تھے اور کالی کو انجوائے کر رہے تھے۔

ہوش کے صدر دروازے پر اس وقت جو دو ٹیکسیاں موجود تھیں۔ میں نے آگے والی ٹیکسی کے ڈرائیور کو کمال کے اسپتال کا پتا سمجھایا تو وہ کچھ تذبذب میں پڑ گیا۔ کمال کا اسپتال مٹان روڈ پر نسبتاً غیر آباد علاقے میں تھا اور آدھی رات کے بعد ٹیکسی والے کو وہاں سے واپس پر سواری ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میرے چلنے کا دستور اب تقریباً ہر شہر میں ختم ہو چکا تھا۔ ریکشا ٹیکسی والے منہ بھاڑ کے دہلی رقم مانگتے ہیں اور ضرورت مند اپنی مجبوری یا... وقت کو دیکھتے ہوئے سودا کر لیتا ہے۔

رات کے پونے دو بجے کمال اسپتال کا چوکیدار بھی اپنے کیمن میں سو رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر بیدار کیا تو اس نے مجھے بچان کے گیت کھول دیا۔ پانچ منٹ بعد میں چندا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کمال اور قمر کا گھر تھا مگر وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور پھر کچھ اونچی آواز میں۔ تو اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی مجھ میں آئی۔

چند اے اندر سے ہی پوچھا "کون ہے؟" میں نے کہا "وہی جسے تم نے فوراً پہنچنے کا حکم دیا تھا۔" چشم تصور سے میں نے چندا کی صورت پر شاگ اور بے یقینی کے آثار کو دیکھا اور پھر اس پر مسرت مسکراہٹ کو جو اس کے سیاہ جذبات سے عاری چہرے پر صبح کی شفق بن کے روشن ہو گئی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے مسکرا کے کہا "بلا تو لیا ہے کیا اب اندر آنے کے لیے نہیں کوئی؟"

"بڑے ڈرامے باز ہو تم۔" اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

"ڈراما کیا۔ تم نے بلایا اور ہم چلے آئے" بقول فلمی شاعر۔

اس نے صحن کا دروازہ بند کیا "تم نے یہیں سے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا "جب تم سے بات ہوئی آخری بار تو میں لندن میں تھا۔ مگر تم نے ماما کو ابھی آجاؤ تو میں نے خیال کے ساتھ پرواز کی اور بس حاضر ہو گیا۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور اس کے بال بھی سمٹھے ہوئے تھے۔ جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی وہ ٹیکے پر الٹی کھلی پڑی تھی۔ چندا مجھے پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور تھکی ہوئی نظر آئی حالانکہ اس کی ادائے حسن کی معصومیت کا انداز پہلے سے زیادہ جان لیوا ہو گیا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا "کب آئے؟" میں نے کہا "تقریباً چھ گھنٹے ہو گئے ویسے تو۔ لیکن یہاں آتے ہی ایک پریس کانفرنس سے نمٹنا پڑا۔"

"مفروضہ معلوم ہے؟" میں نے کہا "پہلے اسے فون کیا تھا۔ اسی نے تمہارا نیا نمبر دیا۔"

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ "بہت مصروف رہے تم؟"

میں نے کہا "تم نے کیسے اندازہ کیا میری صورت سے؟"

"نہیں۔ میں اخبار بھی دیکھتی رہی ہوں۔"

"تمہاری مصروفیت کا اندازہ تمہاری صحت سے ہو جاتا ہے۔ تم بہت زیادہ کام کر رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "کام زیادہ کہاں ہوتا ہے۔ وہی ایک معمول ہے صبح سے شام تک۔"

میں نے کہا "اور شام سے رات تک تم اس گوشہ تنہائی میں قید رہتی ہو۔ کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں، تھوڑی بہت گھر کی صفائی۔ کچھ دیر کا کام فی دی دیکھتی ہوں کتابیں پڑھتی ہوں۔ رات کو اسپتال کی لائبریری سے اخبار لے آتی ہوں۔ دل نہ لگے تو اسپتال کا چکر لگاتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ اکیلا پن تمہاری زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ تم معمولات کے اس دائرے سے باہر کب نکلتی ہو؟"

"مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے کمال اور قمر کے ساتھ بازار بھی جاتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم ان کی طرف بالکل نہیں جانتی۔ وہ ادھر نہیں آتے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آتا جاتا لگا رہتا ہے۔ مگر ان کی ایک پرائیویٹ لائف ہے۔ تم نے اسپتال میں کوئی تبدیلی دیکھی؟"

میں نے کہا "میں نے غور نہیں کیا۔"

وہ بولی "اسپتال کے دو نئے بلاک نظر نہیں آتے جنہیں؟"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بات یہ ہے کہ ایک تو میرا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا نہیں۔ پھر ادھر اندھیرا بھی تھا۔"

وہ بولی "اب تو کام تقریباً مکمل ہو رہا ہے۔ فٹنگ باقی رہ گئی ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ مشینری اور اسپتال ایکوپ منٹ جس کی خریداری کے لیے تم لندن آئی تھیں؟"

"نئی فرموں کے نمائندوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ سامان کراچی پورٹ پر پہنچ گیا ہے اور اب سڑک کے راستے لاہور لایا جائے یا گندڑ نرین سے۔ ہم نے روڈ ٹرانسپورٹ کو ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد آئے گا تنصیب کا مرحلہ۔"

میں نے کہا "کب تک کام شروع کر دے گی لیبارٹری اور دوسری مشینری۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تین ماہ کے اندر اندر اسپتال میں سب کچھ ہو گا۔ جدید انکسرس پلانٹ، موبائل یونٹ۔ سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی۔"

میں نے کہا "مگر آئے مہمان کو کیا چاہئے کے لیے بھی نہیں پوچھو گی۔"

اس نے کہا "تم مہمان بن کے آئے ہو؟"

میں نے کہا "مگر تمہارا ہے، تم جو چاہو سمجھو۔"

وہ اٹھی "آؤ وہیں باتیں کریں گے۔"

میں بچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور اسے چائے بناتے دیکھتا رہا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ خاصی بدل گئی تھی۔ وہ پہلے جیسی چاق و چوبند، پھرتیلی اور تیز طرار نہیں رہی تھی۔ اس کے انداز و اطوار اور حرکات و سکنات میں ایک نکان زور ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ اس کی چٹیلی طبیعت اداس کی شوقی خوش باشی اور زندہ دلی کی جگہ ایک پرسکون نظر آنے والی متانت اور دھیمے پن والی خوش مزاجی نے لے لی تھی جو بعض اوقات مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ کرتی تھی۔

اس کی وجہ مخالف حالات کا نامریاں رویہ تھا جس کا

سلسلہ میری بے راہ روی سے شروع ہوا تھا۔ خان جی کو میری بے گامگی اور بے دفاعی کے احساس نے توڑ کے رکھ دیا تھا اور انہیں میرے شاہ عالم بن جانے سے بہت اذیت ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ غلط ہو گئیں تو انہیں مایوسی کے صدمات نے بیمار کر دیا۔ چندا نے ان کی بیماری کا طویل مہر آزا اور حوصلہ شکن دور اکیلے حالات کا مقابلہ کرتے گزارا جب میں بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ پھر خان اعظم کی موت نے اسے پہلی بار بے سارا، تنہا اور کمزور ہونے کا احساس دلایا۔

گزشتہ کئی ماہ سے وہ دوسروں کے چھوٹے سے قید خانے جیسے گھر میں اپنے اکیلے پن سے لڑ رہی تھی۔ خود کو مصروفیت کی پناہ میں محفوظ رکھنے پر مجبور تھی اور معمولات کے بیزار کن ماحول میں جینے کا عذاب جھیل رہی تھی۔ اس معمول میں سوائے دکھ اور بیماری سے شگوبہ لب سسکتے کراہتے صبح سے شام تک موت اور زندگی کی جنگ میں ہارنے جیتنے مریضوں اور ان کے فریاد کنان، آؤ اس چروں کے ساتھ دست بدعالمو احقین کے درمیان بھاگ دوڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے گرد و پیش کے ماحول کی المناک دیرانی، ناامیدی اور بے بسی چندا کی زندگی میں بھی ایسے اتر آئی تھی جیسے کھلے دروازوں اور روش درپچوں والے کشادہ گھر میں نامعلوم طریقے پر شام کے مٹھن پیدا کرنے والے سائے گھس آتے ہیں۔

چند اے چائے میرے سامنے رکھی "تم تو پلک جھپکنا ہی بھول گئے ہو۔ ایسے کیا دکھ رہے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں تبدیلی دیکھ رہا ہوں جو اندر سے آئی ہے۔"

وہ میرے سامنے ایک شایف کے سارے پر تک گئی "وقت کے ساتھ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "اچھا وقت گزر گیا ہے جب ہم سب میں تم اور خان جی ایک ساتھ تھے۔ تم نے ستار بنانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے درمیان کب سے جوڑو کرانے کا کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔"

وہ غلا میں دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "لیکن اچھا وقت پھر آئے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تمہاری یہ اداسی اور اکیلے پن کا جھوڑا میری زندگی کی بے ترتیبی اور شب و روز کا انتشار، یہ سب ختم ہو جائے گا۔"

وہ بولی "تم فلسفی اور قلمی ہو رہے ہو۔"

میں نے کہا ”میں دہری زندگی کی اذیت اور ہرست محسوس ہونے والی غیرت کے عذاب سے گھبرا گیا ہوں چندا۔ اپنوں سے دور ہو کے میں اتنا ہی اکیلا محسوس کرتا ہوں جتنا غیروں کے جھوم میں محصور ہو کے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ میں واپس آ رہا ہوں۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا اور پھر ہم سب مل کے اچھے دنوں کو بھر منائیں گے جو ہم سے دو گھ گئے ہیں۔ ہم ایک بہت بڑا خاندان ہیں چندا۔ جس میں سب قلعے ’بے ریا پار کرنے والے اور محبت کے قابل لوگ ہیں۔ میں ’تم‘ ’تمرا اور کمال۔ رہیں اور نیک۔ یعنی اور عاقل۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ انہوں نے شادی کر لی ہے۔“ وہ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے چوکی ”کس نے؟“ میں نے کہا ”یعنی اور عاقل نے لندن میں۔“ وہ بولی ”میں ان سے اتنی زیادہ واقف نہیں۔“ ”مگر وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا تم لندن میں ان سے ملی نہیں تمہیں؟“ ”وہ بس سرسری ملاقات تھی۔“ میں نے کہا ”تم انہیں کو تو جانتی ہو نا؟“ ”وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ ڈاکٹر کمال سے بھی پہلے کا۔“

”ہاں۔ وہ شادی کر رہا ہے۔ نیلم سے۔ نیلم کا نام تو سنا ہو گا تم نے۔ مجھ پر اس کی بڑی مہربانیاں ہیں۔“ اس نے سر ہلایا ”تم اکثر اس کا ذکر کرتے تھے لیکن میں کبھی ملی نہیں اس سے۔ ویسے تو وہ صوفی اول کی بیروئن ہے۔ کون نہیں جانتا اسے۔ مگر اسے رہیں میں کیا نظر آیا؟“ ”وہ جو تمہیں کبھی نظر نہیں آیا۔“ میں نے گھڑی دیکھی ”میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہیے۔“ وہ ابھی ”تاہم ختم ہو گئیں یا خیر آ رہی ہے؟“ میں نے کہا ”تم ساری رات جاگتی رہو گی تو صبح مریض جھکتیں گے۔“ ”قرعے نہیں ملو گے؟“

”میں نے اسے فون کر لیا تھا۔ کمال سے بھی بات ہو گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی ”اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“ اس نے اچانک آہستہ سے کہا۔ میں نے سر ہلایا ”تمہاری ایک امانت بھی ہے میرے پاس۔“ ”وہ کیا ہے؟“ ”اگلی بار آؤں گا تو سربراہ مزدوں گا۔ میں لندن سے لے

کر آیا تھا مگر اس وقت لا نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت قیمتی چیز ہے۔“ ”کوئی خفیہ ہے؟“ ”خفیہ ہی سمجھ لو۔ مگر خانہ کی مرحوم کا۔“ اس کی حیرانی اور تجسس میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن میں نے اسے اور کچھ نہیں بتایا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میرے چاروں طرف ایک پُر سکون رات کا سا ناٹا تھا جسے وقفے وقفے سے کسی وارڈ کے مریض کی پُر اذیت کراہ مجروح کر دیتی تھی۔ اسپتال کے لمبے کوریڈور میں بھی روشنیاں کم کر دی گئی تھیں اور وارڈوں میں زیرووات کے بلبوں کا اجالا رہ گیا تھا۔ باہر کے باغ کی لائٹس آف تھیں مگر گیت کی طرف سے آنے والی دھندلی روشنی میں مجھے نئے تعمیر شدہ اسپتال بلاکس کے ضد وخال صاف نظر آ رہے تھے۔ دو لمبی لمبی تاریک بیرکس کسی مستطیل کے دو اضلاع کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اوپر آسمان ستاروں سے روشن تھا اور آخری دنوں کا چاند مشرق سے مغرب کی طرف ست روی کے ساتھ گامزن تھا۔ گیت کے قریب پہنچ کے میں نے مرنے سے پہلے پلٹ کے دیکھا۔ چندا ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ اندھیرے کے پس منظر میں دروازے کی روشنی مستطیل ایک فریم کی طرح دکھائی دیتی تھی اور چندا اس میں لگی ہوئی کسی تصویر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بلایا اور جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلا کے مجھے خدا حافظ کہا۔ رات کے آخری پہر میں لٹان روڈ پر نرسنگ برائے نام رہ گئی تھی۔ مجھے عیسیٰ کی تلاش میں دو گھنٹہ تک پیدل مارچ کرنا پڑی۔ پھر ایک خالی کمرے ہوئے رکشا کے ہم خواہیدہ اور مجھے ہوئے ڈرائیور نے مجھے دگنے کرائے کے معاہدے پر اجازت دی کہ میں رکشا میں تشریف رکھوں۔ ضرورت مند وہ بھی تھا ورنہ اس وقت اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ سو رہا ہوتا لیکن میں زیادہ مجبور تھا۔ مجھے صبح ساڑھے چار بجے باہر سے آنا ہوا دیکھ کے ناٹ ڈیوٹی والے اسسٹنٹ میجر نے واجبی سی حیرت کا اظہار کیا لیکن خاموشی سے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ پرنس سیکورٹی کے معاملے پر اختلاف رائے کے باعث اس کے اور میرے تعلقات میں گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ آواز کیے بغیر دروازہ کھول کے کمرے میں جھانکا۔ خیمہ اسی طرح بند پڑے جس و حرکت لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے جوتے اتار کے کمرے بدلے۔ دروازے کو اندر سے قفل کیا اور صوفے پر گر کے

سو گیا۔ تھکن سے میرا یہ حال تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ پانچ گھنٹے بعد صبح دس بجے میری آنکھ کھلی تو میں نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک انگڑائی کے کراہنے بیٹھا۔ میری نظر بند پڑ گئی۔ بند خالی تھا۔ خیمہ صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے بتائے بغیر اپنے احساس شرمندگی کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ میں نے کاؤنٹر سے معلوم کیا ”میرا کوئی فون یا ملاقاتی؟“ انہوں نے بتایا ”کوئی مسٹر رئیس دوبار فون کر چکے ہیں۔“

میں نے ناگواری سے کہا ”مجھے بتایا کیوں نہیں کیا؟“ ”شاید آپ بھول گئے۔ سب آپ نے فون پر دھمکیاں لینے کے بعد کال لینے سے منع کر دیا تھا۔ لیجئے ان کا فور پھر آ گیا ہے۔“ ”شاید۔“ میں نے چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا ”ہیلو۔“ دوسری طرف سے رئیس نے مجھے گالیاں دینی شروع کیں ”سالے ہیلو کی اولاد۔ اب یہ فوبت آگئی ہے کہ ہم سے بھی بات نہیں کرنا الو کے بچے۔“

میں نے کہا ”سوری یار۔ میں ابھی سوکے اٹھا ہوں اور کل میری رب نواز سے گرما گرمی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے خود کو دبا تھا کہ میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔“ اس کی نفی کم نہیں ہوئی ”بے تو مت کر ہم سے بھی بات۔ ہم تو اچھے بھلے جا رہے تھے لندن۔ تو نے ہی روکا تھا کہ مجھے کام ہے۔“

میں نے کہا ”خفا کیوں ہوتا ہے پارے۔ اپنے تو سارے کامہد کے ہوئے ہیں تیرے بغیر۔ تو آجا فوراً۔“ نیلم گالیاں ہے؟“

”ہم خوار ہو کے ناٹ کوچ سے پہنچے تھے۔ وہ آتے ہی سو گئی تھی۔ میں بھی ابھی اٹھا ہوں۔“

”چل ٹھیک ہے۔ ناشتا کھائے کریں گے۔“ میں نے کہا ”دور فون بند کر کے غسل کے لیے ہاتھ روم میں ٹھس گیا۔ وہاں کپڑوں کے اسٹینڈ پر مجھے خیمہ کی ایک خالص زنانہ استعمال کی چیز نظر آئی۔ مجھے سخت خفت محسوس ہوئی۔ اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو نہ جانے کیا رائے قائم کرتا۔ تاہم اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ صبح خیمہ فرار نہیں ہوئی۔ اس نے اطمینان سے غسل کیا اور ممکن ہے روم سروس سے منگوا کے بریک فاسٹ بھی کیا ہو۔ اس کا گزشتہ شب کا رویہ میرے لیے بڑا پریشان کن ثابت ہوا تھا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ خیمہ برسوں سے شاہ عالم کے التفات کی عادی تھی

جو ذہنی سے زیادہ جسمانی ہوتا تھا۔ میں ناممکن عظیم تھا اور اگرچہ میں نے اپنے رویے کی تبدیلی کے ساتھ خیمہ کو دلا تل سے بھی قائل کیا تھا کہ میرے اس کے مراسم کس حد تک دوسرا رہیں گے مگر خیمہ نے پوری طرح اس حد بندی کو قبول نہیں کیا تھا۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیمہ کو ابتدا ہی سے وہ گھریلو ماحول میسر نہیں آیا تھا جس میں والدین اپنے بچوں کو اپنے رہن سہن کے مطابق ایک مخصوص ضابطہ اخلاق کی پابندی سکھاتے ہیں جس پر وہ خود مختار ہونے کے بعد بھی عمل پیرا رہتے ہیں۔ خیمہ کی تربیت آزاد صاحب نے کی تھی جو ساری عمر ازدواجی زندگی کی سب ڈسٹے واریوں سے بھی آزاد رہے تھے۔ انہوں نے خیمہ کی مادی ضروریات کا خیال رکھنے میں کمی نہیں کی تھی مگر وہ اس کو ماں کی طرح یہ نہیں سمجھا سکے تھے کہ ایک مشرقی لڑکی کو روایات کے زنداں میں خود حفاظی کے کتنے سخت انتظامات کے ساتھ جینا پڑتا ہے ورنہ اس پر آبداخت ہونے کا لیل جتنی آسانی سے لگ جاتا ہے اتنی آسانی سے اتارا نہیں جاسکتا۔

لیٹا خیمہ باغی رجحانات رکھتی تھی اور آزاد صاحب نے اپنی روشن خیالی کے چکر میں اس کی ترقی پسندانہ آزاد روش کو آوارہ مزاجی تک جانے سے نہیں روکا۔ مزید یہ کہ اس نے ایک ایسا پیشہ اختیار کر لیا جس میں اس کی بے باکی کو سراہا گیا اور اس کے خود سر اطوار کو خود اعتمادی کا قابل فخر معیار قرار دیا گیا۔ اس کا تہیہ شاہ عالم کے ساتھ ایسے مراسم کی صورت میں نکلا جو اسے رسوائی کی سند کے سوا کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ معلوم نہیں شاہ عالم نے اس پر کیا جادو بڑھ کے چھوٹا تھا کہ وہ اسی کی دیوانی ہو کے رہ گئی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کا بڑا سراہا طلسم تھا یا اس کی دیوانی کشش کا جذبہ کہ مجھے شاہ عالم مان لینے کے بعد وہ قطعی غیر مشروط انداز میں اپنا تن من و دھن سب کچھ مجھے ہر وقت سوچنے کے لیے تیار تھی اور میرے کسی انداز پرے رخی سے اس کا ایک طرفہ انداز جنوں کم نہیں ہوتا تھا۔ کسی حد تک میں نے اسے مشتق اور ہوس کا فرق سمجھا دیا تھا لیکن اس کی سوچ کو بدلنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔

غسل کے بعد میں نے اپنے کمرے میں ہی ناشتا منگوا یا اور ناشتا آنے تک تمام اخبارات میں شاہ عالم کی پریس کانفرنس اور اس کے سیاسی عزائم پر تبصرے ملاحظہ کیے۔ اتفاق رائے اس بات پر پڑا جاتا تھا کہ شاہ عالم اپنی خیالی زندگی سے خواہ کتنا ہی اوپر اٹھ جائے، حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی

کہ اب اسے یا اس کی جماعت کو آنے والے انتخابات میں کوئی بفرہ ہی توڑی بہت کامیابی دلا سکتا ہے۔
ان تیسروں سے زیادہ میرے لیے وہ خبریں اہم تھیں جن میں شاہ عالم کی زندگی کو لاحق خطرات کا حوالہ تھا اور ان دھمکیوں کا ذکر تھا جو اسے اپنے سیاسی مخالفین اور "سازشی عناصر" کی طرف سے مل رہی تھیں۔ شبنم کی ہدایات کے مطابق اس کے نو ذیلی شرٹے ان چار افراد کا بھی ذکر کیا تھا جو خطرناک عزائم کے ساتھ شاہ عالم کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رہنماں ناشتالانے والے دیگر کے ساتھ ہی اندر آگیا۔ اس کی وضع قطع نے پھر مجھے حیران کیا۔ وہ بہترین سٹل ہونے سفاری سوٹ میں تھا اور اس کے جوتے پالش سے چمک رہے تھے۔ شبنم سے اب تک میں نے کبھی بھی اسے ڈھنگ کے کپڑوں میں نہیں دیکھا تھا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ نلیم نے اسے ایک نئی شخصیت دینے کے پروگرام پر سختی سے عمل شروع کر دیا ہے۔ عورت جب کسی کو چاہے تو اسے اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی روپ دے سکتی ہے۔ نلیم نے اپنی توجہ سے رہنماں کو ایک نمایاں شخصیت بنا دیا تھا۔

"قسم اللہ کی بارے۔ بیٹ میں جو ہے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو کھاجائیں۔"

میں نے کہا "رہنماں تو نے اخبارات دیکھے؟"

"ابے لعنت بھیج اخباروں پر" وہ ناشتے پر ٹوٹ پڑا "خبریں کیا ہوں گی۔ وہی روز کی گھسی پٹی۔"

گیارہ بجے خود میرا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور رہنماں نے ڈٹ کے ناشتا کیا۔ پھر وہ مجھے اپنی ٹائٹ کوچ سے سفر کی چٹانے لگا۔ ناشتے کے بعد میں نے سوچا کہ رخصتی اور فرید عباسی کو بھی اپنی ولایت سے واپسی کی اطلاع دے دوں لیکن ان کے گھر پر گھنٹی بجتی رہی۔ رہیورسکی نے نہیں اٹھایا۔

"فرید عباسی تو ہو گا کورٹ میں؟"

میں نے کہا "اور رخصتی؟"

"وہ آج کل عباسی کا آفس سہنہاتی ہے۔ فرید تو شام کو آتا ہے۔ رخصتی دوپہر کے وقت پہنچ جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے اس نے ایک سیکریٹری کو بھی فارغ کر دیا ہے۔ دفتر میں ایک ٹائپسٹ رہی ہے مگر وہ بھی کوئی عمر رسیدہ ناقابل دید خاتون ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "دودھ کا جلا چھچھوٹ پھونک پھونک کے چیتا ہے۔ شاہ عالم خوب عیش کرتا تھا سیکریٹریوں کے

ساتھ۔ فرید کو وہ کوئی موقع نہیں دے گی۔ تو کب ملا تھا ان سے آخری بار۔"

وہ کچھ خفیف ہوا "مجھے... ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا۔ درمیان میں ایک بار فرید سے بات ہوئی۔ وہ تیرا پوچھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رخصتی قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہی ہے۔ وکیل بن جائے گی اور میاں بیوی مل کے شوق کریں گے۔"

"مشق؟ حتمی مطلب ہے پریکٹس۔"

"ابے ہاں یار۔ اردو میں گھر دیا تو کیا غلط ہو گیا؟"

میں اور رہنماں ناشتے کے بعد بھی ایک گھنٹے تک اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ اپنی اور چند اکی ملاقات کے بارے میں بتایا اور رب نواز سے فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا لیکن شبنم کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی زیادہ تر باتوں کا محور نلیم ہی۔ نلیم کیا ہے، کیسی ہے؟ اس کے لیے کیا کرتی ہے؟ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اس کے خیالات، جذبات اور محسوسات پر نلیم کی حکمرانی ہے۔

بارہ بجے جب اسن واماں تھا۔ اس کے بعد پرانے پارٹی ورکرز کے ٹیلی فونوں کا نامنا بندھ گیا۔ ان میں شہر میرے لیے وقوف خیر خواہ تھے جو آج بھی میری سیاسی کامیابی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا کہ بہت جلد میں پارٹی آفس میں بیٹھنا شروع کروں گا تو تمام کارکنوں سے ملاقات کروں گا۔ خلاف توقع ایک ٹیلی فون اسے لاتے کے ڈی ایس بی نے کیا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ کیا اپنی زندگی کو لاحق خطرات کے پیش نظر میں پولیس کی سیکورٹی لینا چاہوں گا؟ میں نے اسے شکریہ ادا کر کے ٹال دیا کہ ضرورت پڑے گی تو میں کسی پرائیویٹ سیکورٹی کمپنی سے گارڈ حاصل کروں گا۔

سازمے بارہ بجے اچانک فرید کا فون آگیا۔ "مجھے اخبارات دیکھ کے تمہاری تشریف آوری کا علم ہوا۔"

میں نے کہا "میں نے تمہارے گھر فون کیا تھا۔ دس بجے کے قریب۔ مگر شاید گھر پر کوئی نہیں تھا۔"

"ہو آجی کیسے؟" وہ بولا "میں صبح آٹھ بجے کورٹ کے لیے نکل جاتا ہوں۔ رخصتی دس بجے آفس پہنچ جاتی ہے۔"

میں نے کہا "آفس کا مجھے خیال نہیں آیا۔ ابھی رہنماں نے بتایا کہ رخصتی نے آفس کا چارج سنبھال لیا ہے۔"

"وہ ایک حیرت انگیز عورت ہے یار۔ اس نے گھر کے

ی نہیں دفتر کے معاملات کو بھی اتنا سنا دیا ہے کہ میں تبا نہیں سکتا۔ افسوس کہ شاہ عالم نے اس کی قدر نہیں کی ورنہ وہ اس کی سب سے زیادہ قابل اعتماد مشیر ثابت ہوتی۔"

میں نے کہا "رہنماں نے بتایا ہے کہ وہ وکالت کے امتحان میں بھی بیٹھنا چاہتی ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ دن رات تیاری کر رہی ہے اور میں اس کی پوری مدد کر رہا ہوں۔ تم دیکھنا ایک دن ہم میاں بیوی کی بہت بڑی قانونی مشاورت کی فرم ہوگی۔"

میں نے کہا "اس فرم کا پہلا کلائنٹ تم مجھے سمجھ لو۔"

وہ بولا "اچھی طرح سوچ لو۔ ہماری فیس بہت زیادہ ہوگی، خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تمہارے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک نیا ایس ایس پی آیا ہے شوکت علی عٹہ۔ وہ رب نواز کی بیوی کا کچھ کرن وغیرہ ہے۔"

"کیا اس نے خود تجھے بتایا ہے؟"

"وہ مجھے کیوں بتائے گا یار۔ آج صبح بار میں تمہاری پولیس کانفرس پر بیٹھے ہو رہے تھے۔ زیادہ تر وکیلوں کا یہ خیال تھا کہ اب تمہارا کوئی چانس نہیں۔ کسی وکیل نے تمہارے خلاف پرانے مقدمات کے بارے میں پوچھا کہ ان کی اب کیا پوزیشن ہے۔ اس پر دوسرے وکیل نے یہ بات کہی کہ مقدمات دب گئے تھے مگر اب پھر اٹھائے جا رہے ہیں۔"

اس نے شوکت علی عٹہ کا حوالہ دیا تھا۔ معلوم نہیں ان کے آفس میں کس قسم کے مراسم ہیں کہ اسے اندر کی بات کا علم ہو گیا۔"

"کل بھی کچھ صحافیوں نے اس کا انڈر شاہ کیا تھا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم محتاط رہو۔"

میں نے کہا "محتاط رہنے سے کیا ہوگا۔ مقدمات کی نوعیت ایسی ہے کہ پولیس مجھے گرفتار ضرور کرے گی۔ خصوصاً عمودراز کے کل کا پس۔"

"اس میں تمہارے ناقابل ضمانت وارنٹ تھے۔ اب تک تو تمہیں مفروضہ مجرم قرار دیا جا چکا ہوگا۔"

میں نے کہا "بس آج کا دن خیریت سے گزر جائے۔ شام سے پہلے پہلے میں غائب ہو جاؤں گا۔"

"غائب ہو کے کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "وہ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ شاہ عالم کی زندگی کے دن تو پورے ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل ناصر عظیم کی زندگی اس عذاب سے آزاد ہو جائے۔"

ی نہیں دفتر کے معاملات کو بھی اتنا سنا دیا ہے کہ میں تبا نہیں سکتا۔ افسوس کہ شاہ عالم نے اس کی قدر نہیں کی ورنہ وہ اس کی سب سے زیادہ قابل اعتماد مشیر ثابت ہوتی۔"

میں نے کہا "رہنماں نے بتایا ہے کہ وہ وکالت کے امتحان میں بھی بیٹھنا چاہتی ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ دن رات تیاری کر رہی ہے اور میں اس کی پوری مدد کر رہا ہوں۔ تم دیکھنا ایک دن ہم میاں بیوی کی بہت بڑی قانونی مشاورت کی فرم ہوگی۔"

"اور اگر کل سے پہلے ہی تمہیں گرفتار کر لیا گیا پھر؟"

میں نے کہا "میں کوشش کرنا ہوں کہ اس ہونٹ سے ابھی نکل جاؤں لیکن کیا تم میری طرف سے درخواست دائر نہیں کر سکتے۔ ضمانت ملے اور گرفتاری کے لیے۔"

"اس درخواست کے منظور ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔ اس کے لیے تمہارا خود کو عدالت میں پیش کرنا بھی لازمی ہوگا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے میں کسی ہونٹ میں محفوظ نہیں۔ اگر پولیس نے میری تلاش میں چھاپے مارے تو پہلے ہونٹ دیکھے گی۔"

"تم میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔ ڈاکٹر کمال کا گھر ہے۔"

میں نے کہا "میں یار۔ میں کسی کے لیے بھی قانونی مسائل پیدا کیوں کروں۔ میں کوئی کرائے کا گھر دیکھ لیتا ہوں۔ فی الحال میرے پاس رہنے کے لیے کوئی گھر بھی جگہ نہیں ہے۔ شاہ عالم کو نہ سنی ناصر عظیم کو ایک مستقل رہائش گاہ چاہیے۔"

"میرا خیال ہے شبنم نے تمہارے لیے آفس کے علاوہ کسی گھر کا انتظام بھی کیا ہے۔"

میں نے کہا "میں پوچھ لیتا ہوں۔"

اس وقت شبنم گھر پر مل سکتی تھی۔ عام دنوں میں وہ رات بھر اخبار کے دفتر میں کام کرنے کے بعد سات آٹھ بجے تک گھر پہنچنے کے سوا جی بھی اور شام چار بجے تک سوئی رہتی تھی مگر میں نے گھر پر فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی۔ پھر میں نے دفتر میں کوشش کی۔

رہیور آزاد صاحب نے اٹھایا "شبنم؟ جی ہاں کل دستیاب ہے گویا۔ عام طور پر تو صبح دم ہی برگ کل پر نظر آتی ہے مگر آج یہاں بھی نظر آ رہی ہے اس وقت اور یہ وقت ہے گفتگو کے گھنائے ناز کا۔ لیکن تم اپنے بارے میں کچھ ارشاد کرو کہ کیا ہو اور کیوں ہو وغیرہ۔ کچھ اپنا تاریخ جغرافیہ عرض کرو گویا۔"

میں نے کہا "حضرت! میں آپ کا قدیم نیاز مند ہوں۔"

وہ ہنسے "اچھا اچھا۔ نیاز مند صاحب ہو۔ تو نیاز صاحب! گفتگو وغیرہ فرمائیے شبنم سے بقلیم خود گویا۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں شبنم کی پیلو سنتا، لائن ڈراپ ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک سب انسپکٹر نظر آیا۔

وہ عجیب مسکین صورت اور مختصر قسم کا پولیس انسپکٹر تھا۔ وردی اس کے تن لاغر و اتنی ڈھیلی تھی کہ اس جیسے دو ہوتے تو مل کے پہن سکتے تھے لیکن اس کی آواز میں بغیر سالنسر والی موٹر سائیکل کی آواز جیسی کرکٹ تھی۔

”شاہ عالم تم ہی ہو؟ جیڑ میں بی ایچ ایف؟“ اس نے مجھے ڈانٹ کے پوچھا۔

میں نے کہا ”بی ایچ ایف سے تو شاید پاکستان ہاکی فیڈریشن بنتا ہے۔ میں بی ایف کا چیز نہیں ہوں۔“

”بی بی ایف۔ اس سے کیا بنتا ہے؟ ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ اے بی سی ڈی والی اتنی جماعتیں بن گئی ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔“

میں نے کہا ”بی بی ایف سے بنتا ہے پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی۔ لیکن تم کون ہو؟“

اس نے ایسے سر ہلایا جیسے میری کم علمی پر افسوس کر رہا ہو۔ ”میرا نام ہے سب انسپکٹر صابر علی۔ کیا اب میں اندر آ سکتا ہوں؟“

میں نے کہا ”پہلے ثابت کرو کہ پولیس کی وردی میں تم کوئی جعلی انسپکٹر نہیں ہو؟“

اس نے اپنا شناختی کارڈ بڑی ناگواری کے ساتھ پیش کیا۔ ”تلی کر لیں جناب عالی، یہ نقلی نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے تم اندر آ سکتے ہو۔“

اس نے اندر آ کے بڑی مشتبہ اور حیکمی نظروں سے کمرے کے ہر گوشے کا جائزہ لیا۔ پہلے الماریاں کھول کے دیکھیں پھر بیڈ کے نیچے جھانکا اور پھر ہاتھ دوم کا دروازہ کھول کے اپنی تسلی کی۔

میں نے کہا ”آخر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“

”میں نے خطرے کا ”کیا پتہ“ کہیں ٹاجاز اسلحہ مل جائے یا کہیں سے ہیر و سون پر آمد ہو جائے۔“

پولیس مین نے کہا ”کوئی“ آپ بھی کمال کے بندے ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا ”بندہ میں خدا کا ہوں۔ کمال میرا دوست ہے۔“

اس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا ”جناب عالی۔ آپ کو مذاق کے بجائے مجھ سے تعاون فرمانا چاہیے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔“

میں نے کہا ”ہاں نہ مان میں تیرا مسلمان۔ کس الو کے نیچے نے تمہاری ڈیوٹی لگائی ہے یہاں پر اور کیوں؟“

وہ بولا ”افسرانِ بالا کو گالی دینا آپ کو زرب نہیں دیتا۔“

میری ڈیوٹی لگائی ہے ایس ایس پی شوکت علی محلے نے۔ آپ کی حفاظت کے لیے۔“

میں نے کہا ”مگر میں نے تو اس کے لیے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔“

”مگر اخبار والوں سے آپ نے ہی کہا تھا اور آپ کا بیان بھی چھپا ہے اخبار میں کہ آپ کی جان کو دشمنوں سے خطرہ ہے۔“

میں نے کہا ”اور تم آئے ہو مجھے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے؟“

وہ بولا ”پہلے آپ بتائیں خطرہ کہاں ہے، کس سے ہے؟“

”میں ہنسنا“ ”ابھی تمہارے دار صاحب! پہلے آپ جائیں وہ عینک لگا کے آئیں جس سے خطرہ نظر آتا ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں خطرہ تو ہر جگہ ہے لیکن ایسے تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔“

وہ کچھ کھینچا ہوا ”دیکھیں نا جی! آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ آپ کی زندگی کے دشمن بہت ہیں۔ آخر کون ہیں وہ دشمن؟“

میں نے کہا ”تمہارے دار صاحب! آپ ان دشمنوں سے ہنسنے کے لیے اپنے ساتھ کوئی توپ خانہ وغیرہ لائے ہو؟ وہ بڑے ڈاڑھے دشمن ہیں۔“

وہ اضطرابی کیفیت میں ہاتھ تلنے لگا۔ ”جناب عالی“ پولیس سے ڈاڈا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی خود کو سمجھتا ہے تو اس کی غلط فہمی ہے اب ذرا نام بتاؤ مجھے کون ہیں وہ لوگ؟“

میں نے کہا ”دیکھو شیر کا دشمن گیدڑ نہیں ہو سکتا۔ میرے دشمن مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں اور بڑا اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ مثلاً ملک رب نواز ہے اس کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟“

اس کی صورت پر بارہ بجنے لگے ”ملک رب نواز!۔“

میں نے کہا ”کیوں؟ ایک نام سن کے ہی حوصلہ جواب دے گیا؟ میرے کہنے پر اسے گرفتار کر سکتے ہو تم؟“

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری ”کیوں نہیں“ اگر ثبوت ہو۔“

میں نے کہا ”ثبوت تو کوئی ہے ووقوف مجرم بھی نہیں چھوڑتا پولیس کے لیے۔ اور یہ صرف ایک نام ہے ایسے کئی نام ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں“ اس کے علاوہ۔ یہ لوگ خود کچھ نہیں کرتے یہ دشمن صرف حکم دیتے ہیں اور باقی ان کے حکم کے غلام کرتے ہیں۔ تم مجھے کس کس سے

بچاؤ گے اور کہاں کہاں بچاؤ گے صابر علی! فرض کرو کسی نے مجھ پر گولی چلائی تو کیا تم کوئی کورک لوگے؟“

وہ پہلو بدل کے بولا ”میں۔ میں اسے پکڑ لوں گا۔ گولی چلانے والے کو۔“

”میں ہنسنے لگا“ ”وہ کیسے پیارے؟ کیا کوئی سامنے آکے گولی چلائے گا؟ اور تمہیں موقع دے گا کہ اسے گرفتار کر لو؟“

”میں اسے تھاں گولی مار دوں گا۔ جائے واردات پر۔“

میں نے کہا ”لیکن میرے مرجانے کے بعد؟ آفریں ہے تم پر۔ یہی اس پولیس افسر نے کیا تھا جس نے لیاقت علی خان پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں گولی چلانے والے کو وہیں ٹوٹ کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے گرفتار بھی کر سکتا تھا۔“

”اس سے یہ حکم تھا۔ بعد میں اسے قتل کا اور قاتل کا سراغ ملانے پر انعام سے بھی نواز گیا تھا“ ”میں بولا۔“

صابر علی نے بے چارگی سے کہا ”اپنی مرضی سے تم کیا کر سکتے ہیں جی۔ ہم تو غلاموں کے غلام ہیں۔ ہم افسرانِ بالا کے غلام ہیں اور وہ آپ کے غلام ہیں۔“

”میں ہنسنے لگا“ ”افسرانِ بالا کو غلام کہہ کے کیوں گنہگار ہوتا ہے پیارے! وہ ہمیشہ حاکم رہے ہیں اور رہیں گے۔“

میں نے کہا ”ہم جیسے تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ وزیر سے وزیر اعظم تک سب کی نوکری کی جی رہتی ہے۔ پکی نوکری ہے تمہارے دار کی جو بادشاہ ہوتا ہے۔“

”پھر میرے لیے کیا حکم ہے جناب عالی!“ صابر علی کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے کہا ”ایس آئی صابر علی۔ میرا اس بات پر پختہ عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور فرشتہ اجل کا راستہ دنیا کا کوئی سیکورٹی سسٹم آج تک نہیں روک سکا۔ پھر تم کیا کر لو گے لیکن اب تم آہی گئے ہو تو نیچے جاؤ اور ہوٹل کی انتظامیہ سے رجوع کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تمہیں میرے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات برپا ہو کر چاہیے۔ ہوٹل والوں کی اپنی سیکورٹی فورس ہے۔ دیکھو وہ کس حد تک تمہیں دخل انداز ہونے دیتے ہیں۔“

وہ کچھ مایوس ہوا ”لیکن میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“

میں نے کہا ”میں اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا کہ تم ہر جگہ میرے ساتھ سامنے کی طرح نظر آؤ۔ تمہاری وجہ سے میں مارا جاؤں گا یا میری وجہ سے تمہاری جان جائے گی۔“

”پھر میں کیا کروں جناب عالی!“

میں نے کہا ”تم قری الحال آئے جانے والوں پر نظر رکھو۔ کوئی مجھ سے ملے آئے تو پہلے مجھے بتاؤ اور پھر اس کی شناخت کی تصدیق کرو۔ وہ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ سب تو نہیں ہے۔ جس پر تمہیں شک ہو یا جس سے میں نہ ملنا چاہوں اسے روک لو۔ کیا پہلے بھی تم نے کسی وی آئی پی کے ساتھ سیکورٹی ڈیوٹی کی ہے؟“

وہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا ”پہلے۔ نہیں جی“ میرا مطلب ہے ہاں جی۔ ایک فکس صاحب تھے شیخ عنایت اللہ مندار۔ فوت ہو گئے بے چارے! اپنے گاؤں سے واپس شہر آ رہے تھے راستے میں مخالفین کے ساتھ ٹکرا ہو گیا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی۔ تین بندے مارے گئے تھے۔ ان میں شیخ عنایت بھی تھے۔“

میں نے کہا ”اس وقت تم ان کے ساتھ تھے؟“

”ہو جی۔ لیکن مجھے موقع مل گیا جیب کے پیچھے گھس کر جان بچانے کا“ ”وہ روای میں کہہ گیا۔“

میں نے کہا ”یعنی جس کی حفاظت کے لیے تمہیں بھیجا گیا تھا اسے تو تم نہیں بچا سکتے۔ اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے؟“

وہ سخت خفیف ہوا ”دیکھو جی۔ نشانہ خطا نہیں ہوا ورنہ میں بھی ساتھ ہی تھا اور حملہ ہو تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ بندہ جب تک دفاعی پوزیشن اختیار نہ کرے مقابلہ کیسے جاری رکھ سکتا ہے۔ دو بندے نیچے سے پکڑ کا دیے میں نے۔ تھے تو وہ شیخ عنایت کے حریف صادق اعوان کے حمایتی مگر اخبار میں ڈاکو لکھا گیا تھا جو پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے مجھے تعزیری سزا بھی ملی تھی۔“

جب وہ چائے پی کے چلا گیا تو میں نے پھر ختم کو فون کیا۔

لائن ڈراپ ہو جانے کی وجہ سے اور پھر صابر علی کے آنے سے بات نامکمل رہ گئی تھی لیکن اس نے کال بیک کر کے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

اس انداز بے اعتنائی سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ میرے گزشتہ شب کے رویے سے ابھی تک وہ آزرده ہے۔ اب یہ اخلاقی طور پر میرا فرض بنتا تھا کہ میں اسے مناؤں لیکن میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اسے منانے کے لیے مجھے کیا مانا چاہیے۔ صرف سوری کہنے سے بات نہیں بنتی تھی اور اس سے آگے جانا تو مجھے کہنا پڑا کہ خاتون مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا اور آپ کو شکایت کا موقع

نہیں دوں گا بلکہ وہی کروں گا جو آپ چاہتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ میں یہ کیسے تسلیم کر سکتا تھا کہ میں نے جو بھی کیا وہ صحیح نہیں تھا۔

”کھنی کئی بار بچی اور بالآخر ایک وایج مین نے ریسپورڈ اٹھا کے مجھے مطلع کیا کہ آفس میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔“

میں نے شکایت لیجے میں کہا ”ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے بات کی تھی آزاد صاحب سے۔“

”ظہور کی ہوگی“ وایج مین نے ایک منطقی جواب دیا ”کچھ دیر پہلے وہ موجود تھے“ اب جا چکے ہیں۔“ اور ریسپورڈ رکھ دیا۔

”اوکی ٹھہری۔“ میں نے یہ آواز بلند کرنا اور ریسپورڈ پتختہ کرنا ”خیر“ دیکھائی ہے مجھے۔ جنم میں جائے میری طرف سے۔“

”جنم کی لڑائی ہوئی تھی حیرے ساتھ“ ر نہیں مسکرائے گا۔

میں نے کہا ”ہاں۔“

”کس بات پر؟“

میں نے کہا ”تیرا میرے اور جنم کے تعلقات میں بڑی گڑبڑ ہے۔ اور یہ گڑبڑ اچانک نہیں ہوئی ہے۔ بہت عرصے میں حالات اس اتنا تک پہنچے ہیں کہ ایک طرف تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے دوسری طرف میرے لیے لگی لپٹی رکھے بغیر اسے یہ پیمانہ تاثر ہو گیا ہے کہ اس کے اور میرے درمیان تعلقات کی نوعیت وہ نہیں ہو سکتی جو شاہ عالم اور جنم کے درمیان بہت عرصہ رہی۔ میں وہ سب نہیں کر سکتا جو وہ چاہتی ہے۔“

ر نہیں نے سوچ کے ایک احمقانہ سوال کیا ”وہ کیا چاہتی ہے؟“

میں نے بڑے کے کہا ”تیرا سر۔“ اے وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ ویسے ہی جذباتی تعلق رکھوں جیسے شاہ عالم رکھتا تھا۔ اور وہ بڑی فیاضی دکھائی تھی اس محبت میں جو ہوس کے ساتھ نہیں تھی۔ اعلانیہ کتنی پھرتی تھی کہ وہ شاہ عالم سے محبت کرتی ہے اور اسے کسی بدنامی کی پروا نہیں۔ جس کا جو دل چاہے کہ اس نے شاہ عالم کے شادی شدہ ہونے پر بھی خود اپنے ساتھ ایک سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ بیوی کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ لے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے بیوی اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ معلوم نہیں رخصتی نے اس بیوہ صورت حال سے کیسے سمجھوتہ کر رکھا تھا۔

”اے کیسے کیا وہ مجبور تھی۔“

”اب اپنے رویے سے میں نے جنم پر بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں، ناصر عظیم ہوں تو وہ پریشان ہے اور مجھے بھی پریشان کرتی ہے۔ میں دو مہینے بعد لوٹ کے آیا تھا۔ اس نے کل رات ایسے BEHAVE کیا جیسے وہ میری بیوی ہے۔ جدائی کی ایک ایک رات اس نے میرے انتظار میں انکاروں پر لوٹنے کا بیڑا باندھا اور میں واپس آیا ہوں تو جدائی کی یہ لمبی سیاہ رات بھی ختم ہو جانی چاہیے۔ اسے یہ توقع بھی مجھ سے کہ ایسی ہی بے قراری میرے جذبات میں ہوگی اور میں اظہار محبت میں اتنا ہی بے اختیار و افسانہ بن دکھاؤں گا۔ جتنا وہ دکھانا ہوگا شاہ عالم، ہزار بار اس پر واضح کیا ہے میں نے کہ میں اب وہ نہیں ہوں مگر اس کی عادت بگڑی ہوئی ہے۔ بے شک عادت بگڑی تھی خود شاہ عالم نے لیکن اسے آزادی اور مکمل خود سیر کی کی اجازت دینے والی کون تھی؟ خود جنم۔ اس مسئلے پر کئی بار ہمارے درمیان رنجش ہو چکی تھی۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اسے ٹھکراتا ہوں۔ اس کی نوسوانیت کے وقار کو نہیں پہنچتی ہے مگر میں کیا کر دوں؟ میں اس کی بے عنان خواہشات کے آگے ہر تسلیم خم کیسے کروں۔ گزشتہ رات پھر یہی ہوا اور اس نے بھی حد کر دی۔ وہ یہاں سونا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر اعتراض تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں جذبات کی چنگاری بھڑک کر آگ بن سکتی ہے۔ مگر اس نے شرافت سے الگ سونے کا وعدہ کیا تو میں مان گیا۔ رات بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا اب وہ اگلی ماں جائے گی اور اس کے وعدے پر اعتماد کر لیا مگر بعد میں اس نے خنائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ اس حد تک گر گئی کہ مجھے اب بھی سوچ کے شرم آتی ہے۔ تجھ سے میں نے بھی کچھ چھپایا نہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔“

ر نہیں نے سب سن کے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ کچھ متشکر اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔

میں نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا ”تو میری پوزیشن کو سمجھتا ہے نہیں۔ میں جنم سے اس کی محبت کے جواب میں محبت کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ محبت کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے نا۔ کہ یہ کی نہیں جاتی۔ تو یہ بڑی آفاقی سچائی ہے ناقابل تردید۔ شاہ عالم اللہ اس کی مغفرت نہ کرے۔ جنم کے ساتھ بار کا ڈرانا کر سکتا تھا اور کرتا تھا۔ جنم کا جسمانی استحصال کر کے وہ جنم کے ذہن کو استعمال کرتا تھا۔ جنم صرف ایک عورت ہی نہیں تھی وہ ایک دھانسو جرنلٹ بھی تھی۔ عورت اس کے اشارہ ایو پر اپنا سب کچھ شاہ عالم کے حوالے کر دیتی تھی تو صحنی خود اس کے قابو میں آ جاتی تھی۔“

وہ جنم سے دہرا فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ ویسے بھی عیاش آدمی تھا جس کے کوئی اخلاقی اصول وغیرہ نہیں تھے۔ مگر میں جنم سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ محبت کا ناکم نہیں رہا سکتا۔ میں اس کی یکطرفہ محبت والی جذباتی مجبوری کے نظریہ کو مسترد نہیں کرتا مگر اس کے جواب میں جنم کو جھوٹ موٹ کی محبت بھی نہیں دے سکتا۔ شاید ایسا کرنا تیرے لیے بھی ناممکن ہوگا۔ ایک محبوبہ کو ایک گری ہوئی عورت کی طرح داشت بنانے کے نہیں رکھا جاسکتا۔ تیرے میرے جیسے لوگ تو داشت رکھنے کے اصول کو بھی اخلاقی طور پر قبول نہیں کرتے۔ اور محبوبہ کو اس مقام پر لاکے اس کی تذلیل نہیں کر سکتے۔ جس سے تو ہی محبت کرتا ہے اسے رسوائی نہیں دے سکتا۔ اس کی عزت پر حرف آئے یہ برداشت نہیں کر سکتا اور محبت کو ہوس کی قربان گاہ پر ہیئت چڑھا دے اتنا مگر نہیں سکتا۔ یہی کچھ میں چندا کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اور اسی لیے وہ مجھ پر پورا اعتماد رکھتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ مجھ وہ میرے ساتھ اگلی ہو تو میں اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ کل رات جنم کی جگہ اگر چندا ہوتی تو ہم شاید ساری رات باتیں کرتے رہتے۔ پھر وہ مجھے شب بخیر کہہ کے بڑے سکون سے میرے بند پر سو جاتی اور میں اسے کبیل اوڑھا کے صوفے پر لیٹ جاتا اور اسی طرح سکون سے سوتا۔“

”اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے براور“ ر نہیں خان نے بہت دیر غور فرما کے کہا۔

میں نے کہا ”حل تو نکالنا ہی بڑے گا کوئی۔ اس نے سخت تذلیل محسوس کی ہوگی گزشتہ رات۔ بات وہ بھی غلط نہیں کہ ٹھکرائی ہوئی عورت تاگن سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ جنم کے جذبات کا رخ اتنی جلدی پلٹ جائے۔ وہ کسی مثنی رویے کی انتہا تک نہیں جاسکتی۔ کیونکہ وہ ذہن ہے اور اپنی عقل اور سوچ پر اختیار بھی رکھتی ہے۔ لیکن مجھے اس کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو سننے کے لیے اسے DEFINE کرنا ہے۔ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا۔ یہ بالکل واضح ہو جانا چاہیے۔ بے شک وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میری اور ہم سب کی بہت شخص اور بھروسے کے قابل دوست ہے لیکن میرے ساتھ وہ اپنے تعلق کو ایک عورت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اسے کسی خود غرضی یا خوش نمی میں جتنا نہیں رکھ سکتا کہ ایک نہ ایک دن میں اسے زناؤں گا۔ یہ جھوٹ بولنا میرے بس کی بات نہیں اور اسے

اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا میرے نزدیک ذلات ہے۔ اگر اس بات کا کوئی امکان ہو تا کہ میں اسے چاہنے لگوں گا اور مستقبل میں شاید کبھی اسے شریک حیات بھی بنا لوں گا تو میں اس تعلق کو جنم کی نظر سے دیکھتے ہوئے نہایت ریتا مگر بارہ شاہ عالم کی محبوبہ تھی۔ محبوبہ کیاداشت تھی۔ سارا زمانہ یہ جانتا ہے۔ میں اس احساس سے سمجھوتا کیسے کر سکتا ہوں؟“

”اس نے تو سمجھوتا کر لیا ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تو ساری خرابی ہے۔ اس نے مان لیا ہے کہ میں پہلے ناصر عظیم تھا۔ پھر شاہ عالم بن گیا اور اب دوبارہ ناصر عظیم بن گیا ہوں۔ یہ میرے خارجی حالات کے تقاضے تھے۔ اس کا یہ سمجھنا جائز ہے کہ نام بدلنے سے جذبات تو نہیں بدل سکتے۔ شاہ عالم اسے چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ چاہت نہیں تھی۔ ایسے ہی ناصر عظیم کو اسے چاہنا چاہیے۔ اس میں سوچ بچار یا تذبذب کیسا لیکن میں جانتا ہوں اور تو جانتا ہے کہ کچھ کیا ہے۔“

”یہ بات تو اسے کیسے سمجھائے گا۔“

”اسے سمجھنی پڑے گی کہ اب شاہ عالم کے جذبات بھی بدل گئے ہیں۔ وہ جنم کے ساتھ بار کا کھیل جاری نہیں رکھ سکتا کیونکہ یہ جھوٹ بولنا میرے بس میں نہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ناصر عظیم جذباتی طور پر جنم کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ مجبوراً اسے اپنی شریک حیات تسلیم کر لے۔ چنانچہ اس کے ساتھ کسی قسم کے جذباتی تعلق کا ویسے بھی کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اب جنم کو طے کرنا ہی ہوگا کہ وہ میرے ساتھ بے غرض اور بے طلب دوستی رکھنا چاہے یا نہیں۔ وہ عادل و بالغ ہے۔ اپنے قول و فعل کی خود دہی دار ہے۔ اگر مجھے چھوڑ دے وہ کسی اور سے رابطہ استوار کر لیتی ہے تو اس کی مرضی میں اعتراض کرنے والا کون۔“

”وہ پوچھے گی نہیں کہ تمہارے خیالات میں یہ انقلاب کیوں؟“

”وہ کہہ سکتا ہوں کہ۔ اب میرے جذبات وہ نہیں رہے۔ جذبات کیادبل نہیں سکتے۔“

”نہیں۔ محبت میں تو یہ ممکن نہیں۔“

”لیکن شاہ عالم کو جنم سے محبت ہی کب تھی؟ وہ تو اپنا مطلب نکال رہا تھا۔ میں یہ الزام قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ میرا اس سے دل بھر گیا ہے۔ مطلب نکل جانے کے بعد میں نے نظریں پھیر لی ہیں۔ میں نے کب اس کے ساتھ

اعتراض بات نہیں تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انسپکٹر صابر علی کی توخیر سیکورٹی ڈیوٹی لگائی گئی تھی اس لیے وہ وہاں موجود تھا۔ اے ایس بی دلاور شاہ کل رات یہاں کیا کر رہا تھا اور صبح پھر کیوں آیا تھا۔ کیا وہ میری عمرانی کر رہا تھا؟

میں نے رئیس سے مشورہ کیا اور پھر سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس شوکت علی حٹھ سے صورت حال کی وضاحت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ عام طور پر ایس بی اپنے دفاتر میں کم بیٹھتے ہیں۔ وہ انتظامی نوعیت کی کسی پیشگی میں ضلعی انتظامیہ کے ساتھ مصروف نہ ہوں تب بھی ان کے سیکرٹری عام آدمی کو بھی جواب دیتے ہیں کہ صاحب بیٹنگ میں ہیں۔ اب عام آدمی کون ہے اور خاص کون؟ اس کا فیصلہ ہوسیار سیکرٹری ذاتی تجربے اور صلاحیت کی بنا پر کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ آج کل خاص میں کون شامل ہے۔

جب سیکرٹری نے ”ایک منٹ سر“ کہنے کے فوراً بعد ہی میری بات ایس بی سے کرادی تو مجھے یقین آنے لگا کہ میں ابھی تک وی آئی بی لسٹ میں ہوں۔

ایس بی جی نے سپاٹ لیجے میں کہا ”جی شاہ عالم صاحب؟“

میں نے کہا ”میں آپ کا شکریہ ادا کرتا چاہتا تھا۔“

”کس بات پر؟“

میں نے کہا ”آپ نے میری پریس کانفرنس کو اتنی اہمیت دی۔“

وہ بولا ”آئی ایم سوری شاہ عالم صاحب! آج ایک ایمرجنسی ہوگئی تھی صبح صبح مجھے تو اخبار کی سرخیاں دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تو کوئی خاص بات؟“

میں نے کہا ”آپ نے میری سیکورٹی کو اتنا اہم سمجھا۔“

وہ بولا ”ہمارے لیے تو سب کی سیکورٹی اہم ہے۔“

میں نے کہا ”کل رات میں نے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے صبح میری حفاظت کے لیے پولیس فورس بھیج دی۔“

وہ کچھ حیران ہوا ”میں نے؟“

”میرے پاس آکرے رپورٹ کرنے والے ایس آئی صابر علی نے تو یہی کہا تھا کہ آپ نے اس کی سیکورٹی ڈیوٹی لگائی ہے۔“

وہ چند سیکنڈ بعد بولا ”یہ سب انسپکٹر کہاں ہے اس وقت؟“

میں نے کہا ”میں جس ہوٹل میں مقیم ہوں وہیں نیچے لاؤنج میں۔ وہ میرے ساتھ بیٹھا چاہتا تھا مگر میں نے کہا۔“

ایس بی نے میری بات کاٹ دی ”ایکسیکوزی شاہ جی۔ یہ کوئی غلط فہمی ہے یا غلط بیانی؟ میں نے کسی کی ڈیوٹی نہیں لگائی۔ آپ جیسے بڑے لوگ تو ویسے بیانات دیتے ہی رہتے ہیں مگر جب تک وہ خود ہم سے براہ راست سیکورٹی نہ مانگیں، افسران بالا کا یہ اہانت کا حکم نہ ہو، ہم اپنے طور پر کسی کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات نہیں کرتے۔“

میں نے کہا ”آپ کا مطلب ہے صابر علی جھوٹا ہے؟“

”نہیں۔ جھوٹا وہ یقیناً ہے لیکن جھلسا ز بھی ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس سے کہا تھا کہ اپنی شناخت کرائے؟“

میں نے کہا ”میں نے اس کا شناختی کارڈ چیک کیا تھا۔“

”آپ اسے بلا میں اور اسے کہیں کہ مجھ سے بات کرے۔“

میں نے کہا ”ابھی بلاتا ہوں لیکن اس سے پہلے اگر آپ میری ایک انجمن دور کریں تو بڑی رعایت ہوگی۔“

”یہی انجمن؟“

میں نے کہا ”یہ اے ایس بی دلاور شاہ کون ہے؟“

”ایک نیا افسر ہے۔ مردان سے پوسٹ ہوئے ابھی دو مہینے پہلے ہی یہاں آیا ہے۔“

میں نے کہا ”میں آپ کے عہدے کی حساس فزے واریوں کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور کے ایما پر ایسا ہوا ہو۔ لیکن کل شام وہ سادہ لباس پہنے پریس کانفرنس میں صحافیوں کے درمیان کیوں موجود تھا؟“

”اس کی ڈیوٹی لگی ہوگی۔ مگر میں نے بہر حال نہیں لگائی تھی۔“

”ایس بی صاحب! پولیس کی نوعیت کے اجتماعات کی رپورٹ لینا بعض اوقات ایک تنگ جاتی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ میں سمجھتا ہوں لیکن ایک تو اس نے جھوٹ بولا تھا کہ میں صحافی ہوں۔ اس کا جھوٹ پکڑا گیا اور اسے خاصا بے عزت ہو کر رخصت ہونا پڑا۔“

”معلوم نہیں اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟“

میں نے کہا ”بعد میں اس نے ہوٹل کی انتظامیہ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور تھے۔ وہ سب دلاور شاہ کی طرح پکڑے گئے تھے اور دھکے دے کر نکالے گئے تھے۔ مگر وہ بعد میں دلاور شاہ کے ساتھ ہوٹل کی کلابی میں بیٹھے رہے اور انہوں نے خود کو کسٹم کے افسران ظاہر کیا۔ بدھنگی سے نیچے کے لیے صحافیوں نے بھی اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دیا اور ہوٹل کی انتظامیہ بھی خاموش ہونے پر مجبور ہوگئی۔“

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں انکوائری ہو تو لکھ کے رپورٹ کریں۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ وہ بات تو ختم ہوگئی تھی لیکن اب وہ پھر ہوٹل میں موجود ہے۔“

”پھر موجود ہے؟“ ایس بی نے پھر خیال انداز میں کہا۔

”جی۔ اور یہ سب انسپکٹر صابر علی، وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ دیکھئے اگر میری عمرانی کی جاری ہے۔“

ایس بی نے پھر میری بات کاٹ دی۔ ”آئی ایم سوری شاہ عالم صاحب! میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے علم میں کچھ نہیں۔“

میں نے کہا ”اس ڈسٹرکٹ کی پولیس انتظامیہ کے سربراہ تو آپ ہی ہیں۔“

”ہاں، لیکن بعض اوقات افسران بالا کو بھی اوپر سے خفیہ احکامات آجاتے ہیں اور وہ مجھے بتائے بغیر بھی فیصلے کر سکتے ہیں۔ آپ مجھ سے وضاحت طلب نہ کریں۔ براہ راست دلاور شاہ سے بات کریں یا پھر اوپر والوں سے پوچھیں۔ اس نے خاصی ناگوار ہے کہ اوپر فون بند کر دیا۔“

ایس بی کی میری بات سے جربز ہونا غلط نہ تھا۔ وہ بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر کو بھی پولیس اقدامات کا جواز پیش کرنے کا پابند نہیں تھا اور بظاہر اس معاملے سے اس کا تعلق بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نہ اے ایس بی جعلی تھا اور نہ سب انسپکٹر صابر علی۔ وہ دونوں کسی خاص مقصد کے تحت یہاں موجود تھے جو واضح نہیں تھا۔

رئیس نے کہا ”اے بی یار! جا کے انہی سے پوچھ لے کہ بھائی آخر کیا چاہتے ہو تم دونوں؟“

”تھرا کیا خیال ہے وہ وہاں دیں گے؟ کبھی نہیں۔ صابر علی کا جھوٹ تو پکڑا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک اور جھوٹ پول

اے کہ ایس بی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ حکم دے کر بھول گئے تو ان سے گون پوچھئے۔ اے ایس بی میرے قابو نہیں آئے گا۔ وہ کہے گا کہ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں اور آپ کو کچھ بھی بتانے کا پابند نہیں کہ ڈیوٹی کیا ہے۔ اگر آپ کو ہوٹل میں میری موجودگی پر اعتراض ہے تو مجھے ”اوپر والوں سے میری شناخت کرویں۔“

”مجھے لگتا ہے رئیس کہ میری عمرانی ہو رہی ہے کہ میں کس عائب نہ ہو جاؤں۔ پولیس ضرور مجھے گرفتار کرنے کے پیر میں ہے۔ وہ قانونی کارروائی پوری کرنے کے بعد مجھ پر

ہاتھ ڈالیں گے۔ فرید عباسی کے امیٹے بے بنیاد نہیں تھے۔ میرے خلاف پرائے مقدمات کی فائلیں کھول دی گئی ہوں گی۔“

رئیس بھی سوچ میں پڑ گیا ”تو بات کر کے تو دیکھ۔“

میں نے کہا ”میں ان سے نیچے جا کے ملتا ہوں۔ تو پہلے نکل جا۔ میں اب عائب ہونا چاہتا ہوں مگر خاموشی سے نہیں۔ مجھے ایسے پراسرار اور سنسنی خیز طور پر عائب ہونا ہے کہ سب نوٹ کریں۔“

رئیس ہنسنے لگا ”پھر تو ایسا کہ نیچے ہال میں جا کے سب کو متوجہ کر کہ حاضرین! میری طرف دیکھئے! میں شاہ عالم ہوں۔ چیئرمین پی بی بی۔ اس وقت آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے۔ ایک بج کر دس منٹ ہیں سیکنڈ۔ دس منٹ اور پچیس سیکنڈ پر میں عائب ہو جاؤں گا۔ دیکھئے دیکھئے رہے دن نوہ۔ عمری۔ دیکھنا کتنی سنسنی پھیلے گی۔“

میں نے کہا ”ذائقہ مت کہہ میں نے طرفہ واردات طے کر لیا ہے۔ میں آج بلکہ ابھی دو گھنٹے کے اندر اندر عائب نہ ہوا تو کسی مشکل میں نہ پڑ جاؤں۔ میں گرفتار ہونے کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”اے تو سامان اٹھا ابھی اور چلا جا کس بھی۔ ختم نے تیرے لیے رہائش کا انتظام بھی کر لیا ہے اور آفس کا بھی۔“

”ابھی میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔“

”تو چل میرے ساتھ۔ نیلم کے گھر“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”بس۔ وی ایک محفوظ جگہ نظر آتی ہے مجھے ناصر عظیم کا ٹھکانا یا تو قہر کا گھر ہو سکتا ہے یا نیلم کا۔ جہاں یہ گواہی بھی مل سکتی ہے کہ وہ تو وہیں تھا۔ گزشتہ دو مہینے میں بھی جب لندن سے شاہ عالم کے بارے میں خبریں موصول ہو رہی تھیں ناصر عظیم لاہور میں تھا۔ نیلم کے گھر میں تھا۔“

”اور اس کی گواہی دیں گے ہم سب؟“

”اگر ضرورت پڑی۔ میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابھی تو جاپازدار اور کچھ چیزیں لے کر فوراً واپس آ۔ ایک تو مجھے چاہیے کوئی وردی۔ اگر اس ہوٹل کے ویزڈیا سیکورٹی اسٹاف کسی مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ جو تجھے اچھی لگے بس میرے سائز پر فٹ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ روپائی کے لیے مجھے سیاسی چاہیے۔“

”کون سی؟“

”لکھنے والی یا تو بے کی؟“ رئیس ہنسا۔

میں نے کہا ”تو اتر کر آسانی سے صاف ہو جاتے ہیں۔“

وہ بولا ”میری مان تو بیٹھ کے لیے اپنا منہ کالا کر لے۔ پندرہ دن میں ایک بار چہرے پر بیٹر لگا کر لے۔ پھر حال ہے جو

☆ 83 ☆ مداری

کوئی تجھے شاہ عالم سمجھے۔
میں نے کہا "اے کالے منہ والے کو نامہ عقیم بھی کون سمجھے؟"

رہیں نے میرا جان سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک کھٹے میں واپس آئے کا کہہ کے چلا گیا تو میں نے بھی نیچے ہال جا کے صورت حالات کا جائزہ لیا۔ سب انسپکٹر صابر علی مجھے گریٹ کے پاس کرسی والے اخبار پڑھتا نظر آیا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا تو ہال میں بھیلی ہوئی زیادہ تر میزوں پر خوش پوش اور خوش حال لوگ نظر آئے جو یہاں بزنس چمچ پر مدعو تھے یا خود کسی کو مدعو کر کے لائے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے وجود سے بے نیاز اپنی باتوں میں مگن تھے۔

میری نگاہیں سب چہلوں کا طائرانہ انداز میں جائزہ لیتی ہوئی اے ایس پی دلاور شاہ تک پہنچ کے رک گئیں۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاصی فیشن ایبل خاتون بھی جو اس کی بیوی بہر حال نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے اطوار خاصے عامیانہ تھے۔ وہ عمر میں بھی دلاور شاہ سے زیادہ ہی ہوگی مگر اس نے شوخ سبک آپ اور عروانی کی حد تک الزماؤردن لباس کی مدد سے عمر میں دس سال کم نظر آنے کی بھونڈی کوشش ضرور کی تھی۔ اس کا گریبان سامنے سے جتنا کشادہ تھا اس سے کہیں زیادہ پشت پر کمر کے نیچے حصے تک آیا ہوا تھا۔ وہ میز پر کنپیاں ٹکا کر اور اپنا چہرہ دلاور شاہ کے قریب لانے کے لیے کچھ آگے جھک آئی تھی اور اس پوز میں دلاور شاہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ سامنے نہ دیکھے۔

اپنی بیبیائی مصروفیت کے باوجود دلاور شاہ میری موجودگی کے احساس سے بیگانہ نہیں تھا۔ وہ چوری چوری ایک نظر میری طرف بھی ڈال لیتا تھا اور پھر ذرا دیر کے منتظر میں گم ہو جاتا تھا۔ میں نے خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے ہال کے آخری کونپارے تک دیکھا اور پھر پلٹ کے اپنے سوٹ تک لے جانے والے زینے پر چڑھنے لگا۔ اپنے کمرے سے میں نے آفس کا نمبر مانگا اور اسٹنٹ منیجر سے بات کی۔ "میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

"نیں سر!" میں نے کہا "تم نے مجھے بتایا تھا کہ انسپکٹر صابر علی اور اے ایس پی دلاور شاہ باتیں کرتے اندر آ رہے ہیں۔"

"میں نے ایسا ہی دیکھا تھا سر!"

"وہ کتنی دیر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے تھے؟"

میں نے پوچھا۔

"وہ بولا" مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ شاید پانچ چھ منٹ۔"

میں نے کہا "دلاور شاہ اس وقت بھی ہال میں ہے۔ اس کے سامنے ایک عورت ہے۔ وہ کون ہے؟"

"اے اے ایس پی ایک چلتی پھرتی عورت ہے کسی نہ کسی کے ساتھ بچ میں شریک ہو جاتی ہے۔ یہاں اکثر نظر آتی ہے۔"

میں نے کہا "تھنک تو فار دس انفارمیشن۔ اب تم ذرا انسپکٹر صابر علی کو اوپر بھیج دو۔ کہہ دو شاہ کی بلار ہے ہیں۔"

"نیں سر!" سب انسپکٹر صابر علی پانچ منٹ میں اوپر آگیا "آپ نے یاد فرمایا ہے جناب عالی!"

میں نے دروازہ بند کر کے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "صابر علی کوئی براہ کرم تو نہیں ہے؟"

"براہ کرم یہ ہے سر کہ کھیاں مارنے کی ڈیوٹی بڑی سخت ہے۔"

میں نے کہا "میری ابھی ایس ایس پی شوکت علی سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں نے یکسیر ملٹی ڈیوٹی کے لیے جین کے بندے بھیجا ہے۔"

وہ کچھ نروس ہوا "اچھا جی! ایسا بولا انہوں نے؟"

میں نے کہا "کیا غلط بولا انہوں نے؟"

"نہیں" اتنے بڑے افسر ہیں غلط کیسے بول سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے ان سے منسوب کر کے کوئی غلط بات کی ہے تو ان کا رد عمل کیا ہوگا؟"

اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا "وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں جی!"

میں نے کہا "تم کسی اے ایس پی دلاور شاہ کو جانتے ہو؟"

وہ اب گھبراہٹ میں مبتلا ہونے لگا "جانتا ہوں جی مگر..."

میں نے کہا "آخری بار تم ان سے کب ملے تھے؟"

"آخری بار دیکھا تھا ان کو۔ ہفتہ بھر پہلے ملاقات تو نہیں ہوئی۔ وہ افسر لوگ ہیں۔"

میں نے اسے نظر جمائے دیکھا "تم کتنے جھوٹ بولو گے صابر علی!"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "جھوٹ!"

میں نے گرج کے کہا "ہاں جھوٹ۔ ایس ایس پی شوکت علی نے صاف کہا کہ اس نے تمہاری ڈیوٹی نہیں لگائی۔ وہ تو تمہیں جانتا تک نہیں۔"

"وہ۔۔۔ وہ جی۔۔۔ مجھے تو ان کے ریڈر نے حکم دیا تھا۔ وہ..."

بھلائے لگا۔

میں نے کہا "شٹ آپ۔ کون ہو تم صابر علی! کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ کیا مقصد تھا یہ جھوٹ بول کے میرے قریب آنے کا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اے ایس پی دلاور شاہ نے تم کو کیا ہدایات دی تھیں؟"

اس نے ڈھٹائی سے کہا "میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔"

میں نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی۔ "مگر تم نے ج نہ بتایا تو میں تمہیں ننگ کر کے ماروں گا۔ وہ سٹور کا بچہ دلاور شاہ تمہیں بچا نہیں سکتا صابر علی۔ بتاؤ اس نے کیا کیا تھا تم سے؟"

میں ابھی نیچے جا کے سب دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک میز پر اپنی ہمشیرہ کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کل شام سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بولو وہ کیا چاہتا ہے؟"

اس نے گھوڑا صحن کے لیے بہت بات چٹاؤں چلائے لیکن میرے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ پچلا ترپا اور اس نے مجھے دو دو دھکیلنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے ایک کھٹنے کی مدد سے اس کو کرسی پر دبائے رکھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اٹنے لگیں مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اس کے حلق سے الفاظ کے بجائے خرخرات سنائی دینے لگی۔

پھر میں نے اسے سانس لینے کی قہوڑی سی مہلت دی۔ اس نے کھانکے اور کھانکے کے اپنا گلا صاف کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ چند منٹ بعد جب اس کے اوسان بحال ہو گئے تو وہ بولا "تم۔۔۔ تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں اور پوئینقارم میں ہوں۔"

میں نے ایک ایڑی پر گھوم کر اسے لات ماری "پھر کیا خیال ہے پہلے تمہاری پوئینقارم اماروں؟"

وہ کرسی سمیت گر گیا اور بڑی مشکل سے اٹھا۔ میری لات اس کے سر پر گئی تھی چنانچہ اسے پکڑا رہے تھے۔

میں نے کہا "کیا ڈیوٹی دے رہے ہو تم اور کس کے لیے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں چاہوں تو تمہیں قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی ثبوت گواہ کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مقابلے میں میری بات سنی بھی جائے گی اور مانی بھی جائے گی۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "قاتلانہ حملے اہم شخصیات پر ہی ہوتے ہیں۔"

وہ مجھے خونی نظروں سے گھورنے لگا "تم کچھ بھی کرلو۔ میں تمہیں کچھ بھی بتانے والا نہیں ہوں۔ اور مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ اے ایس پی دلاور شاہ مجھے بچالے گا۔ وہ بہت اثر رسوخ والا بندہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم میری گھرائی کر رہے تھے؟ دیکھو صابر علی۔ شاید پہلے تمہارا واسطہ نہیں پڑا ہوگا میرے جیسے لوگوں سے۔ ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم ہمارے غلاموں کے بھی غلام ہو۔ تو یہ بالکل صحیح ہے۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں، تم مارے جاؤ گے۔ تمہاری نوکری ہی نہیں جان بھی جاسکتی ہے۔"

وہ مجھے گھورتا رہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم کبھی کیا سکتے ہو صابر علی سوائے غلامی کے اور وہ بھی دلاور شاہ جیسے چھوٹے افسران کی۔ کیا دے گا اس کا صلہ وہ شخص جو خود دوسروں کے اشاروں پر ناچتا ہو۔ اس کی خوشنودی حاصل کر کے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ شاید ایک دو ایڈوانس انکم۔ محنت۔ کوئی اچھی رپورٹ جو تمہاری ترقی میں معاون ہو۔ اپنی مرضی کی پوشنگ۔ لیکن اس کے نقصانات کی طرف شاید تمہاری نظریں نہیں گئی۔ یہ دیکھو کہ اس نے کس طرح پیادے کی طرح تمہیں موانے کے لیے اپنی بساط پر آگے بڑھا رہا ہے اور خود پیچھے بیٹھ کے کھیل دیکھ رہا ہے۔ یہ بتاؤ میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ صرف یہی تاکہ میں ایک سیاست داں ہوں۔ نہیں صابر علی! اس کے علاوہ بھی میں بہت کچھ ہوں۔ میرے تعلقات انڈورلڈ کی ایک بہت خطرناک مافیا سے ہیں۔"

"میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "بچ میں مت بولو۔ بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری کم علمی پر ترس آگیا ہے ورنہ میرے کاروبار میں انسان کی زندگی بہت بے وقت ہے۔ نہ جانے کتنے کارکن ایک معمولی سی غلطی پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو ٹانگ اڑانے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کہاں ٹانگ اڑا رہا ہے۔ سائیکل کے پیچھے میں یا ٹرین کے پیچھے میں اور کے گرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بکری کے پیچھے کو یا بھی کو۔ اگر میں چاہوں تو تمہاری گردن ایسے توڑ سکتا ہوں۔ ایسے۔"

اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے میں نے ویسی ہی ایک کرسی کو جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا ایک پاؤں بڑھا کے اور اچھالا اور کھڑی بھیلی کے دار سے دو جھگڑے کر دیا۔ اس کی قیمت بل کے ساتھ ادا کرنا میرے لیے کوئی منگنا سودا نہیں تھا کیونکہ فوری طور پر مجھے اپنی ہلاکت خیزی کے مظاہرے سے مطلوبہ

نہج حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔

میں نے جگا بکا اور پریشان نظر آنے والے صابر علی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ ”اور تمہاری گردن توڑ کے میں تمہیں اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں، میرا مطلب ہے تمہاری لاش کو۔ تو پوسٹ مارٹم سے کبھی ثابت نہیں ہوگا کہ تمہاری گردن توڑ کے میں نے تمہیں قتل کیا تھا۔ سمجھا یہی جائے گا کہ تم نے دوسری منزل سے چھلانگ لگائی تو تمہاری گردن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد تعیش ہوگی کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس کے نتیجے میں ثابت ہوگا کہ تم نے خودکشی کی تھی۔ یقین کرو، میرا تو نام ہی کوئی نہیں لے گا۔ اگر تم واقعی سرکاری طور پر یہاں سیکورٹی ڈیوٹی پر مامور ہوتے تو شاید اخبار میں اتنا ضرور لکھا جاتا کہ مرنے والا شاہ عالم چیئرمین پی بی ایف کے حفاظتی عملے میں شامل تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اس وقت تو تمہاری پوزیشن بہت خراب ہے۔“

اس نے ہمت کر کے لب کھولے ”اچھا جناب عالی! غلطی ہوگئی مجھ سے، مجھے جانے دیں۔“

میں نے کہا ”یہ کیسے جانے دوں۔ غلطی کی ہے تم نے تو اس کی سزا بھگتو یا کفارہ ادا کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں یہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟“

وہ نفی میں سر ہلانے لگا ”میں نہیں بتا سکتا سر، میں مجبور ہوں۔“

میں نے کہا ”کیا مجبوری ہے تمہاری۔ جو کچھ تم۔ مجھے بتاؤ گے کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ میں تمہیں تمہاری توقع سے براہ کرا انعام بھی دے سکتا ہوں۔ یہ انعام سرکاری انعام جیسا نہیں ہوگا جیسے اونٹ کے منہ میں ذریہ۔ نہیں، اس سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ بہت بڑا فائدہ۔ اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم ابھی فوری فائدہ حاصل کر کے مطمئن ہوتے ہو یا مستقل فائدہ چاہتے ہو۔“

وہ نروس لہجے میں بولا ”مجھے کوئی فائدہ نہیں چاہیے جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، مجھے معاف کر دیں۔“

میں نے کہا ”دیکھو صابر علی! اچھی بات یہ ہے کہ تم ایماندار فرض شناس اور ضمیر پرست وغیرہ نہیں ہو۔ جذباتی لوگ ان جگہوں میں پڑتے ہیں اور اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔ تم مطمئن آدمی ہو۔ وقت سے فائدہ اٹھانا جانتے ہو۔ میں تمہیں ایک آفر کرتا ہوں۔ تم میرے لیے کام کرو، جتنا تم اس نوکری میں کماتے ہو، اس سے سو گنا کمالو گے اور اگر ڈرتے ہو تو چلو چھوڑو تعاون کی نقد قیمت لو۔“

میں نے اس کے پیچھے جا کے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے ایک ہزار پاؤنڈ نکالے جو بازار میں تقریباً بیسٹالیس ہزار پاکستانی روپے میں فروخت کیے جاسکتے تھے۔ اس وقت اچانک میری نظر ایک برطانوی ساخت کے ریوالور پر پڑی جو میں لندن سے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ ایک منسلب شدہ ریوالور تھا جو میں نے ہوگر اینڈ کمپنی سے چھینا تھا اور یہ میرے ڈیپلومک پاسپورٹ کا کمال تھا کہ میرا بیچ نہ لندن میں چیک ہوا تھا اور نہ کراچی میں۔

ریوالور دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اسے نکال کے ایک کپڑے پر رکڑ کے صاف کیا اور نوٹوں کی گڈی پر رکھ دیا۔ ایک ہزار پاؤنڈ کے نوٹ اور ریوالور میں نے صابر علی کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس نے حیرت خوف اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان پر نگاہ ڈالی۔

میں نے کہا ”صابر علی۔ یہ ایک ہزار پاؤنڈ ہیں۔ سو فیصد اصلی، انہیں تم یکم میں بیچ کے پچاس ہزار بھی بنا سکتے ہو۔ سرکاری نسخہ پر یہ بیسٹالیس ہزار روپے ہیں۔ اور یہ ریوالور بالکل نیا اور دلائی ہے۔ اٹھا کے دیکھو، ڈرو نہیں یہ خالی ہے۔“

اس نے ریوالور اٹھالیا لیکن اسے اٹھاتے ہی صابر علی سمجھ گیا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بہرحال ایک پولیس میں تھا اور اس کے ہاتھ خالی یا بھرے ہوئے ریوالور گنے وزن میں فرق محسوس کر سکتے تھے غلط فہمی اسے یہ ہوئی کہ اس جھوٹ کو وہ میری بے وقوفی یا کمزوری سمجھا۔ وہ سمجھا کہ شاید میں بھرا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ اس کا منہ میری طرف نہ کر دے چنانچہ میں نے جھوٹ بول دیا کہ ریوالور خالی ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب صابر علی میرے پھیلانے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس گیا۔ اسلحہ ہاتھ میں آتے ہی وہ بہادر ہو گیا۔ اس کے چہرے کا تاثر بڑی تیزی سے بدلا۔ اس کی صورت پر پھیلی ہوئی ذلت اور شکست خوردگی کی شرمساری اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی دہشت اور اس کی بزدلانہ رویہ کی بے چارگی سب اچانک غائب ہو گئے اس کی جگہ اعتماد کی بے غنی اشتعال آمیز نفرت اور انتقامی جارحیت نے لے لی۔

اس نے بیچ ریوالور کا منہ میری طرف کر دیا ”سیدھا کھڑا ہو جا، تمہاری تو سب دے سیاست داں دے پتھر لیڈر کے“ اس نے مجھے سے لرزتی آواز میں کہا۔ گالیاں وہ عادتاً

دیتا تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”دی، جو تو میرے ساتھ کر رہا تھا۔“ اس نے دانت پٹس کے مجھے ایک اور گالی دی ”تو میری گردن توڑ کے باہر پھینکنا چاہتا تھا مجھے۔ خودکشی تو اب میں تیری کراؤں گا پتھر۔ میری تو یہاں ڈیوٹی ہی نہیں ہے۔ مجھ سے کون پوچھے گا۔ تعیش میں میرا نام ہی نہیں آئے گا۔ میں تجھے کوئی مار کے بھاگ جاؤں گا مگر ایسے نہیں۔“

اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نوٹوں کی طرف بڑھا ”یہ مال میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

مجھے اس بے وقوف پر افسوس بھی ہوا مگر وہ عقل و ذہانت میں اوسط پولیس والا تھا جس کی نظر اس دام ہم رنگ زین کو نہیں دیکھ سکتی تھی جو میں نے اسے چھانسنے اور ایک تھر سے دو شکار کرنے کے لیے پھیلایا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ کیا وہ مجھے جی جی شوٹ بھی کر دے گا۔ کیا وہ اس حد تک بے وقوف ثابت ہوگا؟ وہ مجھ سے اپنی ذلت کا بدلہ لے رہا تھا اور گالیاں دے کر اپنا غصہ نکال رہا تھا لیکن ایک پولیس میں کسی سیاسی لیڈر کو قتل کر دے، یہ بڑے دل گروے اور جنون کی بات تھی اور بظاہر ایسا ہونا مجھے ناممکن لگتا تھا مگر میں کسی بھی بدترین صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح ہوسکتا تھا۔

مجھے ہی صابر علی نے نوٹ اپنی جیب میں رکھے اس کی آنکھوں میں ایک خون آشام سفاک چمک سی پیدا ہوئی تھی دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اس کی عقل ساتھ چھوڑ چکی ہے اور وہ نتائج سے بے بہرہ ہو کے مجھ پر گولی چلانے کے لیے تیار ہے۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور اس کے ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی کرسی اٹھا کے صابر علی پر پھینک دی۔

کمرے میں تقریباً ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ پہلا دھماکا ریوالور کے فائر کا تھا۔ دوسرا گولی لگنے سے ٹی وی کی کچنر ٹیوب کے ٹپنے کا۔ تیسرا دھماکا کرسی کے کھڑکی سے ٹکرانے کا ہوا جس سے کھڑکی کا شیشہ ٹکڑ ٹکڑ ہو گیا۔

میں نے صابر علی کو دوسرا فائر کرنے کی سہلت نہیں دی۔ نیچے جھکتے ہوئے میں صابر علی میں ٹھس گیا اور ابھی اس کا ہاتھ دوسری بار میرا نشانہ لینے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے بائیں ہتھیلی گھما کے اس کی کلائی پر ماری۔ ایک اور فائر ہوا مگر ریوالور صابر علی کے ہاتھ سے اڑ گیا۔ اس کی کلائی یقیناً ٹوٹ گئی ہوگی۔ وہ نیچے کرتے ہوئے بڑی طرح جھلپٹایا۔

فائر کی آواز کمرے کے باہر بھی سنی گئی تھی۔ دوسرا فائر ہونے کے ساتھ ہی میں نے باہر سے بیچ پکارا اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ جب ہوٹل کی سیکورٹی والے اور انتظامیہ کے لوگ دروازہ توڑنے لگے تو میں نے صابر علی کو ناک آؤٹ کیا۔ اس کی جیب سے ایک ہزار پاؤنڈ نکالے اور دروازہ کھول دیا۔

سیکورٹی عملے کے لوگ خود کار اسلحے سے لیس اندر آ گئے۔ انہوں نے کمرے میں میرے سامنے اور میرے آگے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر نے پہلے مجھے اور فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے صابر علی کو دیکھا اور پھر کمرے کی حالت کو۔ کمرے میں ایک کرسی ٹوٹی پڑی تھی۔ میز الٹی ہوئی تھی۔ دھماکے سے پھٹنے والی پکچر ٹیوب کا شیشہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا۔

کسی پکچر ٹیوب کے ٹپنے کا دھماکا چھوٹے موٹے بم جیسا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیوب کے اندر مکمل خلا ہوتا ہے اور یہ ایک بہت مضبوط موٹے شیشے والے بلب کی طرح بھٹتی ہے تو شیشے کے ٹکڑے انسان کو اچھا خاصا زخمی کر سکتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب گولی پکچر ٹیوب کو لگی تو میں غوطہ مارا جاتا تھا چنانچہ شیشے کے پتھر جیسے ٹکڑے میرے اوپر سے گزر گئے۔ یہ ٹکڑے تین دیواروں سے ٹکرانے کے پورے کمرے میں گرے تھے اور انہوں نے کچھ ڈیکوریشن میں بھی توڑ دیے تھے۔ جو کرسی میں نے صابر علی پر پھینکی تھی وہ پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ صابر علی کو لگنے کے بعد کمرے کی کھڑکی سے ٹکرائی تھی اور کھڑکی کا شیشہ باہر کا ریڈور میں پھیل گیا تھا۔

اسسٹنٹ منیجر نے میری طرف دیکھا ”واٹ ا ز آل دس“

میں نے غصے میں دھاڑ کے کہا ”تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟ بالآخر وہی ہوا تا جس کی میں نے پیش گوئی کی تھی۔ اس سب انٹیکٹر کو کسی نے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے۔“

اسسٹنٹ منیجر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ”آر یو آل رائٹ سر!“

”بس میں جیگیا ہوں۔ حالانکہ اس نے مجھ پر دو فائر کیے۔ میں نے خود کو پُر سکون کرنے کی کوشش کی۔ یہ بڑا ہے اس کا ریوالور۔ خیال رکھنا کہ اسے پولیس کے سوا کوئی نہ چھوئے اس پر فکر برٹ ہوں گے۔“

”لیکن یہ اچانک کیسے ہوا؟“

”اچانک کچھ نہیں ہوتا“ میں نے برہمی سے کہا ”اس

مخلص کو کسی نے خاص طور پر ہار کیا تھا۔ اسی کام کے لیے۔
 "لیکن یہ تو آپ کی سیکورٹی ڈیوٹی پر مامور تھا۔"
 میں نے کہا "یہ اس کا اپنا بیان تھا جس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن اس نے غلطی سے حوالہ دے دیا ایس ایس بی شوکت علی کا۔ آج صبح میری ان سے فون پر بات ہوئی تو اتفاق سے صابر علی کا ذکر آگیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ میرا پریس کانفرنس کا بیان بڑھ کے انہوں نے میری سیکورٹی کے لیے پولیس کے سب انسپکٹر صابر علی کی ڈیوٹی لگا دی۔ وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے کسی کی ڈیوٹی نہیں لگائی تھی۔ میں نے صابر علی کو اسی لیے کمرے میں بلایا تھا کہ اس سے پوچھوں کہ آخر یہ جھوٹ اس نے کیوں بولا تھا اور وہ کیا چاہتا ہے؟"
 میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے میں اسے ایس بی دلاور شاہ نمودار ہوا "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے رعب دار آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا "دروازے پر یہ کیا مچھ لگا ہوا ہے؟"
 اسٹنٹ منیجر نے کہا "آپ کے سب انسپکٹر صابر علی نے مسٹر شاہ عالم کو قتل کرنے کی کوشش کی۔"
 "مجھے پروفا کر کے اس نے" میں نے کہا۔
 "واٹ ٹان سینس!" دلاور شاہ نے کہا "صابر علی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے مسٹر شاہ عالم سے۔"
 "لیکن اسے میرا کوئی دشمن تو استعمال کر سکتا ہے۔"
 "پولیس میں کبھی کراٹے کے قاتل نہیں بنتے آپ کے دشمن کیا اتنے بے وقوف ہیں کہ آپ کو قتل کرانے کے لیے پولیس کو استعمال کریں گے۔"
 میں نے اس کی بات کاٹ دی "بہ سوال کرنے سے پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔ میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"
 اس نے فوراً دفاعی انداز اختیار کر لیا "ہو سکتا ہے آپ نے مجھے مروان میں دیکھا ہو۔ یہاں میں صرف دو ماہ پہلے ہی آیا ہوں اور دو مہینے سے آپ لندن میں تھے۔ ازبک رائٹ میں اے ایس بی دلاور شاہ ہوں۔"
 میں نے کہا "یعنی اس وقت تم اتفاق سے ہوٹل میں موجود تھے۔"
 "ہاں میں ایک صمان کے ساتھ لچ کے لیے آیا تھا۔ کیا یہی وہ ہوٹل ہے۔"
 میں اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ "تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس پر گولی چلانے والے کے فکری پرنٹ ہیں۔"
 اس نے متانت سے کہا "میں ایک ذمے دار پولیس

آفیسر ہوں۔ آپ کو مجھ پر برا بھروسا ہونا چاہیے۔"
 میں نے کہا "اے ایس بی صاحب! کیا آپ آن ڈیوٹی ہیں؟"
 وہ بولا "میں صورت حال میں مجھے ڈیوٹی پر تصور کیا جاسکتا ہے۔"
 میں نے کہا "تھینک یو۔ فی الحال میں کچھ بھی تصور کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تک اس علاقے کے تھانے سے پولیس نہ آجائے صورت حال جوں کی توں رہے۔"
 اے ایس بی بی رہم ہو گیا "میں پولیس کے آنے تک تمام معاملات کا چارج لے رہا ہوں۔"
 میں نے بھی تیز ہو کے کہا "کس حیثیت میں؟ کیا یہ تمہارا علاقہ ہے؟ تمہاری پوسٹنگ کہاں ہے۔ مجھے بتاؤ میں ایس ایس بی سے کفرم کر لوں۔"
 "دیکھئے، آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں" وہ کچھ نرم پڑ گیا۔
 میں نے کہا "میں بھی جب تھانے کے لوگ آجائیں تو آپ میرے خلاف حد سے بڑھنے کی رپورٹ بھی لکھواؤں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن ابھی میں آپ کو کسی قانونی کارروائی کی اجازت بھی نہیں دوں گا بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ تشریف لے جائیں۔"
 اس نے فوراً معاملانہ انداز اختیار کر لیا۔ "شاہ عالم صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہیں۔"
 "کیا اس شخص کو ذہنی طور پر مطمئن اور بہت پرسکون نظر آتا چاہیے جس پر چند منٹ پہلے قاتلانہ حملہ ہوا ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں کیوں موجود ہیں۔ کچھ دیر پہلے میں نے آپ کو آپ ڈانٹنگ ہال میں تھے اور ایک خاتون کے ساتھ جھگڑا کر رہے تھے۔ اس عورت کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں اور اے ایس بی صاحب! جو آپ کی صمان تھی۔ ٹی اے اے پروس۔ آئی نو!"
 "آپ سوچے کچھ بغیر بولتے جا رہے ہیں۔"
 میں نے کہا "نہیں سرب۔ میں صورت حال کو سمجھ کے بات کر رہا ہوں۔ اس وقت آپ کا پھر یہاں موجود ہونا بے سبب نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی اتفاق مجھے ایسا یاد آگیا ہے کہ آپ کو میں نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ آپ کل رات میری پریس کانفرنس میں آئے تھے۔ حالانکہ آپ کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔"

"میں ڈیوٹی پر تھا۔ اور سیاسی نوعیت کے اجتماعات میں ہم وروی بہن کے رپورٹ لینے نہیں جاتے۔"
 میں نے کہا "تو آپ ڈیوٹی پر بھی نہیں تھے جو صفائی یہاں موجود تھے سب نے آپ کی برصغری کا مظہر دیکھا تھا۔ انہوں نے بعد میں اپنے ذرائع سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ کسی اے ایس بی دلاور شاہ کو خفیہ رپورٹ لینے کے لیے یہاں نہیں بھیجا گیا تھا۔ آخر تم کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ اس پولیس میں سے تمہارا کیا تعلق تھا جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی؟"
 وہ ایک دم محتاط ہو گیا "میں سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"
 میں نے کہا "تم اس سے باتیں کر رہے تھے۔"
 "یہ غلط ہے۔"
 میں نے کہا "میں نے اپنے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کے ہوٹل کے باہر تمہیں کیا رپورٹ دینے گیا تھا؟"
 ہوٹل کے اسٹنٹ منیجر نے گھبراہٹ سوار ہونے لگی۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اب میں اسے گواہ کے طور پر پیش کروں گا۔ "سرب! ہم نے آپ کے لیے دوسرے سوٹ کا انتظام کر دیا ہے۔"
 میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے تھانے میں رپورٹ کی ہے یا نہیں؟"
 "رپورٹ کر دی ہے سرب۔ وہاں سے پولیس آتی ہی ہوگی" وہ بولا "آپ چلیں۔"
 میں نے کہا "ان کے آنے سے پہلے میں نہیں چاہتا کہ کسی چیز کو چھیڑا جائے۔ پہلے انہیں رپورٹ لکھ لینے دو۔ پھر میں شفٹ کر لوں گا۔"
 اے ایس بی دلاور شاہ نے اپنی افسرانہ شان اور اپنی خودی کے علم کو بلند رکھتے ہوئے رخصت ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ "مسٹر شاہ عالم! میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نہیں چاہتے تو آپ کی مرضی۔ بعد میں یہ نہ کہنے لگا کہ یہاں ایک اعلیٰ پولیس افسر موجود تھا مگر اس نے اپنا لچ نہیں چھوڑا۔"
 میں نے کہا "نہیں کوں گا۔ آپ جائیں اپنا لچ انجوائے کریں۔"
 پولیس تقریباً پندرہ منٹ بعد پہنچی۔ اس وقت تک صابر شاہ کچھ کراہنے لگا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آجائے گا۔ پولیس بارڈر کی قیادت رواجی تو بند رکھتے

والا ایک انسپکٹر کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف انسپکٹر سلامت علی کی حیثیت سے کرایا۔ اس کے ماتحتوں میں ایک اے ایس بی آئی تھا جس کا نام اس کی شرٹ پر دل مراد خان لکھا ہوا تھا۔ باقی تین میں سے ایک لاس ٹائیک تھا یعنی والدہ اور دو کانٹیل تھے جو اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی اٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔ معاملہ ایک فائبرائٹ ہوٹل اور ایک سیاسی لیڈر کا تھا چنانچہ پولیس اپنی فرض شناسی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ غیروار جاتی انداز میں کر رہی تھی۔
 سلامت علی نے ایک نظر کمرے پر اور پھر صوفے کے قریب پڑے ہوئے ایس آئی سلامت شاہ بر ڈالی اور بولا۔ "اجازت ہے؟" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پچاس برس سے اوپر کا چہرے سے خراش نظر آنے والا افسر تھا جو موقع محل کے اعتبار سے اپنے رویے کو بدلنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے اے ایس آئی دل مراد خان کو اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا "دل مراد! اپنے شاہ صاحب کی رپورٹ لکھو۔"
 دل مراد نے روزنامے کے کور میاں سے کھولا اور اس میں کاربن پیپر رکھنے لگا پھر اس نے بال پوائنٹ نکال کے میری طرف دیکھا "جی سرب!"
 انسپکٹر سلامت علی نے اسے روک دیا "پہلے آپ مجھے بتائیں یہ بندہ کون ہے؟"
 میں نے کہا "اس نے اپنا نام صابر علی بتایا تھا۔"
 "آپ پر اس نے گولی چلائی تھی؟" اس نے مشتبہ لہجے میں کہا۔
 میں نے کہا "ہاں" اس دیوالور سے صابر علی نے مجھ پر دو فائر کیے۔ ان گولیوں کے خول بھی یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو تباہی کمرے میں نظر آ رہی ہے یہ نشانہ خطا ہونے کا نتیجہ ہے۔"
 "اس کا نشانہ خطا ہو گیا" اس نے یوں کہا جیسے یہ جان کے اسے دلی صدمہ پہنچا ہو۔
 میں نے کہا "ظاہر ہے" ورنہ یہاں میری لاش پڑی ہوتی۔"
 اس نے سر ہلایا "میرا مطلب یہ تھا کہ اتنے کم فاصلے سے ایک پولیس والا گولی چلائے اور گولی بندے کو کٹنے کے بجائے ٹی وی میں جا لے یا چھت میں لگے" اس نے سر اٹھا کے اور دیکھا "حیرت ہے۔"
 میں نے کہا "میں دیوتا رہا ہوں جو ہوا تھا کیا اب آپ رپورٹ لکھیں گے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

”پلیس جی“ مجھے شروع سے بتائیں ساری بات۔“
میں نے کہا ”یہ سب انسپکٹر صابر علی آج صبح میرے پاس آیا تھا اور اس نے کہا کہ ایس ایس بی شوکت علی حٹ نے اسے میری سیکورٹی ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔ گزشتہ رات میں نے اپنی پریس کانفرنس میں اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ مجھے اپنے سیاسی حریفوں اور دشمنوں سے جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اخبارات میں یہ بیان دیکھنے کے بعد ایس ایس بی صاحب نے صابر علی کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ اظہار اس کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں صابر علی کے بیان پر شک کرتا مگر میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور پھر خود ایس ایس بی صاحب سے بات کی تو وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے کسی کو بھی سیکورٹی ڈیوٹی پر مامور نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی درخواست کرے یا عدالت حکم دے تو پولیس انکار نہیں کرتی مگر ایسے اخباری بیانیوں پر ایکشن لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صابر علی میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ مجھے کسی کا سامنے کی طرح تعاقب کرنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ ہوٹل میں میرے ملاقاتیوں پر نظر رکھے۔ ایس ایس بی سے بات ہو جانے کے بعد میں نے صابر علی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے مگر جب میں نے سختی کی۔“

”کیا سختی کی؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔
میں محتاط ہو گیا۔ اگر میں کہتا کہ سچ لگوانے کے لیے میں نے صابر علی کا ٹھکانا پایا تھا۔ اس پر جسمانی تشدد کیا تھا اور اسے دہشت زدہ کیا تھا تو انسپکٹر اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کرتا اور ثابت یہ ہوتا کہ قاتلانہ حملے میں پسپا کرنے والا میں تھا۔ صابر علی نے تو اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔
میں نے کہا ”میں نے سختی سے پوچھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے؟ تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے کوئی جواب دینے بغیر جانے کی کوشش کی تو میں نے اس کو روک لیا کہ پہلے ایس ایس بی صاحب سے قیامت کرو۔ اس نے کہا کہ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی ہے اور مجھے دھکا دے کر فرار ہونا چاہا۔ میں نے دروازے کو کڑی لگادی اور صابر علی سے کہا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا اور ایس ایس بی سے کہوں گا کہ اس کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔ اس پر صابر علی نے ہسٹل نکال لیا اور مجھ پر گولی چلا دی لیکن میں بچ گیا اور گولی ٹی وی کے اسکرین پر لگی۔ پھر اس نے دوسری گولی چلائی مگر اس وقت تک میں صابر علی پر قابو پانے کے

لیے اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ چنانچہ دوسری گولی چھت کی طرف چلی گئی۔ یہ کرسی میں نے صابر علی پر پھینکی تھی جو کھڑکی پر لگی۔ اس کا شیش آپ نے باہر کا ریڈور میں پھرا ہوا دیکھا ہوگا۔ فائرنگ پر ہوٹل کی سیکورٹی والے فوراً آگئے لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے طریم کو ناک آؤٹ کرنے کے بعد دروازہ کھولا لیکن نہ میں نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا نہ کسی اور کو اجازت دی کہ وہ کسی چیز کو پھینکے حالانکہ آپ کے حکم کے ایک اے ایس بی صاحب نے مجھے ناک آؤٹنگ ہال میں کسی کے ساتھ کچ کر رہے تھے۔ وہ بھی فوراً آگئے تھے۔“
”شاہ عالم صاحب! آپ نے طریم کو کیسے ناک آؤٹ کیا تھا؟ اس کے سر پر کچھ مارا تھا یا۔“
میں نے کہا ”میں جو ڈوکراٹے جانتا ہوں۔ میرے پاس بلیک جیلٹ وغیرہ تو نہیں ہے مگر آپ میری سمارت آزمائنا چاہیں تو اپنے چادروں ماتحتوں کو کہیں کہ وہ میرے مقابلے پر آجائیں۔“
انسپکٹر معنی خیز طریقے پر مسکرایا ”میں ویسے ہی آپ کی بات مان لیتا ہوں۔“
میں نے عمداً اپنی رپورٹ میں اے ایس بی و لاور شاہ کے مشتبہ روسیے کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر میں اس کی پریس کانفرنس میں بلا جواز موجودگی، صابر علی کے ساتھ اس کے رابطے اور کچھ دیر پہلے ہونے والی تلخ کلامی کا ذکر کرتا تو یہ الگ ایک کیس بن جاتا جس میں ثبوت اور گواہ پیش کر کے بھی مجھے حاصل کچھ نہ ہوتا۔ سوائے اے ایس بی کی دشمنی کے۔ صابر علی کے خلاف رپورٹ لکھوانا بھی ایک کانڈی کارروائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس بالواسطہ طور پر صابر علی کی پوری مدد کرے گی اور اسے بچائے گی۔ ایسا ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ جب خود پولیس کی حیثیت طریم کی ہو جائے تو پورا محکمہ اس کی خاموش حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اول تو اسے گرفتار ہی نہیں کیا جاتا اور ”مفتور“ ظاہر کر دیا جاتا ہے جبکہ درحقیقت وہ اپنے کسی عزیز دوست کے گھر میں مزے سے بیٹھا ہوتا ہے یا تبدیلی آب و ہوا کے کسی دوسرے شہر چلا جاتا ہے اور حالات کے سازگار ہونے تک منظر عام پر نہیں آتا۔ اگر بحالت مجبوری اس کی گرفتاری ظاہر کرنی پڑے تو اسے تھانے کے اندر یا پولیس لائن میں رہنے کے لیے گھر جیسا ماحول فراہم کر دیا جاتا ہے اور اسے قانون کے خلاف پورا تحفظ دیا جاتا ہے۔ دوران ”فتیش“ اس کے ساتھی سر توڈ کو شش کرتے ہیں کہ ثبوت مناد یہے جائیں یا مشتبہ کو یہے جائیں۔ گواہ منحرف

ہو جائیں اور واقعاتی شہادتوں کو مسخ کر دیا جائے۔ طریم بڑی آسانی سے ضمانت حاصل کر لیتا ہے اور بالفرض محال کوئی سربراہ جج ضمانت قبول نہ کرے تو اسے عدالت کے کمرے سے ”فرار“ ہونے کے پورے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ وہ پھر اپنے ساتھیوں کی بنیاد میں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔
مجھے یقین تھا کہ میری رپورٹ سے صابر علی کا کچھ بھی نہیں بچے گا۔ وقتی طور پر اسے معطل اور گرفتار بھی کیا جائے گا مگر بعد میں جب مدعی شاہ عالم بھی نہیں رہے گا تو طریم کے خلاف کیس دیا دیا جائے گا۔ اعلیٰ افسران کی ملی بھگت سے اسے ٹرانسفر کر دیا جائے گا اور وہ کسی دوسرے شہر میں ڈیوٹی بھی دینے لگے گا۔ سال دو سال بعد کے پادرسے گا کہ صابر علی نے غیر قانونی اسٹے سے شاہ عالم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔
صابر علی پر یہ جھوٹا الزام لگانے کا مقصد اسے سزا دینا تھا بھی نہیں۔ میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی ہوتی تب بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ثبوت دینا کے سامنے لانا چاہتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اے ایس بی و لاور شاہ اور سب انسپکٹر صابر علی کے گٹھ جوڑ کا مقصد کیا ہے۔
انسپکٹر نے ”دوقومہ“ کی پوری رپورٹ اس طرح لکھی کہ ٹنڈ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ طریم کو پہنچے جسے اس نے ”فراسٹ“ میں لے کر فوری طور پر میڈیکل رپورٹ اور علاج کے لیے سرکاری اسپتال بھیجا دیا تھا اور ٹانگہ کر دی تھی کہ طریم کی سخت نگرانی کی جائے۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں اس کی ہوشیاری کو بالکل نہیں سمجھتا اور میرا مقصد محض قانونی کارروائی کے رسمی تقاضے پورے کرنا ہے۔ بعد میں پوچھیں کیا کرتی ہے کیا نہیں ”ان معاملات سے میرا کوئی کوڑا نہیں اور نہ میں قاتلانہ حملے سے خوف زدہ یا پریشان ہوں۔ سیاست کے کھیل میں یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ معمول کے مطابق رسمی کارروائی ابھی چل رہی تھی کہ رئیس خان کی واپسی ہوئی۔
اس نے صورت حال کو اور پھر مجھے بڑی تشویش سے رکھا اور یہ حواس ہو گیا ”شاہ جی! آخر یہ؟“
میں نے اسے مدبرانہ حلقے کے ساتھ دیکھا ”سب خیر ہے بکریڑی۔ ہم پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہو گیا“ اور سب کی نظر جاسکے اسے آنکھ ماری۔
”ایک اور یعنی جو میسواں؟ نہیں۔ پیچیسواں، سلور

جوبلی حملہ!“
میں نے کہا ”میں اللہ کی مہربانی ہے اور ہماری خوش قسمتی کہ ہم پھر بچ گئے۔ یہ تھانے دار صاحب آئے ہیں فتیش کے لیے طریم گرفتار ہو چکا ہے۔“
”نہیں بولا“ آپ کو پہلے دو فعل شکرانے کے ادا کرنے چاہئیں۔“
میں نے کہا ”اور تمہیں دو کالے کبیرے ہماری جان کا صدقہ سمجھ کے قریان کرنے چاہئیں۔“
وہ پلٹ کر جانے لگا ”میں اخبار والوں کو بتا دوں۔“
تھانے دار نے اسے روک لیا ”ابھی نہیں سیکریٹری صاحب! اخبار والے آگئے تو ہمارا کام رک جائے گا۔“
”نہیں رک گیا اور تھانے دار نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ قیافت کام کریں۔ ابتدائی فتیش مکمل ہو جانے کے بعد رپورٹ لکھی گئی تو پولیس نے جانے وادرات کا تفصیلی نقشہ تیار کیا اور وادرات میں استعمال ہونے والا اسلحہ اپنی تحویل میں لیا۔ میرے دستخط حاصل کرنے اور مجھے اپنے تعاون کا پورا یقین دلانے کے بعد انسپکٹر سلامت علی رخصت ہوا تو سہ پہر بھی بیت چکی تھی۔
وہ اسٹنٹ منیجر جس نے ایک دن پہلے میرے خدشات کو اہمیت دینے سے انکار کر دیا تھا، پہلے سخت پشیمان اور پریشان تھا کہ کہیں میں قاتلانہ حملے میں ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی ملوث نہ کر لوں جو مجھے مناسب سیکورٹی فراہم کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن جب میں نے کسی بھی معاملے میں اسے گواہ تک نہیں کیا تو وہ خاصی مطمئن اور شکر گزار نظر آئے لگا۔ اس نے مجھ سے بہت معذرت کی اور انتہائی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے سوئٹ نمبر دو میں منتقل کر دیا۔ اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے جو زحمت ہوئی، اس کے بدلے میں مجھ سے قیام و طعام کا ٹن نہ لیا جائے۔
تھانے میسر آتے ہی رئیس مجھ پر برس پڑا ”انوکے پشے۔ یہ تو نے کیا ناپاؤرا شروع کر دیا۔“
میں نے کہا ”مجھے یہ ڈراما لگتا ہے؟ قاتلانہ حملہ کرنے والا سب انسپکٹر وادرات میں استعمال ہونے والے اسلحہ سمیت گرفتار ہوا ہے۔“
”نہیں کی فتی پر قرار رہی“ آخر اس بے چارے تھانے دار نے تمہاری باگ ڈالنا تھا؟“
میں نے کہا ”نہیں۔ اول تو کوئی تھانے دار بے چارہ نہیں ہوتا اور ایسی بے بنیاد الزام تراشی سے اس کا کوئی بھی

کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اس نے جج جج بھج بھج پر قاتلانہ حملہ کیا ہوتا تب بھی پولیس اسے پچا لیتی۔ بے شک واقعاتی شہادت اس کے خلاف جاتی ہے مگر ہوش میں آنے کے بعد وہ بھی تو بیان دے گا کہ مجھے بدلتی کے ساتھ جھوٹ بول کر قاتلانہ حملے کے الزام میں ملوث کیا گیا ہے۔

رئیس نے کہا ”پھر اس کا مقصد؟“

”پلیسی رئیس خان، پلیسی کا زمانہ ہے۔ شاہ عالم پہلے ڈھول پیٹ رہا تھا کہ میری جان خطرے میں ہے دشمن مجھے مار دیں گے۔ اس ڈرامے سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ ڈراما نہیں کر رہا تھا۔ جج بول رہا تھا۔ کتنے عیار دشمن ہیں اس کے انہوں نے ایک قاتل کو محافظ بنائے کھینچ دیا۔ اگر خود پولیس کرائے کے قاتل کا رول ادا کرنے لگی تو لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کون کرے گا؟ سیاست میں مداری کا کھیل ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہمیں میں چنگاری ڈال کے جلا دوں کھڑی تماشا دیکھتی ہے۔ شاہ عالم کو بالآخر غائب ہوتا ہے۔ جب وہ غائب ہو گا تو زبانِ خلق خود گواہی دے گی کہ یہ بھی اس کے دشمنوں کی کارستانی ہے۔ وہ دشمن کون ہیں اور کہاں ہیں۔ جانے شاہ عالم کی بلا۔ قیاس آرائیاں کرنے والے اِدھر اُدھر جھک مارتے پھریں۔“

دروازے پر دستک ہوئی اور دو وٹیر میز پر جج کے لوازمات سجا کے رخصت ہو گئے۔

رئیس کو میری بات نے قائل کر لیا تھا ”اگر مقصد شہتیر ہے تو پھر سب اخبار والوں کو ضرور بتانا چاہیے۔“

میں نے کہا ”شہتیر نہیں جاہل کی اولاد۔“

وہ عجیب کے بولا ”تجہ ہاں دی۔“

میں نے کہا ”سب کو چھوڑ۔ صرف شہتیر کو بتادے۔ باقی کام وہ خود کرے گی۔ ہمارا پلیسی ڈیپارٹمنٹ بہت ذہرست ہے۔“

رئیس بولا ”یہ کام مقول کو خود کرنا چاہیے۔“

میں نے کہا ”مسئلہ یہ ہے پیارے کہ وہ مقول صاحب سے سخت ناراض ہے۔ ہو سکتا ہے وہ خود نہ آئے مگر باقی سب کو بھیج دے گی۔“

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد آٹھ دس معافی مجھ سے قاتلانہ حملے کی تفصیلات معلوم کرنے پہنچ گئے۔ یہ سب غیر معروف قسم کے وہ رپورٹر تھے جن کا تعلق شام کے اخبارات سے تھا۔ بڑے اخباروں کے نامور صحافیوں نے شام کے وقت ایک غیر اہم سیاست دان کے لیے فرصت نکالنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پر تکلف چائے پینے کے بعد بالآخر وہ قائل ہو گئے کہ میں نے ناکام قاتلانہ حملے کی خبر سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں بھیلوائی تھی، ان کے کسی حد تک غیر سنجیدہ رویے سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ بجلی سیاست میں شاہ عالم کا محدود کردار اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

ان حالات میں اگر شاہ عالم مرجاتا تو اس کی موت سے نہ سیاست کی دنیا میں کوئی الجھل ہوتی اور نہ صحافت کی دنیا میں۔ حالات کی یہ عدم موافقت میرے لیے بہت سازگار تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اس بار شاہ عالم دنیا سے رخصت ہو تو دنیا اس کا واجبی انداز میں نوٹس لے اور پھر اسے فراموش کر دے۔

پریس کانفرنس کے اختتام پر رپورٹر می انداز میں اپنی اہمیت کا احساس دلا کے رخصت ہو گئے تو ہال کے اس گوشے میں رئیس کے علاوہ صرف ایک شخص رہ گیا۔ وہ تیس تیس سال کا دیلا پتلا نوجوان تھا جس کی ٹینک پوش آنکھوں میں ایک بے نام سی آوازی تھی اور اس کا منہ ہوا منتظر چو منگراہٹ سے نا آشنا نظر آتا تھا۔ اس نے منہ لے رنگ کی ڈھلی ڈھالی شہرت اور شکن آلود چٹون پن رکھی تھی۔

اس نے کہا ”شاہ صاحب مجھے آپ سے اکیلے میں ایک بات کرنی تھی۔“

میں نے کہا ”رئیس میرا سیکریٹری ہے جس سے میں کوئی بات بھی سیکرٹ نہیں رکھتا۔“

”میں روزنامہ ”تملک“ سے آیا ہوں اور میرا نام ہے مرزا سلیم۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملایا ”آپ کے اخبار کا نام بڑا تملک خیر گنتا ہے لیکن۔“

”لیکن آپ نے بھی اخبار دیکھا نہیں۔“

میں نے مذہرت کی ”دراصل ایک شہر سے نکلنے والے تمام اخبارات دیکھنا بھی بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا۔“

”فقور آپ کا نہیں۔ یہ ایک نیا اخبار ہے۔ اس کی رنر اور پبلشری نہیں ایڈیٹر کو۔ بھی آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ ان کا نام ہے روزنہ۔“ وہ بولا اور پھر مجھے پرتوقع نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”روزنہ۔!“

”ہیں۔ مس جینم نے انہیں بھی فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں موجود ہوں گی۔“

میں نے کہا ”ہو سکتا ہے جینم کہیں مصروف ہو۔“

”کیا آپ کی ان سے کوئی بات نہیں ہوئی؟ وہ بولا۔“

میں نے کہا ”کس سلسلے میں؟“

”خصوصی ضمیر کے سلسلے میں۔ ہم یہ ضمیر شائع کر سکتے ہیں۔ ابھی سوائیں بیجے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو چھ سو اچھے بیجے تک ضمیر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔“ مرزا سلیم نے کندھے پر لٹکے ہوئے کمرے کو نمایاں کیا۔

میں نے کہا ”اس میں میرے چاہنے والی کیا بات ہے؟“

وہ بولا ”شاہ صاحب ابھی خبر گرم ہے۔ صبح تک باسی ہو جائے گی اور یہ کتنا بھی مشکل ہے کہ کتنے اخبار اسے نمایاں سرخی بنا کے پہلے صبح پر شائع کریں گے۔ پلیر ڈونٹ مائنڈ اٹ۔ شاہ عالم کا نام اب پبلک کے لیے اتنا اہم نہیں رہا۔“

میں نے کہا ”مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔“

”لیکن ایک خصوصی ضمیر آپ کو اہم بنا سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو جینم ماروٹن دل ماشاد۔ ضرور چھاپے۔“

اس کے لیوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ آئی ”کتنی تعداد میں؟“

میں نے حیرانی سے کہا ”یہ فیصلہ تو آپ کی پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹری کر سکتی ہیں۔ باقی داوے یہ وہی خاتون تو نہیں ہیں۔“

”روزنہ۔“

”مجھے تعجب ہے کہ یہ نام آپ کو اتنی دیر سے یاد آیا۔“

انہوں نے کہا تھا کہ شاہ جی سے صاف بات کر لیتا۔ دس ہزار کی تعداد میں ایک صفحے کا ضمیر چھاپنے کے اخراجات ہوں گے تقریباً پچیس ہزار۔“

”وہ چاہتی ہے کہ یہ اخراجات میں اٹھاؤں؟“ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”ظاہر ہے۔ دلچسپی یا سنسنی خیزی کے اعتبار سے یہ خبر اتنی بڑی نہیں ہے کہ پبلک اپنی جیب سے ایک روپیہ خرچ کر کے ضمیر خریدے۔ دو چار ہزار نکل جائیں گے باقی روپی ہوگی۔“

میں نے کہا ”یعنی میں پچیس ہزار روپیہ خرچ کر کے دس ہزار اشتہار شائع کراؤں، صرف لاہور میں تقسیم کرانے کے لیے؟“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

”پلیسی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کر سکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھائی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے۔“

یا پہلے صفحے کی سرخی بنایا جائے اور گستاخی معاف، اب آپ نواز شریف یا بے نظیر تو ہیں نہیں۔ لیکن اب انکیشن سے پہلے کچھ توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو پیسہ خرچ کر کے اخبار والوں کو خریدنا پڑے گا۔ اب کو صفحہ اول کی سرخی میں آنے کے لیے جگہ خریدنی ہوگی۔ کیونکہ ویسے تو آپ کی جگہ جتنی نہیں۔“

میں نے کہا ”مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی۔“

وہ بولا ”یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ کی پریس کانفرنس میں آدھے لوگ کھانے پینے آتے ہیں تو آدھے موت میں یا جینم کی وجہ سے آجاتے ہیں۔ روزنہ سے بھی جینم نے یہی ضمیر شائع کرنے کے لیے کہا تھا ورنہ ایسی فضول خبر ضمیر خصوصی کون بے وقوف چھاپ سکتا ہے۔ اب آپ اسے اشتہار کریں یا کچھ اور۔ لیکن زمانہ اشتہار بازی کا ہے۔“

میں نے کہا ”لیکن کیا پچیس ہزار زیادہ نہیں ہیں؟“

”اس لحاظ سے یقیناً زیادہ ہیں کہ آپ خود اشتہار چھاپیں تو شاید پانچ ہزار میں کام ہو جائے مگر کیا یہ کام آپ تین گھنٹے میں کر سکتے ہیں؟ اخبار کے پاس تو دس سال ہیں۔ ایک پوری تربیت یافتہ اور منظم ٹیم ہے اور تجربہ ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ ہونا ہے تقسیم کا۔ آپ سارے لاہور میں اشتہار کیسے تقسیم کریں گے؟ اخبار کے پاس تو ہارن کی فوج ہے۔“

میں نے کہا ”تم بڑے اچھے سیکرٹری ہیں۔“

وہ بولا ”اس کے علاوہ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ نے سیاست کی دکان سجا رکھی ہے تو روزنہ نے خبروں کی دکان لگائی ہے۔ فائدہ کے لیے وہ بھی خدمتِ خلق نہیں کرتی۔ فائدہ آپ دیکھتے ہیں تو کیا اسے نہیں دیکھنا چاہیے؟“

میں نے کہا ”تمہارے دلائل بہت مضبوط ہیں۔ میں قائل ہوں۔ تم جاؤ اور ضمیر چھاپو۔“

اس کے لیوں پر پھر وہی مردہ سی مسکراہٹ آئی ”اگر میں اس بات کی گارنٹی دوں کہ ضمیر پورا بک جائے گا۔ روپی میں نہیں جائے گا بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا تو آپ مجھے کیا دیں گے؟“

رئیس ہنسنے لگا ”یہ بھی تم خود ہی بتا دو پیارے!“

وہ بولا ”آپ مجھے صرف دو ہزار روپے دیں۔ جینم کی دو چار ہزار نہیں دس ہزار کا پیاں یوں جائیں گی یوں۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

میں نے کہا ”اوسکے دو ہزار تمہارے۔ حالانکہ دس ہزار کا پیاں فروخت ہوں گی تو اصل فائدہ ہوگا تملک کے

مالکوں کو مگر یہ کام تم کیسے کرو گے؟
وہ بولا "خصوصی ٹیمیں جتنے ہیں ایک سنسنی خیز سرفی پر۔
وہ سرفی میں بیٹوں گا۔ پولیس کا نفرس کے دوران میں نے کچھ
سرخیاں لکھی تھیں۔ آپ دیکھ لیں، پہلی ہے "پولیس نے
انتخابات سے قبل متعدد سیاست دانوں کو قتل کرانے کی ذمہ
داری قبول کرلی۔"

میں اچھل پڑا "سہ سرفی کیسے ہو سکتی ہے؟"
وہ اسی سائٹ کے لیے میں بولتا رہا "دوسری سرفی ملاحظہ
ہو۔" شاہ عالم کے بعد نواز شریف اور بے نظیر کو قتل کرانے
کے لیے پولیس کا منصوبہ۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا تم اچھل ہو؟"
وہ بولا "تیسری سرفی یہ ہو سکتی ہے۔" پولیس نے کرائے
کے قابل بھرتی کر لیے۔ شاہ عالم پر قاتلانہ حملے کے الزام میں
تھانے وار گرفتار۔"

رہیں نے کہا "یار تم اخبار کو بند کرادو گے۔"
اس نے کہا "سر ہم اپنا کام سمجھتے ہیں۔ اس میں آپ
کی تو کوئی ذمہ داری نہیں۔ ہم اخبار والے بھی مہاری
ہیں۔ روز ایسا تماشا دکھاتے ہیں۔ سرفی کے نیچے کیس متین
میں ہم لکھ دیتے ہیں کہ غیر مصدقہ ذرائع سے ملنے والی
اطلاعات کے مطابق۔"

میں ہنس پڑا "یعنی جھوٹ بولنے کے بعد کہہ دیتے ہو
دروغ بر گردن راوی۔"

"یہی سمجھ لیں۔ مگر اس سے آپ کا کام تو ہو جائے گا نا۔
جو سرفی دیکھ کے ہمیں خریدے گا پھر وہ پوری خبر بھی پڑھے
گا۔ جلدی فیصلہ کریں وقت کم ہے۔"
میں نے کہا "فیصلہ تو ہو گیا لیکن پچیس ہزار میں تمہیں
نہیں دے سکتا۔"

"آپ مجھے میرے دو ہزار دے دیں۔ باقی رقم ایک کھنے
کے اندر اندر میں روزینہ کو پہنچا دیں۔ یا مس جبین ان سے
بات کر لیں کہ رقم مل جائے گی۔"

میں نے کہا "تمہاری مس روزینہ کا پہلے کوئی دوسرا
اخبار تھا۔ کیا وہ بند ہو گیا؟"

وہ بولا "ان کے کئی اخبار بند ہو چکے ہیں مگر اس سے کیا
فرق پڑتا ہے۔ آج کل ڈیٹیکشن اسلام آباد سے نہیں لینا
پڑتا۔ ڈی ای آفس دیتا ہے۔ جتنے چاہو لے لو۔ ہر روز نیا اخبار
نکلا جاسکتا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

وہ چند قدم گیا اور پھر لوٹ آیا "ایک اور آئیڈیا ہے۔ اگر
آپ پسند کریں؟"

میں نے کہا "تم ایک ماہر مشیر بن سکتے ہو پولیس کے
لیے۔ پھر یہ رپورٹنگ کا کام کیوں کر رہے ہو؟"
وہ بولا "ہر کام کے لیے ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے۔ جیسے
آپ کے پاس سیاست ایک پلیٹ فارم ہے عزت شہرت اور
اقتدار حاصل کرنے کا۔ میرے پاس صحافت کی سند نہ ہو تو
میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "نہا آئیڈیا بتاؤ۔"
اس نے کہا "اگر آپ دس ہزار خرچ کریں تو دو بڑے
اخباروں میں یہ خبریں بکے صفحے کی سرفی بن سکتی ہے۔"
میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"ایک نواز آئیڈیٹر ایک ہزار روپے لیتا ہے۔ کم سے کم دو
کالم کی سرفی ہوگی۔ تین کی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر لے آؤٹ
میں جگہ بن جائے۔"

میں نے کہا "تم کیا ان کے ایجنٹ ہو؟"
"میں سب کا ایجنٹ ہوں۔ سب کے فائدے کی بات
کرنا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے مشورہ طلب نظروں سے نہیں کو دیکھا تو اس
نے تائید میں سر ہلایا۔ "کیا اس کے لیے بھی مس جبین کی
صناعت ضرور ہوگی۔"

"آپ چاہیں تو مجھے ادا بھی کر سکتے ہیں۔ ابھی۔"
میں نے کہا "تمہیں بھی ہم پر اعتبار ہونا چاہیے۔"

اس نے کچھ سوچا اور پھر سر ہلا کے رخصت ہو گیا۔ پسا
بڑی تیزی سے زر پرستی کے مذہب کا خدا بننا چاہتا تھا۔ پیسے کی
توسلہ خرید کسی سیٹائی ویلے کی طرح معاشرے کی اخلاقی
قدروں پر غالب آ رہی تھی یہاں تک کہ صحافت جیسے مقدس
سمجھے جانے والے پیشے میں بھی جھوٹ اور منافقت کی
دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پسا ایسی طاقت سے بڑی طاقت بن گیا
تھا۔ اس پر سے جائز اور ناجائز کا لیبل اتر گیا تھا۔ حرام کی
کمانی کے خلاف ایمان کی مزاحمت رکھنے والے اتنے کمزور
پڑ گئے تھے کہ ان کا وجود محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔

شاہ عالم کے لیے مہاری کا آخری کھیل پیش کرنے کے
لیے اسٹیج سیٹ ہو چکا تھا۔ اس رپورٹر کے رخصت ہوتے ہی
میں نے ہوٹل کے اسٹنٹ میجر کو طلب کیا۔ وہ میرا بہت شکر
گزار تھا کہ میں نے کسی سرے پر اس کو یا ہوٹل کی انتظامیہ
کو اپنے قانونی معاملات میں ملوث نہیں کیا چنانچہ اس کی
توہری اور ہوٹل کی نیک نامی دونوں پر کوئی حرف نہیں آیا۔

میں نے کہا "تمہیں زیادہ منتظر ہونے کی ضرورت
نہیں۔ میں اتنا عرصہ لندن میں رہا۔ اب جیسے ہی یہاں رہائش

کا مستقل بندوبست ہو گا۔ میں ہوٹل سے شفٹ کر جاؤں گا۔"
اس نے اخلاقیات کا "آپ ہمارے معزز مہمان ہیں سر۔
آپ کا یہاں قیام ہماری عزت افزائی ہے۔"

میں نے کہا "شاید دو چار دن رہوں گا میں یہاں۔"
"میں نے فرسٹ فلور کی طرف آنے والے راستے پر
اسٹیشن سیکورٹی کا انتظام کر لیا ہے سر۔"

"تھینک یو۔ آج شام تک میں کسی قسم کی مداخلت
نہیں چاہتا۔ نوٹیلی فون کال۔ نوڈیز۔" میں نے اسے دس
ہزار روپے دیتے ہوئے کہا "یہ میرے اکاؤنٹ میں آئیڈ جسٹ
ہو جائیں گے۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا تو میں نے رہیں سے کہا
"بس آپ ایک کھٹے میں مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"
رہیں نے ایک بیگ کھولا "یہ ہے تیری وردی اور
تیرے منہ کالا کرنے کا سامان۔"

میں نے کہا "نیلیم اس وقت کہاں ہوگی؟"
"اس کا شیڈول دیکھ کے بتا سکتا ہوں۔ لیکن میرا اندازہ
ہے کہ وہ آج کچھ جلدی فارغ ہو جائے گی۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ فی الحال اس کے پاس چلا
جاؤں۔"

وہ خوش ہو گیا "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ تو ہمارے
ساتھ رہ۔ تیرے لیے اس گھر سے زیادہ محفوظ جگہ کون سی
ہو سکتی ہے۔"

میں نے وردی کا معائنہ کیا۔ سر میں نیلے رنگ کے
کپڑے کی یہ وردی، پتلون اور بٹرن پر مشتمل تھی۔ اس
کے ساتھ بیچ کرتی ہوئی سفید پٹی والی ڈرائیور کی ٹوپی تھی۔
اسے جسم پر چڑھانے سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنا چوہ بھی
بدلوں۔ میرے چہرے پر کئی ہفتوں کی شیو تھی جو بڑھتے بڑھتے
باقاعدہ داڑھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میرا پرانا
بیزر اسٹائل بھی بالکل مختلف تھا۔ داڑھی تو میں خود شیو کر کے
بٹا سکتا تھا مگر کسی ماہر فن بیئر ڈریسر کی مدد کے بغیر میں اپنے
موجودہ بیزر اسٹائل کو بدلنے سے قاصر تھا۔

چہرے کے ساتھ میں اپنے چیلے میں نمایاں تبدیلی لباس
بدل کے کر سکتا تھا۔ شاہ عالم سیاسی فیشن کے مطابق کلف سے
گھڑکھڑکتے سفید کپڑے کے شلوار قمیص اور سیاہ و اسٹ میں
پلیٹ کے سامنے آیا تھا اور رہیں کے سامنے پیش ہوا تھا۔
اخبارات میں شائع ہونے والی اس کی تمام تصاویر بھی اس
لباس اور وضع قطع کے مطابق تھیں جو سیاست کے کھیل میں
ہر مہاری نے اختیار کر لیا تھا۔ ناصر عظیم یہ پیشہ ورانہ لباس

ترک کر کے پینٹ شرٹ اور ٹائی یا سوٹ میں ایک بالکل نئی
شخصیت کے قالب میں داخل ہو سکتا تھا۔ چیلے اور لباس میں
اس تبدیلی کے اور نام مختلف ہونے کے باوجود اس بات کے
امکانات بالکل ختم نہیں ہوتے تھے کہ کسی تقریب میں سیاسی
اجتماع میں یا راہ چیلے کی سے ایف کے کسی پرانے جانی گویا
کارکن کو ناصر عظیم پر شاہ عالم ہونے کا شبہ ہو جائے لیکن شاہ
عالم کی آخری موت میں کوئی شبہ نہیں رہے گا تو دیکھنے والے
کو یہ مشابہت ایک اتفاق سے زیادہ چونکانے والی محسوس
نہیں ہوگی۔ دنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں جو اپنی صورت کے
نقوش کی مماثلت سے کسی مشہور شخصیت کے ہم شکل نظر
آتے ہیں۔ یہ بات بظہر کے بارے میں زیادہ مشہور ہے کہ وہ
اپنا ایک ہم شکل ساتھ رکھتا تھا اور ایک تقریب میں وہ صرف
اس لیے نکلا کہ وہاں اس کا ٹی بی ٹیٹ موجود تھا۔ دنیا کے کئی
سربراہان مملکت جن کو اسے مخالفین اور بدبخت گردوں سے
حملے کا خطرہ رہتا ہے، ذاتی سیکورٹی کے لیے اپنے کسی ہم شکل
کو قربانی کے کمرے کے طور پر ہر کام رکھتے ہیں۔

اپنا چوہ اور چیلے بدل کے کسی کے نوٹس میں آئے بغیر
ہوٹل سے نکلتا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے
لیے ضروری تھا کہ میں خالی ہاتھ جاؤں۔ اگر میں سوٹ کیس
لٹھاکے جاتا تو انتظامیہ کی نگاہیں زیادہ باریک بینی سے مجھے
تائز میں کہیں کوئی معزز مہمان مل کے واجبات ادا کیے بغیر
تو فرار نہیں ہو رہا ہے۔ میں اپنا سامان رہیں کو بھی دے سکتا
تھا لیکن اس میں بھی یہ رسک برہ حال تھا کہ میرا سوٹ کیس
اس فیجر کی نظر میں آجائے جس نے کچھ دیر پہلے پولیس کے
ساتھ میرے کمرے میں آکے جانے واردات کا معائنہ کیا
تھا۔ اس نے میرا سامان سوٹ نمبر دو میں ہی شفٹ کر دیا تھا۔
وہ سوٹ کیس کو پہچان سکتا تھا۔

پھر میرے ذہن نے اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیا۔
میں نے رہیں سے کہا "یار تمہارا ایک دوست تھا جیرا بلینڈ
عرف انکسٹرڈ نڈر۔"

رہیں بولا "تھا کا کیا مطلب۔ وہ فوت تو نہیں ہوا۔"
میں نے کہا "اس کے کڑوت بھی وہی ہیں۔"

رہیں ہنسا "ابے چور جائے چوری سے۔" میرا پھیری سے
تو نہیں جانتا۔ اس وقت وہ کیسے یاد آ رہا؟

میں نے کہا "وہ ایک کام کر سکتا ہے لیکن وہ ملے گا
کہاں؟ اس کا کوئی فون نمبر وغیرہ ہے؟"
"فون نمبر تو ہے لیکن وہاں میں مندی لگا کے گھر میں تو
نہیں بیٹھا ہوتا۔ اسے تو ڈھونڈنا پڑے گا اس کے ٹھکانوں پر تو

کام تھا۔

میں نے کہا ”یہ جو شاہ عالم کا سامان ہے۔ اس میں سے کچھ تو یہاں چھوڑنا ہوگا مثلاً اس کے کپڑے جو تھے یہ سوٹ کیس اور شاہ عالم کا بریف کیس۔ اس میں شناخت کی بہت سی دستاویزات ہیں۔ پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس۔ چنگ اکاؤنٹ کی چیک بکس۔ اگر یہ ثابت کرنا مقصود ہو کہ شاہ عالم پر اسرار حالات میں غائب ہوا، اسے اغوا کیا گیا تو ظاہر ہے سامان کمرے میں ہی ملنا چاہیے۔ یہ بھی ثابت ہونا چاہیے کہ اسے کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

رئیس نے مجھ سے اتفاق کیا ”پھر پریشانی کیسی۔ چھوڑ دے یہ سب سامان یہاں اور ہاتھ جھڑکے چل۔“

میں نے کہا ”نہیں یا۔ اس میں کچھ سامان تو میرا ہے ہی نہیں۔ مثلاً یہ چھوٹا سا باکس جو دیکھنے میں سگرا باکس لگتا ہے۔“

”اس میں کیا ہے؟“

میں نے کہا ”تو خود دیکھ لے۔“

رئیس نے وہ باکس کھولا جو مجھے لارڈ پرائس نے خاص طور پر اسپتال میں ملا کے دیا تھا۔

”سوئے کے زیورات؟“ رئیس حیرانی سے بولا۔

میں نے کہا ”جو میں قیصر خالص سوئے کے۔ کیسے ہیں؟“

”بہت خوبصورت۔ لا جواب۔ مگر یہ تو کس کے لیے لایا ہے؟“

میں نے کہا ”تیری کھوپڑی میں جس کا نام ہے اس کے لیے نہیں۔“

”میں تو سمجھا تھا تو نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں؟“

میں نے کہا ”مجھے معلوم تھا تجھے اور کوئی خیال ہی نہیں

سکتا۔ یا یہ چندا کی امانت ہے۔ پچاس سال سے لارڈ پرائس کے پاس محفوظ تھی۔“

”لارڈ پرائس کون؟“

میں نے اسے مختصراً لارڈ پرائس کے اور پھر اس سے

اسپتال میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ”کرگل خان“ نے یہ زیور معلوم نہیں کس کے لیے ہوائے تھے اور

لارڈ پرائس کے پاس رکھوا دیے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد لارڈ پرائس واپس افغانستان چلا گیا اور کرگل خان سے اس کا رابطہ

نہیں رہا۔ بس اتفاق کی بات ہے کہ اسے چندا سے میرے

تعلق کے بارے میں معلوم ہو گیا اور یہ کہ چندا اسی کرگل خان کی پوتی ہے۔ ابھی تک مجھے موقع نہیں مل سکا کہ یہ زیورات چندا کو پہنچا سکوں۔“

رئیس نے باکس بند کر دیا ”بڑا باریک کام ہے یا۔ پہلے ہوتا ہوگا۔ یہاں تو میں نے کبھی بھی ایسی سمارت نہیں دیکھی۔“

میں نے کہا ”ان زیورات کے علاوہ پانچ پاؤنڈ چاکلیٹ لایا تھا میں لندن سے۔“

”قر کے لیے؟ اسے اب بھی شوق ہے؟“

میں نے کہا ”شوق کی کوئی عمر ہوتی ہے؟“ اور ابھی اس کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ مجھے تو آج بھی وہ کل والی چھوٹی سی بچی لگتی ہے جو صرف اسی بات پر اپنے بھائی سے روٹھ کے کہا ہو جاتی تھی کہ وہ بازار گیا تھا تو اس کے لیے چاکلیٹ کیوں نہیں لایا۔ بھائیوں کے جذبات نہیں بدلتے۔“

رئیس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی ”اپنی تو پیارے ایسی قسمت ہی نہیں تھی کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بسن ہوتی۔ ہمیں کیا معلوم بسن بھائی کے رشتے میں کیا جذبات ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”کتنی چھوٹی سی بچی تھی قریب اس کی ماں اسے میرے حوالے کر کے گئی تھی۔ باپ قتل ہو گیا تھا۔ ماں قاتلوں سے بدلے لینے لگی تھی اور لوٹ کے نہیں آئی۔ بڑی ذلت داری لگتی تھی میرے کندھوں پر۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے توفیق دی، حوصلہ دیا اور استقامت دی۔ آج قرآن پڑھ کر میں خوش ہے۔ یہ دیکھ کے مجھے کتنی خوشی ملتی ہے۔“ اس کا توا نہ انداز نہیں کر سکتا۔ یہ چاکلیٹ دیکھ کے اس کا چہرہ خوشی سے کیسے کھل اٹھے گا، صرف یہ دیکھنے کے لیے میں کبھی بھی جاؤں اس کے لیے چاکلیٹ ضرور لاتا ہوں۔“

رئیس نے کہا ”چل یہ چاکلیٹ بھی رکھ لے، اور کیا سامان ہے؟“

میں نے کہا ”شاہ عالم کے ایک دو جوڑے بھی ساتھ لینے

ضروری ہیں۔ شاہ عالم کا پاسپورٹ میں ہیں چھوڑ دوں گا۔

شناختی کارڈ بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ دوسرا بن جائے گا۔ لیکن

بعد میں شاہ عالم کی شناخت کے لیے میں ایک چیز رکھ لیتا

ہوں۔ اس کا انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس۔ یہ بات سچی ہے

کہ آئندہ جو میں گھنٹوں میں ہوں سے شاہ عالم کے غائب

ہو جانے کا راز فاش ہوگا تو انتظامیہ اس کی رپورٹ پولیس کو

دینے پر مجبور ہوگی۔ پولیس یہ سب سامان اپنی تحویل میں لے

گی اور جب رپورٹ لکھی جائے گی تو اسے کبھی پر اپنی قرار

دے کر مال خانے میں جمع کرادے گی جہاں یہ آقاقت پڑا رہے گا۔ ظاہر ہے نقد رقم ان کے لیے نہیں چھوڑی جا سکتی۔ غنیمت ہو جائے گی۔“

”یہ سامان تو میں ایک ایک میں ڈال کے نکل جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”یا، اس کے علاوہ بھی کچھ سامان ہے۔ لندن سے سوئی نے اور ٹیلر کے سابق لی آر او عاقل نے کچھ تحائف بھیجے ہیں۔ کچھ نوادرات میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں جو وہاں نہیں چھوڑے جا سکتے تھے مثلاً قرآن کریم کا ایک نایاب نسخہ ہے۔ جو اورنگ زیب عالمگیر نے لکھا تھا۔ یہ سب سامان لے جانے کے لیے ایک سوٹ کیس تو چاہیے۔“

”چل سوٹ کیس مل جائے گا۔“

میں نے کہا ”لیکن اسے باہر کون نکالے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ تو باہر سے کوئی سوٹ کیس لائے اور آدھے گھنٹے بعد واپس لے جانے تو کسی کو شک ہو۔ اس کے لیے میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔ جو اورنگ زیب کا نام آیا ہے تو اسے تلاش کر۔ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”اس میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں، پتا نہیں وہ کہاں ملے گا؟“

میں نے کہا ”وہ جہاں بھی ملے، اس سے کتنا کہ ایک سوٹ کیس میں کچھ سامان ڈال کر لائے۔ کچھ کپڑے میرے ساتھ رکھ کر کچھ ایسا سامان جو کسی کو اغوا کرنے میں کام آسکتا ہو مثلاً ایک بوری، رسی، شراب کی آدمی یا خالی بوتل، بے ہوش کرنے والی دوا۔“

رئیس نے نفی میں سر ہلایا ”تمرا مطلب ہے کلوروفارم۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔“

”تیرے تو اعزہ مرگراؤنڈ دنیا میں بڑے تعلقات تھے۔“

”تھے جب تھے۔ اب نہیں ہیں۔ نیند کے انجکشن

البتہ لاسکتا ہوں کوشش کر کے۔“

”ان سے بھی کام چل جائے گا“ میں نے کہا ”نذیر کو

ایک ریو لور بھی قریان کرنا پڑے گا۔ اسے کتنا فکر نہ کرے،

میں اسے دوسرا دلا دوں گا۔“

”ایک سی ریو لور ہوگا اس کے پاس تو۔“

میں نے کہا ”یہ سب سامان وہ ایک سوٹ کیس میں ڈال

کے یہاں آجائے۔ فرضی نام سے ہوئی میں ایک کمرہ حاصل

کر کے میرے نکل جانے کے ایک گھنٹے بعد وہ اپنا سوٹ

کیس کمرے میں خالی کرے۔ اپنا سارا سامان بیس

چھوڑے اور سوٹ کیس اٹھا کے نکل جائے۔ میں اپنا سامان

اس میں ڈال دوں گا۔“

رئیس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے ”لیکن یہ سب آخر کس لیے؟“

میں نے کہا ”دیکھ یا۔ شاہ عالم کی گمشدگی کے معاملے میں کنفیوژن پھیلاتا ضروری ہے۔ یہ بات بھی بالآخر ہوئی والوں کو معلوم ہو جائے گی کہ جو سامان گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آیا تھا وہ کمرے میں کیا چھوڑ گیا ہے۔ تقریباً اسی وقت شاہ عالم بھی غائب ہوگا۔ اس سے جبرے بلید کی پوزیشن مشکوک ہو جائے گی۔ پولیس بھی اسی چکر میں پڑ جائے گی کہ اس پر اسرار ممان کا یقیناً شاہ عالم کیس سے کوئی تعلق ہوگا۔ تجھے واپس آنے کی ضرورت نہیں۔“

رئیس کے جانے کے بعد میں نے ریکارڈ کے لیے ایک ٹیلی فون کال سوئی کے نمبر پر کرائی۔ لندن میں دوسری عمر عاقل اور سوئی گھر مجھے رہی مل گئے۔

سوئی میری آواز سن کے سخت جذباتی ہو گئی ”اتنی دور

سے تمہاری آواز سن کے بڑا عجیب لگ رہا ہے بھیا!“

”ایسا صرف ٹیلی فون کی ایجاد کی وجہ سے ممکن ہوا

خاتون۔“

وہ بولی ”جب آپ کا جنازہ اڑ گیا تو میں بہت روئی۔“

میں نے کہا ”یا گل ہے تو۔“

”مجھے ایسا لگتا تھا جیسے لندن کے شہر میں صرف ویرانی

اور سناٹا ہے۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اور پاکستان تو اتنی

دور ہے۔ اتنی دور ہے کہ میں اس دوری کا تصور بھی نہیں

کر سکتی۔“

میں نے کہا ”آواز سے تیز چلنے والے جیٹ طیاروں کے

اس دور میں کوئی جگہ دور نہیں۔ لندن سے آٹھ گھنٹے میں

جنازہ پاکستان پہنچ جاتا ہے۔“

وہ اداسی سے بولی ”کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا میرے

لیے بھیا۔ تم ہی بتاؤ سوئی کیسے آسکتی ہے پاکستان؟“

میں نے کہا ”خواہ مخواہ ایسی باتیں مت سوچا کر۔ کیا

یہاں سے شادی کر کے لڑکیاں امریکا، برطانیہ نہیں جا رہی

ہیں۔ اور پھر یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ اس کے بعد تو بھی

جب چاہے گی آجائے گی ورنہ جب تو کہے گی ہم آجائیں

گے۔“

”نہیں بھیا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ

آٹھ او جھل بھاڑ او جھل۔ اتنی دور کون آتا ہے کسی سے

ملنے۔ فرصت کے ملتی ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں اپنے

مصروف ہو جاتے ہیں کہ آتا تو دور کی بات ہے، کسی کو فون

کرنے کی ادھر یا دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔
میں نے کہا "تو اس مت ہو ہم آئیں گے اور بہت جلد آئیں گے" صرف تجھ سے ملنے۔
"سچ بھلا۔ کب آؤ گے" میں دن گنا شروع کر دوں؟
میں نے کہا "ابھی تو میں ابھا ہوا ہوں" اپنے معاملات نمٹانے میں "ان معاملات کے بارے میں تو ابھی طرح جانتی ہے۔"

"آپ اپنا فون نمبر تو مجھے دے دیں۔"
میں نے کہا "بھئی میں نمبر ہوا ہوں ہوں ہوں میں۔"
"ہوں میں کیوں" اپنے گھر میں کیوں نہیں؟
میں نے کہا "میرا کون سا گھر ہے۔ بتاؤ۔ تو نے تو اپنا گھر بتالیا۔"
وہ بولی "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میرا گھر نہیں تھا تو کیا میں ہوں میں رہتی تھی؟"
میں نے کہا "تو نہیں سمجھتی اس لیے کہ رہی ہے۔
بھئی تو رہتی ہی بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ مگر شادی کے بعد بھائی نہیں جاتے۔ بہنوں کے گھر میں رہنے کے لیے۔"
"آخر پہلے کہاں رہتے تھے تم؟"

"رہیں خانے میں مگر وہاں تو بقول شاعر۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ رہیں نے میری وجہ سے بڑی پریشانی اٹھائی۔ اس کالا کون کا گھر جو اس نے بڑے شوق سے بنوایا تھا، راکھ ہو گیا۔ اب وہ خود نیکم کے ساتھ اس کے گھر میں رہتا ہے۔"
"تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں اس گھر میں؟ آخر میں بھی تو رہی تھی۔"

میں نے کہا "ویسے تو شہین نے کیا ہے کچھ انتظام لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ فی الحال نیکم کے ساتھ رہنا سب سے بہتر ہوگا۔ چل اب تو فون دے اپنے مجازی خدا کو۔"
وہ ہنسی "مجازی خدا تو بھوت بنے ہوئے ہیں۔ صبح سے گھر کے چالے صاف کر رہے تھے۔ لوہہ آگے منہ دھو کر۔"
عاقلاً نے کہا "تسلیمات بجالا تا ہوں سالے صاحب!"
میں نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے بارہ دو دن میں تم نے مجھے قائم مقام سر کے عہدے سے گھٹا کے سالا کر دیا۔"

"کیا کریں بھائی! ہماری اپنی اوقات دو کوڑی کی ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے ڈسٹری میں بھی شوہر کے لغوی معنی بدل دیے جائیں۔ شوہر کے معنی حکم کا غلام۔ مفت کا نوکر۔"
میں نے کہا "حضرت! آپ تو وہی دن میں جسم نقش

فرادی بن گئے۔"
"حضرت!" اس نے ایک آہ بھری "خدا آپ پر بھی یہ وقت لائے گا۔ تم ہوئے تم ہوئے کہ میرے ہونے سب اسی زلف کے اسیر ہوئے اور اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا آیا ہے۔ شادی ہوئی، بچے ہوئے اور پھر بچوں کے بچے ہوئے اور بالآخر انجام بخیر ہوا۔ خیر چھوڑو، تم اپنی سزاؤ کہ جب خیر سے بدحوہی کو آئے تو گھر آ کے کیا تیرا مارا؟ تمہارے معاملات کہاں تک پہنچے۔"

میں نے کہا "معاملات اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن یا رکڑے مردے اکھاڑتا بہت مشکل کام ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں لوگ شاہ عالم کو بھول چکے تھے۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلا میں کیا۔ دو دن میں ایک پریس کانفرنس کی اور اپنا ڈھول خود بیٹا۔ اخبار میں خبریں لگوائیں۔ آج ایک قاتلانہ حملے کی خبر کا بندوبست کیا تاکہ لوگ کچھ تو چنیں۔ شاہ عالم کی کچھ سیاسی اہمیت تو بحال ہو تاکہ وہ میرے تو خبر بنے۔ اب وہ پہلے والی شاندار تدفین تو ناممکن ہے مگر کچھ گواہ ضرور مل جائیں گے اس کی موت کے۔"

وہ بولا "میں بھی شادی کے بعد خانہ آبادی کے مسائل میں الجھ کے رہ گیا ہوں اور حال میرا یہ ہے کہ شادی ایک ہوئی ہے مگر گھر دو یا رہنا پڑ گیا۔ پرانے قلیٹ میں جو آتش فشاں کی واردات ہوئی تھی اس کے قانونی مسائل سے نمٹ رہا ہوں۔ انشورنس کلیم کے معاملات الجھ ہیں۔ بھان اللہ کیا جی مون گزر رہا ہے۔"

میں نے کہا "بھئی کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کچھ اداس ہے۔"

"یار ایسی باتیں تو سب لڑکیاں کرتی ہیں۔ لگتا ہے کہ چھوڑ پائل کا گھر موہے پی کے مگر آج جانا پڑا تو گویا بڑا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خوب سوسے بھالیتی ہیں اور آئیٹنگ بھی اچھی کرتی ہیں ڈیپریشن کی۔ سب ڈراما ہے۔ آہ۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"
عاقلاً بولا "وہی جو بچ بولنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ چالے صاف کرنے والا برش ماریا۔ شکر ہے ہاتھ میں گولی مارنے والا آگ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اللہ مہر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ان نوادرات کے بارے میں غور کیا ہے۔"
وہ بولا "جتنا غور کیا ہے اتنا ہی میری فکر میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔ کل اتفاق سے ایک مردانا ملا جو

امپورٹ ایکسپورٹ کے قانونی مسائل کا ماہر تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص یا ادارہ نوادرات کو ایک ملک سے دوسرے ملک لانے لے جانے کا مجاز نہیں۔ یعنی قانونی طور پر یہ ناممکن ہے کہ میں وہ نوادرات آپ کے نام ارسال کر سکوں۔ سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھے تاکہ آخر یہ نوادرات کہاں سے اور کیسے آئے؟ آخر قدیم اور نوادرات کی منتقلی ملک کے اندر ہو یا باہر۔ صرف اور صرف حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ برطانوی حکومت ہماری حکومت سے کہے گی کہ سوری یہ آپ کے ملک کا تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہے جو غلطی سے یہاں پہنچ گیا تھا تو حکومت پاکستان بھی سخت سناڑ کرے گی کہ سوری کا کیا مطلب بتایا جائے کہ یہ غلطی کرنے والا کون تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت طویل اور مشکل قانونی مرحلہ ہے۔ لیکن۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن کیا۔۔۔؟"
"ہر مشکل کام کا ایک آسان طریقہ بھی ہوتا ہے۔ جسے عام طور پر غیر قانونی طریقہ کہا جاتا ہے۔ یہ نوادرات واپس اسکل کیے جاسکتے ہیں لیکن ایک تو مجھے اسکلنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔ دوسرے میرے دوست احباب یہاں تک کہ سسرالی عزیزوں میں کوئی اسمگلر نہیں ہے۔ سب شرفا ہیں۔"
میں نے کہا "کیا تم اسمگلروں کو جانتے۔۔۔ نہیں۔ جولی کا شوہر تو بیل میں ہے مگر جولی تمہاری مدد کر سکتی ہے۔"
"بالکل کر سکتی ہے اگر تم اس سے کہو۔"

میں نے کہا "لارڈ راکس بھی کام کا آدمی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ سب جو آرٹ اینڈ کرافٹ ڈیلر ہیں۔ دنیا بھر سے نوادرات لندن لانے والے اور ان کے ایجنٹ سب تمہارا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔"

عاقلاً نے کہا "ہاں یہ تو ہے۔ جو سیدھا عمل کرتے ہیں وہ انہا کیوں نہیں کر سکتے۔ بقول شاعر۔ یہ سوک جاتی ہے جلال پور جٹاں کو۔ اور پھر واپس بھی نہیں آتی ہے۔ جو پاکستان سے نوادرات لاتے ہیں وہ نوادرات کو پاکستان بھی لے جاسکتے ہیں۔ اسمگلنگ کی شاہراہ پر ون وے ٹریفک تو نہیں چلتی۔"

میں نے کہا "رائٹس تمہارا مسئلہ حل ہوا۔ فو

المنطوب۔"
"لیکن تم تصور کا دوسرا رخ نہیں دیکھ رہے ہو۔ وہ جو تاریخی نوادرات اسمگل کر کے یہاں لاتے ہیں۔ انہیں یہاں حق محنت وصول ہو جاتا ہے۔ انہی گنگا بنائے میں کسی کو کتنے فتن کا ثواب ملے گا۔"

میں نے کہا "ہم اسے معاوضہ ادا کریں گے" تم بات کرلو۔"
"ایک پراہم تمہیں بھی ہوگی۔ تم ان نوادرات کا کیا کرو گے؟ کیسے انہیں حکومت کے حوالے کرو گے۔"
میں نے کہا "میں کوئی صورت نکال لوں گا۔"
بات ختم کر کے میں نے فون رکھا ہی تھا کہ نیکم کا فون آیا۔

میں نے کہا "کہاں ہو تم اس وقت؟"
"راج ایک شوٹنگ کینسل ہو گئی تھی اس لیے گھر آ گئی ہوں۔ تم کیوں ہوں میں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہو؟"
میں نے کہا "ایک لاوارث اور بے گھر آدمی آخر کہاں جائے۔ سب ریکس جیسے خوش قسمت تو نہیں ہوتے۔"

وہ ہنسنے لگی "ذائقہ چھوڑو۔ یہ بتاؤ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ تمہاری پریس کانفرنس کی روداد پڑھ کے تو ایسا لگتا ہے جیسے تم پھر سیاست کے میدان میں اترنے پر کمر بستہ ہو۔"

میں نے کہا "وہ سب فضول باتیں ہیں جو صرف پریس کانفرنس میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت تم جانتی ہو۔ میں اس جال ملک جنجال سے نکلنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

"اپنی رپائش کے بارے میں کیا طے کیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ذمہ داری میں نے جیم کو سونپ دی تھی۔ اس نے میرے لیے آفس اور گھر کا بندوبست تو کیا ہے کہیں۔"

"تم کرائے کے گھر میں رہو گے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ بڑے بڑے معزز لوگ رہتے ہیں۔"
وہ بولی "نام۔ بڑے شرم کی بات ہے یہ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ کیا میرا گھر تمہارا نہیں ہے؟"

"بالکل ہے۔ اور اسی لیے میں تمہارے گھر کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی کو لاحق خطرات کا سایہ بھی اس گھر پر پڑے۔"
"آخر ایسا کیوں سوچتے ہو تم؟ ایسی غیریت کی باتیں کیوں کرتے ہو۔"
میں نے کہا "مجھے معلوم ہے نیکم کے جتنا بڑا تمہارا گھر ہے۔ اس سے کہیں بڑا تمہارا دل ہے۔ میرے لیے تمہارے دل میں جتنی جگہ ہے یہ بھی جانتا ہوں میں۔ اسی لیے تو برسوں بعد بھی سوتی کو لے کر تمہارے پاس آ گیا تھا اور آج اگر یعنی بن جانے والی سوتی اپنے گھر میں ہنسی خوشی آباد ہے تو صرف

تمہاری وجہ سے۔"

"بار بار ایسی باتیں سننا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بس تم اپنا سامان اٹھاؤ اور آجاؤ۔"

میں نے کہا "میری زندگی کی کہانی بھی عجیب ہے۔ نیلم۔ میری آدمی زندگی تو نیم خانے میں گزر گئی۔ اس کے بعد سے میں دیہر ہوں۔ کتنا عرصہ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہا۔ پھر شادو کے عشق نے خوار کیا تو فقیر ہو گیا اور شاہ جی کے ڈبے پر پڑا رہا۔ اس کے بعد ماں باپ کی طرح میرا خیال رکھنے والے بہرہ رانہا مل گئے اور وہاں کچھ دن ایسے آئے تھے جب شادو نے میرا گھر آباد کیا تھا مگر تم جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوا۔ شادو میرا ساتھ چھوڑ گئی اور اس وقت جب دنیا میرا کوئی نہ تھا تم نے مجھے اپنا یا پھر قسمت نے کرل خان کے گھر پہنچا دیا۔ اسے بھی میں نے اپنا گھر سمجھا لیا تھا لیکن تقدیر نے مجھے شاہ عالم ہاؤس پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں روپوش رہا اور ایک سال رئیس خانے میں گزار دیا۔ کوئی بھی گھر ایسا نہیں تھا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

"مگر اپنا گھر بس وہی ہوتا ہے جو اپنے نام ہو تو میں نیلم ہاؤس تمہارے نام کروں گی" نیلم سننے لگی۔

میں نے کہا "جب میں دوسری طرح سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں کتنا خوش قسمت تھا۔ کتنے لوگوں نے مجھے اپنا سمجھا تھا اور آج بھی سمجھتے ہیں۔ اگر میں ڈاکٹر کمال سے کموں کے میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں تو وہ کے گا کہ سڑک کے نیچے اپوچہ کیوں رہا ہے سامان اٹھاؤ اور آجا۔ قراس سے زیادہ خوش ہوگی۔ لیکن وہ خود رہتے ہیں دو کمروں کے ایک کوارٹر میں۔ جب فقیر اور درویش آدمی ہے کمال بھی۔ پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں۔ وہ چاہے تو اسپتال کے احاطے میں ہی اپنے لیے کوٹھی بنا سکتا ہے۔ اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا مگر وہ اپنی ضروریات کی سطح کو کم سے کم رکھتا ہے۔"

"تم خود بھی تو اپنی کوٹھی بنا سکتے ہو ہاں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور واقعی کتنا اچھا ہو اگر نیلم ہاؤس جیسا عالی شان محل نہ سہی۔ اتنا بڑا ایک گھر وہاں ہم سب ساتھ رہ سکیں۔ جیسے پہلے رہتے تھے۔ میں اور قرہ کمال اور چندا ایک فیملی کی طرح۔ لیکن ابھی وہ بڑے سکون سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی زندگی کو اپنے مسائل کے ساتھ ڈسٹرب نہیں کر سکتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہاں آجاؤ۔ میں تم اور رئیس اکٹھے رہ سکتے ہیں۔"

"ابھی تمہارا فون آنے سے پہلے میں یعنی سے بات کر رہا

تھا وہ بھی مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے اور کہیں نہیں رہنا چاہیے۔ خود رئیس یہی چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "شاہ عالم۔"

"اچھا ابھی شاہ عالم! اسے لوگوں کی خواہش ہے تو تمہیں مان لینا چاہیے۔ ویسے بھی آگے چل کے ہماری زندگی کے مقاصد مشترک ہوں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "صرف اپنی اور رئیس کی بات کرو۔"

وہ بولی "کیوں؟ رئیس کے اور تمہارے راستے الگ ہو جائیں گے کیا۔ رئیس تمہارے ساتھ رہے گا۔ میں رئیس کے ساتھ تو گویا تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "اچھا بابا۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔"

اس نے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ ایک کام سے گیا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔ تمہارے سیکریٹری کو میں نے زبردستی اپنا سیکریٹری بنایا ہے۔ اب تم کیا کردی؟"

وہ ہنسی "تم یہاں آجاؤ گے تو ہم اسے شیئر کریں گے۔"

میں نے کہا "بڑی فراخ دلی دکھا رہی ہو۔ بعد میں سب سے زیادہ شکایت تمہی کو ہوگی عام بیویوں کی طرح کہ مجھ سے میرا شو پر چھین لیا۔"

رئیس آگے گئے تھے بعد نمودار ہوا تو اپنے مقصد میں کامیابی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ "زیادہ نہیں تلاش کرنا پڑا اسے۔ جیرا بلڈ اتفاق سے گھر ہی تھا۔"

"کیا وہ تیرے ساتھ نہیں آیا؟"

رئیس نے گھڑی دیکھی۔ "اسے میں نے بتایا تھا کہ کیا سامان ساتھ لاتا ہے۔ پہلے تو سالار برشان ہوا۔ پوچھے گا کہ چکر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ بھوتی کے ساری زندگی تو چکروں میں گزاری ہے۔ اب ہم سے پوچھتا ہے کہ چکر کیا ہے۔ مجھے اپنا چاچا چنگ باز یاد ہے؟"

میں نے کہا "بالکل یاد ہے۔ کیا وہ آج کل جیل سے باہر ہے؟"

"اے یار! وہ صرف ایک بار جیل گیا ہے۔ وہ بھی ایک جھوٹی شکایت پر۔ وہ ہماری پنڈال چوگرڑی کا سردار تھا۔"

"اس وقت چاچا چنگ باز کا ذکر کیسے آگیا؟" میں نے کہا۔

"آج کل وہ اور جیرا بلڈ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ چاچا ہر فن مولا ہے۔ دنیا کا ہر کام کر سکتا ہے۔ وہ جیرے کے

ساتھ گیا ہے انشاء اللہ سب سامان لے کر ہی آئے گا۔ یہاں سالے سیکرٹری والے مجھے بھی روک رہے تھے میں نے کہا کہ میں تو سیکرٹری ہوں شاہ عالم کا لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی۔ مجھے لے گئے فیجر کے پاس۔ پھر کہیں اوپر آنے کی اجازت ملی۔ فیجر کہہ رہا تھا کہ ویسے تو بہت فون آرہے ہیں ان لوگوں کے جو شاہ عالم کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہے ہیں مگر ایک کوئی ایم پی اے ہے۔ ملک رب نواز وہ بہت کرم ہو رہا تھا جب ہم نے کہا کہ شاہ عالم سے بات نہیں ہو سکتی تو دھکیلا دینے لگا۔"

میں نے کہا "سالہ ایم پی اے کی اولاد۔"

رئیس بولا "یار رئیس وہ خود نہ پہنچ جائے۔"

میں نے کہا "یہاں آگے بھی کیا ہوگا۔ میں نے تو ملاقاتوں پر بھی پابندی لگا رکھی ہے۔"

معمل رازداری کے لیے ضروری تھا کہ ہونٹ میں پہنچ جانے کے بعد جیرا بلڈ نہ مجھے فون کرے اور نہ مجھ سے ملنے کوشش۔ اس کا فون نہ معلوم کرنے کے لیے رئیس کو دوبار باہر جانے کا فون کرنا پڑا۔ پہلی مرتبہ تو ہونٹ والوں نے معذرت نہ لی کہ اس نام کے کوئی مہمان یہاں قیام پذیر نہیں ہیں لیکن پندرہ منٹ بعد اس کی دوسری کوشش کامیاب رہی۔

"وہ کمر خیم چار سو گیارہ میں ہے" اس نے واپس آگے بتایا۔

میں نے کہا "تو نے اسے سب سمجھا دیا تھا؟ اسے یہاں صرف ایک گھنٹا قیام کرنا ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "خیرے بلڈ پر بھروسا ہونا چاہیے تھے۔ وہ کتنی مرتبہ ہمارے کام آیا ہے۔"

میں نے کہا "اپنا سب سامان الگ کر لیا ہے میں نے۔ تو اوپر لے جا اور جیرے کو سمجھا دے کہ یہاں سے نکل کے سیدھا نیلم کے پاس جائے اور سوٹ کیس نیلم کے حوالے کر دے۔"

"تو نہیں ملے گا جیرے بلڈ سے۔"

میں نے کہا "اب ملاقات ہوتی رہے گی یا رہے یہاں کسی نے مجھے اس سے ملاقات کرتے دیکھ لیا تو سارا بلان چوٹ ہو جائے گا۔ یہ سامان پہنچا کے تو بھی جا اور وہیں نیلم کے گھر انتظار کر میرا۔"

"زیادہ دیر مت کرنا۔"

میں نے کہا "میں شیو کر کے یہ واڑھی صاف کروں۔ پھر منہ کالا کر کے یہ وردی پہننا ہو اور آتا ہوں تقریباً ایک گھنٹے میں۔"

رئیس کچھ فکر مند ہو گیا "اے ایسا نہ ہو کہ سالے سیکرٹری والے پہچان جائیں گے۔ بارہا بھی روشنی ہے۔"

میں نے کہا "تو جو واڑھ لڑ لایا ہے اس سے میں چہرے اور ہاتھوں پر قدرتی کالا رنگ کروں گا تو بالکل جھٹی نظر آؤں گا۔ ڈرائیروں والی وردی اور سر پر ٹوپی ہوگی تو کس کا دھیان جائے گا میری طرف۔ واڑھی بھی صاف ہوگی اور مونچھیں بھی۔ ایک گھنٹے میں سورج غروب ہو جائے گا تو دن کا اجالا نہیں ہوگا۔ بلبب کی روشنی میں کوئی مجھے نہیں پہچان سکتا۔ تو جا۔"

دس منٹ بعد میں نے روم سروس سے اپنے لیے کافی طلب کی تو یہ بھی کہا کہ مجھے روزنامہ "تہلکہ" کا خصوصی نمبر چاہیے۔ اس کی ایڈیٹرز روزنہ کو میں نے کوئی ادائیگی نہیں کی تھی اور نہ ختم نے میری طرف سے کوئی یمن دہانی کرائی تھی مگر اس کے باوجود شاہ عالم سے برائے مراسم کا لحاظ کرتے ہوئے روزنہ نے فیجر چھاپ دیا تھا۔ شاید اسے بھی یہ بھی یقین ہوگا کہ اب میں نے دوبارہ میدان سیاست میں قدم رکھا ہے تو اسے آئندہ بھی مجھ سے فائدہ اٹھانے کے مواقع ملنے رہیں گے۔

روزنہ شیشی خیر صحافت کی دنیا میں ایک جیننس تھی۔ اس نے شاہ عالم پر ناقام کا قحانہ حملے کی خبر چھ کالی سرخی بنا کے چھاپی تھی یہ سرخی یہی تھی جو مجھے کی ہاتھوں ہاتھ فروخت کی ضمانت ہو سکتی تھی۔ روزنہ نے تیسری سرخی کا انتخاب کیا تھا "پولیس نے کرائے کے قاتل بھرتی کر لیے۔"

شاہ عالم پر قحانہ حملے کا طرم تھا نہ دار گرفتار۔

خبر کی تفصیلات کے ساتھ میری تازہ ترین تصویر مل گئی ہوئی۔ دوسری طرف پولیس کی وردی میں طرم نظر آ رہا تھا۔ وہ اسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی نگرانی کے لیے دو مسلح پولیس والے موجود تھے۔ تیسری تصویر واردات میں استعمال ہونے والے دیوالیور کی بھی اور چوٹ میں جانے واردات یعنی ہونٹ کے گھرے میں جا ہی کے منظر کو واضح کیا گیا تھا۔ روزنہ نے شاہ عالم کے ساتھ تجرید مراسم کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختصر سا ادارہ بھی لکھ مارا تھا جس میں پولیس کو خوب رگید ا گیا تھا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ اعلیٰ حکام نے میری گزشتہ شب کی پریس کانفرنس میں کیے گئے خدشات کو بالکل اہمیت نہیں دی۔

اے ایس آئی صابر شاہ اور اے ایس ایس جی دلاور شاہ دونوں ہی کسی ناویدہ ہاتھ کے آگے بڑھائے ہوئے مہرے تھے بے شک میری غیر متوقع جوابی چال سے چھوٹا مہرہ پٹ

گیا تھا اور بڑے مرے کو پیچھے ہٹا دیا تھا لیکن میری یہ کامیابی
بست عارضی تھی۔ اس نے انہیں زیادہ چراغ کیا ہو گا جو کسی
خاص مقصد کے تحت پولیس کو میرے خلاف استعمال کر رہے
تھے۔ شاید وہ میری گرفتاری چاہتے تھے لیکن اس کے لیے
ضروری تھا کہ برائے مقدمات کی فائلیں پھر کھلی جائیں اور
ایک مفور مجرم کی حیثیت سے میری گرفتاری کے احکامات
بھی حاصل کیے جائیں۔ قانون کے حرکت میں آنے سے پہلے
اگر میں ہوٹل سے نکل کے کہیں جاؤں گا تو
وارنٹ دکھائے بغیر نہ وہ مجھے روک سکتے تھے اور نہ گرفتار
کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے صابر علی کو محافظ بنا کے میرے
ساتھ کر دیا۔ ان کی بد قسمتی یا میری خوش قسمتی کہ یہ راز
فاش ہو گیا اور مجھے تھوڑی سی مصلحت مل گئی۔

فرید عباسی مجھے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ قانونی طور پر
میری پوزیشن بہت خطرناک ہے اور مجھے کسی بھی وقت کہیں
بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ دلاور شاہ کو
میری نگرانی پر کس نے مامور کیا تھا اور صابر علی کو میرے پیچھے
کسی نے لگایا تھا۔ خود پولیس نے یا کسی رپ نواز جیسے مہیاں
نے مگر میرے پاس حقیقت حال تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں
تھا۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی شاہ عالم کا غائب ہو جانا اس
کے اپنے مفاد میں تھا۔ اور بے حد ضروری تھا۔

لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ برا وقت آچکا ہے۔ دروازے
پر دستک ہوئی اور میں نے کہا "لیس!" تو ہوٹل کا اسسٹنٹ فیجر
اندر آ گیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بد خواہی عیاں تھی "سرا"
ایک پھولی سی پراہم پیدا ہو گئی ہے۔
میں نے کہا "میری وجہ سے؟"

اس نے ہاتھ مل کے کہا "آپ کی وجہ سے تو نہیں سرا۔
مگر تعلق آپ سے ہی ہے۔ آپ کی پارٹی کے کچھ کارکن"
جب میں نے دیکھا تو پندرہ بیس تھے۔ اب ممکن ہے زیادہ
ہو گئے ہوں۔ وہ گیٹ کے سامنے جمع ہیں اور پولیس کے
خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگا رہے ہیں۔

میں سمجھ گیا کہ یہ روزنامہ "سنڈیک" کے خصوصی ضمیمے کا
دو عمل ہو گا۔ میں نے کسی سیاسی لیڈر کی طرح ایک ڈائیلاگ
بولا "عوامی غیظ و غضب کا طوفان ایک دن ہو دو کہ کسی کے
سازشی نوے کو سلاب کی طرح ہمارے جانے لگا۔"

اسسٹنٹ فیجر کچھ ترس ہوا "لیکن یہ کارکن ہمارے
لیے انتظامی مسئلہ پیدا کر رہے ہیں۔ سڑک کے اس پار ایک
پولیس چوکی ہے۔ کہیں ان کا تصادم نہ ہو جائے۔ میں خود بھی
ہوٹل کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو بلانا نہیں چاہتا سرا۔

اگر آپ نیچے جا کے ان سے بات کر لیں تو شاید وہ مطمئن
ہو کے واپس چلے جائیں۔"
میں نے کہا "اوسکے اگر تم کہتے ہو تو میں انہیں
سمجھاتا ہوں کہ وہ پراسن رہیں اور کسی قسم کی اشتعال
انگیزی نہ کریں۔"

ہوٹل کے مین گیٹ میں جمع ہونے والے کارکنوں کی
تعداد مشکل سے پندرہ بیس ہو گی۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے
حفاظتی پیش بندی کرتے ہوئے گیٹ بند کر دیا تھا۔ اس سے
آنے اور جانے والی ٹریفک متاثر ہوئی تھی۔ سیکورٹی کا عملہ
جانے والی گاڑیوں کو پارکنگ کے سامنے آنے والے گیٹ کی
طرف موڑ رہا تھا۔

نعرے لگانے والوں کی قیادت ایک جوشیلا نوجوان کر رہا
تھا جس کا قد مشکل سے پانچ فٹ ہو گا۔ وہ ہر نعرے کے ساتھ
ہٹانے کی طرح اچھلتا تھا۔ باقی لوگ زندہ باد اور مردہ باد کہنے
والے دی جذباتی احمق تھے جو ہر سیاسی لیڈر کو بلا معاوضہ
دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ ہر جلسہ گاہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ہر
جلوس میں وعدوں کے قریب کھانے کے باوجود ہر بار خوش
نہی کے نئے خواب دکھانے والے کسی مداری کا تماشہ دیکھنے
لگتے ہیں۔

میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا لیکن میں
نے اپنے چہرے پر ایک دوستانہ شناسائی کی مڑافت
سکراہٹ سجائی اور ان کی طرف دیکھ کے یوں ہاتھ بلایا جیسے
ان سب سے پھر مل کے مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ اپنے
محبوب لیڈر کو ملاقات کے لیے گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر
کارکنوں کا جوش و خروش بڑھ گیا اور ان میں سے ایک گیٹ
پر چڑھ کے نعرے لگانے لگا اور ہوا میں کے لہرانے لگا۔ گیٹ
کے اندر کھڑا ہوا مسلح محافظ خاصا بد خواہ نظر آ رہا تھا کیونکہ
ابھی تک اسے انتظامیہ کی طرف سے کوئی ہدایات موصول
نہیں ہوئی تھیں کہ وہ مظاہرین کا سامنا کرے یا پیچھے ہٹ
جائے۔ عام طور پر کسی بھی ہنگامہ خیز صورت حال میں پولیس
کو فوراً طلب کر لیا جاتا تھا کہ وہ حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے
پولیس اپنے طور پر کوئی ایکشن لینے سے گریز کرتی تھی۔

میں نے قریب جا کے لوگوں کے نعروں کا ہاتھ ہلا کر
جواب دیا اور گاڑی سے کہا کہ وہ گیٹ کھول دے۔ گاڑی نے
تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا تو میں نے پیچھے دیکھا۔
اسسٹنٹ فیجر مجھ سے تقریباً پچاس قدم پیچھے تھا۔ اس نے
گاڑی کو اشارہ کیا کہ گیٹ کھول دے۔
گیٹ کھلتے ہی پندرہ بیس افراد میرے گرد جمع ہو گئے۔

میں نے کہا "آپ لوگ باہر چلیں۔ یہ ہوٹل ہے اور یہاں
ہمارے غیر ملکی مہمان بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے
بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔"
جوشیلا نوجوان نے نعرہ لگایا "قاتل پولیس!"
مجمع نے جواب دیا "ہائے ہائے" اور کچھ لوگ پولیس
چوکی کی طرف منہ کر کے زور زور سے نعرے کو یوں ہلانے لگے
جیسے ان کے خلاف اعلان جنگ کر رہے ہوں۔ بلاشبہ یہ
اشتعال دلانے والی حرکت تھی اور پولیس والے اس کے
جواب میں لامبھی چارج کرنے آجاتے تو کوئی حیرانی کی بات نہ
ہوتی۔

میں نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے اور گر سکون رہنے پر مجبور
کیا۔ میرے کہنے سے لوگ گیٹ چھوڑ گئے کچھ فاصلے پر چلے
گئے۔ جہاں سڑک کے ساتھ ساتھ بہت سی گاڑیاں کھڑی
تھیں۔ وہاں میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں لوگوں
سے کہا گیا تھا کہ وہ مشتعل ہونے کا قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ
لیں۔ قصور پولیس کا نہیں کیونکہ وہ تو خود ہی روٹری کی غلام
ہے۔ ایک پولیس مین کے مجرمانہ فعل کے نتیجے میں ساری
پولیس فورس کو مجرم ٹھہرا کر مناسب نہیں۔ ظالموں کے
احساب کا وقت اب دور نہیں اور وہ دور آنے والا ہے جب
خود کو حاکم سمجھنے والے عوام کے خادم کہلائیں گے وغیرہ
وغیرہ۔

میں نے سبھی کسی سیاسی اجتماع یا جلسے جلوس سے اس
قسم کی صورت حال میں خطاب نہیں کیا تھا۔ وہ پندرہ بیس
افراد بے حد جوشیلا تھے اور ان کے جارحانہ عزائم دیکھ کے
مجھے شبہ ہوا کہ کہیں کسی نے انہیں امن وامان کی صورت
حال خراب کرنے نہ بھیجا ہو یا وہ کسی سازشی ٹولے کا آلہ کار
بن کے نہ آئے ہوں۔ اگر وہ اچانک پتھراؤ شروع
کر لیتے ہوٹل کے اور گاڑیوں کے شیشے توڑنے لگتے یا کسی
گاڑی کو آگ لگا دیتے اور پھر فرار ہوتے تو اس خرابی
کارروائی پر مقدمہ میرے خلاف درج ہوتا۔ گرفتار مجھے کیا
جانا اور الزام بھی مجھ پر آتا کہ میں نے خود ہی پارٹی کے
کارکنوں کو ہوٹل کے سامنے مظاہرہ کرنے کے لیے بلایا تھا
تاکہ اس واقعے کو بھی میڈیا میں اچھالا جاسکے۔

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مظاہرہ کرنے والے
گر سکون ہو گئے۔ ان کے رویے میں تبدیلی ڈرامائی طور پر
آئی۔ پہلے وہ ایسے پیش آرہے تھے جیسے ان کے آتش فشاں
جذبات کی سرکش قوت کنٹرول سے باہر ہے اور اپنے محبوب
لیڈر پر قاطبانہ حملے کے خلاف احتجاج کرنے والے سامنے

آنے والی ہرج مرج کو تس تس کر دیں گے۔ ان پندرہ بیس
افراد کو منتشر کرنے کے لیے پولیس چوکی پر موجود نفری بھی کافی
تھی لیکن وہ یوں BEHAVE کر رہے تھے جیسے ان کے پیچھے
پندرہ سو یا پندرہ ہزار افراد کی طاقت ہے۔ ظاہر ہے وہ
اوپر ایکٹنگ کر رہے تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے میں
نے نعرے لگانے والے جوشیلا نوجوان کو دیکھا تو وہ میری نظر
ہٹا کے مظاہرین کو آنکھ مار رہا تھا اور یہ سب کچھ اس
مظاہرہ ختم اور اس کے ساتھ ہی نعرے کی یکجہتی بند ہو گئے۔
یوں جیسے ڈریوں سے کچھ پتلیوں کو چلانے والے نے اپنا ہاتھ
روک لیا ہو۔

مظاہرین میں سے ایک نے آؤ گراف ایک میرے
سامنے رکھ دی۔ جب میں دستخط کر رہا تھا تو اسی جوشیلا نوجوان
نے کہا "سرب ہاشم" آپ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔"
میں نے بے خیالی میں پوچھ لیا "ہاشم کون؟"
"ہاشم دینی نوجوان سرب جو آپ کی جان بچاتے ہوئے
گولی اٹھانے بن گیا تھا" وہ نوجوان بڑا دھمکی چہرہ بنا کے بولا
"گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں بھنسی ہوئی ہے۔ مفلوج پڑا
ہے تب سے بے چارہ۔"

اگر اس قسم کا کوئی واقعہ شاہ عالم کی زندگی میں پیش آیا
تھا تو میرے علم میں نہیں تھا چنانچہ میں نے آؤ گراف ایک
واپس کرتے ہوئے صورت حال کو سمجھ لیا "اچھا۔ وہ ہاشم"
میں اس سے ضرور ملوں گا۔ کہاں ہے وہ آج کل۔"

"سرا" وہ آپ سے ملنے خود آیا ہے؟ "نوجوان نے ایک
بڑی ٹیوٹا پیک اپ کی طرف اشارہ کیا جو پولیس موبائل جیسی
نئی ہوئی تھی۔
میں نے کہا "اس نے اتنی تکلیف اٹھائی۔ صرف مجھ
سے ملنے کے لیے۔"

جوشیلا نوجوان نے کہا "سرا سے بڑا صدمہ ہوا ضمیمہ
دیکھ کر۔ کہہ رہا تھا کاش آج میں شاہ عالم صاحب پر چلائی
جانے والی گولی اپنے سینے پر روک سکتا۔"

میرے نزدیک یہ جذباتی دیوانگی تھی لیکن ہر سیاسی لیڈر
کو ایسے واقعات کا نشانہ بن جاتے ہیں جو اس کے ساتھ اپنی پُر
عقیدت و انتہائی میں کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے عقل کی
دیکل کے محتاج نہیں ہوتے۔ میں نے ہاشم کو بھی اپنا ایسا ہی
مرد سمجھتے ہوئے اس کی خواہش پوری کرنا اپنا اخلاقی فرض
سمجھا اور چند قدم دور فٹ ہاتھ کے متوازن کھڑی ہوئی پیک
آپ کی طرف بڑھ گیا۔

پیک اپ کا رخ ہوٹل کی طرف تھا چنانچہ میں اس کے

بیچھے گیا تو بھول کا پورا منظر میری نگاہ سے اوچھل ہو گیا۔ ایک آپ کے پچھلے حصے پر شین کی چھت تھی اور اسے دروازے جیسے دو فلادی پٹ لگائے بند کر دیا گیا تھا۔ ویسے بند کین والی ایک آپ عام طور پر مال برداری میں استعمال ہوتی ہے لیکن میں نے اس میں اسکول کے بچوں کو بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید اندر لپٹے ہوئے فالج زدہ ہاشم کو دھوپ سے بچانے کے لیے کہیں کا دروازہ بند کیا گیا ہو گا خود ہی ہاتھ بڑھانے کے کٹدی کھولی اور اندر بھاگا۔ اس ایک لمحے میں بہت کچھ ہو گیا۔ اندر سے اچانک اور غیر متوقع طور پر بڑھنے والا ایک ہاتھ میرے منہ پر جم گیا۔ اس ہاتھ میں ایک رومال تھا جو غالباً گھورو فارم میں بیٹھا ہوا تھا میرے دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا مگر اس سے پہلے کہ میں اس ہاتھ کو ہٹانے کے لیے کچھ کرتا یا خود پیچھے ہٹتا۔ دو ہاتھوں نے مجھے پیچھے سے اٹھا کے آگے دھکیلا اور ایک آپ میں پھینک دیا۔ وہ بوش کا آخری لمحہ تھا جس میں میرے کانوں نے خود اپنے ہی جسم کے فرش پر گرنے کی اور پھر کہیں کا دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی ایک آپ کے انجن کے غرانے کی آواز سنی۔ پھر میرا ذہن بے حس کے گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی سے بوش مندی کی جانب واپسی کا سفر ایک طویل پُر اذیت تجربہ تھا۔ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے اندر بجلی چل رہی ہے یہ بے ہنگم شور رفتہ رفتہ ایک پُر شور غلجے کی آواز میں ڈھل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں گول گھومنے والے جھولے پر بیٹھا ہوں اور جھولا اتنا تیز چل رہا ہے کہ میری نظر کسی چیز کو یا کچھ چہرے کو کوس نہیں کر سکتی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے اپنے گرد ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے سر کے اندر اب درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور میرا حلق ایسے ہو رہا تھا جیسے میں نے صحرائی خشک ریت پھانک لی ہو۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد میں نظر جمائے دیکھنے اور کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا جو اب جھولے کی طرح گھوم نہیں رہا تھا۔ پانی کی لہروں پر ہستی کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔ کمرے میں روشنیاں تھیں جو جل بجھ رہی تھیں اور میرے ہاتھوں پیروں میں اتنی جان نہیں تھی کہ میں اٹھ کے بیٹھ سکوں۔ میرے پیٹ میں اینٹھن سی تھی اور ظاہر ہے یہ سب گھورو فارم جیسی خطرناک دوا کے

ذیلی اثرات تھے۔

مجھے اغوا کرنے والے وہی مظاہرین تھے جو شاہ عالم کی پارٹی کے کارکن بن کر نعرے لگاتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو رفتہ رفتہ مجھے سب یاد آنے لگا۔ ہاں میں نے ایک آپ میں جھانکا تھا۔ کیا دیکھنے کے لیے کیا نام تھا اس کارکن کا۔ ہاں۔ ہاشم لیکن اندر ہاشم نہیں تھا۔ اندر کوئی اور تھا۔ اس نے میرے منہ پر رومال رکھ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اور پھر پیچھے سے مجھے کسی نے اندر اچھال دیا تھا۔ بس۔ ایک آپ فوراً روانہ ہو گئی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اب میں کہاں ہوں؟ اس سوال کا صحیح جواب پانے میں جیسے صدیاں بیت گئیں۔ میں وقت کی رفتار کا اندازہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ ہر لمحہ درد کے احساس کی ایک گھڑی ہو گیا تھا۔ یہ درد میرے وجود میں غلط فہمی کے بے بسی بن گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ میرے لیے آنکھیں کھولنا اور گرد و پیش کو دیکھتے رہنا بھی ایک مشکل کام تھا۔

آہستہ آہستہ میرا دماغ بے ہوشی کی دوا کے مغلوب کر لینے والے اثرات کے خلاف اپنی جنگ میں کامیاب ہونے لگا۔ میں اپنی نظر کو مرکوز کرنے اور غور سے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا ذہن گرد و پیش کے منظر کو سمجھنے لگا۔

میں ایک ایسے کمرے میں لیٹا ہوا تھا جس کی آرائش شہ جدید اور قدیم کا امتزاج تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین تھے اور کھڑکیوں دروازوں کے سامنے پھیلے ہوئے پردے جدید وضع کے تھے کمرے کی ایک دیوار میں نصب آرٹ گیلری شہر کے علاوہ ایک کونے میں رکھا ہوا ٹیلی ویژن اور دو سہلے کونے میں رکھا ہوا چھوٹا سا ڈبل ڈور فرنیچر جدید کے پر تکلف اور پر آرائش بید روم کا نقشہ پیش کرتے تھے لیکن کمرے کا فرنیچر روایتی قدیم ہندو کا آئینہ دار تھا۔ جس بیدر میں لیٹا ہوا تھا وہ تقریباً پانچ فٹ چوڑا اور سات فٹ لمبا پانک تھا جس کے موٹے موٹے پائے شوخ رنگوں کے نقش و نگار سے مزین تھے۔ کٹن والے صوفوں کے بازو اور پچھلے حصے پر لکڑی میں تراشے ہوئے گل بوٹے کسی درمیانی کاریگری کی مناسبت کا نمونہ تھے صوفوں کے پائے بھی موٹی لکڑی کو تراش کے بنائے گئے تھے اور ان کے اوپر والے حصے کو مسجد کے مینار جیسی شکل دے دی گئی تھی۔ صوفے اتنے بھاری تھے کہ ایک آدمی انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا۔ ایسی ہی رنگین پالیوں والی میز کے درمیانی حصے میں سیاہ پالش والے گل بوٹے

کھدے ہوئے تھے اور ان میں کوئی سفید مسالا بھرا گیا تھا جو دیکھنے میں ہاتھی دانت کی طرح اور اور جہاں دیوار چھت سے ملتی تھی ہر کونے کی لمبائی چوڑائی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے نقش و نگار بنے ہوئے تھے کمرے کی دیواروں پر گلابی رنگ تھا اور مجموعی طور پر اسباب آرائش میں تیز لال نیلے اور پیلے رنگ غالب تھے۔

جب میری طبیعت اس حد تک بحال ہو گئی کہ میں اٹھ کے بیٹھ سکوں تو میں نے اپنی کلابی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر تازہ اور دن پر نظر ڈالی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے بے ہوش ہونے کے چار گھنٹے بعد دوبارہ ہوش آیا ہے۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ایک بھاری پتھر ہے۔ نو میرے کندھوں کے درمیان ٹکا دیا گیا ہے۔

میں کچھ دیر سر تھامے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے پتہ چلا کہ میں نے کچھ کر لیا۔ اب مجھے سخت متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر قالین پر سر رکھے پڑا رہا اور پھر بہت کمرے کے اٹھا تو تھوڑی دیر جھومنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔

میں نے ایک پردہ ہٹا کے دیکھا۔ اس کے پیچھے کوئی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر اندھیرا کالے رنگ کی طرح بھا ہوا تھا۔ دوسرے پردے کے پیچھے ایک بند دروازہ تھا جو شاید باہر سے منقطع تھا۔ تیسرا دروازہ لپٹا ہوا تھا۔ میں نے لائٹ جلائی تو اپنے سامنے ایک وسیع اور جدید وضع کا مکمل واش روم دیکھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں پچھلے ٹائلوں والے فرش پر میرا پاؤں نہ پھسل جائے، میں آہستہ آہستہ چلا ہوا واش روم میں تک گیا اور نوٹنی کھول کے اپنا سر پانی کی دھار کے نیچے کر دیا۔ چند منٹ بعد میں نے سر کو تولیے سے رگڑ کے صاف کیا تو مجھے اپنی حالت میں نمایاں افادہ محسوس ہوا۔

اب میں نے اپنے اس زنداں یا مہمان خانے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کا دروازہ ایک اور کمرے میں کھٹا تھا جو آرائش کے اعتبار سے ڈرائنگ روم سمجھا جاسکتا تھا۔ اس میں بھی ہر چیز بہت صاف ستھری، بیش قیمت اور خوبصورت تھی مگر مجموعی آرائش کے انداز میں مغربی فیشن سے زیادہ مشرقی روایات کے حسن کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔

میں نے ایک بار بلند آواز میں پوچھا ”کوئی ہے؟“ تو مجھے اپنی ہی آواز بہت اجنبی لگی۔ دوسری بار میں نے زیادہ واضح انداز میں یہی بات دہرائی لیکن مجھے جواب میں وہی خاموشی ملی۔ میں نے ڈرائنگ روم کے ایک کھلے دروازے کا رخ کیا۔ اٹھا کر ابھی مہمانوں کے بیٹھنے کا تھا مگر یہاں فرش

نشت کا انتظام تھا۔ دیوار پھول دار قالین پر دیوار کے ساتھ ساتھ سرخ مٹلی غلاف والے گاؤں گئے رہتے ہوئے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی گلاس ٹاپ میزیں نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ایک نسبتاً بڑی میز پر گداناں میں بالکل تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔ یہ کراچی تقریباً اٹھارہ فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا تھا۔ اس میں بھی لمبائی کے رخ چھت سے تین فانوس معلق تھے جن میں درمیان والا بڑا تھا۔ ایک اگر ویزٹن اسٹائل کا ڈرائنگ روم تھا تو دوسرا مشرقی انداز کی بیٹھک تھی۔ دونوں میں ایک خاص اہتمام صدر مٹل یا میزبان کی نشست کا تھا۔ مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں ایک دیوار کے ساتھ شاہانہ تخت جیسا صوف تھا تو بیٹھک میں نشست کا خصوصی انتظام ایک چھ فٹ چوڑے فوٹ لے قالین کی صورت میں کیا گیا تھا جس پر بالکل الگ نظر آنے والے گولڈن شیش کے کور چڑھے گاؤں گئے لگے ہوئے تھے۔

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا
تسلیم سے ایک خوبصورت
ناول

اندھی

ایک آپ بیتی، خوچکا
اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ مڑنے والا ایڈوینچر جس
میں آپ بہتے پھلے جائیں گے

مغربی طرز کے ڈرائنگ روم میں قالین اور پردوں کا رنگ بھی وہی تھا جو مشرقی انداز کی بیچنگ میں لیکن انداز نشست کے فرق نے ماحول کو یکسر بدل دیا تھا۔

میں دوسرے سے میرے کمرے میں گیا اور پھر گھومتا پھر تاجکن میں جا نکلا۔ وہاں ایک خانساں ٹائپ شخص خاموشی سے کچھ پکائے میں مصروف تھا۔ میرے کھانے پر وہ تیزی سے پلٹا اور پھر مجھے دیکھ کر اتنا بدحواس ہوا جیسے اس نے اپنے سامنے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

”سلام سائیں!“ اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا ”آپ نے ادھر آنے کی تکلیف کیوں کی؟ مجھے حکم دیتے۔“

میں نے کہا ”تم کون ہو؟“

”وہ بولا ”ہم سائیں حکم کے غلام ہیں۔ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔“

میں نے کہا ”ہم کیا ہے تمہارا؟“

”ہم تو سائیں عبداللہ بلوچ ہے پر سب عبدل بولتے ہیں۔“ وہ اسی طرح دست بستہ کھڑا رہا۔

میں نے کہا ”عبدل۔ یہ گھر کس کا ہے؟“

”یہ سائیں ڈیرا ہے پیر سجان شاہ کا۔ وہ جب لاہور آتے ہیں تو ادھر ہی ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اس وقت وہ کہاں ہیں؟“

”اس وقت تو سائیں کچھ پتا نہیں کہاں ہوں گے۔ بادشاہ لوگ ہیں، اپنی مرضی سے آتے جاتے ہیں، کبھی اسلام آباد تو کبھی کراچی۔ ابھی سائیں ناراض مت ہونا۔ آپ مہمان ہوں۔ ہم کو اجازت نہیں ہے مہمان سے بات کرنے کی اور آپ کو بھی ادھر نہیں آنا چاہیے۔ کسی نے دیکھا تو ہماری شامت آئے گی۔ ابھی حکم کرو۔“

میں نے کہا ”تمہارے علاوہ یہاں کون ہے؟“

”ہمارے علاوہ سائیں سارے خدمت گار ہیں۔ سب پرانے ملازم ہیں۔ پیر سائیں کے ٹک خوار ہیں۔“

میں نے کہا ”پیر صاحب کا یہ ڈیرا کہاں ہے؟“

میرے سوالات سے وہ سخت پریشان تھا۔ ”ہم کو کچھ پتا نہیں سائیں۔ ہم بھی آج ہی آئے ہیں۔“

میں نے کہا ”تمہاری بڑی حویلی میں مجھے تمہارے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا ہے۔“

وہ بولا ”پیر چوکیدار ہے سائیں۔ ادھر ڈرائیور بھی ہوگا۔ آپ حکم کرو۔“

میں نے کہا ”کیا یہاں ٹیلی فون ہے؟“

”ہر کمرے میں ٹیلی فون ہے سائیں۔“

میں نے کہا ”جہاں تم کافی بات کر سکتے ہو؟“

”ابھی حاضر کرنا ہوں سائیں۔ آپ ادھر چلو۔“

میں نے کہا ”عبدل۔ میں مہمان ہوں یا قیدی؟“

وہ میرے سوال سے زور ہو گیا ”جی سائیں!“

میں نے کہا ”میرا مطلب ہے کیا میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آ جا سکتا ہوں۔ اگر میں ابھی ڈرائیور سے کہوں کہ مجھے کہیں لے چلو تو کیا وہ گازی نکالے گا؟“

اس نے ہاتھ جوڑ دیے ”جہیں کچھ پتا نہیں سائیں۔“

آپ مہمان ہو پیر سائیں کے اور ہمیں حکم ہے آپ کی خدمت کرنے کا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔“

میں بچکن سے نکل کے باہر گیا تو مجھے حویلی کی وسعت اور شان و شوکت کا اندازہ ہوا۔ یہ مکمل نما عمارت جدید اور قدیم طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھی اور کم سے کم بھی تیس کتال پر محیط تھی۔ اس کی بیرونی تفصیل کی بلندی دس فٹ سے زیادہ تھی چنانچہ میں باہر کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس تفصیل کے چاروں طرف سرخ لائٹس اس طرح لگائی گئی تھیں کہ تفصیل کے دونوں جانب روشنی ہے۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر مجھے دائیں بائیں دو بلند وبالا فولادی گیٹ نظر آ رہے تھے جن کے درمیان تقریباً دو سو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ایک سرخ بجری چمچی سڑک انگریزی حرف یو کی شکل بنائی ایک گیٹ سے شروع ہو کے درمیانی لان اور باغ کے گرد گھومتی اور پورچ سے گزرتی دوسرے گیٹ تک جاری تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ آرائشی قسم کے درختوں کی قطار بھی اور درمیان میں سرسبز لانا تھا جس کے وسط میں بست خوبصورت فوارہ بنا ہوا تھا۔

چوکیدار مجھے کسی گیٹ پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ شاید کسی پرائیویٹ سیکورٹی کمپنی کا گارڈ ہو گا جو جدید ترین اسلحہ لیے باہر کھڑا ہوگا۔ ڈرائیور سے کچھ فاصلے پر ایک شاہانہ قسم کی لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی مگر اس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ اندر باہر کی ساری لائٹس جل رہی تھیں مگر آواز کوئی نہیں تھی۔ یہ صورت حال میرے لیے بہت چکرا دینے والی تھی۔ ابھی تک کسی نے مجھے روکا نہیں تھا اور بظاہر میری حیثیت مہمان جیسی ہی تھی مگر میرا دل یہ بات نہیں مانتا تھا کیونکہ مجھے یہاں مہمانوں کی طرح نہیں لایا گیا تھا۔

میں پیر سجان شاہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اتنا اندازہ مجھے ہو رہا تھا کہ وہ کوئی بہت دولت مند اثر سوخ کے اعتبار سے انتہائی طاقتور اور ذہنی طور پر چالاک اور سفاک شخص ہوگا۔ ممکن ہے وہ کوئی جدی پیشی

جاگیردار یا خاندانی پیر ہو۔ ملکی سیاست میں ایسے لوگوں کی افراط ہے جو کئی نسلوں سے حکومت کو اپنا موروثی حق سمجھتے آتے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے سجان شاہ بھی کوئی ایسا ہی نمود کی خدائی کا دعوے دار پیر ہوگا۔ اس نے کسی وجہ سے کوشش کی تھی کہ مجھے اے ایس بی دلاور شاہ کے ذریعے اپنے طاقتور ہونے کا احساس دلانے، ایسے لوگ اپنے علاقے میں پولیس افسر بھی اپنی پسند کے رکھتے ہیں اور پھر انہیں اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ اے ایس بی دلاور شاہ پیر سائیں کا کوئی فرمان مجھ تک پہنچاتا اسے پریس کانفرنس سے نکال دیا گیا۔ وہ حکم کا غلام اس کے باوجود وہیں موجود رہا۔ وہ پیر سائیں کو اپنی کوشش میں ناکامی کی خبر دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسری چال چلی اور حکم کے دوسرے غلام صابر علی کو محافظ کے روپ میں میرا نگران بنانے کی کوشش کی مگر یہ ترکیب الٹی اس کے گلے پڑ گئی۔

ابھی میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آخر پیر سائیں مجھ سے ملاقات کے لیے اتنے بے چین کیوں ہیں لیکن یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ مجھے اس پر قریب طریقے سے زبردستی بلانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ پیر سائیں کو اپنے ایک مرید خاص کے ساتھ میرا سلوک سخت ناگوار گزرا ہو گا اور انہوں نے فیصلہ کیا ہو گا کہ مجھے اس گستاخی پر کچھ سبق سکھایا جائے۔

بظاہر مجھے گھر کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی تھی اور میں اس کو کبھی میں کسی معزز مہمان سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا لیکن میرے لیے آزادی کا مفہوم یقیناً محدود تھا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ میں کس چاہوں چلا جاؤں اور جس سے چاہوں رابطہ کروں۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً ہی مل گیا۔ میں نے واپس اپنے کمرے میں آ کے دیکھا تو مجھے ٹیلی فون نظر آیا مگر اس میں کوئی آواز نہیں تھی۔ ٹیلی فون واقعی ہر کمرے میں تھا مگر بے جان تھا۔ غالباً کوٹھی کے اندر جتنے فون تھے ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ وقتی طور پر منقطع کر دیا گیا تھا۔ ممکن ہے حویلی کا اپنا ایک دلائن کا ایکس پیج ہو اور کسی فون کو ڈس کنکٹ کرنا آپریٹر کے اختیار میں ہو۔

عبدل تھوڑی دیر بعد کافی لے کر آیا تو میں نے پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کی ”عبدل۔ تمہارے اور ڈرائیور یا چوکیدار کے علاوہ یہاں کوئی ایسا ذمہ دار ملازم ہے جو مجھے کچھ بتا سکے۔“

اس نے ہاتھ جوڑ دیے ”سائیں۔ ہم ادھر آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ پیر سائیں کو پتا چل جائے تو ہماری زبان پھری سے کاٹ دیں۔“

میں نے کہا ”لیکن اس وقت تو پیر سائیں یہاں موجود نہیں ہیں۔“

اس نے خوف زدہ نظروں سے باہر دیکھا۔ ”لیکن دوسرے بندے ہیں جو ہماری شکایت کر سکتے ہیں۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں سائیں!“

میں نے کہا ”صرف اتنا بتاؤ کہ پیر سائیں کے بارے میں مجھے کوئی بتا سکتا ہے؟ اگر مجھے ان سے ملنا ہو یا ان سے فون پر بات کرنی ہو۔“

”ابھی ان کا وہ آجائے گا سائیں“ کیا بولتے ہیں اس کو؟ ہاں سیکرٹری، وہ کسی کام سے گیا ہے۔“ عبدل نے جاتے جاتے کہا۔

کافی بہت عرصہ تھی۔ ریاستی خانساں ایک ماڈرن لیکن چلانے کا تجربہ نہ رکھتا تھا۔ کافی پیٹے ہوئے میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا۔ میں اچانک سب سے کٹ گیا تھا۔ رکشیں جب اوپر والے کمرے میں جڑے بلڈ کو میرا سامان پہنچانے واپس آیا ہو گا تو مجھے غائب دیکھ کے شک میں جھٹلا نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے پہلے تو یہ سمجھا ہو گا کہ میں کسی کام سے باہر نکلا ہوں لیکن ایک گھنٹے بعد اسے تشویش لاحق ہوئی کہ اے اسے پتہ ہے بغیر ہی ہوٹل سے باہر کہاں جا سکتا ہوں۔ انتظار سے گھبرا کے اس نے ہوٹل کے اسٹنٹ منیجر سے پوچھا ہو گا تو اس نے بتایا ہو گا کہ عالم اپنی پارٹی کے کارکنوں سے بات کرنے گئے تھے میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مظاہرین کو سمجھا بھکا کے منتشر کریں اور انہوں نے چند منٹ میں مظاہرہ ختم کر دیا تھا۔ کیا اس کے بعد وہ لوٹ کے کمرے میں نہیں آئے تھے؟ ممکن ہے وہ کسی کام سے چلے گئے ہوں۔ مظاہرین ہی ان کی پارٹی کے وفادار کارکن تھے کیا پتا وہ شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ انہیں پارٹی لیڈر سے کوئی کام پڑ گیا ہو۔

مزید گھٹنے دو گھٹنے انتظار کے بعد رئیس کا شک یقین میں بدل گیا ہو گا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں جی بچا سرا طور پر غائب ہو گیا ہوں لیکن رئیس کا شک بھی مظاہرین کی طرف کیے جا سکتا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ مجھے اے ایس بی دلاور شاہ نے اغوا لیا۔ صابر علی کو تو میں نے پھنسا دیا تھا مگر دلاور شاہ ایک سینئر پولیس افسر تھا اور کسی اے ایس آئی سے کہیں زیادہ اختیار کا مالک تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

☆ 107 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 106 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 107 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 106 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 107 ☆ گیارہواں حصہ

☆ 106 ☆ گیارہواں حصہ

سوچ سوچ کے میرا دماغ تھک گیا۔ کافی نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح مستعد ہو گیا تھا۔ اب مجھے یہ قید گراں گزر رہی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ اگر میں غریب خانہاں یا ڈرائیو کو تاک آؤٹ کر دیتا تب بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ کوٹھی کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی مجھے اسی لیے حاصل تھی کہ باہر کی فسیل بہت اونچی تھی۔ اس پر کانٹے والی تاریکی بانڈھ تھی اور یہ بات خاصہ وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ اس بانڈھ میں برقی رو ہوگی۔ فسیل کے باہر بھی پیرا آتا سخت ہوگا کہ میرے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میرے دل میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ میں پیر سائیں سے ملوں اور اس سے پوچھوں کہ اس نے تعارف حاصل کرنے کا یہ پراسرار اور غیر شرفیاد طریقہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر اس کا پیغام ملتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس سے ملنے سے انکار کرتا۔

کافی پینے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے گھوم پھر کے کوٹھی کا مزید جائزہ لینا چاہیے۔ شاید صورت حال اتنی مایوس کن نہ ہو جتنی میں سمجھ رہا ہوں اور مجھے باہر نکلنے کا موقع مل جائے لیکن میں نے اٹھنا چاہا تو مجھ پر نقاہت غالب آنے لگی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ کافی پی کے مجھے زیادہ جست محسوس کرنا چاہیے مگر میرے پاؤں اتنے بے جان ہو رہے تھے کہ میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر نکلتے تھے۔ میں نے سر جھٹک کے نااطافی کے اس وقتی احساس سے نجات حاصل کرنی چاہی لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تو میں سمجھ گیا کہ یہ سارا فساد اس کافی کا ہے۔ مجھے کافی میں کوئی بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی اور یہ اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں اچانک اٹھ کے پیر سائیں کی کوٹھی کا جائزہ لینے نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاید مجھے زیر دماغ لانے والوں کو یقین ہوگا کہ میں اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتا۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ اس رسائی اور بے وقوف نظر آنے والے خانہاں نے بڑی سادگی سے مجھے سائیں سائیں کہتے ہوئے خود کو محفوظ رکھا۔ مجھے کسی دشواری کے بغیر پھر ہوش سے بے گانہ کر دیا۔ میں چکر کے نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی گرد و پیش کا منظر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب میں پھر ہوش میں آیا تو مجھے منظر بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ ایک نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کسی تھانے کی حوالات میں ہوں جہاں میرے سوا کوئی قیدی نہیں تھا۔ میرے جسم پر وہی کپڑے تھے اور میں سینٹ کے سخت اور

سرد فرش پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پر سے گھڑی اتار لی گئی تھی چنانچہ اب میں وقت دن اور تاریخ کا صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ عام طور پر بے ہوشی کی دوا کا اثر چھ سے آٹھ گھنٹے تک رہتا ہے۔ میں نے کافی رات ساڑھے دس بجے لی تھی۔ اس حساب سے یہ صبح پانچ بجے کے درمیان کا وقت ہو سکتا تھا اور دن کے ساتھ تاریخ بدل گئی تھی۔

عام طور پر حوالات ہر تھانے کی عمارت کا ایک حصہ ہوتی ہے جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن یہ حوالات جیسا کہ کسی الگ جگہ پر بتایا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ہال تھا جس کی لمبائی شاید چوبیس فٹ ہوگی اور چوڑائی بارہ چودہ فٹ۔ اس کے آٹھ فٹ حصے کو لوہے کی سلاخیں لگا کے الگ کر دیا گیا تھا۔ چودہ فٹ لمبے حصے میں میرے پیچھے اور دائیں بائیں سیٹ دیواریں تھیں۔

کمرے کا باقی حصہ بھی بالکل خالی تھا۔ اس میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن فرش میں لوہے کی ایک کرسی نصب تھی۔ اس کے سین مقابل کی دیوار پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سرخ لائسن لگائی گئی تھیں جو اس وقت روشن نہیں تھیں۔ تمام سرخ لائسن کو کرسی پر فکس کیا گیا تھا۔ ایک دیوار میں لوہے کے مضبوط بک فرش سے دس فٹ کی بلندی پر لگائے گئے تھے اور ان سے فولادی زنجیریں منسلک تھیں۔ چھت سے لوہے کے حلقے آویزاں تھے اور ایک گوشے میں کچھ رسیاں اور چمڑے کی تیشیں پڑی تھیں۔

یہ سب ایذا رسانی اور جسمانی تشدد کا سامان تھا۔ کسی مبینہ ملزم سے کسی بھی جرم کا اقرار کرانے کے لیے اسے لوہے کی کرسی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہوگا۔ کھائی میں زنجیریں ڈال کے اسے دیوار پر کپڑے کی طرح ٹانگ دیا جاتا ہوگا۔ اس طرح کہ اس کے پیر زمین کو نہ چھو میں یا چھت سے آویزاں حلقوں میں اس کے پاؤں ڈال کے اسے الٹا لٹکا دیا جاتا ہوگا۔ میری نظروں کے سامنے پولیس کا عقوبت خانہ تھا جہاں لائے جانے والوں پر ایسے انسانیت سوز تشدد کے حربے آزمائے جاتے تھے جن کے تصور سے بھی یونگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو بات مجھے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ حوالات میں دو سری انسانی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو کسی بھی پولیس اسٹیشن کے ماحول کا حصہ ہوتی ہیں۔ گالی گھونچ، پیچ پکار، آہ و زاری، ٹیلی فون کی گھنٹی۔ گاڑیوں کے آنے جانے کی آوازیں اور زندہ انسانوں کے وجود کا ثبوت فراہم کرنے والی آوازیں۔ اس حوالات کا ماحول بھی نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ میں نے شہر کے اکثر تھانوں کی حوالات میں وہی بدبو اور گھنٹی

محسوس کیا تھا جو کسی پبلک ٹوالٹ کی سوانہ جیسا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حوالاتی جب تفتیش کے لیے نکالے جاتے تھے تو خوف سے ان کا پیشاب وہیں خطا ہو جاتا تھا۔ تفتیش کے بعد لا کر دہاں ڈال دیے جاتے والے بھی بعض اوقات اپنے ہی خون یا پیشاب پھانے کی گندگی سے ٹھنڈے ہوئے ہوتے تھے۔ میں نے کسی حوالات کو کبھی بالکل خالی بھی نہیں دیکھا تھا۔ عموماً اتنے ہی بڑے کمروں میں آٹھ دس افراد بڑے نظر آتے تھے۔ بعض اوقات ان کی تعداد پندرہ میں تک بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس صاف ستھری حوالات میں میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی کہ میں کسی تھانے کی حوالات میں نہیں ہوں بلکہ کسی کی نجی جیل میں ہوں۔ یہ جگہ غالباً پیر سائیں کے اس قعر عالی شان کے یہ خانے میں تھی اور دو سری بار بے ہوش کرنے کے بعد مجھے زیادہ سخت حفاظتی انتظام کے لیے ایک پُر تکلف خواب گاہ سے اس زمیں دو قید خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

اس انتظام کی ضرورت کو میرا ذہن سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کی یہ سزا تھی۔ میں ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کے صرف پچن تک گیا تھا اور خانہاں سے چند بائیں کی تھیں جو بالکل بے ضرر تھیں۔ میں نے فرار ہونے کی کوشش تو درکنار فرار کے کسی راستے کا عملی جائزہ تک نہیں لیا تھا۔

حوالات کے اندر وقت بھی قید میں محسوس ہوتا تھا۔ باہر یقیناً وقت اپنی ازلی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا مگر ان سلاخوں کے پیچھے میرا وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ ہوش کے لیے شمار کرتے کرتے میں بالآخر اس قابل ہو گیا تھا کہ بیٹھ سکوں، پھر کھڑا ہو سکوں اور پھر اپنی مزید محدود ہو جانے والی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زنداں کی دیواروں کے حصار میں چل پھر سکوں۔

ان سلاخوں کے پیچھے میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سوائے سوپے کے۔ چنانچہ میں جنگل سے پکڑے جانے والے جانور کی طرح سے بھڑکے میں چکر لگاتا رہا اور اپنے آپ سے وہ سوالات کرتا رہا جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور کب تک ہوتا رہے گا؟ پیر سائیں مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کسی وجہ کے بغیر وہ میرا دشمن کیوں ہو گیا ہے۔ انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر اک بار سوئے دامن یوسف تو دیکھئے۔ اگر کسی نے غلط فہمی کی بنا پر مجھے اٹھوایا ہے

تو کیا اس کا یہ اخلاقی فرض نہیں بننا کہ مجھے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دے، میری بھی سنے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ پیر سائیں جیسے لوگ اپنی ذات کو پر قسم کی اخلاقی یا قانونی ذمہ داریوں اور پابندیوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت پیر سائیں کی مصروفیت کون ہوگی۔ وہ رات کے آخری پیر میں کہاں اور کس کی خواب باز میں خواہشات بوت ہوگا۔ جب اس کی صبح ہوگی اور اس کے معمولات میں جہاں میرے لیے منجائش ہوگی اس سے پہلے وہ میرے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔

بے بسی کے ایک طویل عذاب ناک انتظار کے بعد جب میں دیکھتے اور سوچتے سوچتے بھی تھک گیا تھا ہال کے آخری حصے کا ایک دروازہ کھلا اور ایک ساتھ تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ باقی دو کے ہاتھوں میں جدید ترین خود کار کھانکھو تھیں۔ ان میں سے ایک نے دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور وہیں رک گیا۔ دوسرا اس ملازم کے ساتھ آگے آیا جس نے تاشیے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس کی لمبی لمبی مونچھیں اس کے مختصر قد سے ذرا بھی پیچ نہیں کھینچ سکتی تھیں مگر اس کی آنکھوں میں ایک بھیجی بھیجی سی سفاک چمک تھی۔ ٹرے اٹھا کے لانے والا وہی خانہاں تھا جس سے میری گزشتہ شب پچن میں ملاقات ہوئی تھی۔

مونچھوں والے محافظ نے چند فٹ کے فاصلے پر رک کے کہا "ادھر سے پیچھے ہٹ جاؤ یا با!"

میں نے اس کی بات سنی آن سنی کردی اور مسکرا کے کہا "کیا حال ہے تمہارا عبدال؟"

عبدال کا چہرہ سو جا ہوا تھا اور ایک آنکھ پر نیل بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور حوالات کے گیٹ کا آلا کھولنے لگا۔

مونچھوں والے کو میرے انداز بے نیازی نے مشتعل کیا "دیکھو بابا۔ ہم کو آرڈر ہے کہ گریڈ ہو تو تم کو گولی مار دیوے۔ آگے مت آنا۔"

عبدال نے ٹرے اندر کھسکا کے دروازے کو پھر مقفل کر دیا "ابھی ناشتہ کرو سائیں۔ ہم برتن واپس لے جائیں۔" میں نے کہا "کل کافی خوب پلائی تم نے۔ کیا اس چائے میں بھی بے ہوشی کی دوا ڈالی ہے؟"

محافظ نے غرا کے کہا "ابھی قانونیات نہیں کرونی۔" میں نے ٹرے کو اپنی طرف کھسکایا "تم مجھے کتے کے جھوٹے سے لپکے کی طرح لگتے ہو جو چڑیا گھر کے پتھر سے بند

شیر بھوک رہا ہو۔“

فرط اشتعال سے اس کی مونچھیں لرزے لگیں مگر وہ خون کے گھونٹنی کے خاموش رہنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ میں نے ناشتے پر غور کیا۔ اس میں دو پراٹھے تھے، تھوڑی سی آلو کی بھجیا اور ایک گجلی میں ریڈی میڈ مکس چائے میں نے گزشتہ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا چنانچہ اب سامنے کھانا دیکھ کے میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے ناشتا لانے والے تین معمولی حیثیت کے ملازموں سے فضول بات کرنا لا حاصل سمجھا۔ عدیل کو گزشتہ رات مجھ سے غیر ضروری باتیں کرنے کی اچھی خاصی سزا ملی تھی۔ اب میں لاکھ کوشش کرتا وہ میرے کسی سوال کا جواب نہ دیتے چائے پینے میں پھر رک تھالیں میری عقل یہ کتنی تھی کہ اب مجھے مزید بے ہوش رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور شاید یہ ناشتا اس لیے لایا گیا تھا کہ جب مجھے پیر سائیں کے سامنے پیش کیا جائے تو میری حالت ٹھیک ہو۔ لیکن اس کے برعکس صورت حال بھی مجھے منظور تھی۔ اس بجبرے میں جاگ کے وقت کا ایک ایک لمحہ شمار کرنے سے تو یہی بہتر ہو گا کہ میں سو جاؤں۔

میں نے ناشتا ختم کیا تو عدیل نے رے اٹھائی اور سلاخوں والے دروازے کو پھر مقفل کر دیا۔ محافظوں نے اس کے لیے باہر جانے والا دروازہ کھول دیا مگر خود اپنی جگہ پر موجود رہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ یہ حوالات زیر زمین تھے۔ جب عدیل باہر گیا تو مجھے ایک لمحے کے لیے اس زینے کی ایک جھلک دکھائی دی جو اوپر جا رہا تھا۔

ناشتے نے میرے جسم میں توانائی بھری تھی۔ اندر ٹہلتے ہوئے میں بے چینی سے اس عذاب کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا اور چائے میں ملائی جانے والی بے ہوشی کی دوا کے اثرات کے ظاہر ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وقت ایک زنجیر گرانا رہ گیا تھا جو کائے نہیں کنتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بقول شاعر جو ہم گزرتی ہے اک بار گزر جائے۔

بالآخر میری دعائیں قبول ہوئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے کسی نے کچھ کہا۔ ایک محافظ نے فوراً چابی لگا کے قفل کھول دیا اور پھر اندر آنے والے کو سیلوٹ کیا۔

اندر آنے والا اے ایس بی دلاور شاہ تھا۔ اسے وہاں دیکھ کے مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ ایک سوال جس کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا تھا، یہ تھا کہ دلاور شاہ کس کے حکم کا غلام تھا؟

دلاور شاہ باوقار قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اور بڑے اسٹائل سے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا آگے آیا۔

وہ حوالات کی سلاخوں سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ ”تم حیران نہیں ہوئے مجھے دیکھ کے شاہ عالم؟“ اس نے کہا۔

میں نے کہا ”نہیں۔ بس مجھے اپنے ایک سوال کا جواب مل گیا ہے کہ وردی تو تمہارے جسم پر حکومت پاکستان کی دی ہوئی ہے لیکن تمہاری گردن میں پنہ کسی اور نے ڈال رکھا ہے۔ آج معلوم ہو گیا کہ تم کس کے فکروں پر چلنے والے کتے ہو۔“

اس کا چہرہ مسخ ہونے لگا ”کتے کی طرح تو تم بھوک رہے ہو۔ رسی جلی گئی پر تل نہ گیا۔“

میں نے کہا ”یہی رسی ایک دن تمہاری گردن میں پھانسی کا پھندا اپنے گی دلاور شاہ! اس وقت اپنا تل کھانا کھانا۔“

اس نے آدھی سگریٹ کو پاؤں سے مسل دیا ”تم کو ان اخبار والوں نے خبریں چھاپ چھاپ کے ابھار رکھا ہے ورنہ تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو شاہ عالم کہ تمہیں اب کوئی پوچھتا نہیں۔ تمہاری سیاسی حیثیت کا گراف زبردی طرف جا چکا ہے۔“

میں نے کہا ”فضول باتوں میں وقت گنوانے کے بجائے تم مجھے میرا جرم بتاؤ۔“

اس نے ایک اور سگریٹ نکالی اور اسے پر سکون انداز میں لائٹ کرنے جلانے لگا۔ ایک کش کا دھواں خارج کر کے اس نے کہا ”تمہارے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست ہے۔“

میں نے کہا ”تم قانونی الزامات کی بات کس منہ سے کرتے ہو؟“

وہ بولا ”میں قانون کا نمائندہ ہوں۔ پولیس سروس آف پاکستان کا ایک اعلیٰ افسر ہوں۔ اور میں نے تمہارے خلاف قائم کیے جانے والے تمام قانونی مقدمات کی فائلیں دیکھی ہیں سائیں۔“

”پھر مجھے قانون کے تحت گرفتار کیوں نہیں کیا۔ تم قانونی طریقے سے میرے خلاف گرفتاری کا وارنٹ بھی لاسکتے تھے۔“

اس نے سر ہلایا ”میں نے کوشش کی تھی کہ تمہیں قانونی گرفتاری سے محفوظ رکھوں۔ تمہیں یقیناً علم ہو گا کہ تمہارے خلاف برائے مقدمات کی فائلیں پھر کھول دی گئی ہیں اور اس وقت اگر تم یہاں نہ ہوتے تو کسی تھانے کی حوالات میں عام قیدیوں کے ساتھ پڑے ہوتے۔“

میں نے کہا ”حوالات تو یہ بھی ہے۔“

”سائیں! یہ پیر سجان شاہ کا وہ مہمان خانہ ہے جہاں خضر ناک مجرم رکھے جاتے ہیں۔ تمہیں پہلے غلطی سے معزز مہمان کا درجہ دے دیا گیا تھا لیکن پھر پتا چلا کہ تم جوڈو کرانے کے ماہر بن چکے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بھی جھپٹار کا کام لینا جانتے ہو۔ اے ایس آئی صابر علی کا بیان سننے کے بعد تمہیں یہاں منتقل کر دیا گیا۔ تم نے اس پر ایک جھوٹا مقدمہ کیوں بنایا۔ تمہیں معلوم نہیں شاید کہ وہ پیر سائیں کا خاص آدمی ہے۔“

میں نے کہا ”اس نے مجھے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”وہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وقت تمہارے لیے بہت بدل گیا ہے شاہ عالم۔ تم اب وہ سیاسی لیڈر نہیں ہو جس کے پیچھے چلنے والے ہزاروں تھے۔ تمہاری ایک اسلحہ بردار غنڈا فورس تھی جو تمہارے نام پر کسی کی بھی جان لینے کے لیے تیار رہتی تھی۔ فلاح عالم فورس۔ اس وقت لوگ تم سے ڈرتے تھے۔ تمہارے دشمن بہت تھے مگر تم محفوظ رہے۔ تمہارے وہ دشمن آج تم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اور ان کے لیے پرائے بولے چکانے کا وقت آ گیا ہے۔“

ساری بات اچانک میری سمجھ میں آ گئی ”پیر سائیں کو بھی اسی دن کا انتظار تھا۔“

”ظاہر ہے۔ تم اگر ذرا بھی حقیقت پسند ہوتے تو تمہیں حالات کا صحیح اندازہ ہوتا تو شاید تم لوٹ کے پاکستان آنے کا رستہ نہ لیتے۔ اب تم کیا کرو گے شاہ عالم!“

میں نے سوچ کے کہا ”تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”سائیں“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”تمہارے اختیار میں اب کیا ہے؟“

میں نے کہا ”قانونی مقدمات سے میں نہیں ڈرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ جھوٹے تھے اور عدالت میں جھوٹ سامنے جائے گا۔“

”نہیں شاہ عالم! عدالت پر اور انصاف کے عمل پر اتنا بھروسہ مت کرو۔ کس بے گناہ کو مجرم ثابت کرنا ہے اور کس مجرم کو بے گناہ۔ یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اصل معاملات کچھ اور ہیں، تم جانتے ہو۔“

مشکل یہ تھی کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ عالم کے معاملات کا شاہ عالم کو علم نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر میں اے ایس بی دلاور شاہ سے کتنا کہ مجھے پیر سائیں سے شاہ عالم کے اختلافات کی وجہ

بتاؤ تو وہ کھٹا شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔

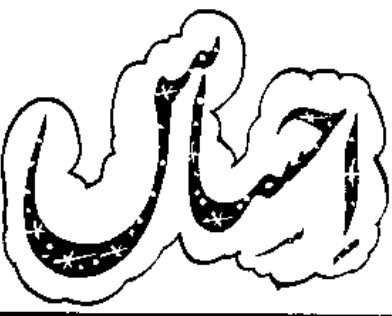
میں نے اعتقاد کے ساتھ الفاظ کا انتخاب کیا۔ ”اے ایس بی دلاور شاہ! سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ کل کے دوست آج کے دشمن اور کل کے دشمن آج کے دوست بن جائیں تو یہ کوئی انوکھی اور انسانی بات نہیں۔ سیاست میں یہ داری کا کھیل چلتا ہے۔“

اس نے مجھے غور سے دیکھا ”پیر سائیں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ تم ان کے مقابلے پر اپنا بندہ کھڑا مت کرو لیکن تم نہیں مانے تھے۔ حاصل کیا ہوا تمہیں۔ تمہارا امیدوار تو ایک عام آدمی تھا۔ وہ پیر سائیں کے مقابلے میں جیت ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ جیت جاتا تو پیر سائیں کے مزید اسے قتل کر دیتے لیکن اس نے انتخابی جلسوں میں پیر سائیں کے خلاف جو کچھ کہا۔ اس کے ذمے دار تم تھے۔ خود تم نے بہت بکواس کی تھی۔ تمہارے اس امیدوار سے تو ہم نے منت لیا۔ ابھی تم باقی تھے۔“

”دیکھو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی۔ اور پیر سائیں کے سامنے اس کا اعتراف بھی کر سکتا ہوں۔ میں اپنی غلطی پر کسی سے بھی معافی مانگنے کو اپنی بے عزتی تصور نہیں کرتا۔ خواہ میرے سامنے کوئی مجھ سے بڑا ہو یا چھوٹا۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا ”چلو! فرض کرو۔ پیر سائیں سے سیاسی معاملات طے کر لیتے ہو، تم اب سیاست کے کھیل سے ہی باہر ہو گئے ہو تو یہی کر سکتے ہو کہ بے شرم بن کے سب سے معافی مانگ لو۔ جب آدمی غیرت کو بیچنے پر تل جائے تو اس کے لیے بے عزتی کی کوئی بات نہیں رہتی لیکن تم اپنے کاروبار کا

جناب ایم اے راحت
کا ناقابل فراموش ناول



کیا کرو گے؟ کتنا نقصان کیا ہے تم نے پیر سائیں کا۔“
میں نے کہا ”میرا کاروبار۔ کون سا کاروبار؟“
”وہی جو تم پیر سائیں کے دشمنوں کے ساتھ مل کے چلاتے ہو۔“

میں نے اندازے سے اندھیرے میں تیر چلایا ”تمہارا مطلب ہے نوادرات کا پرلہ؟“

وہ ہنسی سے بولا ”نہیں۔ ریڑھی پر کباب بیچنے کا پرلہ!“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ہر برس میں کاروباری رقابت کی اتنا دشمنی پر ہو سکتی ہے لیکن رب نواز نے آج تک کبھی پیر ساجان شاہ کا نام میرے سامنے نہیں لیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا کہ آثار قدیمہ اور نوادرات کے پرلہ میں ملک رب نواز اور پیر سائیں ایک دوسرے کے حریف ہی نہیں جانی دشمن بھی ہیں۔

میں نے کہا ”وہ پرلہ تو میں نے ختم کر دیا ہے۔“

وہ مجھے نفرت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا ”ابھی۔ اسی وقت ختم کر دیا ہے؟ نہیں سائیں شاہ عالم! ایسے تم کسی کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

میں نے برہمی سے کہا ”تم کیا سمجھتے ہو میں ڈر کے جھوٹ بول رہا ہوں؟“

اس نے گرج کے کہا ”ہاں۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔ بکواس کر رہے ہو پورے کچے۔“

”یہ تم نہیں بول رہے ہو دلاور شاہ۔ تمہاری وردی بول رہی ہے اور پیر سائیں کی حمایت بول رہی ہے ورنہ تمہاری محال نہیں سمجھی کہ مجھ سے اس لیے میں بات کر سکتے“ میں نے بھی دھاڑے کہا۔

”دیکھو شاہ عالم۔ میری نظر میں تمہاری اوقات ایک معمولی چور کے برابر بھی نہیں ہے۔ جو سمجھ سے جوتیاں چرانا ہے یا مالک کی تجوری سے روپے میرے سامنے تمہارا ڈرانا نہیں چلے گا۔ میں نے پیر سائیں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا مال تم سے برآمد کر کے چھوڑ دوں گا۔ چوری کا مال برآمد کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کا ابھی تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔“ وہ خالص پولیس والوں کے انداز میں دھمکی دیتے لگا۔

”جج تم میرے قابو میں آئے ہو تو تم بولو گے میں تمہاری کھال میں بھس بھر کے پیر سائیں کے سامنے رکھ دوں تو تمہارا وہ چور پتلا بھی بولے گا۔“

میں سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے بار بار چور کیوں کہہ رہا ہے اور چوری کا کون سا مال برآمد کرنا چاہتا ہے۔ یہ شاہ عالم کی زندگی کا کوئی ایسا راز

تھا جو میرے علم میں نہیں تھا۔ میں اس سے لاعلمی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا اور حقیقت جانے بغیر کوئی بات کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ مجھے اس عقوت خانے میں کیوں لایا گیا تھا۔ اسے ایس بی جی سے وہ مال برآمد کرنا چاہتا تھا جو میں نے چوری نہیں کیا تھا۔ اور جس مال کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم نے چوری کیا تھا یا رب نواز نے۔ اس کے بارے میں میں کچھ بتا بھی تو کیسے؟

بالآخر میں نے کہا ”دلاور شاہ۔ میں پیر سائیں سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”تم پیر سائیں سے مل سکتے ہو۔ لیکن؟“

میں نے اس کی بات کاٹ دی ”لیکن کیا؟ مجھے جو بتانا ہے میں پیر سائیں کو بتاؤں گا۔“

وہ ہنسی میں سہلانے لگا ”نہیں سائیں۔ پہلے تم مجھے بتاؤ گے۔“

اچانک میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جج کے کہا ”دفع ہو جاؤ یہاں سے فضول بھونکنے والے کتے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا؟ پنجرے میں بند کر کے تم نے شیر کو گیدڑ سمجھ لیا ہے۔ میں تمہیں کھاجاؤں گا دلاور شاہ۔“ میں نے اسے اور اس کی پولیس افسری کو ایک سے بڑھ کر ایک گندی گالی دی جو اس کے محافظوں نے بھی سنی۔

میرا یہ حربہ موثر رہا۔ اسے ایس بی دلاور شاہ نے اپنے رویے سے کسی خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا لیکن اس کے جارحانہ طور بدل گئے۔ اس نے اپنے اندازے نیازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے میری دی ہوئی گالیوں کو سنا ہی نہیں اور سنا تو فضول بکواس سمجھ کے اہمیت نہیں دی۔

”آج پہلا دن ہے شاہ عالم! اگلے دو دن میں تمہاری زبان بدل جائے گی۔ لیکن تم چاہو تو خود کو بڑے عذاب سے بچا سکتے ہو۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ لندن میں چوری ہونے والا چھ لاکھ کا مال اب کہاں ہے؟“

میں ممکن تھا کہ یہ جملہ سن کے میں اچھل پڑتا لیکن میں نے اپنے تو عمل کا اظہار نہیں ہونے دیا ”چھ لاکھ کا مال؟“

”ہاں۔ وہ سب نوادرات اب کہاں ہیں؟“

میں نے کہا ”بالکل کے بچے۔ ابھی تک لندن کی پولیس یہ بات معلوم نہیں کر سکی۔“

”لیکن میں کر لوں گا“ وہ چلا کے بولا۔

میں نے جواب میں چلا کے کہا ”اور میں کہہ چکا ہوں کہ

جو بتاؤں گا پیر سائیں کو بتاؤں گا۔“

پہلی بار اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے ”مجھے پتا تھا کہ چور کا مال چوری نہیں ہو سکتا۔“

اب آہستہ آہستہ میرا ذہن اس الجھن کو سلجھانے لگا تھا۔ میں نے کہا ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ مال میں نے چوری نہیں کیا تھا۔ میں تو دو سال سے لندن میں تھا۔“

”مال تم نے چوری کیا یا رب نواز نے۔ بات ایک ہی ہے۔ وہ مال پیر سائیں کا تھا اور انہیں واپس ملنا چاہیے۔“

میں نے اب خود کو زیادہ برا متاخم محسوس کیا۔ قیاس آرائی کی بنا پر میں نے جو سنگ اخذ کیے تھے وہ درست ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے کہا ”دلاور شاہ۔ تم پر یقیناً پیر سائیں کو بہت اعتماد ہے اور خود کو پیر سائیں کی نظر میں معتبر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تم اس کے ساتھ کتنے سے زیادہ وفادارین کے رہو اور تمہاری کارکردگی میں ریس کے گھوڑے جیسی رہے۔“

وہ غریبا ”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ میں رشتے میں پیر سائیں کا سالابھی ہوں اور پرلہ میں اس کی ایک پارنٹر میری بہن ہے۔“

میں سنبھل گیا ”یہ کہنے کی بات نہیں مگر تم پیر سائیں کے سامنے نہ ہوتے تو شاید پولیس کے ایک کانسٹیبل ہی ہو سکتے تھے تم کو کوئی اے ایس آئی بھرتی نہ کرتا۔“

”شاہ عالم! مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں جو تمہارے میں ایک عام چور کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم یہ دیکھ رہے ہو؟“ اس نے اپنے ارسائی کے اسباب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا ”دو باتیں ذہن میں رکھو دلاور شاہ۔ ایک یہ کہ مرا ہاتھی بھی سوالا کہ کا ہوتا ہے۔ سیاست میں میری اہمیت کم ہوئی ہے ختم نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی میرے ایسے وفادار اور جانثار ہیں جو میرے لیے جان دے بھی سکتے ہیں اور تمہاری جان لے بھی سکتے ہیں۔“

وہ ہنسی سے ہنسا ”مشر سے پہلے انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ان کا لیڈر کہاں گیا؟“

میں نے کہا ”دوسری بات‘ تم نے ایسے مجرم بھی دیکھے ضرور ہوں گے جو تشدد سے مر جاتے ہیں لیکن اپنی زبان نہیں کھولتے۔ میرے نہ پوی بچے‘ نہ ماں باپ جو مجھے روئیں۔ لیکن تمہیں رونے والے بست ہیں۔ بست سے صفائی تمہیں پولیس کا نفرنس میں دیکھ چکے ہیں‘ تم میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔“

وہ ہنسا ”لیکن تمہیں تو اپنی ہی پارٹی کے لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“

میں نے کہا ”کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم کام کی بات کریں۔ میرے اور پیر سائیں کے درمیان تعلقات میں بہتری آسکتی ہے۔ اس کے لیے ان کے اور میرے درمیان براہ راست ملاقات ضروری ہے۔“

وہ پھر اپنی بات براؤ گیا ”جب تک مال برآمد نہ ہو کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔“

میں نے کہا ”تم پیر سائیں تک میرا ایک پیغام پہنچا دو۔ میں رب نواز کے ساتھ اپنا برس ختم کر چکا ہوں۔ وہ مال اب بھی برآمد ہو سکتا ہے مگر رب نواز سے۔ اور اس کام میں پیر سائیں کی مدد میں کر سکتا ہوں لیکن ایسے نہیں‘ مجھے قید میں اذیت دے کر یا میری جان لے کر انہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم برابری کی سطح پر ایک دوسرے کے لیے فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ مستقبل میں ان کا اور میرا کاروباری اشتراک بھی ممکن ہے۔“

دلاور شاہ کچھ دیر سوچتا رہا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند منٹ خاموشی میں گزر گئے لیکن اس کی صورت کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے ترکش کا یہ آخری تجربہ بھی نشانے پر لگا ہے۔

بالآخر اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کے جوتے کی اڑھی سے بھجایا ”پیر سائیں کل رات ہی کراچی سے آئے ہیں۔ میں موقع ملنے ہی ان سے بات کر لوں گا۔“ اس نے کہا اور بھجھکا ہٹ کے انداز میں پیر پتلا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں محافظ بھی غائب ہو گئے جو اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرنے کے لیے یوں کلا شکوف کا رخ میری طرف کیے کھڑے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ میں آہنی سلاخیں توڑ کے دلاور شاہ پر حملہ نہ کروں۔

ایک بار پھر میں قید خانے کی تنہائی میں اپنی سوچوں کے ساتھ رہ گیا لیکن اب میں پہلے کی طرح ناامید نہیں تھا۔ میں نے اپنی ہر چال بڑی ہوش مندی سے چلی تھی اور کسی حد تک صورت حال کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

پیر سائیں سے ملاقات میری نجات کا واحد ذریعہ تھی اور میں نے دلاور شاہ کو قائل کر لیا تھا کہ یہ ملاقات باہمی مفاد میں بے حد ضروری ہے۔

پیر سائیں سے ابتدائی عاتقانہ تعارف کے بعد میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہو گا۔ اس نے گزشتہ عام انتخابات میں شاہ عالم کی پارٹی کے کسی امیدوار کو شکست

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ قید و بند کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور مجھے پیر سجان شاہ کی جی جیل سے کیسے رہائی ملے گی۔ اگر شاہ عالم کو پولیس نے گرفتار کیا ہو تو اس کی رہائی کے لیے سب سے مؤثر انداز میں جینم اپنے وسائل کا استعمال کر سکتی تھی۔ وہ میری گرفتاری کے معاملے پر اخبارات میں آواز اٹھاتی۔ میرا پتا چلانے کے لیے اور مجھ سے ملنے کے لیے اپنے تعلقات کو استعمال کرتی اور عدالت عالیہ میں جس بے جا کی درخواست دائر کرتی۔

گزشتہ چند برسوں میں خود حکومت نے جی آزادی کے تصور کو بڑی طرح پامال کیا ہے۔ اب کسی بھی شخص کو دن دہائے یا رات کے اندر جیل سے اس کے گھر سے دفتر سے یا بلیک کی نظروں کے سامنے سے اٹھایا جاتا ہے اور پھر وہ شخص عدالت ایسے غائب ہو جاتا ہے کہ اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے والے سادہ کپڑوں میں آتے ہیں اور اپنے دہشت زدہ کرنے والے رویے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ سرکاری اہلکار ہیں۔ گرفتاری کے نام پر یہ اغوا ہوتا ہے جس پر اعتراض یا احتجاج کرنے والوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ غیر متعلقہ لوگ جو چشم دید گواہ ہوتے ہیں، نظریں چرائیتے ہیں اور انجان بن جاتے ہیں یا بے مروت ہو کر صاف کہہ دیتے ہیں کہ انہیں اپنی اور اپنے اہل خانہ کی جان و مال اور آبرو عزیز ہے اس لیے وہ پرائے معاملے میں گواہی کے عذاب سے دور رہنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد صرف اغوا ہونے والے کے گھر والے رہ جاتے ہیں جو سارے زمانے میں پوچھتے پھرتے ہیں کہ وہ جسے "قانون نافذ کرنے والے ادارے" نے گرفتار کیا تھا اب کہاں ہے اور کس کی تحویل میں ہے؟ پولیس، اسپیشل پولیس، سی آئی اے، ایف آئی اے، پیرا ملٹری فورس اور آرمی۔ سب قانون نافذ کرنے والے ادارے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ پتا نہ چلے اور لواحقین عدالت عالیہ میں درخواست دائر کرنے کا حوصلہ اور استطاعت رکھتے ہوں تو قانون کا "طریق کار" والا ست اور تکلیف دہ عمل شروع ہوتا ہے۔ اپنی کورٹ حکومت کو نوٹس جاری کرتی ہے کہ گرفتار شدہ شخص کے بارے میں بتایا جائے۔ پھر ایڈووکیٹ جنرل سے لے کر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہ یا ان کے نمائندے کی طرف سے عدالت میں بیان داخل کر دیا جاتا ہے کہ مذکورہ شخص کسی کی تحویل میں نہیں ہے۔ اب فریاد

کرنے والا جائے تو کہاں جائے؟ گواہ بھی پیش کر دے تو فائدہ؟ انگلی اٹھائے تو کس پر اٹھائے قیمت اچھی ہو تو گرفتار ہونے والا کسی دن خود ہی لوٹ آتا ہے لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں تھا اور حراست میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ ورنہ لواحقین ساری عمر ایک پُر عذاب صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہتے ہیں اور جانے والے کبھی نہیں آتے۔

میرا معاملہ اس سے بھی بُرا تھا۔ اگر جینم کسی وکیل کے ذریعے سے عدالت عالیہ تک جاتی تو اسے بالآخر قانون نافذ کرنے والے ہر ادارے سے وہی جواب ملتا کہ شاہ عالم بے شک دن دہائے ایک ہوئل کے باہر سے اغوا ہوا تھا مگر وہ ہماری تحویل میں نہیں ہے اور ان کا یہ بیان جی بر حقیقت ہوتا ہے۔ اب یہ صرف پیر سجان شاہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ مجھے کب تک اپنی قید میں رکھتا ہے۔ بالآخر چھوڑتا ہے یا میری موت کا فرمان جاری کر دیتا ہے۔

سرکاری قانون نافذ کرنے والے اداروں سے الگ ملک کے ہر صوبے میں وڈیروں، جاگیرداروں، خراکداروں، اسکولوں اور ڈاکوؤں کی جی جیلیں ہیں جہاں ان کے مخالفین، دشمن اور ان کے مجرم قید رہتے ہیں۔ ان جیلوں کا غیر قانونی وجود ثابت ہے اور پولیس خود ان تک بالواسطہ رسائی رکھتی ہے مگر ان کے سامنے قانون بے بس ہے۔

اس لحاظ سے اغوا برائے نامان کرنے والے ڈاکو سب سے اچھے ہیں کہ قانون کے لحاظ یا نمائندے بن کر نہیں آتے۔ جو کرتے ہیں اعلان یہ کرتے ہیں اور صاف بتا دیتے ہیں کہ یہ نقد جان کا سودا ہے۔

ابھی میری ایسری کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میں نے ابھی تک ایسری کے سوا جو خود ایک اذیت تھی کوئی اذیت نہیں اٹھائی تھی مگر مجھے ان سب کی طرف سے پریشانی تھی جو مجھے اپنا سمجھتے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب تک رئیس نے صورت حال کی سنگینی کو سمجھ لیا ہوگا۔ اس نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ جو لوگ مجھے ہوئل کے اندر سے اغوا کرنے میں ناکام رہے تھے انہوں نے مجھے باہر سے اٹھایا۔ ہوئل کے فیچر نے اسے مظاہرین کے بارے میں بتایا ہوگا تو قدرتی طور پر یہ بات اس کے دماغ میں بھی آئے گی کہ یا تو یارن کے کارکن بن کر آئے والے ہی در حقیقت کرائے کے لوگ تھے جو مجھے دھوکے سے اپنے پاس بلانے میں کامیاب رہے یا پھر مجھے اس وقت اغوا کیا گیا جب میں مظاہرین کو

پر سکون رہنے اور منتشر ہو جانے کی تلقین کر کے واپس آ رہا تھا۔

رئیس بہت سمجھ دار اور محض دماغ رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ میری پراسرار گمشدگی سے پریشان تو ہو گا مگر بدحواس نہیں ہوگا۔ وہ جانے واردات سے کوئی بات معلوم کرنے میں ناکام ہو جائے گا تو سب سے پہلے فرید عباسی کو اطلاع دے گا اور پھر شاید جینم سے بات کرے گا مگر نیکم سے اور قریباً چند سے یہ بات چھپالے گا۔

قدرتی طور پر خود رئیس کا اور فرید عباسی کا شک سب سے پہلے اے ایس بی دلاور شاہ پر جائے گا اور ممکن ہے اب تک وہ کسی ذریعے سے اپنے شک کا اظہار بھی کر چکے ہوں مگر دلاور شاہ ایک چالاک پولیس افسر ہیں پیر سجان شاہ کا سالام بھی ہے۔ نظریہ ضرورت کا ناجائز استعمال تو اب بالکل عام ہو گیا ہے۔ دلاور شاہ جیسا شخص اپنے جھوٹ کو جواز عطا کرنے کے لیے حلف بھی اٹھا سکتا ہے کہ نہ اس نے شاہ عالم کو گرفتار کیا ہے اور نہ اس کا شاہ عالم کے اغوا سے کوئی تعلق ہے۔ نیت کا حال تو صرف خدا جانتا ہے۔ الفاظ کی حد تک اس کا حلف غلط نہیں ہوگا۔ وہ چاہے تو قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ دے کہ نہ کوئی گرفتاری کا حکم ہے اور نہ اس نے شاہ عالم کو اغوا ہوتے دیکھا۔

اب مجھے پیر سجان شاہ سے ملاقات کا انتظار تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے دلاور شاہ کو یقین دلایا تھا کہ میں کاروباری معاملات میں پیر سجان کے ساتھ اشتراک کا خواہش مند ہوں کیونکہ میرے ملک رب نواز سے کاروباری مراسم ختم ہو گئے ہیں۔ دلاور شاہ بڑے ظمطراق کے ساتھ آیا تھا کہ مجھ سے چوری کا مال برآمد کرے مگر میرے جارحانہ رویے نے اسے فوراً سا محتاط ہو کے پسپائی پر مجبور کر دیا تھا اور اس نے اپنی ذمے داری پر کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے پیر سجان سے بات کر لینا بہتر سمجھا تھا۔

میں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس زنداں سے میری رہائی صرف پیر سجان کے اجازت نامے سے مشروط ہے۔ اس معاملے میں نہ میری ہوشیاری کام آئے گی نہ میری جرأت زندان اور نہ قانون کی دیکھیری۔ اگر میں کسی طرح پیر سجان کو یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ میں نے واقعی ملک رب نواز کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور میں نیک نیکی کے ساتھ پیر سجان سے عہد وفا استوار کرنا چاہتا ہوں تو شاید کسی ضمانت پر مجھے مملکت مل جائے کہ میں جو کہہ رہا ہوں ثابت

کر کے بھی دکھاؤں۔ یہ ضمانت کیا ہوگی؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ یقیناً پیر سجان اتنا احمق نہیں تھا کہ صرف میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے چھوڑ دے۔

میں چاہتا تھا کہ پیر سجان سے ملاقات ہو جائے تو دوسرے معاملات پر بات کرنے سے پہلے میں اس سے درخواست کروں کہ وہ میرا ایک پیغام گھروالوں تک پہنچا دے۔ اگر مجھے فون کرنے کی اجازت نہیں تو کوئی اور رئیس سے کہہ دے کہ میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ وہ میری گمشدگی کے بارے میں کسی وکیل سے بات نہ کریں اور خاموشی سے میری واپسی کا انتظار کریں۔ رہی شاہ عالم کی پارٹی اور اخبار والوں کی بات تو وہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر جو چاہیں کریں۔

مجھے یقین تھا کہ پیر سجان میری یہ بات ضرور مان لے گا۔ لیکن اس سے ملاقات کب ہوگی؟ یہ غیر یقینی تھا۔ میں نے گزشتہ رات یہ سنا تھا کہ وہ کراچی سے لاہور آیا ہے اور اس سے ایک امید پیدا ہوئی تھی کہ فرصت ملے ہی وہ میرے معاملے میں کوئی فیصلہ ضرور کرے گا۔

دوسرے دن میں اپنی تنہائی اور خاموشی کے ساتھ اپنے خیالات کی دنیا میں سرگرداں رہا۔ میں اپنی گرفتاری سے ذرا بھی خوف زدہ یا ناامید نہیں تھا۔ مجھے صرف اپنی فکر کرنے والوں کی فکر تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی قمر کو کچھ معلوم ہو تو وہ دروے کے خود کو بلکان کر لے یا چندا اور نیکم کو پتا چلے تو وہ پریشانی میں کھانا چننا بھی چھوڑیں اور آسمان بمانے بیٹھ جائیں۔ ڈاکٹر کمال فرید عباسی یا رئیس حقیقت پسندانہ انداز میں صورت حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

دوسری طرف یہ بات بھی یقینی تھی کہ آج صبح کے اخبارات نے شاہ عالم کے پراسرار طور پر اچانک لاپتا ہوجانے کی خبر کو پوری تفصیلات کے ساتھ شائع کیا ہوگا اور یہ ناممکن ہوگا کہ یہ خبر چندا، نیکم یا قمر سے چھپی رہے چنانچہ اب یہ میرے لیے ضروری تھا کہ میں جلد از جلد انہیں اپنی خیریت سے مطلع کروں تاکہ ان کا حوصلہ کچھ بحال ہو۔

دوسرے بعد عید کے ساتھ کوئی سطح محافظ نہیں آیا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ اس نے دروازے کے پاس رک کے مجھے رحم طلب ملتی نظروں سے دیکھا "سائیں" ہم کھانا لے کر آئے ہیں۔

میں نے کہا "نہوں نے تمہیں اکیلا کیسے آنے دیا؟" وہ کچھ دیر چپ رہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے سائیں۔"

تھا کہ وہاں محفل ابھی برخواست ہوئی ہے۔ ایک ملازم چیزوں کو سینے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھ رہا تھا۔ دوسرا قالین کو جھاڑ رہا تھا۔ سگریٹوں کے کھڑے الٹے ٹرے میں ڈال رہا تھا اور تیسرا خالی ہونے والے چائے کے برتن ایک ٹرالی میں سمیٹ کر لے جا رہا تھا۔

نیم دروازہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید اس کمرے میں کسی خفیہ کمرے کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہوگی۔ وہ مجھے دیکھ کے دوستانہ انداز میں مگر عیاری سے مسکرایا۔ "ہاؤ آر یو فینلک ناؤ؟"

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ "تم نے پیر سائیں سے میری بات کی؟"

وہ سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑتا رہا "ابھی نہیں۔"

میں نے کہا "جھوٹ بول رہے ہو تم۔ تم اتنا اختیار نہیں رکھتے اس گھر میں کہ مسمان کو قیدی کا اور قیدی کو مسمان کا درجہ دے سکو۔"

وہ دھٹائی سے مسکراتا رہا "میرے اختیارات کی بات مت کرو۔ ساری خدائی اک طرف ہے۔ جو رو کا بھائی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کون سی جو رو کا بھائی۔ پیر سائیں نے شرع کی حد میں چار ٹوکلی ہوں گی۔"

"کوئی بھی بڑا آدمی چار چھوڑوس کرے۔ مگر کی ما لکن وہی سمجھی جاتی ہے جو خاندانی ہوتی ہے اور پہلی ہوتی ہے۔" میں نے کہا "تمہارے اطوار میں مجھے کوئی بات خاندانی نہیں لگتی۔"

یہ اس کے لیے گالی تھی۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے خنجر ہوا۔ "چلو میرے ساتھ۔ تمہیں پیر بھان شاہ نے بلایا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تم اس کی حویلی میں ہو۔ جس طرح تم میرے ساتھ پیش آئے ہو ایسے اس کے سامنے بی ہو مت کرنا ورنہ نقصان میں رہو گے۔"

میں نے کہا "مجھے پوٹوکل مت سکھاؤ۔"

وہ بولا "یقیناً یہ ضروری ہے۔ تمہارے لیے وہ شاید غیر اہم ہو۔ ایک عام آدمی جو تمہارا سیاسی حریف تھا یا کاروباری لیکن یہاں وہ ایک تسلیم شدہ پیر ہے۔ جتنے لوگ تمہیں یہاں نظر آئیں گے وہ اس کی قدم پوسی کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ اگر تم نے ان کے سامنے پیر سائیں کی شان میں کوئی گستاخی کی یا توہین آمیز جملہ بولا تو وہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

اسے ٹالنے کے لیے میں نے کہا "اوکے میں خیال رکھوں گا لیکن نہ میں اس کی قدم پوسی کروں گا اور نہ اس کے سامنے دوڑاؤ ہو کے اور عقیدت سے سر جھکا کے بیٹھوں گا۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ہم اسی مغربی طرز کے ڈرائنگ روم اور اس سے متصل مشرقی انداز کی بیٹھک سے گزرے۔ بیٹھک میں صفائی ہو رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا

کس کے ہاتھوں کیسے مارا گیا اور کہاں دفن ہوا۔ یوم حشر سے پہلے میرے لو کا سراغ نہ مجھے چاہئے والے لگا سکتے تھے اور نہ وہ سراغ رساں جو ڈرتے سے آفتاب کا پتا پوچھ لیتے ہیں۔

تیسری بار میری آنکھ پھر اسی کمرے میں کھلی جس میں مجھے پہلی بار لاک کے رکھا گیا تھا۔ میں اسی آرام دہ بستر پر دراز تھا اور اب میری وہ حالت بھی نہیں تھی جو پہلی بار ہوش میں آنے کے بعد تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں سکون کی طویل خند لے کر جاگا ہوں۔ میں نے اٹھ کے ایک انگڑائی لی اور پھر یہ دیکھا کہ کیا ایک بار پھر مجھے آزادانہ نقل و حرکت کی آزادی عطا ہو گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک واش روم کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے باہر سے قفل تھے۔

میں نے ساتھ والے ڈرائنگ روم کے دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی تو مجھے بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں مگر وہ ڈرائنگ روم سے آگے والی بیٹھک میں تھے۔ میں ان باتوں کا کوئی مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔

کمرے میں گئے ہوئے کلاک نے شام کے پانچ بجائے۔ مجھے اغوا ہونے اب چوبیس گھنٹے ہونے والے تھے۔ وہ کام جو میں ہمیشہ بدل کے کرتا چاہتا تھا خود بخود ہو گیا تھا۔ شاہ عالم مڑا سر اور طور پر اپنے ہونٹ سے غائب ہو گیا تھا کہ کسی نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا اور خود ہونٹ والے گواہ بن گئے تھے کہ شاہ عالم نے چپک آؤٹ نہیں کیا مگر وہ باہر اپنی پارٹی کے کچھ مظاہرین سے ملنے گئے تو لوٹ کے نہیں آئے۔ سیکورٹی کا عملہ بھی گواہی دے گا کہ وہ سامنے ہی موجود تھے کہ اچانک غائب ہو گئے۔

اچانک میری نظر کپڑوں کے ایک جوڑے پر پڑی جو بڑے سلیقے سے استری کر کے میرے بیڈ کے پاس ہی صوفے پر رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے دیکھا۔ یہ میرے ساز کا تھا اور مجھے اپنے میزبانوں کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا۔ صاف کپڑے دیکھ کر میرے دل میں نمائے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں کپڑے اٹھا کے واش روم میں چلا گیا۔ وہاں میں نے ہاتھ نم میں نیم گرم پانی بھرا اور نمائے کے لیے ٹھس گیا۔ اسی شاہی حمام میں ایک سے بڑھ کر ایک ہاتھ سوپ لوشن اور میسج ہو جوتھے۔

آج سے گھنٹے بعد میں کپڑے بدل کے نکلا تو بالکل فریض تھا۔ میں نے کمرے میں آتے ہی اے ایس بی ولاور شاہ کو دیکھا جو خاموشی سے کمرے میں آکے بیٹھ گیا تھا اور صوفے پر

باہر تو وہ کھڑے ہیں ہندوق لیے۔" میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

وہ بولا "آپ پیچھے چلے جاؤ تو ہم دروازہ کھول کے کھانا اندر رکھ دیں۔" میں آخری دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ "عبدل! مجھے بہت افسوس ہے کہ کل میری وجہ سے تم پر معیبت آئی۔" اس نے دروازے کا قفل کھول کے کھانے کی ٹرے اندر رکھی اور پھر جلدی سے تالا لگا دیا۔ اس ایک منٹ میں عبدل کی نظر مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میں کوئی آدم خور شیر ہوں جو موقع ملنے ہی اس پر بھجھ پڑے گا۔

میں نے کہا "عبدل! میں پیر سائیں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ دھڑا دھڑکے کے بولا "ہم کیا کر سکتے ہیں سائیں؟" میں نے کہا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ پیر سائیں آگئے ہیں؟" وہ حویلی میں موجود ہیں جناب! آپ کھانا کھاؤ۔"

میں نے کہا "ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور خوف زدہ انداز میں چلا ہوا واپس ہو گیا۔ میں نے کھانے پر نظر ڈالی۔ یہ قیدیوں والا کھانا نہیں تھا۔ یہ پیر سائیں کے دسترخوان پر رکھا جانے والا خوانِ نعمت تھا جس کے چر کھلف سرخ کھانے اپنی اشتہا انگیز خوشبو پھیلا رہے تھے۔

مگر مندی کے باوجود مجھ پر بھوک غالب آگئی۔ میں نے سوچا کہ جو ہوتا ہے وہ تو ہوگا۔ مجھے بھوکا رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جسم میں کچھ توانائی ہوگی تو کام آئے گی۔ خالی پیٹ کے ساتھ تو دماغ بھی کام نہیں کرے گا۔ میں نے مرغ قورے' پلاؤ اور شیرمال کے ساتھ پورا انصاف کیا اور بعد میں سوٹ ڈش سے بھی۔ آہستہ آہستہ مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ قید خانے میں میرے ساتھ ایک مجرم جیسا سلوک نہیں ہو رہا ہے بلکہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی مجھے مسمان کی حیثیت دی جا رہی ہے تو اس میں پیر سائیں کی رضامندی شامل ہوگی۔

کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد جب پھر مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایک بار پھر مجھے کوئی خواب آور دوا کھلا دی گئی ہے تو اس کا بھی کچھ مقصد ہوگا۔

مردہ بدست زندہ۔ ایک قیدی اپنی مرضی سے کیا کر سکتا ہے۔ مجھے زنداں میں رکھنے والے جتنی آسانی سے... ذہر دے سکتے تھے اتنی ہی آسانی سے مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ دنیا کو کبھی معلوم نہ ہوتا کہ شاہ عالم جو درحقیقت نامرطیم تھا۔

محی الدین نواب کے قلم سے ایک دل گداز داستان

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اپنے ہاگیا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۴۲۴۴۱۲

دیکھو یہی ہے وہ بندہ تو بچتا ہے اسے؟
 فریادی نے دونوں ہاتھ جوڑے "ہمت اچھی طرح مائی
 باپ!"
 پیر نے عورت سے پوچھا "تو بھی دیکھ لے" اس کی
 شکل۔
 عورت نے روتے ہوئے کہا "میں ہے تو وہ حرامی پلا۔"
 پیر سائیں کے چہرے کھڑے ہوئے محافظ نے گرج کے کہا
 "کالی مت دے پیر سائیں کے سامنے۔"
 مرد نے کہا "مطلعی ہوگئی پیر سائیں!"
 پیر سائیں نے سر ہلایا "جس کا دل دکھا ہوا ہو" اس کے
 منہ سے گالی نکلنے لگی یا بد دعا۔
 مرد چلانے لگا "پیر سائیں۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے
 قابل نہیں رہے۔ اس نے بچوں کے سامنے ماں کی عزت
 خراب کی۔ وہ بچے خیر... جوان ہو رہے ہیں۔ لڑکا ہے چدرہ
 سال کا، لڑکی چودہ سال کی ہے۔ اس سے پوچھو سائیں کہ کیا
 اس کے گھر میں ماں بسن کے ساتھ ایسا ہو۔"
 پیر سائیں نے اسے دلا دیا "حوصلہ کر حوصلہ۔ ابھی
 تیرے ساتھ انصاف ہوگا۔" پھر وہ داڑھی والے سے مخاطب
 ہوا "ہاں بھئی، بچ بول رہی ہے یہ عورت یا جھوٹ بک رہی
 ہے؟"
 داڑھی والے نے سر جھکالیا۔
 پیر سائیں گرجا "ابھی منہ سے کچھ بکواس کر۔ تیرے منہ
 میں زبان ہے نا۔ یا نکال کے دکھائیں تیرے کو۔ ڈاکو ایسے
 ہوتے ہیں بے غیرت!"
 ڈاکو نے ہاتھ جوڑ دیے "پیر سائیں، بھول چوک
 ہوگئی۔"
 "بھول چوک! یہ بھول چوک ہے؟" پیر سائیں آگ بگولا
 ہو کر بولا "اے بھئی کے ساتھ بھول چوک۔ بابا بھی اپنے
 گھر میں بھی جی ہے بھول چوک۔ خود کو ڈاکو کہتے ہو اور کام
 کرتے ہو نامردوں والے۔"
 ڈاکو اسی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھا رہا "سائیں اس بار
 معافی دے دو۔"
 پیر سائیں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں بابا۔ ابھی ہم کون
 معافی دینے والا۔ معافی دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ یا یہ
 فریادی تیرے کو بول دے کہ جامعہ کیا۔"
 ڈاکو نے فریادی کی طرف نظریں اٹھائیں تو اس کا سر
 انکار میں ہلنے لگا "ہم کو انصاف چاہیے پیر سائیں!"
 پیر سائیں نے کہا "انصاف برابر ملے گا۔ ضرور ملے گا۔"

دلدار شاہ مجھے جو ملی یا کوٹھی کے عقب میں لے گیا جہاں
 سنگ مرمر کے ٹائٹل والا صحن تھا۔ یہ جو ملی کا آخری حصہ تھا
 جس کے بعد وہی خاردار تاروں والی اونچی فصیلی تھی۔ یہاں
 بھی ایک تخت تھا اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ تخت پر قالین
 بچھا ہوا تھا اور بیڈ کی بنائی والی کرسیوں پر کٹن تھے۔
 پیر سائیں تخت پر ایک شال اوڑھے بیٹھا ہوا تھا اور
 اس کے ایک ہاتھ میں ربر کے پائپ والی جتنے کی تھی۔ وہ
 پچاس پچیس سال کا بھاری بھر کم آدمی تھا جس کے چہرے پر
 مذہبی تقدس کی علامت داڑھی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس
 سے پہلے کوئی کلین شیڈ پیر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بارعب
 چہرے کو جلالی انداز دینے والی لال لال آنکھیں تھیں اور
 گھنی مونچھیں جو ناک کے دونوں جانب دو دو انچ تک پھیلی
 ہوئی تھیں۔ اس کے سر پر ہمت کم جھوٹے جھوٹے بال تھے
 جن کی سفیدی اس کی عمر کے باعث سیاہی پر غالب آچکی
 تھی۔
 تخت سے کچھ دور ٹائٹل کے فرش پر ایک گھنی سیاہ
 داڑھی والا شخص بڑے موزانہ انداز میں دوڑانو بیٹھا ہوا
 تھا۔ وہ نیچے سر تھا اور اس کے سر پر لمبے پٹوں والے سیاہ بال
 تھے جو تیل سے چمک رہے تھے۔ وہ ہلکے پتلے رنگ کے سلک
 جیسے شلوار قمیض میں تھا۔
 پیر سائیں کے دائیں ہاتھ پر ایک غریب صورت خست
 حال اور کمزور سا آدمی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا اور
 اس کے ساتھ ایک عورت خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔
 عورت کے عہد شباب کا وہ زمانہ تو گزر چکا تھا جب اس کے
 چہرے کی نازکی اور بھرپور بدن کی جوانی و دعوت دیدہ رہتی ہوگی مگر
 وہ ابھی بوڑھی نہیں ہوئی تھی۔ نئی حالات اور نظرات نے
 اس کی جوانی کو قبل از وقت بوجھا۔ یہ کی طرف سمجھنے لیا تھا۔ وہ
 اپنے انداز و اطوار سے میاں بیوی نظر آتے تھے۔
 پیر سائیں کے تخت کے بالکل پیچھے ایک محافظ کاندھے
 سے کلا شکوف لٹکائے کھڑا تھا اور دلچسپی سے عورت کو دیکھ
 رہا تھا جو حسین تو خیر نہیں تھی، لیکن جاذب نظر ضرور تھی۔
 میں قریب پہنچا تو پیر سائیں نے سیاہ چہرے کے ساتھ
 ایک نظر مجھ پر ڈالی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے ان
 کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا جو تخت کے سامنے دائیں بائیں
 دو ہتھاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
 دلاور شاہ چند قدم چل کر گیا اور مخالف سمت کی ایک کرسی پر
 بیٹھ گیا۔
 پیر سائیں نے فریادی مرد کی طرف دیکھا "ہاں بھئی"

یہ تو حکم ہے آنکھ کے بدلے آنکھ جان کے بدلے جان!
 ڈاکو چلانے لگا۔ "سائیں! ایسا مت کرو۔"
 پیر سائیں کا چہرہ جلال ہو گیا "بھونکتا ہے میرے سامنے
 کہتے ہیں جاتا ہے کیا کرو! اپنی آواز کم کرو نہ ہمیں بند کرنی
 پڑے گی۔"
 ڈاکو جلد سے میں گرجا "معافی پیر سائیں معافی!"
 لیکن پیر سائیں نے حکم صادر کر دیا "اوسے لاؤ اس کی
 حروالی کو۔"
 ڈاکو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ایسا ظلم نہیں کرو پیر سائیں ہم
 پیر سائیں نے دلاور شاہ کی طرف دیکھا "ابھی یہ اس کو
 ظلم لگتا ہے جب اس کا زور چلتا تھا تو اسے خیال نہیں آیا کہ
 یہ ظلم ہے۔"
 دو ملازم ایک عورت کو بازو سے پکڑنے کے گھسیٹتے ہوئے
 ریمین میں لے آئے۔ وہ خاصی فریہ بدن اور تپیں تپیں
 سال کی جوان عورت تھی جس کے سانولے رنگ اور تپتے
 خوش میں بڑی دلاوری تھی۔ اس نے آنکھوں میں ڈھیروں
 سرمہ لگا رکھا تھا اور شوخ رنگ کے ریشمی کپڑے پہن رکھے
 تھے لیکن خوف اور گھبراہٹ سے اس کا حال خراب تھا۔ وہ
 راحت کر رہی تھی اور کانپ رہی تھی۔
 پیر سائیں کے سامنے پہنچ کے وہ زور زور سے روتے لگی۔
 "پیر سائیں، میری کیا غلطی ہے۔ اس کے جرم کی سزا مجھے
 کیوں دیتے ہو؟"
 پیر سائیں نے فرمایا "اس لیے کہ تو بیوی ہے اس کی۔
 اگر یہ مردائے تو اس کی جائداد اور دولت تجھے ملے گی یا
 نہیں؟ اس پر سب سے پہلے تیرا ہی دعویٰ ہوگا۔ پھر اس کا
 قرض تو کیوں نہیں چکا؟"
 نظام انصاف کے ان اصولوں کی ایسی انوکھی تشریح نے
 مجھے حیران کر دیا مگر میں ایک خاموش تماشا کی طرح دیکھنے
 کے سوا کیا کر سکتا تھا۔
 پیر سائیں نے ڈاکو کی بیوی کو لانے والے سے پوچھا "کیا
 یہ اکیلی آئی ہے؟"
 ایک ملازم نے دست بستہ عرض کی "آپ نے حکم دیا تھا
 کہ بچے بھی ساتھ لائے جائیں وہ اندر ہیں۔"
 پیر سائیں نے فریادی کو دیکھا "جل بھئی، جا کے اپنا
 حساب برابر کر لے۔ ہم تجھے انصاف کا پورا حق دیتے ہیں۔"
 عورت پھر چلی "سائیں میرے پرانا ظلم مت کریں۔"
 پیر سائیں نے دھاڑ کے کہا "ظلم ہم نہیں کر رہے ہیں۔"

تیرے گھر والے نے پل کی تھی۔ اب وہ بچتے گا۔
 میں اس فیصلے پر بھونکا رہ گیا۔ پیر سائیں نے اسلام کے
 نظام انصاف کی اتنی غلط فہمی کی تھی مگر باقی لوگ اسے میں
 انصاف قرار دے رہے تھے۔ خود دلاور شاہ قطعی لا تعلق بیٹھا
 تھا اور باقی لوگ تائید میں سر ہلا رہے تھے۔ مجھے اس وقت مزید
 مدد نہ پہنچا جب فریادی نے اس فیصلے کو تسلیم کیا اور اس کی
 بیوی نے بھی رضامندی اس پر قبل در آمد کی اجازت دی۔
 یہ میں جہالت تھی اور لا قانونیت کی انتہا تھی کہ ایک جرم کا
 حساب دوسرے جرم کا ارتکاب کر کے برابر کیا جائے۔ مگر
 یہاں ملک کا قانون نہیں، پیر سائیں کا قانون چلتا تھا۔ ڈاکو
 نے ایک شخص کی بیوی کی عزت اس کے بچوں کے سامنے
 لولی تھی۔ اب وہ شخص ڈاکو کی بیوی کی عزت اس کے بچوں
 کے سامنے لوٹے گا۔ انصاف زندہ باد! پیر سائیں زندہ باد۔
 میں نے فریادی کو جوش انتقام سے تھمتائے چہرے کے
 ساتھ ڈاکو کی بیوی کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ڈاکو کی بیوی نے
 بھی اب پیر سائیں کے حکم کو (خود باشت) فرمان الٹی کی طرح
 تسلیم کر لیا تھا۔ پہلے بے آبرو ہونے والی عورت نے بھی اپنے
 شوہر کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کا
 حساب برابر کر آئے کس کا فیصلہ ہو گیا تھا اور فریقین اسے
 انصاف سمجھ رہے تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ اس فیصلے کے
 خلاف نہ اچل تھی نہ کسی عدالت عالیہ میں فریادی کی مخالفت۔
 صحن میں اب ہم چار ہی افراد رہ گئے تھے۔ میں،
 پیر سائیں، اے ایس بی دلاور شاہ اور پیر سائیں کے چہچہے کھڑا
 ہوا مسلح محافظ۔ میرا خیال تھا کہ اب پیر سائیں مجھ سے
 مخاطب ہو گا مگر اس نے حکم دیا "ابھی کتے کو لاؤ بابا!"
 پیر سائیں کے تخت سے ساتھ سترف کے فاصلے پر جو ملی
 کی قمی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کے پیچھے سے لوگ
 ایسے نمودار ہوتے تھے جیسے انڈیج آرٹسٹری دیتے ہیں۔
 اس دروازے سے ڈاکو کی بیوی کو لایا گیا تھا۔ پھر اسی
 دروازے سے وہ ایک غیر مرد کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔
 اندر کی کمرے میں اس کے بچے سے بیٹھے ہوں گے۔ وہ نہ
 قانون کو سمجھتے ہوں گے نہ مکافات عمل کو۔ شاید انہیں یہ
 بھی علم نہ ہو کہ ان کے باپ کا جرم کیا تھا مگر جو کچھ ان کی ماں
 کے ساتھ ہو گا اسے شاید وہ تمام عمر نہ بھلا سکیں۔ ایک مظلوم
 عورت مطمئن ہوگئی تھی کہ پیر سائیں نے انصاف کیا اور
 ایک ظالم ڈاکو اس افسانے سے گزر رہا تھا جو وہ دوسروں کو دے
 چکا تھا۔
 مجھے ایسا لگتا تھا جیسے سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹ

جائے گا۔ میں اپنی پریشانی بھول گیا تھا اور اکیسویں صدی کی باتیں کرنے والی دنیا میں زمانہ جاہلیت کا نمونہ دیکھ کے حیران تھا۔ دل کو روکوں کہ چٹوں جگر کو میں۔ پیر سائیں کی مطلق العنانی اور طاقت کے مظاہرے نے مجھے حتماً کڑوا دیا تھا۔

اچانک سامنے والا دروازہ جو میرے دائیں جانب تھا پھر کھلا اور اس مرتبہ میں نے ایک نیا سین دیکھا۔ ایک شخص اندر سے کتنے کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے گلے میں چٹا بھیڑا ہوا تھا اور پٹے سے خشک زنجیر کو ایک ملازم نے تھام رکھا تھا۔ پھر وہ سراسر ملازم پار کیا جس نے اسیشتیں نسل کے ایک کتے کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ ایک انسان اور ایک کتا ایک ہی طرح چلتے ہوئے آگے بڑھے۔

اصل کتا تخت کے قریب پہنچ کر پچھلی دو ٹانگوں پر بیٹھ گیا اور پیر سائیں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کانوں کو سلایا۔ کتا خوشی سے غرائے لگا۔ کتے کی طرح چلنے والے انسان نے پہلے صحن کا ایک راؤنڈ لگایا۔ وہ پہلے دلاور شاہ کے پاس گیا اور تختے کی طرح ہی اس کے جوتوں کو چاٹتا رہا۔ پھر میری طرف آیا۔ اور میرے پیروں میں لوٹنے لگا۔

میرے بدن میں ایک کچی پھیل گئی۔ کتے کی طرح حرکتیں کرنے والے اس انسان نے صرف ایک انڈرویز پین رکھا تھا۔ اس کا جسم دھلا پتلا اور سیاہ تھا جس پر لمبے لمبے داغ کوٹوں کی مار کے غماز تھے۔ وہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا جسے مار مار کے کتا بنادیا گیا تھا اور اس نے تشدد کے عذاب سے بچنے کے لیے بالآخر ذہنی طور پر خود کو انسان اور اشرف المخلوقات کے بجائے ایک حقیر کتا تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے بالآخر پیر سبحان شاہ کے سامنے جا کے بھونکنے شروع کر دیے۔

میں نے پیر سائیں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک خباثت بھری 'فائنڈ' اور 'اطمینان' مسکراہٹ تھی 'ہاں ہاں' ٹھیک ہے بابا۔ تمہارے بھوک گئی ہے ابھی۔"

دروازے سے ایک ملازم باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تقریباً تین فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی ٹرے تھی اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک کین تھا۔ اس نے ٹرے کو کتے کے سامنے رکھا اور کین سے اس میں دودھ اندر لیتے لگا۔ پھر میں نے ایک اور انسانیت سوز اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ وہ انسان کتا اور خود کو کتا سمجھنے والا ایک انسان اس ٹرے میں منہ جھکا کے پھڑپھڑ دودھ پیتے لگا۔

پیر سائیں نے ایک قہقہہ لگایا "شاہ عالم! اپنے

دوست کو دیکھو بابا!"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا "کس دوست کو پیر سائیں؟"

اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اس بار دلاور شاہ نے بھی ہنسنی کا ساتھ دیا "یہ کہیں بات ہے۔ تم نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تو اس بے چارے کو کتنا صدمہ ہوگا۔"

میں نے غور سے کتے کے ساتھ ایک ہی ٹرے میں دودھ پینے والے انسان کو دیکھا مگر یہ کوئی شاہ عالم کا دوست تھا۔ معلوم نہیں وہ اپنے کس جرم کی سزا کاٹ رہا تھا مگر میں اسے شناخت کرنے سے قاصر تھا۔

دلاور شاہ بولا "پہلے یہ بت بھونکتا تھا۔"

پیر سائیں مسکرایا "سینچ پر چڑھ کے بھونکتا تھا۔ دیکھو شاہ عالم! یہ تمہارا پار ہے یا سراسر ایذا میں؟ جسے تم نے ہمارے مقابلے میں کھڑا کیا تھا۔ اگر یہ جیت جاتا تو اس کی سیلی کا نمبر ہوتا۔"

ساری بات ایک دم میری سمجھ میں آگئی۔ یا سراسر ایذا میں میری اپنی پارٹی لی ہے ایف کے ٹکٹ پر سبحان شاہ کے مقابل کھڑا ہوا تھا اور پارٹیاں اس کے جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں دلاور شاہ نے مجھے بتایا تھا۔ شاہ عالم کے ایک وفادار ساتھی کا یہ حال دیکھ کر میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ قطع نظر اس سے کہ شاہ عالم کا انداز سیاست کیا تھا، شخص اس سے عمدہ وفائے کی یہ سزا قابلِ نفرت حد تک شیطانی تھی۔

لیکن مصلحت نے یا میری بزدلی نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور میں اس انسان کو دیکھتا رہا جو مقام انسانیت سے گرا دیا گیا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی ہو گئی تھی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں محمود و یاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں اور عام انتخابات میں عام آدمی بھی حصہ لے سکتا ہے۔ مقابلہ کر سکتا ہے اور جیت بھی سکتا ہے۔

میں نے کہا "پیر سائیں۔ اس کی خطا کب معاف ہوگی؟"

پیر سائیں نے دونوں کتوں کو دیکھا "ہم اسے یہ سزا دیتے مگر اس نے اس سبب پر ہمارے لوگوں کے سامنے ہمیں کتا کہا تھا۔"

میں نے کہا "اپنی غلطی کی یہ بت سزا بھگت چکا ہے۔ اب اسے معاف کر دیں۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا "میں بھی ساری دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ کتا کون ہے؟ اس لیے تمہارے کتے پر ہم اس کو معاف

کرتے ہیں۔ تم مہمان ہو ہمارے۔"

پیر سائیں کے اشارے پر دو ملازم دونوں کتوں کو زنجیر سے تھام کر لے گئے جاتے جاتے یا سراسر ایذا نے ایک پارٹیت کر مجھے دیکھا اور اس وقت مجھے ان آنکھوں میں دیرانی کی جگہ نفرت کا لالہ بھونکتا محسوس ہوا۔ میں اس سے نظریں نہ ملا۔ اسے یہ بھی نہ بتا سکا کہ میں قصور وار نہیں کیونکہ میں شاہ عالم جیسا ضرور ہوں مگر شاہ عالم نہیں ہوں۔

پیر سبحان شاہ نے اپنے انصاف اور اپنی حدود و اختیارات کے درنوں نے مجھے متاثر کرنے کے لیے دکھائے تھے۔ اس نے مجھے جانتے بوجھتے وہاں ایسے وقت میں طلب کیا تھا جب وہ مجھے اپنی تہادری و جہاد کی طاقت کے مظاہرے سے مرعوب کر سکے۔ تاہم اس نے مجھے مہمان کا درجہ بھی دیا تھا اور بظاہر میری ایک درخواست کو شرف قبولیت بخش کے میرا اعتماد بحال کر دیا تھا لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "پیر سائیں۔ آپ کو میرا پیغام۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا "وقت کے ساتھ تمہارے خیالات کتنے بدل گئے ہیں شاہ عالم۔ آج تمہارے لمبے میں اتنی عاجزی ہے کہ تمہارا رویہ دیکھ کے مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔ تم مجھے پیر سائیں کہہ رہے ہو۔ تم تو مجھے پیر سبحان شاہ نہیں پیر شیطان شاہ کہتے تھے۔"

میں نے کہا "پرانی باتوں کو جانے دیں۔ میرے اور آپ کے درمیان جو سیاسی اختلافات تھے، وہ اب ختم ہو جانے چاہئیں۔"

وہ دلاور شاہ کی طرف دیکھ کے مسکرایا "اس لیے کہ تمہاری سیاست ختم ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا "حالات کے پیش نظر میرے لیے سیاست سے خود کو الگ کر لینا ہی بہتر ہے۔"

وہ بولا "پریس کانفرنس میں تو تمہارے دعوے کچھ اور تھے۔ بہت گرج برس رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "آپ تو جانتے ہیں کہ میں دو سال سے باہر تھا۔ مجھے یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد دو دن میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ملکی سیاست میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے سیاست سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اس کا اعلان تم کب کر گے؟" وہ پُر متعجب لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اعلان کیا پیر سائیں۔ بس میں خاموشی سے واپس لندن چلا جاؤں گا۔"

دلاور شاہ بولا "کیا خیال ہے، پہلی فلائٹ سے تمہاری سیٹ بک کرنا ہوں؟"

میں نے دلاور شاہ کی طرف دیکھا بھی نہیں "میں یہ چاہتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کا دل صاف ہو جائے ہمارے درمیان دشمنی کی وجہ کوئی نہیں۔ سیاست میں ہم ایک دوسرے کے حریف تھے اور ہم نے ایک دوسرے کے خلاف بہت سی باتیں کیں ہوں گی جو دل آزار تھیں۔ آج میں پھل کرتے ہوئے ان سب باتوں پر آپ سے معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا جو میں نے کی تھیں۔ میں ہر حال عمر میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ میں اصرار نہیں کروں گا کہ آپ مجھ سے معافی مانگیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔"

میری بات کے خوشگوار تاثرات آہستہ آہستہ پیر سبحان شاہ کے چہرے پر ظاہر ہوئے "یہ میں جانتا ہوں شاہ عالم کہ تم

میں نے کہا "پیر سائیں، آپ کو شک ہے کہ میں خود انخواستہ آپ کو بے وقوف بنا رہا ہوں؟"

"ضرورت پڑنے پر تم کو مجھے کو باپ بنانے کے اور کام نکل جائے تو باپ کو گدھے کی طرح لات مارنے کے ماہر ہو۔"

میں نے کہا "میں یہ بات سب کے سامنے کہہ سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اخبار والوں کو بلا لیں۔"

"افسوس اس بات کا ہے بابا کہ ہم تھیں مہمان نہیں رکھ سکتے ورنہ جھوٹ بچ کا پتا چل جاتا۔" وہ بولا۔

اس کی بات نے مجھے چوکنا کر دیا "آپ کا مہمان تو میں ہوں۔"

وہ بولا "بھئی بھئی برائی بھی آدمی کے حق میں اچھا بن جاتی ہے۔ ابھی تم کو صرف اس لیے پیر سبحان شاہ کی جیل سے رہائی ملے گی کہ گورنمنٹ تم کو اپنی جیل میں رکھنا چاہتی ہے۔ تمہارے خلاف گرفتاری کے وارنٹ ہیں دلاور کے پاس۔"

اس لیے تم یہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رہ سکتے لیکن ہمارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اس کا اندازہ تم کو سرکاری جیل میں بھی ہوگا۔"

میں نے اس اطلاع سے وقتی طور پر کچھ اطمینان محسوس کیا کہ پرانے مقدمات میں میری دوبارہ گرفتاری کے احکامات موجود تھے ورنہ شاید پیر سبحان شاہ کی جیل میں میرا بھی وہی حال ہو سکتا تھا جو شاہ عالم کے ساتھی یا سراسر ایذا کا ہوا۔ اب

اے ایس بی دلاور شاہ قانونی طور پر باندھا تھا کہ مجھے گرفتاری کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کسی بمبلیٹ کے سامنے پیش کرے اور پولیس کو تحویل میں دینے کے لیے رعایت حاصل کرے۔ اگرچہ یہ قانون بھی صرف کتابوں تک محدود تھا مگر اس وقت یہی کتابی قانون میرے تحفظ کی ضمانت بن گیا تھا۔ سرکاری جیل میں اپنے لیے قانون کے مطابق زندہ رہنے کی سہولت حاصل کرنا میرے اختیار میں تھا۔ میں اپنے تعلقات اور اپنے وسائل استعمال کر کے اچھے سے اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر سکتا تھا اور ایک قانونی جنگ لڑ کے جیتنے کی امید کر سکتا تھا جو پیر سبحان شاہ کی نجی جیل میں ناممکن تھا۔

میں نے کہا ”پیر سائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کل تک ہم سیاسی حریف بھی تھے اور ہمارے درمیان کاروباری رقابت بھی تھی مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔“

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ”دلاور نے یہ بات بھی بتائی ہے مجھے کہ رب نواز کے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا پر کیا ہے۔“

میں نے اب خود کو زیادہ پراعتماد محسوس کیا ”آپ تو اچھی طرح جانتے ہو پیر سائیں کہ دو سال سے میں باہر تھا۔“

”یہ ہم نے سنا ہے۔“

میں نے کہا ”میں لندن میں تھا۔ وہاں میں نے شادی کر لی تھی۔ وہ ناکام ہو گئی۔ پھر میں نے دوسری شادی کی۔ لندن میں میرے قیام کے ایک ایک دن کے گواہ موجود ہیں۔ ان دو سالوں میں ایک بار بھی میں پاکستان نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ بات اے ایس بی دلاور شاہ سے معلوم ہوئی ہے کہ وہ چھ لاکھ پاؤنڈ مالیت کے نوادرات درحقیقت آپ کے تھے۔“

پیر سائیں نے سر ہلایا ”وہ ہمارے گودام سے غائب ہو گئے تھے شاہ عالم۔ ہم نے محافظوں کو غفلت کی بہت سخت سزا دی لیکن پھر معاف کر دیا۔ وہ ملک رب نواز کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔“

میں نے کہا ”آپ کو یقین ہے کہ وہ نوادرات ملک رب نواز کے سوا کسی نے نہیں چرائے تھے۔“

وہ گرم ہو گیا ”ہم نے پوری تفتیش کی تھی بابا۔ دلاور نے چوری کا سراغ لگایا تھا۔ وہ چوری نہیں ڈھنکی تھی۔ رب نواز کے آدمی ایک ٹرک میں بھر کے آئے تھے۔ انہوں نے ایک محافظ کو مار دیا۔ ایک کو وہ مردہ سمجھ کے چھوڑ گئے تھے لیکن وہ زخمی ہوا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کی صورتیں دیکھی تھیں۔“

میں نے کہا ”پیر سائیں۔ آپ جو کہہ رہے ہیں بالکل صحیح ہو گا لیکن اس چوری کا الزام آپ مجھے کیسے دے سکتے ہیں؟“

”چور کا ساتھی کیا چور نہیں ہوتا؟“

میں نے کہا ”میں سائیں۔ میرا اس چوری کے مال سے کیا واسطہ؟ کتنے سالوں سے میں اور ملک رب نواز پرنس پارٹنر تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے چوری کا مال چھاپا ہو۔ اور کیا پرنس ایسے چل سکتا ہے کہ آج تم نے میرے مال پر ڈاکا ڈالا، کل میں تمہارا مال اٹھا کے بازار سے لے جاؤں۔“

اس نے مجھ سے اتفاق کیا ”پرنس ایسے نہیں چل سکتا۔“

میں نے کہا ”خیر مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ مال رب نواز کا نہیں ہے لیکن اس کی وجہ سے ہمارے تعلقات ضرور خراب ہوئے۔ وہ مجھ پر شک کرتا ہے مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ تو ملک رب نواز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ آج میرا دشمن ہو رہا ہے۔“

”یہ بات میں کیسے مان لوں۔“

میں نے کہا ”میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔“

”لیکن اس دشمنی کی وجہ؟“ وہ جانتے بوجھتے انجان بن گیا۔

میں نے کہا ”پیر سائیں‘ سب کچھ تو اخباروں میں شائع ہوا تھا۔“

وہ بولا ”بابا‘ اخبار والوں کی بات مت کرو۔ کیا ہم جانتے نہیں کہ جو کچھ اخباروں میں شائع ہوتا ہے، کیسے شائع کرایا جاتا ہے۔ ہمارے تعلقات بھی ہیں اخبار والوں سے۔ وہ ہمیں اندر کی بات بھی بتا دیتے ہیں۔ ہمارا ایک بندہ اخبار والوں کے ساتھ اچھے تعلقات بنا کے رکھتا ہے۔ تم اسے ہمارا پی آر او سمجھ لو۔ وہ سب کو خوش رکھتا ہے۔ سب کو موقع مل دیکھ کے تجھے تحائف دیتا رہتا ہے۔ ابھی کل ایک کالم نویس کی شادی کی سلور جوبلی ساگر تھی۔ ہم نے ایک کے ساتھ اس کی بیوی کے لیے سونے کا ایک سیٹ بھیج دیا۔ اس کالم نویس کا نام ہے اس کا۔ حتیٰ بزدلی“ اس کے لیے ایک امپورٹڈ سوٹ پہن بھیجا۔“

میں نے کہا ”میں مانتا ہوں کہ۔“

اس نے میری بات کاٹ دی ”تمہارا تو معاملہ ہی سب سے الگ ہے۔ تمہارا اپنا اخبار ہے۔“

میں نے کہا ”میرا ذاتی اخبار تو کوئی نہیں۔“

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا ”تو ذاتی ہی سمجھو۔ اس کی جو فیڈ بک ہے وہ تمہارے قبضے میں ہے۔“

میں نے کہا ”آپ ختم کی بات کر رہے ہیں؟“

”اور کون ہے جس کا کوئی نام لے۔ ہم نے کسی دانشور کو اتنے وفادار نہیں دیکھا۔ اسے ذرا خیال نہیں اپنی پوزیشن کا۔“

میں نے کہا ”پیر سائیں۔ ختم نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ یہ سب پہلے لندن کے اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں کہ چھ لاکھ پاؤنڈ کا وہ مال جو یہاں سے رب نواز نے لندن میں اپنے ایجنٹ جیمس پونڈ کی جی کو بھیجا تھا اور جو درحقیقت تمہارا تھا، یہ اب معلوم ہوا۔ وہ چوری ہو گیا تھا۔“

وہ شکی لہجے میں بولا ”تم اس کی قیمت وصول کر چکے تھے؟“

میں نے کہا ”آدھی قیمت۔ اور اس کے بعد مال سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کو بغفلت رکھنے کا ذمہ دار میں نہیں جانتا۔ اب تو لندن کی پولیس اسے گرفتار کر چکی ہے اور اس کے خلاف ثبوت خود جی کی بیوی نے فراہم کر دیا ہے کہ مجھے تین لاکھ پاؤنڈز سے محروم کرنے کا سارا پلان خود جی نے ہی بنایا تھا۔ بظاہر وہ میرا ہمدرد اور دوست بنا ہوا تھا۔ بلکہ محافظ بن کے میرے ساتھ گیا تھا۔“

”بابا‘ وہ سب قصہ میں نے پڑھا ہے۔ لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔“ پیر سائیں نے پدمزنی سے کہا۔

میں نے کہا ”پیر سائیں‘ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نوادرات میں نے چوری کیے تھے؟“

وہ شش و پنج میں پڑ گیا ”اس مال کا تمہارے علاوہ صرف جی کو علم تھا۔ مگر جی کے پاس وہ مال ہوتا تو اب تک برآمد ہو جاتا۔“

میں نے کہا ”تم لاڈل پرائس کو بھول رہے ہو۔“

وہ غمی میں سر ہلانے لگا ”اسے تم دونوں نے پھنسانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ میرا مال یہاں رب نواز نے چوری کیا اور جی کو بھیجا۔ اگر وہ گرفتار نہ ہوتا تو میرے آدمی اس سے بھی پوچھ لیتے لیکن وہ پولیس کی گرفتار میں ہے اور اس کے خلاف دوسرے بہت سے سنگین معاملات ہیں۔“

میں نے کہا ”اسے اگر مزائے موت نہ ہوئی تو اس کی باقی زندگی جیل میں ہی گزرے گی۔“

وہ بولا ”دیکھو شاہ عالم۔ یہ کوئی پرجون کی مارکیٹ نہیں

ہے۔ نوادرات کا پرنس ہے اس میں چوری کا مال کوئی نہیں چھپا سکتا۔ جب مال نکلے گا تو مارکیٹ میں نظر آئے گا۔ اور چور کا بھی پتا چل جائے گا۔“

میں نے کہا ”یہ بات ملک رب نواز سمجھ لیتا تو کبھی مجھ پر شک نہ کرتا۔ اس کے اور میرے تعلقات اتنے خراب نہ ہوتے۔“

پیر سائیں سوچ میں پڑ گیا ”کیا واقعی تمہارے ساتھ اس کے تعلقات اتنے خراب ہیں؟“

میں نے کہا ”کیا تمہیں ثبوت چاہیے؟“

وہ بولا ”تم کیا ثبوت دے سکتے ہو؟“

میں نے کہا ”ثبوت تم خود اپنے کانوں سے سن سکتے ہو۔ میری اس سے فون پر بات کرنا۔ جو گفتگو ہمارے درمیان ہوئی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ تم میرے فون پر ہماری باتیں سنو یا ٹیپ کر لو۔“

وہ کچھ قائل ہوا۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا ”میرا خیال ہے کہ ہم اندر چلتے ہیں۔“

اے ایس بی دلاور شاہ کے ساتھ ہی پیر سبحان شاہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم اس بیٹھک میں آگئے جو مغالی کے بعد اب پھر برہم آرائی کے لیے تیار تھی۔ پیر سائیں اس قالین پر بیٹھ گیا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔

اس نے دلاور شاہ سے کہا ”رب نواز کا فون ملاؤ۔“

دلاور نے قبیل کی اور چند سیکنڈ سننے کے بعد ریسپور رکھ دیا ”اچھی یہ لائن بڑی ہے۔ میں دوسرے فون پر دیکھتا ہوں۔“

پیر سبحان شاہ نے ریسپور پر ہاتھ رکھ دیا ”یہاں سے ہم بات سنیں گے، تم اندر جا کے فون ملاؤ۔ اور کسی کو چائے کے لیے بولو۔“

دلاور چلا گیا تو میں نے کہا ”پیر سبحان شاہ۔ تم شاید اسی لیے کامیاب ہو کہ خدا نے تمہیں ذہانت کے ساتھ صحیح قوت فیصلہ بھی عطا کی ہے۔ تم معقول بات سن سکتے ہو اور سمجھ لیتے ہو۔“

اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ پیر سبحان شاہ نے میری بات کو خوش آمدانہ مطلب برآری کا انداز نہیں سمجھا تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کہ گفتگو کے کسی مرحلے میں نہ میری خود اعتمادی میں کمی آئی تھی اور نہ میں نے اپنے خوف کو ظاہر ہونے دیا تھا۔

”شاہ عالم۔ نہ پیری مریدی کے معاملات جذبات سے آلود ہیں اور نہ کاروبار کے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”پیر سائیں‘ ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو“ اس نے کہا۔

”تمہارا مال یہاں لاہور میں چوری ہوا تھا۔ تمہیں کیسے شک ہوا کہ یہ مال وہی ہے جو لندن پہنچا اور وہاں چوری ہو گیا۔ تم نے وہ مال دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور جب تک مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش نہ ہو۔ دیکھو گے بھی نہیں۔“ وہ عیاری سے مسکرایا ”میرے پاس مال کی ایک فرسٹ تھی۔ بلکہ پورا رنگین تصویروں والا کیٹلاگ ہے“ تم دیکھو گے؟“

میں نے کہا ”ضرور دیکھوں گا۔“

پیرس میں اندر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو اہم اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تک چائے بھی اگلی تھی۔ کسی وجہ سے دلاور شاہ کو ملک رب نواز کا فون ملائے میں ناکامی ہوئی تھی چنانچہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آ بیٹھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اہم کے صفحات کھول کے ہر تصویر کو دیکھا۔ ایسا ہی ایک کیٹلاگ مجھے لندن میں جی نے بھی دکھایا تھا۔ جو اس کو یقیناً ملک رب نواز نے بھیجا ہو گا۔

میں نے کہا ”میں یہ اہم دیکھ چکا ہوں۔“

”کہاں دیکھ چکے ہو؟“ پیرس جانے لے پوچھا۔

میں نے کہا ”مال کے ساتھ۔“

”ہاں اس نے دو سرا بنوایا ہوگا“ اس نے ملک رب نواز کے نام کی جگہ ایک زوردار گالی استعمال کی۔ ”جب مال چوری ہو گیا تو میں نے اس کیٹلاگ کی سوکاپیاں بنوا کے لندن اور پیرس ’روم‘ ’جنیوا‘ اور دنیا کے دس بڑے بڑے شہروں کے آرٹ ڈیلرز کو بھیج دی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب چوری کا مال دنیا میں کیس بھی فروخت کے لیے پیش کیا جائے مجھے معلوم ہو جائے گا۔ ہر شہر کے دس بڑے آرٹ اینڈ کرافٹ اور اسٹیکس کے ڈیلرز نے یہ کیٹلاگ شہر کے سوائیکٹوں کو دکھائی ہوں گی۔ اس طرح دنیا بھر کے ایک ہزار ایکٹوں نے چوری ہونے والے مال کو پہچان لیا ہوگا۔ مجھے تو رب نواز پر حیرانی ہے کہ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟ عام چور مریخی تو چرا سکتا ہے چڑیا گھر کا یا تھی یا زبرا کیسے چرا سکتا ہے؟“

”شاید اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تم ایک کیٹلاگ تیار کرا چکے ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، یہی ہوا شاید۔ تم جانتے ہو یہ مال ایک دن میں جمع نہیں ہوتا۔ اس میں کئی ہفتے بعض اوقات کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ میرے پاس جیسے جیسے مال آتا ہے میں اس کے رنگین فوٹو تیار کر لیتا ہوں۔ پھر ان سب کو ایک اہم میں

لگا دیتا ہوں۔ اس کے بارے میں ضروری معلومات اور حوالے جمع کر کے کیٹلاگ بن جاتا ہے۔ لندن کے ایک ایکٹ نے یہ مال دیکھا اور پہچان لیا۔“

میں نے کہا ”اوہ۔ تم اس ایکٹ کی بات کر رہے ہو جو لاڈ پرائس کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس نے بتایا تھا کہ چوری کا مال لندن میں ہے۔“

”اے۔ لیکن اس ایکٹ نے اپنے کیشن کے لالچ میں یہ بات پہلے لاڈ پرائس کو نہیں بتائی تھی۔ جب سودا ہو گیا تو لاڈ پرائس پر انکشاف ہوا کہ وہ چوری کا مال خرید چکا ہے۔ وہ اس کی آدھی قیمت بھی ادا کر چکا تھا۔ اس نے باقی آدھی قیمت جی کو ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بھی حیرانی کی بات ہے کہ نہ جی نے میرے چوری ہو جانے والے مال کے بارے میں سنا تھا اور نہ لاڈ پرائس نے حالانکہ دونوں لندن کے ڈیلر اور ایکٹ سے واقف ہیں۔ خیر، جی نے لاڈ پرائس کے الزام کو جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ ایکٹ تو سارا مال دیکھ چکا ہے۔ اس نے مال کو چوری کا نہیں بتایا اور وہ کوئی عام یا غیا ایکٹ نہیں۔ پرانا تجربہ کار آدمی ہے۔ لاڈ پرائس نے اس ایکٹ کو بلا کے پوچھا تو اس نے تسلیم کر لیا کہ مارکیٹ میں ایک ایسی اہم موجود ہے جس میں اس سامان کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ لاڈ پرائس اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے ایکٹ کو گولی مار دی۔ اور بعد میں اس کی لاش غائب کرانے کی کوشش میں پکڑا گیا۔“

”لاڈ پرائس نے تین لاکھ پاؤنڈز مجھے ادا کیے تھے اور مزید تیس ہزار اس ایکٹ کو۔ اور اس کے بدلے میں چوری کا مال خرید ا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”شاید وہ تمہیں اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھتا تھا۔“

میں نے کہا ”میں ملوث تھا بھی نہیں۔ مال جی کا تھا۔ جی نے ایک ایکٹ کے ذریعے فروخت کر دیا۔ اس کے پاس بھی مال لاہور سے آیا تھا اور ملک رب نواز نے بھیجا تھا۔ میں تو صرف درمیان کا آدمی تھا جو پہلے جی کی قیمت وصول کرتا تھا اور آگے پہنچا دیتا تھا۔“

”کیا تم بعد میں اس سے ملے تھے؟“

میں نے کہا ”میں اس سے اسپتال میں ملا تھا جہاں وہ دل کا دورہ پڑنے کے بعد داخل ہوا تھا۔“

پیرس جانے لے پوچھا ”شاید اسے دل کا دورہ بھی اسی لیے پڑا ہوگا۔“

میں نے کہا ”ہو سکتا ہے اس دورے کا یہی سبب ہو مگر وہ دل کا پرانا مریض ہے۔ اس کی حالت خاصی نازک تھی۔ وہ کسی وقت بھی مر سکتا ہے۔ جی پولیس کی تحویل میں ہے اور تمہارے مال کا کچھ پتا نہیں“ اب تم کیا کرو گے؟“

”میں انتظار کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ جس نے بھی وہ چوری کا مال چرایا ہے، وہ کبھی نہ کبھی اس کو بازار میں لانے کا اور پکڑا جائے گا۔“

میں نے کہا ”تمہیں کم از کم مجھے شک سے بری کر دینا چاہیے۔ میں پاکستان آ گیا ہوں اور میرا واپس جانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اس لیے بھی بے تصور ہوں کہ مجھے یہاں آنے کے بعد اصل بات معلوم ہوئی۔ جی نے اور ملک رب نواز نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو الٹا مجھے خرم بنا رہا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اصل چور جی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ اس کے باوجود جی نے مال کا سودا کیا۔ حالانکہ یہ بات چھپ نہیں سکتی تھی۔ وہ بعد میں پکڑا جاتا لیکن اس نے لاڈ پرائس کو کچھ نہیں بتایا اور سودا کر لیا۔ آدمی رلم تم نے وصول کر لی مگر باقی آدھی جی کے ہاتھ میں آنے سے پہلے یہ راز فاش ہو گیا۔ جی کو ضرور پتا چل گیا ہوگا کہ وہ ایکٹ اپنے کیشن کے لالچ میں مارا گیا۔ اگر وہ لاڈ پرائس کو بتا دیتا کہ مال چوری کا ہے تو سودا ہی کہاں ہوتا۔ اس ڈر سے کہ مارکیٹ میں ساکھ خراب نہ ہو، جی نے خود بھی چوری کا مال غائب کر دیا۔ نقصان ہوا صرف لاڈ پرائس کا مگر وہ بعد میں جی سے پورا کر لے گا۔ ابھی تو جی اس چوری کے مال کو چھپا کے بیٹھا رہے گا۔ سال دو سال یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اسے قہوراً قہوراً کر کے مختلف راستوں سے نکالے گا۔“

میں خاموشی سے پیرس جان شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ اسے ایسے معلوم ہو سکتا تھا کہ چوری ہونے والا سارا مال بحفاظت لندن کے ایک گھر میں موجود ہے جس کے بارے میں نہ جی کو معلوم ہے اور نہ لاڈ پرائس کو۔ اس کے بارے میں سوئی غرب یقینی جانتی ہے۔ اس کا شوہر عاقل جانتا ہے یا میں جانتا ہوں۔ اور یہ کہ اب وہ مال کبھی کسی مارکیٹ میں سیل کے لیے پیش نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ایک امانت کے طور پر حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ ابھی اس سوال کا میرے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ اب یہ کام انتہائی خطرناک ہو گیا تھا۔ اسے ایس پی دلاور شاہ نے ٹیلی فون ملائے کی ذمے

داری کسی ملازم کو سونپ دی تھی جو شاید مسلسل رب نواز کا نمبر ری ڈائل کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک اس نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا ”پیرس میں ‘نمبرل’ گیا ہے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا ”میں اور مرے بات کرنا ہوں“ آپ یہاں نہیں۔“

وہ ایک ہی فون تھا جس کی ایکس منشن مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں بھی تھی اور مشرقی طرز کی بیٹھک میں بھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے کہا ”ہیلو!“

دوسری طرف سے رب نواز نے کہا ”شاہ عالم! کہاں سے بول رہے ہو تم؟“

میں نے کہا ”اپنے منہ سے۔ کیا تم کہیں اور سے بول رہے ہو؟“

اس نے یہ مذاق پسند نہیں کیا ”میرا مطلب ہے تم کہاں ہو اس وقت؟“

میں نے کہا ”میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔“

”تم اپنے ہوٹل سے بات کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”نہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

وہ بگڑ گیا ”فرق تمہیں نہیں پڑتا۔ آخر تم یہ کیا ڈراما کر رہے ہو پورا سرا رگشہ کی۔ اخبار والے سب کیا لکھ رہے ہو۔“

میں نے کہا ”میں نے اخبار نہیں دیکھا۔“

”خبروں میں تمہارے اغوا ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا مگر میں نے ختم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تمہیں پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“

میں نے کہا ”شاید۔ لیکن ابھی میں کسی تھانے میں نہیں ہوں گا۔ تم یہ نہیں پوچھو گے کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟“

”تمہارے خلاف پرانے کیس کی فائلیں پھر کھل گئی ہوں گی۔“

”اتنے انجان مت بنو رب نواز۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔“

وہ برہمی سے بولا ”فضول باتیں مت کرو۔ دھوکا تم نے کیا ہے میرے ساتھ اور اب تم نے کوئی نیا کھیل شروع کر دیا ہے۔“

میں نے کہا ”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ وہ مال چوری کا تھا؟“

وہ اس سوال کے لیے یقیناً تیار نہ تھا ”کون کتنا ہے کر۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی "رب نواز" تم نے چوری کا مال بیچا تھا جی کو۔؟

"یہ غلط ہے" اس نے براہ اعتماد رہنے کی کوشش کی۔

"تم نے جی کو بھی ڈبل گراس کیا رب نواز۔ اسے بھی نہیں بتایا کہ یہ مال چوری کا ہے۔ وہ اسے بازار میں لے گیا۔"

"تمہیں ضرور کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔"

"نیکو اس بندہ کو۔" میں نے ایک شرمناک گالی دی "تم ایک گھٹیا چور ہو۔ تم نے سب کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے تھے؟ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی کہ جس مال کو تم باپ کا مال سمجھ کر لندن کی مارکیٹ میں لے گئے تھے۔ اس کے بارے میں حقیقت کبھی سامنے نہیں آئے گی۔"

وہ چلائے لگا "تم اپنا جرم میرے سر تھوپ رہے ہو۔ وہ مال تم نے چوری کیا ہے؟ تم نے اور جی نے مل کے چوری ڈکیتی کا ساز اور مار چایا تھا چور تم ہو۔"

میں نے اسے مزید گالیاں دیں "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ مال کس کا تھا؟"

"وہ میرا مال تھا۔"

"تمہارے بھونکنے سے میں قائل نہیں ہو سکتا کہ وہ مال پیر سجان شاہ کا تھا" میں نے دھاڑ کے کہا۔

وہ ایک دم غصہ اڑ گیا "دیکھو۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ لیکن تم میرے پاس آؤ، میں تمہیں اصل بات بتا دوں گا۔"

"اصل بات تو پتا چل گئی ہے مجھے۔ تم نے بہت گھٹیا حرکت کی ہے رب نواز۔ جی میں اور تم کب سے ساتھ تھے۔ تم نے ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا۔ تم نے اپنی ہی نہیں مارکیٹ میں میری اور جی کی ساکھ بھی خراب کی۔"

شاید رب نواز سمجھ گیا کہ اب اس کی باتوں کا جاوہ مجھ پر نہیں چلے گا۔ وہ لہجہ بدل کے بولا "ایسی باتیں فون پر نہیں ہونی چاہئیں۔ تم لوگ تو میں بتا دوں گا۔"

"اب ہم کبھی نہیں ملیں گے رب نواز۔ ذرا سوچو کہ تمہارے لالچ کی وجہ سے کتنی خرابی ہوئی۔ مجھے جی کا کوئی افسوس نہیں، لیکن تمہارے جرم کی سزا ایک ایجنٹ کو ملی۔ وہ اپنی جان سے گیا۔ لاڈلہ راس کو ہارٹ اٹیک ہوا۔"

"دیکھو شاہ عالم! ہم آرام سے اس مسئلے پر بات کریں گے۔"

میں نے چلائے کہا "طعن اس پر جو پھر تم سے بات کرے، جو تمہاری شکل بھی دوبارہ دیکھے وہ اپنے باپ کا نہیں

رب نواز۔ تم نے بہت بڑا دھوکا دیا مجھے اور الزام بھی مجھے دیتے رہے۔ مجھ پر کبھی بھروسہ مست کرتا۔ میں آج سے تمہارا دوست نہیں دشمن ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور ختم ہوا۔

میں نے رب نواز سے وہی کہا جو مجھے کتنا چاہیے تھا لیکن اس گفتگو نے پیر سجان شاہ کو میری بے کنایہ کا قائل کر لیا تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ رب نواز سے کاروباری تعلقات ختم کرنے کے معاملے میں جو کچھ میں نے اے ایس بی دلاور شاہ سے کہا تھا، جھوٹ نہیں تھا۔ جب میں واپس ان کے پاس گیا تو وہ آپس میں سرجوڑے کچھ ملاح مشورہ کر رہے تھے۔

میں نے کہا "اب تو آپ کو یقین آیا؟"

پیر سجان شاہ نے سر ہلایا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رب نواز نے تمہارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تم اس کے پرانے ساتھی ہو؟"

میں نے کہا "ملاحی آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔"

"گر وہ چوری کا مال مارکیٹ میں آجائے تو رب نوازی ساکھ کا بڑا غرق ہو جائے۔ اس سے کوئی سودا نہ کرے۔"

میں نے کہا "شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ اس نے خود ہی وہ مال ہالیا اور مشہور کر دیا کہ مال چوری ہو گیا۔ میں اب اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔"

"تم کیا آپ کو کہہ گئے؟"

میں نے کہا "ابھی میں نے سوچا نہیں۔ میں اپنا پرئس بھی کر سکتا ہوں اور اگر آپ کے ساتھ کوئی بات بن جائے تو کیا بات ہے۔"

وہ بولا "بات بننا بچوں کا کھیل نہیں ہے بابا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی تمہاری آپس کی چال ہو۔ دشمن پر اپنی جلدی اعتبار کر لینا کوئی گھنڈی کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ ابھی تم پر پولیس کیس ہیں۔"

میں نے سخت کا اظہار کیا "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"تم نے ہمارے ایک آدمی کو بھی چھوڑا ہے شاہ عالم۔" اس نے شکایتی انداز میں ناراضی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "وہ بے وقوف آدمی تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"وہ تمہیں کیا بتاتا؟" دلاور شاہ نے کہا۔

میں نے اے ایس بی دلاور شاہ کی طرف دیکھا "آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے تو مجھے ایک پیغام بھیج دیتے۔ مجھ سے کسی نے بات نہیں کی۔"

"ہمیں معلوم تھا تم نہیں آؤ گے" دلاور شاہ بولا۔

میں نے کہا "تم نے بہت رسک لیا۔ تمہیں پرئس کا نفرنس چھوڑ کے جانا پڑا۔ صابر علی میرے ہاتھوں مارا جاتا تو یہ اپنے دفاع میں قتل کر دیتا۔"

پیر سجان شاہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "ابھی ہم اس کے لیے کچھ ضرور کریں گے۔ تم نے بہت زیادتی کی۔ اس پر قاتلانہ حملے کا کیس بھی بنایا۔ اسلحہ ایکٹ الگ لگا دیا۔ وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ جیل خانے سے تو ہم بچائیں گے اسے مگر نوکری کئی اس کی۔"

میں نے کہا "پیر سجان۔ آپ کی مہربانی ہو تو اسے نوکریوں کی کیا کمی۔ میں بھی کوشش کروں گا۔"

"تم نے یہ جوڈ کرنا کب سیکھا؟"

میں نے کہا "ابھی لندن میں۔"

اس کے ساتھ ہی میری اپنے میزبانوں کے ساتھ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس سے میری حیثیت پیر سجان کے دشمنوں جیسی نہیں رہی۔ میں اس رات پیر سجان شاہ کا سمان بن کے رہا۔ ہم نے کھانا بھی ساتھ ہی کھایا مگر دسترخوان پر دیگر لوگوں کی موجودگی میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس وقت دلاور شاہ بھی موجود نہیں تھا مگر رات گیارہ بجے کے بعد جب میں سونے کے موڈ میں تھا وہ پھر نمودار ہو گیا۔ یہ اس کی بہن کا گھر تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ زیادہ وقت یہاں گزارتا ہے۔

اس نے مجھے مطلع کیا "صبح تمہیں سرکاری مہمان خانے میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "کوئی مجبوری ہے؟"

وہ بولا "ہاں۔ وہ جو تمہاری منجری ہے نا۔ اس نے وخت ڈال رکھا ہے شاہ عالم کو غیر قانونی طور پر اغوا کیا گیا اور گرفتاری کے وارنٹ ہونے کے باوجود کسی خانے میں نہیں رکھا گیا۔"

میں نے کہا "آئندہ میرے سامنے جہنم کا ذکر کرو تو کوئی غلط لفظ استعمال مت کرنا۔ اس وقت میں نے تمہارے عہدے کا نہیں پیر سجان کے ساتھ تمہارے رشتے کا لحاظ کیا۔"

وہ برا سامنے بنا کے بولا "ورنہ تم کیا کرتے؟"

میں نے کہا "معاذہ تو ہے دن میں تارے دکھاتا۔ میں تمہیں رات میں سو روج دکھاتا۔"

"دن میں تارے ہم دکھائیں گے تمہیں" وہ مجھے دھمکی دے کر اٹھ گیا۔

پیر سجان شاہ نے صبح کہا تھا کہ ایک خرابی نے مجھے

بجایا۔ اگر اے ایس بی دلاور شاہ کے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ نہ ہوتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ میں پیر سجان کا مجرم تھا۔ مجھے اس کی جیل میں ڈالنے والے کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھتے۔ وہ مجھے پیر سجان کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے میرا دماغ درست کرتے اور یہ کام جلیت میں نہ ہوتا۔ سجان شاہ کو اپنے پیری مریدی کے سیاسی اور کاروباری مشاغل سے فرصت ملتی تو وہ پوچھتا کہ بابا وہ شاہ عالم کو منگوا تھا ہم نے۔ وہ کدھر گیا۔ لاؤ آج اس کی بھی مزاج پڑی کر لیں۔

لیکن شاہ عالم کے دو سال پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولی گئیں تو اس کی گرفتاری کے احکامات از سر نو جاری کیے گئے کیونکہ عدالت کے ریکارڈ کے مطابق شاہ عالم ایک مفور مجرم تھا۔ اس کے خلاف سماعت کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہونا لازمی تھا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

میری گرفتاری سے پیر سجان کو بھی بڑی دلچسپی تھی۔ گرفتاری کے بعد اس کا برادر ابراہیم اے ایس بی دلاور شاہ اپنی نگرانی میں مجھ سے خصوصی گفتگو کرتا اور مجھ سے مال قیمت برآمد کر کے اپنے جیباجی کی نظروں میں مزید سرخرو ہوتا۔ چنانچہ اس نے ملزم شاہ عالم کی گرفتاری کے احکامات پر عمل درآمد کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ سرکاری قواعد و ضوابط کے مطابق وارنٹس کے اجرا میں دو دن گزر گئے تھے مگر خود کو پولیس کا اعلیٰ افسر سمجھنے کے باوجود دلاور شاہ میں اپنی بہت نہ تھی کہ وہ مجھے صحافیوں کے سامنے یا ہوٹل کے اندر سے وارنٹ دکھائے بغیر گرفتار کر سکتا۔

تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ کیس میں پھر قانون کو جمل دے کر غائب نہ ہو جائیں، اس نے میری نگرانی جاری رکھی تھی اور اپنے ایک خاص آدمی صابر علی کو بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا میری خوش قسمتی کے باعث ہوا۔ صابر علی نے ایس ایس بی کا نام لینے کی غلطی کی اور اس سے پیچھا چھڑانے اور اس کو سزا دینے کے لیے مجھے اس کے خلاف ایک جھوٹا کیس کھڑا کرنا پڑا۔

اس کے بعد اچانک پیر سجان شاہ کو معلوم ہوا کہ مفور ملزم شاہ عالم کی سرکاری قانون کی حد سے بڑھ گئی ہے اور اس کی پیر سجان کے ایک مرید خاص کو بیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کی جموئی سازش بھی کامیاب ہو گئی ہے چنانچہ پیر سجان نے حکم دیا کہ عدالت میں پیشی سے پہلے اس گستاخ کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم اسے جانتے ہیں کہ پیر سجان شاہ سے ذاتی عداوت پانا کتنا مگرا پڑ سکتا ہے۔

لیکن پیر سائیں کے سامنے پیش میرے لیے ایک بنام بن گئی، مجھے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے ذاتی عداوت کے الزام کی صفائی پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ شاہ عالم کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے اسے گرفتار ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ یہ وارنٹ نہ ہوتے تو میں پیر سبحان شاہ کی نجی جیل میں اسی طرح جے بس پڑا رہتا جیسے یا سرایاؤ تھا۔

آج میرا ہوٹل کے باہر سے اچانک غائب ہو جانا ایک مراسرار معاملہ بن گیا تھا۔ فرید عباسی یا جینم نے اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلا کے یہ معلوم کر لیا ہو گا کہ شاہ عالم کے وارنٹ اسے ایس ایس ڈی لا اور شاہ کے حوالے کیے گئے تھے۔ مجھے اغوا ہوتے کسی نے نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ فرض کر لیا گیا کہ شاہ عالم کو پولیس نے ہوٹل کے باہر سے اٹھالیا ہو گا۔ مگر اس کے بعد ظہم کو اسی علاقے کے تھانے میں ہونا چاہیے جس میں ہوٹل واقع تھا۔ اس تھانے کے روزنامے میں شاہ عالم کے نام کا اندراج بھی ہونا چاہیے لیکن اس رات میں پیر سبحان شاہ کی حویلی میں تھا تو تھانے میں کیسے مل سکتا تھا۔

میرے دوستوں میں قانونی کارروائی کو سمجھنے والا صرف فرید عباسی تھا یا جینم بھی جو لا قانونیت کے خلاف آواز اٹھا سکتی تھی۔ انہوں نے ایک کے بعد دوسرے تھانے دیکھے ہوں گے اور صبح کے اخبارات میں یہ خبر دے دی ہوگی کہ پولیس نے کیسے اغوا کے انداز میں شاہ عالم کو گرفتار کیا اور پھر کہیں غائب کر دیا کیونکہ اسے لاہور کے کسی تھانے میں نہیں رکھا گیا ہے۔ خبر میں مطالبہ کیا گیا ہو گا کہ حکومت شاہ عالم کا آجاتا بتائے ورنہ اس معاملے میں عدالت عالیہ سے رجوع کیا جائے گا۔

یہ اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ مجھے اگلی صبح پولیس کی ایک گاڑی میں بٹھکڑی لگا کے مسلح نفری کے ساتھ تھانے لے جایا گیا اور میری گرفتاری کا اندراج کرشمہ تاریخ میں چوبیس گھنٹے قبل دکھایا گیا۔ انسپکٹر سلامت علی نے خاصی سرد مہری اور مایوسی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اگرچہ مجھے پیر سائیں کے ذریعے سبحان شاہ ہاؤس سے گھما کے لایا گیا تھا مگر اب میری غیر سرکاری حیثیت بدل گئی تھی۔ میں اب پیر سائیں کا معتبہ ظہم نہیں تھا۔ میں اپنی ذاتی حیثیت کے علاوہ سبحان شاہ ہاؤس کے معزز مہمان ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا چنانچہ تحقیق و تفتیش کے نام پر مجھے ہر عذاب دینے کی ساری حسرت باقی رہ گئی تھی اور اس عذاب سے نجات کے لیے لواحقین سے نذرانے وصول کرنے کی اور سرکاری مہمان خانے میں گھر جیسے آرام و آسائش کے اسباب فراہم کرنے کا

معاوضہ وصول کرنے کی آرزو بھی پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ جینم کے ایمار تھانے کے باہر موجود رہنے والے ایک رپورٹر نے میری تشریف آوری کے ساتھ ہی ایس ایچ او صاحب کو اپنی صورت دکھادی اور یہ خوش خبری بھی سنائی کہ اطلاع آگے سب کو پہنچادی گئی ہے کہ شاہ عالم کس تھانے میں ہے۔

انسپکٹر سلامت علی کا موڈ اور خراب ہو گیا "میں تھانے میں کسی صفائی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔" "کوئی صفائی بھی آپ کو تھانے میں دیکھنا نہیں چاہتا۔" رپورٹر نے بڑی عاجزی کے ساتھ اعتراف کیا۔ "لیکن اپنی اپنی پیشہ ورانہ مجبوریوں ہیں۔ نہ میں آپ کو تھانے سے نکال سکتا ہوں اور نہ آپ مجھے۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" سلامت علی زچ ہو کے بولا۔

"میں شاہ عالم سے ملنا چاہتا ہوں" رپورٹر نے کہا۔ میں اندر والے ایک کمرے میں بیٹھان کی بحث سنا رہا۔ مگر تھانا انچارج نے اس کی ایک نہیں سنی اور اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر مجھے عام حالات میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا تو وہاں رپورٹر بہ آسانی پہنچ جاتے چنانچہ ایس ایچ او نے مجھے تھانے کے مخفی حصے میں الگ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے ہتھکڑی بھی نہیں کھولی اور اس کی زنجیر کو ایک کھڑکی کی آہنی سلاخوں کے ساتھ لاک کر دیا۔

میرے احتجاج پر اس نے واضح کیا کہ میرے بارے میں افسران بالا کے احکامات کیا ہیں۔ شاہ عالم ایک خطرناک مجرم ہے جو غالی ہاتھوں سے بھی ہتھیار کا کام لیتا جانتا ہے۔ اسے کھلا بھڑونے کا خطرہ مول نہ لیا جائے" اسے جہاں بھی لے جایا جائے، مسلح نفری کے ساتھ لے جایا جائے اور اگر ظہم فرار کی کوشش کرے تو اسے بلا تامل گولی ماری جائے۔

مجھے کھڑکی کے قریب ہی ایک چارپائی دے دی گئی جس پر میں بیٹھ لیا۔ سنا سکتا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی کو ہتھکڑی نے جکڑ رکھا تھا لیکن میں اپنا دایاں ہاتھ استعمال کر سکتا تھا۔ ہتھکڑی سے منسلک زنجیر کوئی دو گز لمبی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی وہ ہاتھ روم تھا جو تھانا انچارج صاحب کے ذاتی استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ میں اس دروازے سے اندر داخل ہو کے اپنا بائیں ہاتھ باہر پھیلاتا تو اس قابل ہو سکتا تھا کہ ڈیڑھ سی بجھی استعمال کر سکوں۔ فوری طور پر میں کچھ بھی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

تھانا انچارج مجھے ایک ماتحت سب انسپکٹر کے سپرد کر کے چلا گیا تھا لیکن تھانے کے اندر کا ماحول میرے لیے سخت معاندانہ تھا کیونکہ میں نے اسی تھانے کے ایس آئی صابر علی کو جھوٹے الزام میں گرفتار کر دیا تھا اور وہ عملاً آزاد ہونے کے باوجود حوالات میں بند تھا۔ کم سے کم روزنامے کا اندراج یہی ظاہر کرتا تھا۔

لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک رپورٹر مجھے تھانے میں دیکھ گیا تھا اور اس نے خبر آگے بھی پہنچادی تھی۔ اب اس بات کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ شاہ عالم کے سیاسی کارکن یا دوست اس سے ملاقات کے لیے جوق در جوق چلے آئیں مگر میرے اپنے دوستوں میں سے رئیس کا فرید عباسی کا اور جینم کا آتا ہی نہیں تھا۔

صابر علی دس منٹ بعد کہیں سے گھومتا پھرتا نمودار ہوا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔ "آگیا تو۔" "اس نے مجھے ایک گالی دے کے کہا" اب دیکھ تیرا کیا حشر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "پیار محبت کی باتیں اتنی دور سے مزہ نہیں دیتیں۔ ذرا قریب آکے فرماؤ جو فرماتا ہے۔ میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔"

"کھول دیں گے کان کے سوراخ بھی" وہ بولا "سارے سوراخ کھول دیں گے آج ہی۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "سب انسپکٹر صابر علی۔ کل میں نے پیر سبحان شاہ سے بات چیت میں یہ بتادیا تھا کہ تمہارے ساتھ جو بھی ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔"

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا "اب کیا فائدہ افسوس کا؟" میں نے کہا "تم میرے ساتھ ذاتی دشمنی کر کے میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اپنے پاؤں پر کھڑی مت مارو۔ میں ایک سیاست داں ہوں اور اس ملک کی سیاست میں سب سے بڑا کردار پیسے کا ہے۔ وہ بھی بہت ہے میرے پاس۔ تمہارے خلاف مقدمہ تو دبائے والے دیباہی دیں گے تو کڑی نہ ملے تو میرے پاس آجائے۔ میں تمہیں دگنی تنخواہ پر ملازم رکھ لوں گا۔"

شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسے اپنی اور میری اوقات کے فرق کا اندازہ بھی ہو گیا اور یہ بھی کہ اس نے میرے ساتھ عام مجرموں والا سلوک کیا تو وہ نقصان اٹھائے گا۔ وہ کچھ کہے بغیر پلٹ کے چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد تھانے میں پہلا ٹیلی فون موصول

ہو گیا "یہ ایس ایس ڈی شکت علی حٹے نے کیا تھا۔ ڈیوٹی افسر تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ "سرجی" آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" میں نے کہا "کیا تھانے میں مجرموں کو ان کی ضروریات کے مطابق ہر چیز فراہم کرنے کا انتظام ہے؟"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک لٹکا "وہ جی" اپنے ایس ایس ڈی صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ کا خیال رکھا جائے۔ ہماری تو جناب کوئی خطا نہیں۔ ہم جو کرتے ہیں قانون کے مطابق کرتے ہیں۔ آپ ناراض مت ہونا۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے چائے لا دو۔" آدھے گھنٹے بعد فرید عباسی اور جینم ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ ایس ایچ او صاحب گشت پر گئے ہوئے تھے چنانچہ ڈیوٹی افسر بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے ان دونوں کو انچارج صاحب کے کمرے میں بٹھایا اور خود موبائل کے دائرہ میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "جناب ہماری مجبوری کا بھی خیال کریں۔ ہم تھانا انچارج صاحب کے آؤر کے خلاف نہیں جاسکتے۔"

دیکھتے دیکھتے صورت حال تبدیل ہو گئی۔ جینم نے تھانے میں بیٹھنے بیٹھنے دو فون کیے اور دس منٹ میں تھانا انچارج صاحب گشت سے لوٹ آئے۔ چند منٹ بعد فرید عباسی اور جینم نے اس کمرے میں قدم رکھا جو میرے لیے خصوصی حوالات کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ وہاں بیٹھنے کے لیے وہی ایک چارپائی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ فرید عباسی نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا "اس پر دستخط کرو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟" "تیرا وکالت نامہ" فرید عباسی بولا "اب سارے مقدمات کی سماعت پھر شروع ہوگی۔"

جینم نے مایوسی سے کہا "تمہارا وکالت پالے کا پروگرام تو رہ گیا۔"

میں نے کہا "کچھ عرصے کے لیے مؤخر ضرور ہو گیا ہے مگر بدلا نہیں۔"

فرید عباسی نے کہا "ایک لفظ فہمی میں دور کردوں۔ فی الحال تیری رہائی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کوئی بھی عدالت کسی مفروضہ مجرم کی دوبارہ گرفتاری کے بعد اس کی ضمانت پر رہائی منظور نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "ویل صاحب! جو ایک بار فرار ہو گیا ہو، کیا وہ دوبارہ فرار نہیں ہو سکتا؟"

فرید نے پلٹ کے دیکھا "تھانے میں بیٹھ کے ایسی بات

بالکل نہیں کرنی چاہیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

نیل نے کہا ”مجھے ذرا سی دیر ہوگئی نکلنے میں۔“
فرید بولا ”میں نے تو دو دن پہلے بتا دیا تھا تجھے یار کہ تیرے خلاف ہزار مقدمات ہیں۔ مزید یہ کہ آپ کی واپس بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اخبارات میں اتنا دھول مٹا جا رہا تھا گرفتاری تو حقیقی تھی۔“
میں نے جھٹم سے کہا ”تم نے واقعی مجھے بہت سپورٹ کیا۔“

”اس سپورٹ سے کیا فائدہ ہوا؟“ وہ بولی۔
”یہ فائدہ کیا کہ ہم نے سیاسی حیثیت کچھ نہ ہونے کے باوجود تم نے مجھے ایک وی آئی بی بنا دیا اور میرا بھرم باقی رہا ورنہ شاہ عالم واپس آتا تو شاید یہ کوئی خبر بھی نہ بنی۔“ میں نے کہا ”اس وقت جو سلوک میرے ساتھ پولیس کی تحویل میں ہو رہا ہے صرف اس لیے اچھا ہے کہ پولیس میرے ساتھ ہے۔“

جھٹم نے اپنے بیگ سے دو کانڈ نکالے ”مجھے تم سے کرائے ناموں پر بھی دستخط کرانے تھے۔“
”یہ کس چیز کے کرائے نامے ہیں؟“
وہ بولی ”ایک تو تمہارا آفس ہے اس پر تم ناصر عظیم کے دستخط کو گے اور میں دن پہلے کی تاریخ ڈالو گے۔ دوسرا اسی آفس کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ ہے۔ دونوں ایک دوواڑے کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں مگر کرائے نامے کی رو سے الگ ہیں۔“

میں نے دونوں پر دستخط کر دیے تو جھٹم نے انیس اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ فرید عباسی مجھ سے گزرتے ہوئے دو دنوں کی تفصیل جانتا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے اغوا سے تھانے میں لائے جانے تک تمام واقعات کی مفصل رپورٹ دی۔

پھر میں نے پوچھا ”رئیس کہاں ہے؟“
”ابھی آجائے گا“ فرید نے کہا ”نیلیم تمہاری گرفتاری کی خبر سے بہت آپ سیٹ تھی۔ اس نے رئیس سے کہا کہ تمہاری بیوی کے لیے وکیلوں کا پورا بیل ہونا چاہیے جس میں لاہور کے سینئر وکلاء ہوں۔ رئیس نے مجھ سے کہا تو میں نے نیلیم سے بات کی اور اسے تسلی دی کہ احمد اینڈ کمپنی فوجداری مقدمات میں خصوصی شہرت رکھتی ہے اور احمد صاحب کا شمار سینئر ترین وکلاء میں ہوتا ہے شاہ عالم پر قتل

کے دو مقدمات ہیں جن میں سے ایک تو شاید پہلی دوسری پیشی میں ختم ہو جائے گا کیونکہ خالد عثمان اور خادم مرزا کے دھبے قتل کا الزام ان کے زندہ سلامت پائے جانے کے بعد بے معنی ہو گیا ہے۔ دوسرے کیس میں شاہ عالم پر اپنے ایک پرانے ساتھی عمود راؤ کو زہر دے کر قتل کرنے کا الزام ہے مگر یہ بھی بہت کمزور کیس ہے۔ ہم شاہ عالم کو باعزت طور پر بری کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس کا ساعت عمل ہونے سے پہلے فرار ہو کے برطانیہ جانے کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ وہ دو سال بعد واپس آیا ہے ظاہر ہے عدالت اس کا بہت سیریس نوٹس لے گی اور اس میں تین سال تک جیل ہو سکتی ہے۔“

”تو نے یہ نیلیم کو بتا دیا؟“
”اسے پہلے سے معلوم تھا“ فرید عباسی بولا ”وہ بے وقوف نہیں ہے اس کے علاوہ ذاتی قانونی معاملات کے لیے اس کا بھی ایک وکیل ہے وہ نیلیم کو قانونی پوزیشن بتا چکا تھا۔“
میں نے کہا ”اگر قتل کے مقدمات ختم ہو جائے ہیں تو کیا اس کے بعد بھی میری ضمانت پر رہائی کا کوئی امکان نہیں؟“

فرید نے نفی میں سر ہلایا ”دراصل ہمارے پاس کوئی مجبوری کا عذر نہیں۔ فرض کر، کسی کو اپنے علاج کے لیے یا بیوی بچوں کا علاج کرانے کے لیے جانا پڑتا ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اسے عدالت سے اجازت ملنے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ مجبوراً بلا اجازت چلا گیا۔ اور عدالت سے درخواست کر سکتا ہے کہ مجبوری کی اس غلطی کو معاف کر دے یا کسی کو جان کا خطرہ تھا۔ کوئی بے کے کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ کوئی جھوٹی جی کمانی سنا دے تو ممکن ہے عدالت رحم دلانہ نقطہ نظر اختیار کرے مگر شاہ عالم کے پاس لندن جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے وہاں دو سال رہا۔“

”شاید اس کا رہا؟“ جھٹم بولی۔
”ہاں۔ اور یہ سب خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں۔ ایسی صورت میں عدالت کیسے چھوڑے گی؟“

میں نے کہا ”میری زندگی تو خطرے میں تھی۔“
”یہ سب آف دی ریکارڈ ہے۔“ فرید عباسی نے کہا ”اگر شاہ عالم یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی جان کا خطرہ ہے تو اس پر لازم تھا کہ یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر لانا اور درخواست کرنا کہ اس کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ عام طور پر ایسی درخواست کے جواب میں پولیس ہر ظلم کو حفاظتی تحویل میں لے لیتی ہے۔ شاہ عالم ایک سیاست دان تھا اور

اس کو خطرہ مقدمے کے کسی فریق سے لاحق نہیں تھا۔ اپنے سیاسی حریفوں سے تھا۔ شاہ عالم عدالت میں کسی کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن اس بات کا امکان تھا کہ اسے پولیس گارڈ مل جائے مگر وہ عدالت کو کچھ بتائے بغیر بھاگ کے لندن چلا گیا تھا۔ اب وہ عدالت سے کسی رعایت کی امید کیسے رکھ سکتا ہے۔“

ہم ویسے تو کمرے میں آزادانہ گفتگو کر رہے تھے لیکن باہر دوسرے کمرے میں ایس ایچ او صاحب بغیر بغیر موجود تھے اور تھانے کے انتظامی امور میں مصروف ہونے کے باوجود ہماری طرف سے بے خبری گزرتی تھی۔ اس کمرے کی لمبائی چوڑائی مشکل سے دس فٹ ہوگی اور یہ کمرے سے زیادہ ایک اسٹور لگتا تھا۔ اس کمرے سے باہر جانے کا واحد راستہ تھا انچارج کے کمرے سے تھا۔ کھڑی صرف ایک تھی اور اس میں ناقابل شکست قسم کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہاتھ روم میں کوئی روشن دان تک نہیں تھا جس سے کوئی باہر نکل کے فرار ہو جائے۔ انسپٹر سلامت علی خود بھی مسلح تھا اور جب تک وہ کمرے میں موجود رہتا تھا ایک مسلح محافظ باہر والے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔ چنانچہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

ایک گھنٹے بعد سلامت علی کا حوصلہ بالا خرجواب دے گیا۔ اس نے اندر آ کے طرہ انداز میں فرید سے سوال کیا۔ ”نیلیم صاحب! ایک وکالت نامے پر دستخط کرانے میں آخر کتنا وقت لگتا ہے؟“
فرید نے کہا ”مجھے اپنے منوکل سے قانونی مشورہ بھی کرنا تھا۔“

”مس جھٹم! آپ بے شک صحافی ہیں اور ہم بڑی عزت کرتے ہیں آپ کی۔ لیکن کچھ ہماری نوکری کا بھی خیال رکھو۔ قانونی طور پر آپ کو ظرم سے ملاقات کی اجازت دینے کا میرے پاس کوئی اختیار نہیں۔“
”ہاں۔ قانونی طور پر“ جھٹم نے اس سے اتفاق کیا۔ ”غیر قانونی طور پر تم اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کر سکتے ہو۔ اور کرتے ہو؟“ اس کی کوئی حد نہیں۔ پھر بھی تمہارا شکریہ ادا نہ کرنا بد اخلاقی ہوگی۔“

وہ بولا ”دیکھو جی، شکر ہے کہ کوئی دفعہ کرو۔ بس کسی کو معلوم نہ ہو کہ تھانا انچارج میاں بیٹھا جھک مار رہا تھا اور اندر وکیل صحافی سب جمع تھے۔“
ابھی انہیں گئے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے تھے

کہ رئیس نمودار ہو گیا۔ ”تھانے دار صاحب! سلام! لیکن اس نے عادت کیا۔“

”کون ہو تم؟“ تھانے دار نے اسے غور سے دیکھا ”تم کو میں نے پہلے ہی دیکھا ہے۔“
”جناب عالی! رئیس ہے میرا نام لیکن بندہ بڑا غریب سا ہوں۔“ رئیس نے کہا ”خیر سے پولیس میں اپنی اچھی صاحب سلامت ہے۔ آپ جیسے مہربان بہت ہیں۔“

”کام بتاؤ اپنا؟“ سلامت علی نے رکھائی سے کہا۔
”سرمی۔ اپنا پاس آپ کا مسلمان ہے۔“
سلامت علی نے پوچھا ”پاس۔ کون پاس؟“
”شاہ عالم میں ان کا سیکرٹری ہوں۔“
تھانے دار نے کہا ”اوئے رئیس اعظم! یہ پکڑ کیا ہے آخر۔ میں نے تو کچھ اور سنا تھا۔ کہ تم اس فلموں کی ہیروئن نیلیم کے سیکرٹری ہو اور تمہارا کچھ چکر ہے اس کے ساتھ؟“
رئیس نے اپنی عاجزی والی اداکاری جاری رکھی ”مائی باپ یہ اخبار والے ایسے ہی اڑاتے رہتے ہیں جھوٹ بچ۔“
تھانے دار نے کہا ”شاہ عالم حراست میں ہے۔ تم اس سے نہیں مل سکتے۔“

رئیس ہنسنے لگا ”سرمی! ملاقات کی اجازت دینے کا اختیار بھی آپ کے پاس ہے۔ ہم تو بس خدمت گزار ہیں۔“
سلامت شاہ کچھ نرم پڑا ”اوئے کتنی خدمت کر سکتے ہو؟“ ”سرکار! آپ کی توقع سے کہیں زیادہ۔ لیکن پاس پر کوئی باندھی نہیں ہوئی چاہیے۔ وہ جس سے چاہے لے گھر سے بستر اور کھانا منگوالے۔“

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انسپٹر سلامت علی نے کہا۔ ”کتکتے ہیں؟“
”پورے دس عالی جاہ!“ رئیس نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس نے لٹافے میں دس ہزار روپے ڈال کے تھانا انچارج کو تھما دیے ہیں۔

ایک منٹ بعد وہ دروازے میں نمودار ہوا اور قریب آ کے مجھ سے لپٹ گیا۔ ”کیا حال ہے تیرا پیارے۔ قسم اللہ کی دو دن مایہ بے تاب کی طرح تیرے گزارے ہیں۔“
میں نے اسے بے تکلفی سے ایک مکار سید کیا ”مایہ بے آب جاہلی کی اولاد۔“

”ابے رہنے دے اپنی اقلاطونیت۔ تجھے کیا پتا ہم سب کی بے مائی کا۔“ رئیس میرے پاس بیٹھ گیا ”وہ تو میں نے

روکے رکھا نیلم کو ورنہ وہ پتا نہیں کس کس سے بات کرتی۔“

میں نے کہا ”یہ تو نے بڑا اچھا کیا۔ نیلم کا کیا تعلق شاہ عالم سے؟“

”میں نے تو یارے جھوٹ بول دیا قسم کھا کے اللہ معاف کرے مگر اس کے بغیر گزارا کہاں تھا۔ نیلم کو قاتل کیا بڑی مشکل سے کہ تو نے فون کیا تھا کہیں سے اور یہ کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ کہنے لگی کہ ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کھاؤ میری قسم!“ تو یارے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا اس نے مجھے یار اس میں تو کوئی غلط بات نہیں ہو سکتی؟ مگر میں نیلم کو بچانے کے لیے اس کی جھوٹی قسم کھاؤں؟“

میں نے کہا ”میں کوئی مفتی تو ہوں نہیں مگر میرا خیال ہے کہ آدمی کی نیت ٹھیک ہو تو معاف کرنے والا اللہ ہے۔“

”اس کے بعد مجھے بڑی ایکنگ کرنی پڑی۔ میں یہ ظاہر کر رہا جیسے اب میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔ نیلم پوچھتی رہی کہ فون کس وقت آیا تھا میں کہاں بھی ”تم نے ریسپو کیا تھا؟ ناصر۔ شاہ عالم کی آواز سے کیا لگ رہا تھا؟ وہ واقعی ٹھیک ہے یا کوئی زبردستی اس سے یہ کہتا رہا تھا؟ آخر اس نے بتایا کیوں نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ بس یار اس کے سوال تھے اور اپنے جھوٹ ایک جھوٹ کو بھانسنے کے لیے بولے سو جھوٹ۔ پھر بھی آخر میں پھنسا ہوا ہی گیا۔ میں نے کہا کہ غیب کا علم نہیں ہے میرے پاس۔ اتنا ہی بتا سکتا ہوں میں بتنا شاہ عالم نے بتایا۔ میرا داغ مت کھاؤ۔ بس یار اس کے بعد وہ آگئی عورت ذات کے ہتھیاروں پر۔ رونے لگی سالی!“

میں نے کہا ”گالی مت دے اسے میرے سامنے۔“

”اے یار۔ پرانی عادت ہے؟“ وہ خفیف ہو کے بولا۔

”نیلم نے چھڑادی ہے مگر پھر بھی زبان بھک جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”قرنے اور چنڈا نے بھی تو پوچھا ہوگا؟“

”وہاں میں خود چلا گیا تھا کل۔ وہ جو تیری بہن ہے نا۔ وہ تو بالکل ہی پاگل ہے۔ دو روکے برا حال کر لیا تھا اس نے اپنا۔ میں نے چاکلیٹ کا ڈبا دیا تو ایسے چلائے لگی جیسے اس کے مرحوم بھائی کی کوئی شافی سامنے رکھ دی ہو۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھا یا کہ سب ٹھیک ہے مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اس کے شو پر ڈاکٹر صاحب نے بھی کوشش کی مگر یار وہ لڑکی بہت ہی جذباتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تو اس سے خود بات کر لے تاکہ اسے تسلی ہو جائے۔ میرا اپنا تو یہی خیال تھا کہ یہ کام ہے پولیس کا۔ وہ مجھے اٹھا کے لے گئے۔“

”آپ کا خیال غلط تھا سیکرٹری صاحب!“

اس کی شکل ہونٹوں والی ہو گئی ”اے غلط کیسے تھا؟“

میں نے کہا ”مجھے پیر سبحان شاہ نے اغویا تھا۔“

چند منٹ رہیں کو پیر سائیں کی مسمانی کا حال سنانے میں لگے۔ رہیں منہ کھولے ستا رہا اور اپنے انداز میں تبصرے بھی جاری کر رہا۔

”میری گھوڑا صی اس لیے ہو گئی کہ میں نے پیر سائیں کو کاروباری اشتراک کی پیش کش کر دی تھی۔ یہ اس نے اپنے کانوں سے سن لیا تھا کہ رب نواز کے ساتھ میرے تعلقات ختم ہو گئے“ میں نے کہا۔

”چل یار۔ سب ٹھیک ہو گیا“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا ”ٹھیک کہاں سب چھوٹ ہو گیا۔ میرا کیا پروگرام تھا لیکن فی الحال تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے شاہ عالم بن کے ہی رہنا پڑے گا۔“

”تھوڑے دن کی بات ہے یار!“

”عدالتی معاملات اتنی جلد ہی ختم نہیں ہوں گے رہیں۔ اور مجھے فرید بتا گیا ہے کہ قتل کے الزام سے چاہے میں بری ہو جاؤں۔ مگر میں جو لندن چلا گیا تھا۔ ضمانت پر رہائی کے دوران وہ جرم ناقابل معافی ہے۔“

”اس میں کیا ہوگا۔ تو معافی مانگ لینا۔“

میں نے کہا ”ایسے معافی مانگنے سے معافی ملتی تو لوگ ہر جرم کے بعد سو بار معافی مانگ لیتے۔ اب تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

میں نے چٹکی بجا کے کہا ”پھر رو۔!“

رہیں کی سمجھ میں میری بات آہستہ آہستہ آئی۔ اس نے سر ہٹا کے میرے خیال کی تائید کی ”بالکل ٹھیک۔ مگر۔“

”یہاں اگر مگر کچھ نہیں۔ پھر بات کریں گے۔ مجھے یہ بتا کہ ہوٹل سے میرا سامان اٹھایا تھا تو نے۔“

”ہاں۔ اور نیلم کے گھر پہنچا رہا۔“

”اس میں ایک چیز بھی چنڈا کے لیے“ میں نے کہا۔

”وہ تو اپنا یار جیرا بلینے لے گیا تھا۔ جب میں چنڈا سے ملنے گیا تھا کمال ہسپتال۔ تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اسے بتاتا جا سکتا تھا بتا دیا۔ باقی تو خود بتا دینا۔ اس کی بڑی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ میں تو سمجھا کہ سکتہ ہو گیا۔ پلک جھپکائے بغیر دیوار کو گھور رہی تھی۔“

میں نے کہا ”باب کی یاد آ رہی ہوگی۔“

”ہاں۔ مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے جج بتا دو۔ میں قمر نہیں

ہوں۔ میں نے کہا کہ قمر سے کیا جھوٹ بولا ہے میں نے اس نے بڑا کنٹرول کیا خود کو لیکن پھر بھی آنسو نہ روک سکی۔ پھر کہنے لگی کہ یہ ناصر بڑا جھوٹا آدمی ہے۔ اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم سے کیا جھوٹ بونا اس نے۔ اس پر کہنے لگی کہ تم دوست ہو اس کے تم بھی جھوٹ بولتے ہو گے۔ میں نے پوچھا کہ آخر کچھ بتاؤ کیا بات جھوٹ لگی تھیں۔ وہ بولی کہ ابھی کیا کہوں لیکن تم دیکھ لینا۔ جب وہ لوٹ کے آئے گا تو یہ جملے گا کہ جج کچھ اور تھا۔ مجھے اور قمر کو مطمئن رکھنے کے لیے تم کہہ رہے ہو کہ وہ ٹھیک ہے۔ تم سارے مرد آپس میں مل جاتے ہو۔ عورتوں سے حقیقت چھپا لیتے ہو۔“

میں نے کہا ”ایسا کہا اس نے؟“

”ہاں یار۔ میں تو لا جواب ہو گیا تھا قسم اللہ کی۔ لیکن جھٹائی سے اپنی بات پر اڑا رہا۔ زیورات پر تو اس نے ایک نظر ڈال کے ایسے ایک طرف رکھ دیے تھے جیسے ٹکلی ہوں۔ ایک کلو سے زیادہ ہی وزن ہو گا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ پاگل تو خیر ہیں یہ سب۔ قمر اور چنڈا اور نیمہ۔ اور وہاں لندن میں ایک بیٹی ہے۔ بس ایک خچم کچھ ٹھیک ہے مگر اس کا باپ لگی ہیں دو سڑا ہے۔“

میں نے کہا ”بھئی کو کچھ مت بتانا۔ اگر اس کا فون آئے کہہ دینا کہ پرانے مقدمات میں گرفتار کیا ہے۔ ضمانت ہو جائے گی۔ مقدمات ہیں تو کچھ بھی نہیں۔ جلد ختم ہو جائیں گے۔ وہ بھی کم جذباتی لڑکی نہیں ہے۔ اور اکیلی ہے سب سے دور تو ہر بات کو زیادہ ہی محسوس کرتی ہے۔ یہاں سب کو سمجھانا کہ مجھ سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں۔ شاہ عالم کا کسی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ نہ چنڈا سے نہ قمر سے۔ نہ نیلم سے اور نہ ڈاکٹر کمال سے۔ مجھ سے خچم کا یا فرید عباسی کا رابطہ رہے یا تیرا کوئی شک کی بات نہیں۔“

تھانے میں میرا پلا دن بہت سیر آ رہا۔ اگرچہ مجھے پیر سائیں کے سمان کا درجہ حاصل تھا مگر صرف یہ اعزاز مجھے کوئی رعایت دلانے کے لیے نکالی تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں زبردستی کی تفتیش کے عذاب سے بچ جاتا لیکن حالات میں بند رہنے کی اذیت سے چھٹکارا صرف رہیں کی کوشش سے ملا تھا۔ دس ہزار روپے میں مجھے حالات کے قیدیوں سے الگ ایک کمرے میں رہنے کی اجازت حاصل ہو گئی تھی جہاں میرا اپنا بستر تھا اور میں اپنی مرضی سے اپنا پیسہ خرچ کر کے کھانا یا چائے بھی منگوا سکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تھانہ

انچارج کا دس ہزار روپے لینے والا ہاتھ ہفتے بھر بعد پھر کھل جائے گا اور مراعات کے تسلسل کے لیے ہفت واری نذرانے کو جاری رکھنا ضروری ہو گا۔

تاہم تمام دستیاب یا قابل خرید سولتوں کے باوجود قید کی اذیت اپنی جگہ تھی۔ انسپکٹر سلامت علی کسی یقین دہانی پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میرے ایک ہاتھ سے جھکڑی کھول دی جائے تو میں سارے تھانے کو ناک آؤٹ کر کے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس معاملے میں تھانے دار کا موقف بہت واضح تھا۔ ”میرے پاس فالو غری تو ہے نہیں کہ ایک مسلح کانسٹیبل کو چوبیس گھنٹے شاہ جی کی نگرانی

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیرنگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ
- آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے
- ”خفیہ ہاتھ“ کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ کی پاکستان
- میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گدھوں کی طرح نوپنے
- والے سیاست دانوں کی شرمناک داستان
- اسے لکھا ہے ش۔ راجے کشتال سے طلب فرمائیں

کے لیے کھڑا کروں۔ اور سچی بات ہے کہ گھرائی کرنے والے کی نظر بھی چوک جاتی ہے۔ یہ تو ایک منٹ میں اس سے بدوقت بھی چھین لیں گے۔ اب بھی ان کی مرضی میں ہتھکڑی کھول کے انہیں حوالات میں کھلا چھوڑ دیتا ہوں۔ یا ان کا اپنا کمرہ اور بستر ہے۔ یہاں رہیں مرنے سے۔ ایک ہاتھ کو فرض کر لیں کہ ہے ہی نہیں۔

اس جسمانی تکلیف کے ساتھ تھانے کے ماحول کی ذہنی اذیت بھی۔ سلامت علی دن میں کئی بار آتا جاتا تھا۔ اس نے دروازے کے باہر کھڑے ہونے والے سنتری کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہ جائے اسے شاید یہ ڈر تھا کہ کہیں میں ہتھکڑی کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخیں یا کھڑکی توڑ کے آزاد نہ ہو جاؤں۔ ہر بار آتے ہی وہ ایک نظر اندر جھانک کے ضرور دیکھتا تھا کہ میں موجود ہوں یا خالی چارپائی مع ہتھکڑی موجود ہے اور میں غائب ہوں۔

تھانے کے اندر کی ساری آوازیں مجھ تک صاف پہنچتی تھیں۔ دن بھر میں جتنے مجرم پکڑے گئے، ان کا استقبال بڑے زور شور سے ہوتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ آنے والے فریاد و فغان کرتے تھے اور اس کے بعد سودے بازی کا عمل شروع ہوتا تھا۔ کالج میں پڑھنے والا ایک لڑکا نوٹس سینٹر سے واپس گھر جاتے ہوئے بد قسمتی کا شکار ہو گیا۔ وہ جس بسی میں سفر کر رہا تھا اس میں کسی جیب کمرے نے ہاتھ کی صفائی دکھادی مگر جس کی جیب صاف ہوئی تھی اسے پتا چل گیا کہ جیب بکلی ہو چکی ہے۔ اس نے شور مچا دیا۔ جیب کترے نے پکڑے جانے کے ڈر سے بڑا اس کالج کے لڑکے کی جیب میں ڈال دیا۔ جب تلاشی شروع ہوئی تو اصل مجرم پکڑا گیا اور وہ لڑکا پکڑا گیا جس کی جیب سے بڑا برآمد ہوا تھا۔ لوگ اسے پکڑ کے تھانے لے آئے۔ تھانے والے بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ مجرم کو صورت سے بھی پہچان لیتے ہیں خصوصاً جب کترے تو اپنی انگلیوں کی ساخت اور حتی سے بھی پہچان لے جاتے ہیں۔ تھانے والوں نے دیکھ لیا ہو گا کہ وہ سیدھا سادہ شریف لڑکا ہے مگر اس کے گھر والوں کے آنے سے پہلے تفتیش کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ گھروالوں نے سخت احتجاج کیا اور ثبوت پیش کیے کہ وہ تھوڑا سا طالب علم ہے۔ اور وہ شریف لوگ ہیں مگر تھانے میں خالی خولی شرافت کی سند کہاں چلتی ہے۔ لڑکے کو رہا نہیں کیا گیا اور اتنا مارا گیا کہ اسے خون کی التلیاں ہونے لگیں۔ اب گھر والے روئے بیٹے لگے اور ہاتھ پیر جوڑنے لگے۔ اس کے بعد رہائی کے لیے مذاکرات شروع ہوئے اور بالآخر گھر والے اپنی عزت اور لڑکے کی جان کی

قیمت ادا کر کے اسے گھر لے گئے۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں تھا۔ ایک جگہ ہم کا دھماکا ہوا۔ اصل مجرم تو پہلے ہی جانے واردات سے فرار ہو چکے تھے۔ بے وقوفوں کی طرح وہاں کھڑے ہو کے تماشا دیکھنے والے پکڑے گئے۔ پولیس نے پندرہ میں آدی شے میں اٹھا لیے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی بے گناہی کی قیمت ادا کر کے گھر گیا۔ ان پکڑے جانے والوں میں بعض اوقات ایسے لاوارث بے گھر بھی دھر لیے جاتے ہیں جن کو چھڑانے کوئی نہیں آتا۔ وہ محاورے کے مطابق حامد کی پکڑی محمود کے سر رکھنے میں کام آتے ہیں۔ دوسروں کے جرائم ان کے سر ڈال دیے جاتے ہیں اور وہ مبینوں بعض اوقات برسوں تھانے یا جیل میں پیشی کے ہتھکڑے سڑتے رہتے ہیں۔ نہ وہ خود اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی دیکھ کر ٹھیک نہ کوئی اور ان کی رہائی کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔

شام تک اس ماحول میں میری طبیعت بیزار ہو گئی لیکن میری رہائی کسی قیمت پر ممکن نہیں تھی ورنہ میں ایک لاکھ تو کیا ایک کروڑ بھی لے آتا۔ رات ہوئی تو کمرے میں اندھیرا چھلنے لگا۔ کمرے کا بلب فیوز ہو چکا تھا اور تھانے میں کوئی بھی اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے بلب لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جب میں نے پیسے دیے تو کسی نے لاکے بلب لگا دیا۔ میں نے بازار سے چائے منگوا کے پی تو اس خدمت کا معاوضہ الگ دیا۔ دراصل وہ بڑے تھانے دار صاحب تو محاورے کے مطابق شیر کا حصہ لے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ پھر شکار رہ جاتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کی مخلوق کے لیے۔ تھانے کا عمل سارا دن پرجوش فروشی کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کا معاوضہ وصول کر کے اپنا خرچ پورا کرتا ہے۔ رپورٹ لکھوائی ہے، رپورٹ کی نقل چاہیے۔ ملاقات کرنی ہے۔ کھانا منگوانا ہے، پکڑے بدلنے ہیں۔ رفع حاجت کے لیے جانا ہے۔ پیسے نکالو، قدم قدم پر دس بیس سو پچاس خرچ کرنے ہی پڑتے ہیں۔

رات کو رہیں پھر آیا۔ وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا پھر ختم آئی۔ اس نے اپنے طور پر پولیس کے اعلیٰ افسران سے بات کی تھی اور انہوں نے کہا ضرور تھا کہ وہ میرے ہاتھ کو ہتھکڑی سے آزاد کرادیں گے لیکن ایس ایچ او سلامت علی نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا کہ ملزم خطرناک ہے۔ جو ڈو کرائے جاتا ہے۔ پہلے بھی دو سال سفور رہا ہے۔ اگر پھر بارودا کر کے نکل گیا تو میری نوکری پر حرف آئے گا۔ نتیجہ یہ کہ ہتھکڑی اپنی جگہ پر رہی۔

ختم نے مجھے تسلی دی، ”کل تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے

پیش کر دیا جائے گا۔“

میں نے کہا ”اس سے مجھے کیا فائدہ ہو گا۔ پولیس ریمانڈ دے گی۔“

”وہ پولیس کی مجبوری ہے۔ انہیں ظاہر تو کرنا ہے کہ وہ تفتیش کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا ”تفتیش تو پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی۔“

”تمہارا یہ جرم اضافی ہے کہ تم سماعت کے دوران میں نہایت قوی کے فرار ہو گئے تھے“ ختم بولی۔

میں نے کہا ”اس میں تفتیش والی کون سی بات ہے۔ میں تو مان رہا ہوں کہ ہاں میں بھاگ گیا تھا اپنی جان بچ کے۔“

اس نے کہا ”پولیس کو بھی خانہ چوری کی تفتیش کرنی ہوتی ہے۔ وہ تمہارا بیان ٹھیک گئے کہ کیوں فرار ہوئے تھے۔ فرار ہو کے کہاں رو پش رہے تم ذرا ہمت سے کام لو۔“

میں نے کہا ”ہمت سے کیا ہو گا۔ ریمانڈ تو پولیس کو مل ہی جائے گا اور ضمانت پر رہائی ہوگی نہیں۔“

”میں کو شش کر رہی ہوں کہ سرکاری وکیل سے بات ہو جائے اور ضمانت منظور ہونے کی کوئی صورت نکل آئے۔ ضمانت کی رقم دینی ہو جائے، ہم ایک کے بجائے دو افراد کی شخصی ضمانت بھی فراہم کر دیں گے۔ لیکن اس کے بعد ختمیں عدالت کا فیصلہ ہونے تک شاہ عالم ہی رہنا پڑے گا۔“

”اس میں تو برسوں لگ جائیں گے۔“

”نہیں یار۔ پولیس ابھی ایک ہفتے کا ریمانڈ لیتا چاہے۔ ہم کو شش کریں گے صرف تین دن کا ریمانڈ ملے۔ آج شہریت کا پتا چل جائے گا۔ ممکن ہے اس سے بات ہو جائے۔ قانونی طور پر وہ تمہاری ضمانت منظور نہیں کر سکتا۔ میں وہ تمہیں رہا کر دے تو اسے کون پوچھ سکتا ہے۔ فرید مہی نے بتایا ہے کہ ضمانت پر رہائی کا اختیار اسے ڈی جے کے پاس ہے۔“

میں نے کہا ”یہ اسے ڈی جے کون صاحب ہیں؟“

”ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج۔ ایک دو بج ایسے ہیں جن کی ریویشن اچھی نہیں ہے۔ وہ تمہاری پھر ضمانت پر رہائی کا حکم صادر کر سکتے ہیں۔ وہ پوری طرح با اختیار ہیں۔“

ختم نے ان حالات میں ہائی کورٹ بھی ضمانت پر رہائی کا حکم سن دیا مگر اسے ڈی جے کے اختیارات کو صرف سرکاری وکیل چیلنج کر سکتا ہے کہ عدالت نے ضمانت منظور کر کے غلطی کی ہے اور ہائی کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے کہ ضمانت منسوخ نہ کی جائے مگر ہم سرکاری وکیل کو راضی کر لیں گے کہ وہ اسے

نے کوشش کی کہ آنکھیں بند کر کے کسی طرح خنجر کو بلا لوں مگر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا نا انچارج کے کمرے میں دن بھر کے مقدمات پیش کیے جا رہے تھے اور فیصلے ہو رہے تھے۔ گالی گولج اور مار پیٹ کی آوازیں آ رہی تھیں اور سودے ہو رہے تھے۔

رات کا وقت ہر تھانے میں بڑی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ پولیس چھاپے باری ہے اور ہر قسم کے مجرم پولیس موبائل میں بھر بھر کے تھانے لائے جاتے ہیں۔ تھانا انچارج جو دن بھر "گشت" پر رہتے ہیں، مقدمات کی سماعت کے لیے دستیاب ہوتے ہیں۔ پولیس کے خبر نامی کارکردگی کی رپورٹ لاتے ہیں اور پرانے لمز ان سے تفتیش کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

ایسے دشت ناگ ماحول میں کون سو سکتا تھا۔ میں بھی کروٹیں بدلتا رہا اور بار بار سے آنے والی آوازوں سے بھاگ کر نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی ناکام کوشش میں مصروف رہا۔ بالآخر صبح کے تھار سلاخوں والی گھڑی کے باہر سفیدی کی صورت میں عیاں ہونے لگے۔ مجھے فیض کی نظم "زندگیاں کی ایک صبح" یاد آئی اور یہ شعر "رات باقی بھی ابھی جب سربالیں اگر چاند نہ مجھ سے کہا جاگ سحر آتی ہے"۔

قریب ہونے کے باوجود سحر بہت دور تھی۔ میں بوجھل آنکھوں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا جو میری دسترس میں آسکے نکل گیا تھا۔ اگر اس روز میں اپنی باری کی "مظاہرین" کو سمجھانے کے لیے باہر نہ جاتا تو شاید ایک گھنٹے میں ہمیں بدل کے نکل گیا ہوتا اور آج شاہ عالم نہیں ناصر عظیم بن کے عظیم کے قصر عالی شان کی کسی شاندار خواب گاہ میں جو خواب ہوتا۔ یہ احساس مجھے رہ رہ کے چوکے دیتا تھا کہ بہت قریب آجانے والی منزل کو خود میں نے اپنی ایک پھوٹی سی غلطی سے گنوا دیا تھا۔

لیکن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی غلطیاں انسانی تدبیر پر تقدیر کی بالادستی کا ثبوت ہوتی ہیں ورنہ انسان جو چاہے وہ کر سکے تو نعوذ باللہ خدا نہ بن جائے۔

تھانا انچارج رات دو ڈھائی بجے چلا گیا تھا اور اس کے بعد مقامات کی پیشی کا شور تو کمرے میں نہیں رہا تھا لیکن باہر سے آنے والی چیخ و پکار کا شور بڑھ گیا تھا۔ بد قسمتی سے اس کمرے کے پیچھے ہی تھانے کا ڈرائنگ روم تھا جہاں صبح کا اچانا نمودار ہونے تک مجرموں پر تشدد کا مذاب ٹاک سلسلہ جاری رہا اور میں ساری رات ان کے سکھنے نرنے کے ہائے ہائے کرنے اور وحشیانہ انداز میں چیخنے چلانے کی آوازیں سن سن کر چوٹا رہا۔

رہیں صبح ہوتے ہی پھر نمودار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تھوڑا سا کانی بڑا لٹا لٹا تھا "یہ چندا لے بیٹھی ہے" میں نے کہا "تو صبح صبح وہاں گیا تھا۔"

"سب مجھے تیرے یار ڈاکٹر کمال نے بلایا تھا۔ اس نے بھی اور دواؤں سے بات کی ہے۔ تو بے غم ہوجا۔"

میں نے کہا "چند اے کچھ کہا۔"

"یار یہ سب لڑکیاں ایک جیسی پاگل کیوں ہوتی ہیں۔ جو بات چندا لے کسی وی فرمے کی۔ وی ٹیکم نے کسی شاہ عالم کو دیکھنے کے لیے تھانے جانا ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا جاؤ اپنا نام بھی بتا دینا اور یہ بھی کہ شاہ عالم سے کیا رشتہ ہے تمہارا۔" کیسے جانتی ہو تم شاہ عالم کو۔ اس کی باری میں تھیں تو پہلے لے کر خیال کیوں نہیں آیا۔ اب اس کی اپنی باری کے لوگ بھاگ گئے ہیں تو تم وقار داری جتنا چاہتی ہو۔ پہلے فرمے کہنا کہ رہیں بھائی میں برقع اور ڈھکے چلی جاؤں۔ اور اپنا نام کچھ بھی بتا دوں۔ یہ ہو سکتا ہے نا؟ میں نے کہا ہو تو سکتا ہے مگر تم بیٹھو آرام سے گھر میں۔ اس کا خیال رکھنے والے ہم ہیں نا۔ یہی خیال چندا کو بھی آیا اور بالآخر ٹیکم کو منع تو سب کو کیا تھا میں نے عمر وہ ماننے والی نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟ یہاں آئیں گی؟ مجھ سے ملنے؟" میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

آٹھ بجے جنم پنج گئی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق ناشتا بھی ساتھ لائی تھی۔ "رات آزاد صاحب کی بات ہوگی ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے۔ اگر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ایڈیشن کورٹ نے تمہاری ضمانت منظور کر لی تو اس فیصلے کے خلاف اپیل نہیں ہوگی۔"

"لیکن اے ڈی جے کا مرحلہ ابھی دور ہے۔"

"ہاں۔ آج ایس ڈی ایم جن دن کا ریٹائرڈ دے گا۔ پولیس ایک ہفتے کی درخواست دے گی۔ فرید عباسی مخالفت کرے گا۔ ایس ڈی ایم اچھا آتی ہے۔" جنم نے کہا۔

رہیں بولا "کل رات ڈاکٹر کمال کی اس سے بات ہوئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں مجبور ہوں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر یہ بہت مشکل ہے کہ میں ایک دن کا ریٹائرڈ بھی نہ دوں۔ کیس بہت سیریس ہیں۔"

سازمے کو بچے میری عدالت میں پیشی ہوئی اور جیسا کہ پہلے سے طے تھا پولیس کو تین دن کے لیے میرا جسمانی ریٹائرڈ مل گیا۔ پولیس مجھے باقاعدہ ہتھکڑی ڈال کے اپنی موبائل میں لے گئی تھی اور حفاظت کے لیے چار مسلح افراد کی غری بھی ساتھ تھی۔

دو بجے میری تھانے واپسی ہوئی اور ایک بار پھر مجھے کوئی کی سناخ سے باندھ دیا گیا۔ میرا بایاں ہاتھ مسلسل ہتھکڑی میں رہنے سے پلاز میا تھا اور کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ میں نے اس پر آؤڈیکس کا ٹیکس کیا اور ہتھکڑی دوسرے ہاتھ میں مونی کر وہ دایاں ہاتھ تھا۔ رات تک میں سارے کام نہ کی "تھے" یعنی لیفٹ ہینڈ کی طرح کرتا رہا۔

شام کو میں نے قرم کی آواز سنی۔ وہ باہر کسی سے بحث کر رہی تھی "میں شاہ جی کی بہن ہوں۔"

"میں کسی بہن بھائی کو نہیں جانتے" سنتری نے کہا "ہمارا چاند ان نہیں مل سکتا تھانے میں۔"

میں نے یہ ساری بحث محض سوچا اس روپے کے لیے تھی۔ فریڈا خیر برقع میں ملفوف اندر آگئی۔ مجھے ہتھکڑی لگی دیکھ کے اس کا برا حال ہو گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ کے زار و تظار رہنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے فحش کرنے "مجھے منع کیا تھا رہیں نے پھر کیوں آئی ہے یہاں۔" دیکھ لے "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بالکل آرام سے ہوں۔ رات آرام سے سو رہا تھا۔ کھانا خورد نہیں لے کر آتا ہے۔ بس گھر نہیں ہے مگر آرام کیا گھر سے کم ہے؟"

وہ تنسو پوچھ کے بولی "بس بھائی دل نہیں مانتا تھا۔"

"اس کی بیٹی۔ کچھ دماغ سے بھی کام لے۔" میں نے اس کے سر پر ایک چپٹ لگائی "مگر یہاں تو بھری ہوئی ہے پکڑ لے۔"

"سب کب تک آؤ گے گھر بھائی؟"

میں نے کہا "بس تھوڑے دن کی بات ہے۔ تین دن کا ریٹائرڈ ہے۔ پھر میں چلا جاؤں گا جیل۔ وہاں رہوں گا سماعت میں ہونے تک۔ سال دو سال۔ اس کے بعد چودہ سال کی سزا کاٹ کے گھر۔ یوں گزر جائے گا وقت" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

تین دن نادان لڑکی پھر پھس پھس روئے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ میں مذاق کر رہا تھا اور میں ایک ہفتے کے اندر اندر ضمانت پر رہا ہوجاؤں گا۔ وہ مٹی ہی لگی۔ دوسری رشتے کی بہن نمودار ہو گئی مگر چندا "ڈاکٹر کمال کے ساتھ آئی تھی۔ چندا نے کوئی روٹا دھونا نہیں کیا بلکہ الٹا ہر اہل صلہ بڑھائی رہی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رہیں نے ڈاکٹر کمال سے جھوٹ بول بول کے اسے مطمئن کر دیا تھا کہ گرفتاری اور رہائی سب ڈراما ہے اور قانونی ضرورت ہے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے سب دیکھے بتا دینے کو تیار نہ

تھی۔ میں نے اس سے بھی وہی سب کہا جو قمر سے کہا تھا۔ میرے لیے انکیشل حوالات قرار دیے جانے والے اس کمرے میں سماعتوں کی آمد و رفت سے پہل پہل رات تک جاری رہی۔ رہیں نے کئی پیکر لگائے۔ وہ گھر سے کھانا اور کانی ہوا کے لایا اور مجھے بتا گیا کہ رات کو ٹیکم ضرور آئے گی۔ جنم مغرب کے بعد آئی اور آفس جانے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر کمال، جنم اور ٹیکم کی مشترکہ کوشش کی وجہ سے میرے لیے تھانے میں مسلسل فون آرہے تھے اور تھانے والے میری اہمیت کے قائل ہوتے جا رہے تھے اور مجھ پر عائد پابندیاں نرم پڑتی جا رہی تھیں۔

ٹیکم سب کے بعد رات کیا رہے آئی اور میں نے اسے برقع میں دیکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کہا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس وقت تھانے میں فلم اسٹار ٹیکم موجود ہے۔ اگر یہ بات میں کسی سے کموں تو وہ کہے گا کہ ضرور آئی ہوگی تمہارے خواب میں۔"

وہ سنجیدہ رہی "یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔"

میں نے کہا "خالوں۔ ہر شخص خود اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے۔"

"بلادجہ تم نے دیر کی۔ شاہ عالم کی اچھی خاصی تشریح ہو چکی تھی ایک پریس کانفرنس سے۔ اس کے بعد ہول میں رکنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں کہا "ایک کے بعد ایک بے وقوفی سرزد فرماتے رہے وہاں بیٹھ کے اتنی لمبی پلاننگ کی بلاوجہ۔ اور خواہ مخواہ اس پولیس والے سے پکڑ لیا۔"

میں نے کہا "ایک بات کون؟"

"بولو۔"

"برقع میں تم قیامت لگ رہی ہو۔ کیا تمہارے پرستاروں نے کبھی تمہارے چہرے کو ایسے سیاہ نقاب میں دیکھا ہے؟"

وہ تھوڑا سا شرملا کے مسکرائی "ایک دو فلموں میں برقع بھی اوڑھا تھا۔ لیکن اتار کر لی یا مال پر شاپنگ کے لیے جانا ہو تو میں یہی برقع استعمال کرتی ہوں۔"

"مجھے رشک آ رہا ہے رہیں پر۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے۔"

وہ بولی "میں اب چلتی ہوں۔ تم یہ ایک لاکھ اپنے پاس رکھ لو۔"

مجھے ہنسی آگئی "ایک لاکھ تھانے میں؟ کیا کون گا ان سے میں؟ جو اٹھیں پولیس والوں کے ساتھ۔ اور ہاں جاؤں

ورنہ یہ لوگ ایسے ہی چھین لیں گے۔ ایک لاکھ کے لیے تو قتل بھی ہو سکتا ہے میرا۔

”بے وقوفی کی بات مت کرو۔“ تھانے میں ہر قدم پر بیسہ کھانا پڑتا ہے۔

میں نے کہا ”تھانے کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں اور مجھ سے زیادہ رکش سمجھتا ہے۔ میرا دن بھر دس اور سو پچاس کے معاملے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے میرے پاس دو ہزار ہیں۔ رکش آتا جاتا رہتا ہے۔ ضرورت پڑی تو بتا دوں گا اسے۔“

اس نے کچھ خفیف ہو کے نوٹ واپس بیک میں رکھ لیے اور چہرے پر نقاب ڈال کے نکل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی موجودگی میں کوئی آیا نہیں اور کسی نے اس کی صورت نہیں دیکھی ورنہ تھانے میں سنسنی پھیل جاتی اور صبح کے اخباروں میں یہ خبر آ جاتی کہ ”سپر اسٹار نیلم نے تھانے میں شاہ عالم سے ملاقات کی۔“

آدمی رات کے وقت پھر گزشتہ رات والا معمول شروع ہوا یعنی تھاکہ انسپکٹر سلامت علی میرے پاس آگیا ”کیسا وقت گزر رہا ہے شاہ جی؟“

میں نے کہا ”میریانی ہے آپ کی۔“

وہ بولا ”اے ایس بی صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ اور معلوم ہے انہوں نے کیا فرمایا تھا؟“

میں نے کہا ”مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے؟“

”وہ چاہتے ہیں کہ تم سے کوئی رعایت نہ کی جائے۔“

پیر بھان شاہ کا مہمان نہ سمجھا جائے نہیں۔“

میں نے کہا ”تم افغان بالا کا حکم نہیں مانتے؟“

وہ بولا ”میری تو زندگی عذاب کر دی ہے لیلی فونوں نے۔ ایس ایس بی شوکت علی بٹے کتا ہے شمارا خیال رکھا جائے۔ ہم کیا خیال نہیں رکھ رہے ہیں؟ پھر تم اوپر والوں سے کیوں کہلاتے ہو؟“

میں نے کہا ”اوپر والے خود فون کرتے ہوں گے۔ میرے مراسم تو سب سے تھے۔ میں کس کس کو منع کروں؟“

”میں نے طے کیا ہے کہ تمہیں یہاں سے شفقت کروا جائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ تم سے سی آئی اے سینٹرز میں نفیش ہوگی۔“

میں نے کہا ”یہ سراسر غیر قانونی ہوگا؟“

”ایسی کی جیسی مجھے قانون سمجھانے والے کی“ وہ دھما کے بولا ”میں تم کو ابھی ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں کسی کے فرشتے بھی تمہارا پتہ نہ لگا سکیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سارا دن

یہاں سیل لگا رہتا ہے۔ تمہارا سارا خاندان ملنے آ رہا ہے۔ یہ تھانا ہے یا تمہارا ہوش؟“

اس کے رویے میں رہی کا یہ انداز اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا مگر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ تھانے کی فنی کے ساتھ پھر نمودار ہوا۔ ایک حوالدار نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور دوسرے نے میرے ہاتھ کر کے چیچھے کے جاکے ہتھکڑی لگا دی۔ میرے کسی سوال یا احتجاج اور مزاحمت کی انہوں نے بالکل پروا نہیں کی۔

میں نے سلامت علی سے کہا ”یہ جو بھی تم کر رہے ہو غلط ہے اور غیر قانونی ہے۔“

اس نے بڑی رعوت سے کہا ”پھر؟“

میں نے کہا ”میں اپنے وکیل کو بتانا چاہتا ہوں۔“

اس نے وکیل کو ایک گالی دی ”وکیل کی۔۔۔ تمہیں ضرورت سے زیادہ رعایت مل گئی تھی۔“

میں نے کہا ”تم نے مجھے ہر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ سلامت علی۔ تم مجبور تھے اور تمہیں اس کی قیمت بھی ادا کر دی گئی تھی۔“

اس نے زہر آلود لبے میں کہا ”کیو اس مت کرو۔“ اور مجھے ایک دھکا دیا ”چل آگے۔۔۔ میری مجبوری دیکھ لی تو نے۔ اب ذرا اپنی مجبوری بھی دیکھ لے۔“

میں دھکے سے گرتے گرتے بھاگ۔ وہ مجھے کسی اندھے کی طرح ہاتھتے ہوئے باہر لے گئے اور ایک موٹار میں بیٹھا۔ پولیس کے رویے میں اس تبدیلی کا میں ایک ہی مطلب سمجھتا تھا۔ کسی حریف یا دشمن نے مجھے ملنے والی رعایتوں کی آگے شکایت کر دی تھی اور کہیں بہت اوپر سے حکم آگیا تھا کہ یہ مراعات واپس لے لی جائیں۔

مجھے اب اپنے اور فرید عباسی کے اندازے غلط ہونے دکھائی دیتے تھے۔ شاید اب میرے رہنماؤں میں توسیع بھی ہو جائے گی اور مجھ سے پوچھ گچھ میں عام مجرموں جیسا سلوک بھی ہوگا۔ خیر اب جو ہونا ہے وہ ہوگا۔ صبح سے میرے خالی پھر میدان میں آتے آتے گئے اور سفارشوں کے سارے اور رشوتوں کے مل پر میرے لیے انصاف کے حصول کی کوششوں کا سلسلہ آج سے نو شروع ہوگا۔

موٹار آرمی رات کی خاموشی میں اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ میں نے ابتدا میں حساب رکھنے کی کوشش کی کہ موٹار کتنی بار دائیں بائیں مڑی ہے لیکن بعد میں سب غلط ہو گیا اور جب بالآخر چندہر میں منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی ٹھہری تو مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ مجھے کہاں لایا گیا ہے۔ یہ ہو سکتا

تھا کہ گاڑی سیدھے راستے پر چلتی رہی ہو مگر اس بات کا امکان بھی تھا کہ اسے گھما پھرا کر لے جایا گیا ہو۔

ایک بار پھر مجھے دھکے دے کے نیچے اتارا گیا اور میں نے ایس ایچ او انسپکٹر سلامت علی کی آواز سنی۔ دو ہاتھوں نے مجھے دائیں بائیں بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور میں ان کی ہدایت کے مطابق چل رہا تھا۔ میرے کانوں نے لوہے کا ٹیک بھانک کھولے جانے کی آواز سنی۔ میں تین بیڑھیوں کے برابر بلند ایک ڈھلوان سڑ پر چڑھ کے اوپر گیا۔ پھر مجھے سو قدم اندر چلنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی دروازہ کھلا اور میرے پیروں کے نیچے قالین آگیا۔

میرا دماغ سوچنے لگا۔ کس تھانے میں ایسے دیر قالین بچے ہوتے ہیں؟ سی آئی اے سینٹر بھی میرا دیکھا ہوا تھا۔ وہاں کا پاس بھی مختلف نہیں تھا۔ پھر کیا مجھے کسی ڈس آر آئی جی اور

تبی کی کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ خود تبی کی مجھ سے ملنا چاہتا ہو یا اس نے حکم دیا ہو کہ شاہ عالم کو کسی ریسٹ ہاؤس میں رکھا جائے سیاستدانوں کے لیے کسی گھر کو بھی ”سب جیل“ قرار دے دیا جاتا ہے۔

مجھے ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے ایک نے کہا ”آگے بیڑھیاں ہیں۔ اور جاتا ہے۔“

میں ایک ایک بیڑھی گنتا گیا اور اوپر چڑھا گیا۔ بائیں بیڑھیوں کے بعد مجھے سیدھا چلنے کے لیے کہا گیا۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اپنے قدم شمار کیے ٹھیک چالیس قدم کے بعد مجھے پھرتا گیا کہ آگے اترنے والی بیڑھیاں ہیں۔ میں نے دوبارہ انہیں شمار کیا۔ وہ پھر بائیں تھیں۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میں ایک طرف سے اوپر چڑھا تھا اور چالیس قدم سیدھا چل کے پھر نیچے اتر گیا تھا۔ ایسا کہاں تھا؟ مجھے یہ نقشہ جانا پہچانا سا لگا۔

مجموع کے چند قدم چلنے کے بعد مجھے پھر گیا کہ آگے بیڑھیاں اترتی ہیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے کنفیوژ کرنے کی ایک احتیاج کو شش تھی۔ سی آئی اے سینٹر کی دو منزلہ عمارت تھی۔ وہ مجھے پہلے اوپر کی منزل پر لے گئے۔ میں نے پورا پر آمد طے کیا اور دوسری طرف کی بیڑھیاں اتر کے دوبارہ ٹراؤنڈ فلور پر آگیا۔ اب وہ مجھے زمین روز عقوبت فٹوں میں لے جا رہے تھے جو ایذا رسائی کے نیک انسانیت طریقہ کے لیے بدنام زمانہ تھے۔ ذہنی طور پر میں نے خود کو ہر طرح کے جسمانی تشدد کے لیے تیار کر لیا۔ میں سفارشوں کی جگہ میں بار گیا تھا اور اب میری حیثیت عام مجرم سے بھی کمتر ہوئی تھی۔ میرے خلاف کسی دشمن کا انتقامی جذبہ کام کر رہا

تھا۔ یہ دشمن ملک رب نواز بھی ہو سکتا تھا اور پیر بھان شاہ یا اس کا سالا بھی۔

خانے کی کمرانی زیادہ نہیں تھی۔ میں چودہ بیڑھیاں نیچے اڑا۔ پھر فرش آگیا۔ میرے اندازے کے مطابق ہر بیڑھی چھ سات اچ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جس خانے میں اڑا تھا اس کی چھت اچھے فٹ کے قریب اوپر تھی۔ جو بات مجھے ابھی تک کھلک رہی تھی یہ تھی کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے جانے والے دونوں زینے بالکل سیدھے نہیں تھے جیسے کہ عام طور پر پرانی عمارت میں ہوتے ہیں۔ وہ زینے ایک نیم دائرے میں گول گھوم کے نیچے اترے تھے اور ان پر پیس کا یا ماربل کا فرش تھا۔ سی آئی اے سینٹر کی عمارت تو اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس کا فرش پرانی اینٹوں کا اور گھسا ہوا تھا۔

اچانک میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور مجھے کسی دروازے سے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب میرے ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے آنکھوں کی پٹی اتار دی۔ اس کے باوجود میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہا۔ اس زندان میں گھپ اندھیرا تھا لیکن ایک دروازے کے نیچے سے باہر کی روشنی ایک لکیر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ

در بعد بھی روشنی کی لکیر اندر کے اندھیرے میں میری آنکھوں کو دیکھنے کے قابل بنائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ بعد جب میں اندھوں کی طرح ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کے اور پیر فرش پر کھسکا تا آگے بڑھ رہا تھا اچانک میرے مقابل کوئی دیوار آئی۔

اب میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ پہلی دیوار پانچ قدم کے بعد ختم ہو گئی۔ دوسری سے تیسری اور پھر چوتھی دیوار تک کا فاصلہ بھی پانچ قدم ہی رہا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دس بارہ فٹ چوڑا اور لمبا کرا تھا جس میں دو دروازے تھے۔ ایک وہ جس کے نیچے سے لائٹ نظر آرہی تھی اور دوسرا پچھلی طرف کے آخری گوشے میں۔

میں نے دوسری کوشش میں کمرے کو ترچھا غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کمرہ بالکل خالی ہے۔ اس کی دیواروں پر بھی سات پلاستر تھا لیکن نیچے کا فرش موزائیک تھا۔ اس کی چٹنی سطح کو میں نے اپنے پیروں سے بھی چھو کے محسوس کیا۔ فرش پر گرد و غبار کا نہ ہونا یہ ثابت کرنا تھا کہ اسے روزیابنتے میں دو تین بار ضرور صاف کیا جاتا ہوگا۔ کمرے میں کوئی تعفن والی بو بھی نہیں تھی اور نہ وہ اعصاب شکن بھانک بدبو جو سی آئی اے سینٹر جیسے سفاک اداروں کے عقوبت خانوں سے

منسوب کی جاسکتی ہو۔ پیشاب اور انسانی فضلے، خون اور پسینے کی ملی جلی ہو جو قید میں اذیت بھیلنے والوں کی موجودگی کا پتا دیتی ہے۔

چنانچہ یہ بات مجھے اس حقیقت کا پتا دینے کے لیے کافی تھی کہ میں ایک صاف ستھرے خالی کمرے میں ہوں جو کسی تھانے یا تقبضی ادارے کا عقوبت خانہ نہیں ہے۔ اس سے میری کچھ دھارس بندھی اور میں فرش پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اس برائے نام روٹنی میں دیکھنے لگی تھیں جو دروازے کے نیچے سے آ رہی تھی۔

اچانک دروازے کے باہر کسی نے قفل میں چابی لگا لی اور میں ایک دم چپ لگا کے دروازے کے قریب والی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دروازہ کھلا تو مجھ پر جیسے چوہہ طبق روشن ہو گئے کمرے کے باہر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں مجھے اپنے مقابل لالی نظر آئی۔

چھ فٹ سے زائد قد کی بھاری بھرکم مضبوط ہاتھوں پر ہوں اور مردانہ صفات کی حامل لالی وہ مخلوق تھی جس کو دیکھتے ہی مجھے ملک رب نواز کا اور پروفیسر ہاشم رضا کا خیال آیا۔ اس نیم انسانی نیم حیوانی عورت نما مخلوق کو پروفیسر ہاشم رضا نے اپنی جینیاتی سائنس کے ایک تجربے سے ایجاد کیا تھا۔ لالی کی ماں ایک عام عورت تھی مگر باپ افریقہ کے بن مائس اور گوریلے جیسی حیوانی مخلوق تھا اور لالی ان کی ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی نوع کی دوسری تخلیق جو تھا جسے پروفیسر ہاشم رضا نے پال کے بڑا کیا تھا اور وہ مردانہ صفات رکھتا تھا لیکن خاص بات یہ تھی کہ جبو اور لالی دیکھنے میں مرد عورت نظر آنے کے باوجود تولیدی نظام سے محروم تھے اور شادی کر کے اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

جیسا کہ پروفیسر ہاشم رضا نے بتایا تھا، جبو یا لالی APE فیملی کے دو جانداروں کے ملاپ سے پیدا ہوئے لیکن یہ ملاپ جسمانی نہیں تھا۔ یہ ایک لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسی مخلوق کو دنیا میں لانا تھا جو ماں باپ کی مشترکہ نسلی صفات سے مزین ہو یعنی گوریلے باپ جیسی جسمانی طاقت کی مالک ہو تو ماں کی طرف سے انسانی ذہانت رکھتی ہو۔ اور پروفیسر ہاشم رضا کا یہ تجربہ کامیاب رہا تھا۔ جینیٹک سائنس کے تجربات کا سلسلہ پچھلی ایک صدی پر محیط ہے اور اس کی تازہ ترین کامیابی DOLLY نام کی بھیڑ ہے جو کلوننگ سے وجود میں آئی تھی۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک زندہ خطنے سے پورا جاندار یہاں تک کہ اپنی مرضی کا انسان بھی تیار

کر سکتے ہیں اور اس طرح بنائے جانے والے انسان میں وہی ظاہری طاقتی صفات ہوں گی جو اصل خطنے کے مالک میں تھیں۔ اخلاقی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر ابھی تک دنیا کے بیشتر ممالک میں جانوروں کی کلوننگ پر کام ہو رہا ہے مگر انسانی کلوننگ پر پابندی عائد ہے۔ تاہم اسرائیل، یونان اور چھ دیگر ممالک کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں انسانی کلوننگ پر چھپ کے کام ہو رہا ہے۔

پروفیسر ہاشم رضا کا تجربہ ابتدائی نوعیت کا سمجھا جاسکتا تھا۔ لالی ایک ہی نسل کے سمجھے جانے والے دو جانوروں کی مشترکہ صفات رکھتی تھی۔ جیسے کہ خچر جو گدھے گھوڑے کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے اور دونوں کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے یعنی گدھے کی طرح جھانکشی اور بوجھ دھونے والا ہوتا ہے تو گھوڑے کی طرح تیز رفتار۔ لیکن اس میں بھی خالی یہی ہے کہ خچر سے پیچیدہ نہیں ہوتا۔

لالی میں دوسری خرابی یہ تھی کہ اس عمل کو انسانی جاسکتا تھا یعنی اس کا باپ انسان اور ماں گوریلے کی مادہ نہیں بن سکتی تھی چنانچہ وہ عورتیں جو لالی اور جبو کی ماں بنی تھیں انہیں جنم دینے وقت مرگئی تھیں اور پروفیسر جانتا تھا کہ گدی گوریلے کے بچے کی پیدائش کے وقت ہر عورت مر جائے گی چنانچہ جبو اور لالی جیسی نسل کے فروغ کا کام نہ صرف یہ کہ انسانی منگا تھا بلکہ قانونی طور پر بھی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ پروفیسر ہاشم رضا نے اپنے تجربات کے لیے جن عورتوں کو استعمال کیا تھا انہوں نے معاشی مجبوری کے باعث اپنے آپ کو بہت بھاری قیمت پر فروخت کیا تھا اور ایسی عورتیں آسانی سے دستیاب نہیں تھیں جو دس میں لاکھ لے کر ایک طویل تکلیف دہ موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوں۔

پروفیسر ہاشم رضا سے ایک ذاتی ملاقات میں بہت سے ایسے ہی ہوناٹک انکشافات ہوئے تھے اس نے بتایا تھا کہ وہ ہندو جیسی پھرٹی گوریلے جیسی قوت اور انسانی ذہانت سے مزین اس مخلوق پر مزید تجربات کر رہا ہے اور ان کے رویے کو معنوی طریقے سے کنٹرول کرنا چاہتا ہے تاکہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جاسکے۔ وہ جبو کو ایک آنکھیں لگا تھا جس سے اس کا ذہن اس طرح متاثر ہوتا تھا جیسے مسکریں سے ہوتا ہے اس کے بعد وہ جبو کو جیسی ہدایات دیتا تھا وہ اس کے لاشعور میں اتر جاتی تھیں اور وہ انکی کے مطابق عمل کرتا تھا۔

پروفیسر کا نظریہ تھا کہ ایسی مخلوق کی دنیا میں بہت زیادتی

ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ جرائم پیشہ تنظیموں کو ان کی ضرورت ہوگی بلکہ مختلف ممالک اپنی فوج میں ایسے ہی سپاہی رکھنا پسند کریں گے۔ عملی طور پر یہ کسی حد تک ممکن تھا۔ یہ کمنا نکل زور تھا لیکن ایسے کسی امکان کی کامیابی کا خیال انتہائی خوف ناک تھا۔

ایک بہت لمبے عرصے کے بعد لالی کو دیکھ کے مجھے بہت سی پرانی باتیں یاد آئیں۔ ایک عجیب و غریب قرارداد کی جانے والی مخلوق نے ایک بار جشن کے اخبار کے دفتر اور ایک بار میرے گھر حملہ کیا تھا۔ اخبار کے دفتر حملہ کرنے والا بھی ایک بچہ تھا جو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چھلانگ لگاتا ہوا غائب ہو گیا تھا مگر نیم کے گھر حملہ کرنے والا بچہ گولی کا نشانہ بن گیا تھا لیکن بعد میں اس کی لاش پوسٹ مارٹم سے بے ہی غائب ہو گئی تھی۔ اس حملہ آور کو محض قذی وجہ سے قتل کیا گیا تھا لیکن بعض عینی شاہدین کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ بہت بڑے سائز کا بندر تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اس کا تعلق بھی پروفیسر ہاشم رضا کی تجربہ گاہ سے ہوگا۔

جبو سے ایک بار میں کا واسطہ پڑ چکا تھا اور لالی کو میں نے بھگتا تھا۔ وہ اپنی جسمانی طاقت میں جی جی کے ٹارزن تھے۔ میرے جیسے آدمی سے ایسے کھیل سکتے تھے جیسے بی چوہے کی کھلتی ہے۔ اگر لالی مجھے دبوچ لیتی تو اس کے فونادی روٹی کی گرفت میں میری پسلیاں پڑ کر مر جاتیں۔

کسی اشتعال انگیزی کے بغیر لالی پر حملہ کرنا آسانی نہیں تھی۔ اسے اسے کمرے میں داخل ہونے کا موقع دیا اور دوستانہ انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا ”کیسی ہو لالی؟“ لالی نے میرے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور حق سے کوئی آواز نہ کی تو میری سمجھ میں نہیں آئی پھر میں نے رب نواز کو دیکھا جو ایک کاٹھنکوف والے سسٹم محافظ کے طور پر آگے بڑھتا رہا تھا۔ اندر آنے سے پہلے اس نے باہر سے کوئی سوچ آن کیا۔ کرا روشن ہو گیا۔ رب نواز کی صورت سے نظر آ رہا تھا کہ وہ میرے خلاف عناد کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔

”مجھے سو تم باغی شہزادے۔“ وہ طنز سے بولا۔ میں نے کہا ”بقول فلمی شاعر۔“ تم نے بدو، درمہ پٹے، گلاب، پتیلی، پلے، پلے سے رہے۔“ وہ خچی سے مسکرایا ”قانونی طور پر تم اس وقت بھی باغی کی تحویل میں ہو۔“ میں نے کہا ”قانون پہلے اندھا بہرا سمجھا جاتا تھا۔ اب مذکور بھی ہے قانون کی بات کیا کرتے ہو؟“

”پولیس نے تمہارا فزیکل ریٹائنڈ تین دن کے لیے حاصل کیا تھا۔“ میں نے کہا ”آج پہلا دن تھا۔ اگلے دو دن تم میرے ساتھ وہ سلوک کر سکتے ہو جو پولیس نے نہیں کیا تھا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

”شاہ عالم میں صرف جی جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا ”کون سا جی۔“ مجھے نہیں معلوم تم کس جی کی بات کر رہے ہو؟“ وہ بولا ”اس ڈیپیر سیمان شاہ کے ڈیرے پر تم بہت آگڑوں دکھا رہے تھے۔“

میں نے کہا ”معاف کرنا رب نواز۔ میں تمہیں اتنا احسن نہیں سمجھتا تھا جتنا تم نے خود کو ثابت کیا۔ وہ تمہارا دشمن ہے۔ وہاں بیٹھ کے کیا میں تم سے دوستی جتاؤ اور تمہاری تعریف کرتا؟“

اس کی صورت پر ابھرنے کے آثار نمایاں ہوئے ”تم مجھے ایسی باتوں سے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“ میں نے کہا ”رائٹ۔“ تم تو بے بنائے بے وقوف ہو۔ تم نے جو سنا اس پر اعتبار کر لیا۔ یہ نہیں سوچا کہ میں کہاں سے

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت

درجہ اول میں مکمل

طاہر جاوید مغل

قیمت فی جلد 250 روپے

بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ڈاکٹر

ڈاکٹر میاں مالک کیشنری

2022 میں ریکارڈ: اردو بازار لاہور 07247414

نہایت روڈ، چوک سید ہسپتال، لاہور

اور کن حالت میں وہ بات کہہ رہا تھا۔ پیر سجان شاہ کے آدمی مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ مجھے جان سے مار کے نہیں کاڑھتے تو روز محشر سے پہلے میرا سراغ نہ ملتا۔ وہ تو میری قسمت کی خرابی ہی ایک اچھائی بن گئی کہ پولیس کے پاس یعنی اسے ایس بی ڈی اور شاہ کے ہاتھ میں میری گرفتاری کے وارنٹ آچکے تھے اور پولیس میری گرفتاری دکھانے کی پابند تھی۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے پیر سجان شاہ سے بڑے قائل کرنے والے انداز میں جھوٹ بولنا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ میں نے تمہارے ساتھ کاروباری مراسم ختم کر لیے ہیں۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میں نے تمہیں فون پر بہت کچھ کہا۔ جو دوسرے فون پر پیر سجان شاہ نے سنا۔ پھر میں نے اسے یقین دلایا کہ اب میں اس کے ساتھ بزنس پارٹنرشپ کے لیے تیار ہوں۔

رہ نواز کنفیووز نظر آئے لگا "اس نے تمہیں اور کیا بتایا؟"

میں نے کہا "کیا ہم یہاں کھڑے رہیں گے رات بھر؟ ہمیں جگہ کے شرفاء انداز میں بھی باتیں کر سکتے ہیں؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں شاہ عالم۔"

میں نے کہا "تم اپنے گھر میں مجھ سے ذرے ہو؟ تمہاری یہ خوفناک بلا جسے تم بہار سے لالی کہتے ہو۔ میرا راستہ روکے کھڑی ہے۔ باہر ایک محافظ ہاتھ میں کلا شکوف لیے موجود ہے۔ تمہارا گھر ایک قلعے سے زیادہ محفوظ ہے۔"

"میں تم سے ڈرتا نہیں۔ لیکن اب میں تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ دھوکا تم نے مجھے دیا تھا۔ وہ چوری کا مال تھا تو تم نے میرے حوالے کر دیا کہ لندن کی انٹرینشل مارکیٹ میں نکال دو۔ سوچو ذرا اگر میں پکڑا جاتا تو کیا ہوتا۔ پکڑا جاتا جسے ابھی تک اسے معلوم نہیں کہ تم نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا لیکن اسے معلوم ہو جائے گا۔"

"اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "رہ نواز۔ تم ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ لاڈ پرائس پر ایک بروکر کے گس کا الزام ہے۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہو گا تو وہ بتا دے گا کہ بروکر نے اپنا کمیشن بکا کرنے کے لیے اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ چوری کا مال ہے چنانچہ بعد میں جب اس نے اعتراف کیا کہ وہ یہ بات جانتا تھا تو اس نے بروکر کو گولی مار دی۔ وہ بروکر کی دروغ گوئی پر سخت مشتعل ہو گیا تھا۔ لیکن ہے اس

سے لاڈ پرائس کو دی جانے والی سزا میں تخفیف ہو جائے۔ لیکن تم سوچو کہ اس سے تمہاری ساکھ کتنی متاثر ہوگی۔ ایسا کیوں کیا تم نے رہ نواز۔ بزنس کیا ایسے چل سکتا ہے کہ ایک بزنس میں دوسرے کا مال اٹھالے۔"

وہ جھجکا کے بولا "بند کرو اپنی یہ بکواس۔ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ اس پیر نے تمہیں آدمی بات بتائی ہے۔"

"اوکے۔ باقی آدمی بات تم مجھے بتا دو۔"

رہ نواز کچھ دیر سوچتا رہا "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایک موقع اور دوں گا۔"

پانچ منٹ بعد میں رہ نواز کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا جہاں میں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ میرے بالکل سامنے ڈرائنگ روم کا وہ دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ اس دروازے کو بند کر کے کلا شکوف بردار میڈیکل اینڈ سن کھڑا ہوا تھا۔ لالی اپنے چار حائل تیر بھول کے اپنے ریکیٹ میں جا چکی تھی اور شاید بنارٹس لیے کالی بنارٹی تھی۔

"پیر سجان شاہ نے گزشتہ تین سالوں میں کم سے کم چھ بار میرا مال ضبط کرایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ سب کو خوش بھی رکھتا ہوں اور اس کاروبار میں میرے جیسے اور بھی لوگ ہیں۔ صوبہ سرحد میں مردان اور تخت بھائی کے علاقے میں دو ڈیڑھ ہیں۔ جن کی پس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ ایسے ہی دو بلوچستان میں ہیں۔ سندھ میں تین ہیں مگر اپنے اپنے علاقے ہیں ان کے اور وہ ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتے۔ ایک کراچی میں ہے۔ دونا ڈکان اور جبک آباد میں ہیں۔ پھر میان پنجاب میں مجھ سے کون دشمنی کر رہا ہے۔ ایک ڈیڑھ ساہیوال میں تھا۔ اس نے حلیفہ کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور کسی سے کاروباری رقابت میں نہیں پڑا۔ وہ بڑا صوفی ٹائپ آدمی تھا۔ کہنے لگا کہ میاں جی، جس کا جتنا رزق ہے اور جہاں ہے وہ اسے ضرور مل جاتا ہے۔ بالآخر مجھے پولیس کے ایک ذریعے سے بخبری کرنے والے کا پتا چلا اور میں نے اسے اٹھوایا تو پتا چلا وہ پیر سجان شاہ کا مرید ہے۔ اس پیر نے ابھی چار پانچ سال پہلے ہی یہ دھندا شروع کیا تھا اور اپنی پیری مریدی کی طرح اس کاروبار میں بھی کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنا کام چھوڑ کر مریدوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ خیر اس مرید کی تو آج قبر بھی کسی کو یاد نہیں کہ کہاں ہوگی۔ میں نے حساب لگایا تو اس پیری کی وجہ سے میرا لاکھوں کا نقصان ہو چکا تھا۔ میں نے کہا کہ جتنا سوسائری کی تو ایک لہار کی۔ ایک رات ڈاکوؤں نے

اس کا گودام صاف کر دیا۔ اس کو پتا بھی نہیں چلا اور مال بچ گیا لندن۔"

میں نے کہا "پنجابی کی ایک کماوت ہے کہ سیانا کو اسی گو کھاتا ہے۔ تم نے اپنی داستان میں ہیڑی ہو سیاری سے کام لیا تھا مگر وہ پیر تم سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس کے پاس چوری ہونے والے مال کا پورا کیڑا لگ تھا۔ اس نے دس دس کاپیاں بنوا کے دس بڑے شہروں کے ڈیڑھ کو فراہم کر دی تھیں۔"

"تم چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ کہ اب وہ مال کہاں ہے؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پیر سجان شاہ کی طرح تمہاری رائے لندن پولیس کے بارے میں اتنی خراب کیوں ہے حالانکہ ان کی کارکردگی دنیا میں مثالی سمجھی جاتی ہے۔ تم خود سوچو کہ اگر وہ نوادرات خود پس نے جی نے یا لاڈ پرائس میں سے کسی نے چھپائے ہوتے تو کیا پولیس کے سراغ رساں ہماری گھرائی کر کے ان کا پتا نہ لے لیتے۔"

"تم لندن پولیس کے سراغ رسانوں سے زیادہ چالاک ہو سکتے کے بچے! وہ چلا کے بولا۔"

میں نے کہا "اس تعریف کا شکریہ لیکن رہ نواز اس معاملے میں اگر کسی پر شک کیا جاسکتا ہے تو وہ جی کی ذات ہے۔"

"اسے تو پیوی نے مڑا دیا۔"

میں نے کہا "گر وہ سچ بولی کا شوہر ہو تا تو یہ صورت میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ جولی نے مجھے بتایا کہ جی کا اپنا کاروبار مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ اس کے کمپنیوں کی ساکھ خراب ہو گئی تھی اور ٹائٹ کلب پر کئی بار چھاپا پڑ چکا تھا کیونکہ وہ غیر قانونی طور پر انڈین لڑکیاں اسٹائل کرتا تھا۔ وہ وہاں صرف اسٹریٹ میز پر نہیں، جسم فروشی بھی کرتی تھیں۔ جی کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ پیوی جس پر وہ سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے وہی اس سے دشمنی کر رہی ہے۔ اگر اس کا یہ نوادرات کا بزنس نہ ہوتا تو وہ بالکل ہی برباد ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کو لوٹ کے بے ایمانی سے سرمایہ حاصل کرنے کا خیال جی کو اسی لیے آیا کہ وہ سمجھتا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ٹائٹ کلب اور جوئے خانے کو بچ کر کوئی اور بزنس کرے گا۔ اس کو اچانک موقع مل گیا۔ اس نے پیوی کو بتایا اور اپنے مال پر خود ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنالیا۔"

"جی یہ بات نہیں مانتا۔"

"وہ بری طرح چھس چکا ہے۔ اس پر کم سے کم چار افراد کے قتل کا الزام ہے۔ فرسٹ ڈگری مژور نے ہماری قانونی زبان میں قتل عہد کیا جاتا ہے، دوسرا الزام عورتوں کی اسٹنگلنگ اور ان سے جسم فروشی کرانے کا ہے۔ تیسرا ٹیکس چوری کا تھا۔ چوتھا ڈیکٹی کا بن گیا۔ اس کی پیوی نے پولیس کو ایک ویڈیو کیسٹ فراہم کر دی جس میں اس نے اپنے آفس میں مجھ سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ جیسے ہی میں یہ رقم لے کر جی کے آفس پہنچا دو ڈاکو وہاں سیف ڈیپازٹ کینی کے نمائندے بن کر پہنچ جاتے اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے۔ یہ ساری گھنگو جولی نے سنی اور ریکارڈ کر لی۔ جی کے پلان میں دو افراد اس کے ساتھ شریک تھے جو شاید ایک ایک لاکھ پاؤنڈ لے جاتے۔ غالباً جی کو یہ سودا منگنا ہو گا۔ بعد میں اس نے دو سرا پلان بنایا جس کی خبر جولی کو نہیں ہوئی۔ اس نے دو آدمی اس کام کے لیے حاصل کیے کہ جب ہم لاڈ پرائس کے گھر سے تین لاکھ پاؤنڈز لے کر واپس آ رہے ہوں تو وہ راستے میں ہم سے گاڑی چھین لیں۔ میرا خیال ہے کہ جی نے انہیں گاڑی میں موجود کیش کے بارے میں نہیں بتایا ہو گا۔ گاڑی چھیننا ایک عام سا جرم ہے۔ جی نے شاید پانچ ہزار پاؤنڈز میں دو بد معاشوں کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی کہ گاڑی چھین کے لے جانا اور فلاں جگہ پر چھوڑ دینا۔ اس طرح جی نے دو لاکھ پاؤنڈز بچا لیے ہوں گے۔ نوادرات کو غائب کرنے کا پروگرام اس نے پہلے ہی بنا رکھا ہو گا۔ اس مال کو وہ بعد میں آہستہ آہستہ نکالتا۔ اس کی بد قسمتی کہ وہ مال چوری کا تھا اور اس چوری کی خبر مارکیٹ میں پہلے ہی عام ہو چکی تھی۔ اسے نولاکھ پاؤنڈز مل جاتے تو وہ اپنا بزنس سنبھال لیتا لیکن گھر کے بھیدی نے لٹکا ڈھادی۔ اس کی پیوی نے جانتے کب سے موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے جی کو ٹھکانے لگا دیا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ رہ نواز میری باتوں سے قائل ہونے لگا ہے۔ یہ سب باتیں اسے پہلے ہی معلوم تھیں لیکن میں نے اپنا کیس ایسے مدلل انداز میں پیش کیا کہ مجھے ٹھوڑی سی مسلت مل جاتی تو میں اسے اپنا ہم خیال بناتا اور قائل کر لیتا کہ پیر سجان شاہ کے ذریعے سے میں نے جو بھی کہا تھا، بحالت مجبوری اپنی جان بچانے کے لیے کہا تھا۔ نہ ہم حسب سابق پارٹنر ہیں اور رہیں گے ڈیکٹی سے ہونے والے اس نقصان کو مل جل کے برداشت کریں گے اور مستقبل کے سودوں میں برابر کر لیں گے۔ بار زندہ صحبت باقی۔ بزنس میں کبھی ایسے غیر متوقع نقصانات بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن میری قسمت کی خرابی کہ اچانک رب نواز کا بیٹا آگیا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا اور اس وقت تو بت اچھی طرح دیکھا تھا جب میں نے اور سونی نے مل کے اسے اس گھر سے اغوا کیا تھا۔ وہ اب کافی بدل گیا تھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں کچھ بھاری ہو گیا تھا اور اس کی شخصیت شاندار ہو گئی تھی کیونکہ باپ کی طرح وہ بھی دراز قد اور کھلی کھلی رنگت کا مالک تھا۔ رب نواز کا جسم اب اوپر عمری کی طرف مائل تھا اور اس کے سر پر حج بھی نمودار ہو گیا تھا جبکہ دلنواز کے سر پر گھنے چیلے سیاہ بال تھے۔

مجھے دیکھ کے وہ چونکا اور پھر سیدھا میری طرف آیا۔ ”ڈیڈ“ یہ کون ہے؟

اس کے باپ نے حیرانی سے کہا ”تم شاہ عالم کو جانتے ہو؟“

”نہیں ڈیڈ!“ اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا ”یہ وہی داڑھی والا جن سے غور سے دیکھئے“ اسی نے اغوا کیا تھا مجھے اور اس کے ساتھ وہ فاحش سونی تھی۔

ملک کے لاشعور میں اگر داڑھی والے جن کا خیال تھا تو یہ بات ابھی تک اس کی زبان تک نہیں آئی تھی۔ دلنواز کی بات نے جیسے اس کے خیال کو اٹھار کی راہ دکھادی۔

رب نواز نے مجھے غور سے دیکھا ”داڑھی والا جن!“

”ہاں ڈیڈ! یہ وہی بد معاش ہے۔“

میں نے کہا ”دل نواز۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

اس نے گرم ہو کے کہا ”کیوں اس بند کو۔ میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔“

میں نے کہا ”مجھ سے اس لیے میں بات مت کرو۔ میں شاہ عالم ہوں سارا زمانہ جانتا ہے مجھے۔“

دلنواز میرے قریب آیا اور اس نے میرا کار پکڑ لیا ”اس وقت ہم داڑھی سے دھوکا کھا گئے تھے۔“

میں نے غرا کے کہا ”ہاتھ بٹاؤ ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔“

رب نواز بھی کھڑا ہو گیا ”کیا ٹھیک نہیں ہوگا۔ دلنواز ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری آنکھیں واقعی دھوکا کھا گئی تھیں۔“

میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ تم وہی ہو، شک کی کوئی بات ہی نہیں۔ آج تمہارے چہرے پر داڑھی ہے تو تم سو فیصد وہی نظر آ رہے ہو۔ داڑھی والے جن!“

میں نے کہا ”رب نواز کیا تم بالکل ہو گئے ہو؟“ میں نے کہا۔

”نہیں“ میں بالکل تھا۔ اب مجھے ہوش آگیا ہے۔ میرا سب سے بڑا دشمن تو میرا بدن پار نہیں تھا جس پر میں سب سے

زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ وہ چلا کے بولا۔

دل نواز نے کہا ”یہ ایسے نہیں مانے گا ڈیڈ۔ اسے آپ میرے حوالے کر دیں۔ اس نے داڑھی والا جن بن کے ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ عالم ہی داڑھی لگے کے ہمارا دشمن بنا ہوا تھا۔ اب میں اس سے پوچھ لوں گا۔“

میرا انکار احتجاج اور اشتعال سب رائگاں گیا۔

اچانک رب نواز کو بھی یقین آگیا تھا کہ داڑھی والے جن کے روپ میں بھی یہ میں ہی تھا جو اس کے خاندان کو تباہ کر رہا تھا۔ اس نے کانٹھوں کو حکم دیا کہ اس کو وہیں بند کر دو اور پانچ منٹ بعد میں پھر اسی زنداں میں تھا جہاں سے میں نے اپنی چرب زبانی کے باعث رہائی حاصل کر لی تھی۔

رب نواز کے مقابلے میں اس کا بیٹا بہت چالاک ثابت ہوا۔ وہ کچھ دیر بعد کپڑے بدل کے آیا تو اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ تھا اور لالی تھی۔ وہ خود ایک چہرے کا بنزیر لے کر آیا تھا۔

”کیا تم مجھے شرافت کی زبان میں بتاؤ گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟“ وہ بنزیر لہرا کے بولا۔

میں نے مضبوطی سے کہا ”مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟“

دلنواز کا بنزیر ہوا میں لہرا کے میری کمر پر لگا۔ ”مجھ میں آجائے گا تھوڑی دیر بعد۔ آخر کیا بگاڑا تھا میرے باپ نے تیرا۔“ وہ گالیاں بٹکنے لگا اور بنزیر سے دیوانہ وار میرے جسم پر وار کرنے لگا۔ بنزیر کی ہر ضرب سے میرے جسم پر جیسے آگ کی اک لکیر سی بن جاتی تھی مگر میں برداشت کر رہا تھا۔ اس کا نشانہ میرے جسم کا گردن سے نیچے راتوں تک سارا بدن تھا اور میری خود کو بچانے کی کوشش لا حاصل تھی لیکن ایک مرحلہ ایسا آگیا جب میری قوت برداشت جواب دے گئی اور

میں نے چابک پکڑنے کے ایک جھٹکا دیا۔ دلنواز کی گرفت چابک پر بہت مضبوط تھی۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور تھوڑا سا آگے آگیا۔ اگر وہ میرے ہاتھوں کی پتلی میں آجاتا تو میں اسے دبوچ لیتا اور پر غمال بنالیتا لیکن اس نے چابک چھوڑ دیا۔

دلنواز نے مجھے گالی دی اور پلٹ کے لالی سے کہا ”لالی۔ اس کو پکڑو۔“

میں نے ہوا میں چابک لہرایا۔ ”اگر لالی نے مجھے چھوئے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

لیکن لالی پر دلنواز کے حکم کا بڑا عجیب اثر ہوا تھا۔ اچانک اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس کا سانس

دھونکی کی طرح جلنے لگا تھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اس کی انسانی صورت پر حیوانی جذبات کی سفاکی آگئی تھی اور اس کا جسم جیسے طاقت کے دباؤ سے مل کھانے لگا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی۔ میں نے پھر چلا کے کہا ”دلنواز! اگر میرا ڈاؤ چل گیا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ بعد میں مت کہنا۔“

لیکن میرے الفاظ کے جواب میں کلا شکوف کے راؤنڈ کا برسٹ آیا اور میرے پیروں سے کچھ فاصلے پر فرش اوپر

گیا۔ مسلح محافظ میری جارحیت کے جواب میں میری ٹانگ پر گولی مارنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

لالی نے اپنے ہونٹوں پر زبان بھرنے کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور پھر مجھ پر جست لگائی۔ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں جھکا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ مگر اس کے بعد لالی نے غیر انسانی پھرتی کے ساتھ رخ بدلا اور میرے سنبھلنے سے پہلے دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف چھلانگ لگائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اپنے انداز کی غلطی کا احساس ہوتے ہی ہوا میں اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے پیر زمین کو پھوٹے، وہ میری طرف پلٹ گئی۔

لالی کے بازو غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ اس نے مجھے پیچھے سے کمر میں ہاتھ ڈال کے دبوچ لیا۔ میں نے دونوں کھنٹیوں کو پیچھے لے جا کے اس کی پٹلیوں میں مارا۔ لالی کے حلق سے ایک گراہ نکلی اور اس نے مجھے اٹھا کے دوڑ پھینک دیا۔ میں دیوار سے ٹکرایا اور ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ لالی میرے اوپر آگئی۔ اس کا وزن اتنی ہی جسامت کے کسی مرد سے بھی زیادہ تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کے نیچے سے نہ نکل سکا۔

اب لالی مجھ پر سوار تھی۔ اس نے ایک گھٹنے سے میرے شانوں کو ایسے دبا رکھا تھا کہ میرا سانس رگ رہا تھا۔ اس کا دو سرا گھٹنا میری کمر پر تھا۔ میرے لیے اپنے بازوؤں کو موڑنا بھی اتنا ہی مشکل ہو رہا تھا جتنا اپنی ٹانگیں اٹھانا۔ لالی کے جسم کی حیوانی قوت دو طاقتور مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ میرے جسم پر چابک سے بڑے والی کپڑوں نے میری جلد کو زخمی کر دیا تھا اور ان زخموں کی اذیت فرش کی رگڑ سے اور بڑھ گئی تھی۔

میں نے گراہ کے کہا ”خدا کے لیے مجھے چھوڑو۔“

دلنواز نے ولن کے انداز میں قہقہہ لگایا ”بڑی جلدی خدا یاد آگیا تھے داڑھی والے جن۔ اب یہ مجھے چھوڑے گی

میں نے کہا ”دل۔“ نواز۔ میرا دم نکل۔ جانے گا۔“

دلنواز پر کوئی اثر نہیں ہوا ”لالی! اس حرام زادے کو مار۔“

لالی نے ایک دم مجھے دونوں ہاتھوں میں ایسے اٹھالیا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ اس نے مجھے الٹا پکڑ کے ایک دائرے میں گھمایا اور چھوڑ دیا۔ میں کسی بے قابو ہو جانے والے ہوئی جہاز کی طرح اڑتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ میرا سر ایک دھماکے سے دیوار پر لگا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں ستارے سے جھللا گئے۔

میں نیچے گرا تو کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا کیونکہ میرے قدموں کے نیچے زمین ابھی تک گردش میں تھی۔ مجھے وہ کرا بھی گھوٹا ہوا سانس ہوا تھا۔ لالی نے مجھے فرش سے اٹھایا اور اپنا ایک ہاتھ دھب سے میری کمر پر مارا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہاتھ نہیں توپ کا گولہ تھا جس نے میری ریزہ کی بڑی توڑ دی ہے۔ اس نے دو سرا ہاتھ میرے سر کے اوپر مارا تو میری گردن جیسے میرے کندھوں کے درمیان دھنسن گئی اور میرا سر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھوں پیروں کے گرد ٹانگوں کی مضبوط رسی تھی اور میں ایک چارپائی پر الٹا بندھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ سامنے باندھے گئے تھے لیکن چارپائی کا صرف فریم تھا۔ اس کے درمیان میں میرے جسم کو سارا دینے والی کوئی چیز نہ تھی۔ میں چھ فٹ لمبے کٹڑی کے فریم میں الٹا بندھا ہوا تھا اور میرے جسم کا سارا وزن میری کمر پر آگیا تھا۔ میرا چہرہ بیگنا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے مجھ پر پانی ڈالا گیا تھا۔

سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ میرے جسم پر سے ہر چیز اتار لیا گیا تھا۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو لالی مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر موجود تھی اور دلنواز سر ہانے کی طرف ہاتھ میں بنزیر لے کھڑا تھا۔

اس نے اچانک میرے بال پکڑ لیے ”بول تیری۔ تو وہی داڑھی والا جن سے؟ تو نے اغوا کیا تھا مجھے۔“

میں نے بڑی مشکل سے گراہ کے جواب دیا ”دلنواز! تمہیں غلط فہمی۔“

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پٹنگ کی پٹی پر مارا ”تیری غلط فہمی کی۔“ اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکٹڑے کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

کاسر مردو گلے ہو جائے گا۔

لے لے سانس لیتے ہوئے میں نے خدا کو یاد کیا اور اس سے استقامت مانگی۔ اگر میری زندگی کی معیاد پوری ہوگئی ہوگی تو میں اپنی رودنوں میں مریضوں کا ورنہ دو دن بعد پولیس مجھے پھر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی پابند ہوگی۔ رب نواز مجھے دو دن سے زیادہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

دنوں گھنٹوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گیا "شاہ عالم۔ وہ دن گزر گئے جب میرا باپ تیرا محتاج تھا۔ تو اپنے ڈیپوٹک پاسپورٹ پر باہر آتا جاتا تھا تو اس کا مال بھی لے جاتا تھا۔ اب نہ تیری سیاست ہے نہ میرے باپ کو تیری ضرورت۔ اس کا مال تیری مدد کے بغیر بھی آئے گا جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ۔ تو بھی بات ہے۔" اس نے میرے منہ پر ٹھوک دیا "بے غیرت، دغا باز۔ تو نے دوستی کی آڑ میں دشمنی کی ہمارے ساتھ۔ ہمارے خاندان کو مصیبت میں ڈالا، داڑھی والے جن کی اولاد۔"

میں نے کہا "میں کسی داڑھی والے جن کو نہیں جانتا۔" وہ میری داڑھی کو مٹھی میں پکڑ کے زور زور سے جھٹکے دیتے لگا "اب میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ ایسی ہی داڑھی تھی تیرے چہرے پر مگر وہ غلطی تھی۔ اس سے تھوڑی سی بڑی تھی۔ لیکن آج تو اصلی داڑھی میں سامنے آگیا۔ تیری شامت اعمال لے آئی۔"

افیت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے "تم کیا چاہتے ہو آخر؟ چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں ہی داڑھی والا جن تھا۔ تم زبردستی منوانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

"میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تجھے۔" مجھے مار کے کیا لے گا تمہیں۔ سو اسے تسلی کے لیکن تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ پولیس نے مجھے غیر قانونی طور پر تمہارے حوالے کیا ہے۔"

وہ ہنسنے کے مجھ پر جلی پڑا "قانون کی بات کرتا ہے میرے سامنے۔" مسلسل پڑنے والے چابکوں کی مار کی افیت نے بالآخر مجھے ہوش سے بے گانہ کر دیا۔ مجھے پھر ہوش آیا تو میں اسی اندھیرے کمرے میں ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا اور میرے بدن کے ہر حصے سے درد کی تڑپا دینے والی میں اٹھ رہی تھی۔ اب دن نکل آیا تھا۔ میں درد آنسو کے پیچھے سے دن کا اجالا دیکھ سکتا تھا لیکن کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو مجھے پتا چلا کہ وہ نیوٹ لائٹ کی روشنی تھی۔ اس نے خانے میں دن کے اجالے کا کڑر

ہی نہ تھا۔ یہاں ہر وقت رات رہتی تھی۔

ایک بار پھر رب نواز ایک مسلح محافظ اور لالی کے ساتھ اندر آگیا۔ اس نے مجھے ایک بے رحمانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا "وقت تمہارے لیے کتاب بدل گیا ہے شاہ عالم۔ تم جیل میں اسے کلاس مانگنے والے کس حالت میں فرش پر پڑے سبک رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں اپنی مصیبت کو اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتا ہوں۔"

"تمہیں اندازہ ہو جاتا چاہیے کہ میں تمہارا بھتا اچھا دوست تھا اتنا ہی اچھا دشمن بھی تھا۔ دنوں بہت برا دشمن ہے۔ وہ مجھ سے بہت مختلف ہے شاہ عالم۔"

میں نے کہا "یہ بھوت ہے اور بھوت ہی رہے گا خواہ میری زبان اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ میں ہی داڑھی والا جن ہوں۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہاری وجہ سے ہمارا کتنا نقصان ہو چکا ہے۔ اگر تم وہ نقصان پورا کرنے کا وعدہ کرلو تو میں تمہاری رہائی کے لیے کوشش کر سکتا ہوں" رب نواز بولا۔

میں نے صاف انکار کر دیا "میں کوئی وعدہ کیوں کروں جب کہ میں خود بھی ایسے وعدے کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

لالی اپنے ساتھ ایک ٹرے لائی تھی جو اس نے میرے پاس رکھ دی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے لالی کی آنکھوں میں جذبات کی بے رحمی کا حیوانی تاثر باقی نہیں رہا۔ اب اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لالی اپنے دل میں پیدا ہونے والے رحم کے جذبات کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یہ خیال بھی فریب آرزو لگا۔

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔ لالی مجھ پر مہربان ہو جائے اور مجھے رہائی کا کوئی موقع فراہم کر دے۔ وہ ایک غلام تھی اور اس کے لیے آقاؤں کے حکم کے خلاف سوچنا بھی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔

ٹرے میں ایک روٹی تھی جو باسی اور رات کی بجلی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک پانی کا کلاس تھا اور ایک چائے کا کپ۔ مجھے اپنی جیل میں اسیر رکھنے والے نہیں چاہتے تھے کہ میں جسمانی نااطاقی کے سبب قید حیات سے نجات پا سکوں۔

کوئی خواہش نہ ہونے کے باوجود میں نے ٹرے کو خالی کر دیا۔ یہ خدا کی عطا کردہ وہ نعمت تھی جو اس قید خانے میں من و سلوی سے کم نہ تھی۔ اسے ٹھکانا نگران نعمت تھا۔ میرے لیے وہ پورا دن عذاب کی ایک صدی بن گیا تھا۔

میں نے جسمانی تشدد کے وہ سارے مرحلے جھیلے جن کا تصور ممکن تھا۔ دنوں نے کئی بار میرے جسم پر اپنی سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پولیس کے مستقل تمام طریقے آزمائے لیکن مجھ سے یہ کھلانے میں ناکام رہا کہ میں ہی وہ داڑھی والا جن تھا جس نے اسے سونی کے ساتھ مل کے اغوا کیا تھا۔ اسے بھی جیسے خدی ہو گئی تھی کہ یہ میری زبان سے سن کے رہے گا۔ اس نے میرے جسم کے زخموں پر ٹھک مریخ والا پانی ڈالا۔ مجھے مریخ کی دھول دی۔ مجھے سج ٹھنڈے پانی میں ڈبوایا اور میرے جسم کو سکرینوں سے دغا۔ اس افیت ناک عمل کے دوران میں کئی بار بے ہوش ہوا اور دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خدا سے استقامت کے سوا کچھ نہیں مانگا۔

بالآخر یہ عذاب مرحلہ تمام ہوا۔ آخری بار جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی بیڈ روم میں تھا اور میرے جسم پر صاف ستھرے کپڑے تھے۔ میری جسمانی حالت بھی بہتر تھی اور میری افیت بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ غالباً میرے جسم پر زخموں کو مندل کرنے والی دواؤں کا لپ کیا گیا تھا اور مجھے درد کش دوائیں انجکشن کے ذریعے دی گئی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ اب مجھے پولیس کو واپس کرنے کا وقت قریب ہے۔ قانونی طور پر رب نواز مجھے صحیح سلامت واپس کرنے کا پابند تھا۔ جب میں اس کے حوالے کیا گیا تھا تو میرے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا مگر اب میرا پورا جسم افیت رسائی کی روٹنے کھڑے کرنے والی کامیاب تھا۔ لیکن اس سے رب نواز یا اس کے بیٹے کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ انہوں نے پیسہ خرچ کر کے مجھے پولیس سے خرید لیا تھا اور ریمانڈ کے دو دنوں میں ایذا رسانی کے وہ سب طریقے آزمائے تھے جو پولیس تھانوں میں اعتراف جرم کرانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ الزام اگر آتا تو پولیس پر۔ پولیس جسمانی ریمانڈ کے پیریڈ میں تعیش کیے کرتی ہے۔ یہ عدالتوں کے علم میں بھی تھا چنانچہ اب کسی زیر تعیش ملزم کی خراب حالت دیکھ کے بیشتر عدالتوں کا رد عمل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

اگر عدالتیں سختی سے قانون پر عمل درآمد کرتے ہوئے پولیس کو تھوڑا ڈر کی کے حربے استعمال کرنے سے واقعی روک دیں تو شاید جتنے جرائم کا سراغ اب مل جاتا ہے اس سے نصف میں بھی پولیس کو کامیابی نہ ہو لیکن معاشرے میں ارتکاب جرم کی شرح دگنی ہو جائے۔ مجرم جیل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تعیش کے دوران پولیس کی حراست سے ڈرتے ہیں۔

رات کے وقت رب نواز پھر مسلح محافظ کے ساتھ آیا

اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم بہت خدی آوی ہو" تم مر بھی سکتے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر میری قضا آگئی ہوتی۔" وہ بولا "دنوں کا یقین ہے کہ تم ہی وہ داڑھی والے جن ہو۔"

"اور تمہیں؟" "اس کے لیٹن کو دیکھتے ہوئے میں بھی ایسا ہی سمجھنے پر مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "گویا تمہاری بھی ضد ہے کہ مجھ سے منوا کے دم لو گے۔"

وہ بولا "دنوں نے حساب لگایا ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمیں اس چھ لاکھ پاؤنڈز کے علاوہ کم سے کم ایک کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کے بھی پاکستانی کرنسی میں تقریباً پونے تین کروڑ بنتے ہیں۔ اگر تم چار کروڑ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کرو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔"

"اور اگر میں نہ مانوں تو؟"

"پھر تم ہمیشہ مشکل میں رہو گے۔ ابھی تو تم صرف دو دن کے مہمان تھے۔ صبح مجسٹریٹ تمہیں جوبائیل ریمانڈ پر جیل بھیج دے گا۔ جس طرح پولیس میری مرضی کے تابع ہے اسی طرح جیل میں بھی میری مرضی چلتی ہے۔ تم کو شاید اپنی دولت پر بھروسہ ہوگا۔ یا پھر قانون پر۔ لیکن تمہارے لیے نہ اے کلاس ہوگی نہ بی۔ تم سی کلاس میں عام مجرموں سے بدتر حالات میں زندگی گزارو گے اور جو کچھ تمہارے ساتھ جیل میں ہوگا اس کی خبر کوئی باہر پہنچانے والا نہیں ہوگا۔ تمہارے اخباری دوست تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

جو کچھ رب نواز کہہ رہا تھا، غلط نہیں تھا۔ وہ جیل کے اندر میری زندگی کو عذاب کا جنم بنا سکتا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جیل کے اندر کی دنیا کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ رب نواز کی چار کروڑ ادا کرنے کے وعدے والی بات احقانہ اور مضحکہ خیز ضرور تھی مگر صرف ایک وعدے پر میری نجات ممکن ہو اس سے اچھی بات بھی کون سی ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا "چار کروڑ میں کیسے ادا کروں گا؟ میرا مطلب ہے اگر میں نے وعدہ کر کے جان چھڑائی؟"

وہ معنی خیز انداز میں سرہلانے لگا "تم نے اچھا کیا پوچھ لیا۔ رب نواز کچی گولیاں نہیں کھیتا۔ تم پہلے بھی میرے مقروض تھے مگر اس وقت ہمارے درمیان ایک کاوباری معاہدہ تھا۔ اب میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں تم سے

مختلف تاریخوں کے اشامپ پیپر زیر انگریزی منٹ کروں گا جس کی رو سے تم مجھے مجموعی طور پر چار گروڑ روپے ادا کرنے کے پابند رہو گے۔ تم بہت سی رسیدوں پر دستخط کرو گے اور میری مرضی کے مطابق تاریخیں ڈالو گے۔ اگر بعد میں تم نے اوائلی منٹ کی تو دوسرے وصولی کے طریقے اپنی جگہ۔ میں تمہارے خلاف سول سوٹ فائل کروں گا۔ اس میں جتنا وقت چاہے لگے لیکن بالآخر مجھے تمہارے خلاف ڈگری مل جائے گی۔

”تم اس ڈگری کا کیا کرو گے؟“

وہ بولا ”میں تمہارے بینک اکاؤنٹ منجمد کرا سکتا ہوں۔ تمہیں جیل بھجوا سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”چار گروڑ روپے ادا کرتے کرتے میری ساری زندگی گزر جائے گی۔“

”جھوٹ مت بولو۔ یہ چند سو دوں کا کھیل ہے۔ اگر تم اپنے جیسے کا منافع بھی میرے حوالے کرو تو زیادہ سے زیادہ آٹھ سال میں قرض ادا ہو جائے گا۔“

میں نے ذہنی مزاحمت جاری رکھی تاکہ اسے شک نہ ہو ورنہ چار گروڑ کیا وہ چار ارب کا قرض ادا کرنے کے وعدے پر میری جان چھوڑ دیتا تو میں آٹھ ہند کر کے ہر دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے کہا ”میرا سالانہ منافع اتنا تو نہیں ہوتا۔“

وہ بولا ”ایک طرف سے اور ہے۔ ابھی تک اس کا دوبار میں سارا سرمایہ میرا تھا۔ اگر تم ایک بار ٹرین جاؤ۔“

”یاد نہ تو میں ہوں۔“

”ابھی تم درکنگ بار ٹرین ہو۔ اگر اتنا ہی سرمایہ تمہارا ہو جتنا میرا ہے تو تمہارا کام دیکھنا ہو جائے گا۔ مال کی فکر مت کرو۔ لینڈ میں سلاز زیادہ ہوتے جا رہے ہیں اور مارکیٹ بھی اونچن ہوتی جا رہی ہے۔ قیمت بھی پہلے سے اچھی مل رہی ہے۔ اس لیے منافع بڑھنے کی توقع ہے۔ تم دو سال میں بھی فارغ ہو سکتے ہو۔“

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں سوچ میں پڑ گیا ہوں اور اس پیش کش پر غور کر رہا ہوں۔ بالآخر میں نے کہا ”مجھے یقین ہے کہ تم نے تمام امکانات پر غور کر لیا ہو گا۔“

مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی خوشی کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ”میں نے سب سوچ لیا ہے لیکن فیصلہ تمہارا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم رادھراؤ مرحمت جاؤ۔ پیر بھان شاد جیسے بہت سے لوگوں کی میرے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ بہت سے نئے لوگ بھی میدان میں آ رہے ہیں مگر تم دیکھنا ان

میں سے کوئی نکلے والا نہیں ہے۔ وہ خود نکل جائیں گے ورنہ میں انہیں بھاگنے پر مجبور کروں گا۔“

میں نے کہا ”تم پھر مجھ پر اعتبار کر رہے ہو۔“

”اس کے لیے تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ تمہارا سیاست کا کھیل تو اب ختم ہوا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ اگر تم خود سیاست چھوڑ کے اپنی ساری توجہ کاروبار پر دو تو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سیاست سے کہیں زیادہ منافع بخش پیشہ ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں نے پہلے بیہ کمایا پھر سیاست میں آیا اور سیاست کو بزنس پروموشن کے لیے استعمال کیا۔ تم نے اس کا الٹ کیا اور نقصان میں رہے۔ خیر اب تم اپنی پوری کوشش کرو تو تم سے کم اپنے مالی بحران پر ضرور قابو پاؤ گے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے حالات بالآخر ٹھیک ہو جائیں گے۔“

رب نواز نے آہستہ آہستہ اپنا تحکمانہ انداز برتری اور اپنی بالادستی کا غور چھوڑ کے کچھ تصحانہ اور بزرگانہ انداز اختیار کر لیا تھا اور ظاہر یہ ہوتا تھا جیسے اس سے بڑھ کر میرا خیر خواہ کوئی بھی نہیں ہو سکتا حالانکہ ایک تو اسے اپنے ذوق جانے والے سرمائے کی فکر تھی تو دوسری طرف اپنی کمزور قانونی پوزیشن کا احساس تھا۔ وہ میرے ذریعے ایک ایسی بازی کوئی حکمت عملی سے جیتنے کی پلاننگ کر رہا تھا جو بظاہر اس کی باریک طرف جاری تھی۔ وہ تین چار گروڑ کے پھیر میں آچکا تھا مگر اپنا ہاتھ اوپر رکھتے ہوئے مجھے زیر دام لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اسے قرض مان لوں اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کر لوں۔

میں نے بہت ”بے وقوف“ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بالآخر اپنی رضامندی کا اظہار ایسے کیا جیسے مجبوری نے میرے لیے انکار کے سب راستے مسدود کر دیے ہیں۔ ملک رب نواز کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا لیکن اس نے جرے سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اور اس کے ہونہار سپوت نے موقع سے دہرا فائدہ اٹھالیا۔ انہوں نے اپنی بد معاشی کی بے حد حساب طاقت کا مظاہرہ کر کے مجھے دہشت زدہ بھی کر دیا اور اپنے مرتبانہ رویے سے مجھے قائل کر کے صراطِ مستقیم بھی دکھا دی۔

ہونہار سپوت ایک بار پھر میدانِ عمل میں نظر آیا۔ بظاہر اس نے اپنے والد کی عاقبت نا اندیشی والی پالیسی سے اختلاف کیا جو میرے جیسے محسنِ بخش اور بے اعتبار شخص کو تیسری بار ”سندھرنے“ کا موقع فراہم کر کے بڑی فاش غلطی کر رہے تھے اور یہ موقوف بھی دہرایا کہ مومن ایک سوراخ

سے دوبار نہیں ڈسا جاتا اور والد صاحب نے فرمایا کہ اس دور پر آشوب میں مومن کون ہے؟ بزنس میں اونچ نیچ ہوتی ہے اور حالات کی خرابی کو مزید خرابی کی طرف لے جانے میں دانش مندی کوئی نہیں۔

اگلی صبح مجھے پھر مجسٹریٹ کی عدالت میں پیشی کے لیے جانا تھا لیکن حالات کچھ ایسے بدلے تھے کہ نصف شب کو ایک سہ فریقی مذاکرات کا دور ہوا جس میں میرے اور رب نواز کے ساتھ ایس ایچ او سلامت علی بھی شریک رہا۔ طے یہ پایا کہ پولیس میرا مزید تین دن کا رہنما لے گی تاہم اس کے لیے میرا شخص نہیں پیش ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اگر میرا وکیل اعتراض نہ کرے تو وہ صبح مجسٹریٹ کے جج پرستہ مزید تین دن کے لیے رہنما کے احکامات حاصل کر لے گا اور میں مزید تین دن ملک صاحب کا مسلمان رہوں گا۔

سب کچھ طے ہو جانے کے بعد میں نے ایک نکتہ اٹھایا۔ ”ملک رب نواز مجھے تمہارے پلان کے مطابق چلنے میں اصولی طور پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عملی طور پر یہ کیسے ہو گا۔ تین دن بعد مجھے جیل بھیج دیا جائے گا اور میرے خلاف قتل کے دو مقدمات شروع ہو جائیں گے۔ تیسرا مقدمہ میرے شناخت توڑ کے فرار ہونے کا ہے۔“

رب نواز نے سوچ کے کہا ”تمہارا وکیل کیا کہتا ہے؟“

میں نے کہا ”وہ کہتا ہے قتل کے مقدمات میں کوئی جان نہیں مگر اس کیس میں مجھے سزا ہو سکتی ہے جس کا تعلق سماعت کے دوران میں کورٹ کی اجازت کے بغیر لندن جانے سے ہے۔ میں دو سال مفقود رہا۔“

رب نواز نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا ”اس کیس میں کیا ہو سکتا ہے؟“

”شاہ جی عدالت سے معافی مانگ لیں اور خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو عدالت معاف بھی کر سکتی ہے۔“

میں نے کہا ”عدالت معاف نہیں کرے گی۔“

”تو تم سے کم سزا دے سکتی ہے۔ صرف چھ مہینے چھ مہینے تو ایسے ہی گزر جائیں گے سماعت میں اور جتنا عرصہ تم جیل میں گزارو گے وہ سزا کی مدت میں شامل ہو گا۔“

میں نے کہا ”یعنی مجھے جیل ضرور جانا پڑے گا۔“

”اگر تمہارا وکیل عدالت کے باہر دھوکے پر کھڑے اور اچھا خاصہ پیسہ خرچ کیا جائے کیس کو کمزور کرنے کے لیے تو چار چھ جیشیوں میں قتل کے مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ فرار کے کیس میں تمہیں ایک سال کی جیل ہو تو چھ مہینے میں تم باہر آ جاؤ گے۔ چھ مہینے تمہیں بہر صورت اندر رہنا پڑے

گا۔“

میں نے کہا ”ایسی کوئی صورت نہیں ملک صاحب کہ میں جیل نہ جاؤں؟“

رب نواز نے کہا ”شاہ جی عدالت کی کوئی بات نہیں جیل میں تمہیں اسے کلاس بھی مل سکتی ہے۔ بالی گھر جی سولت تم خود حاصل کر سکتے ہو۔ شاہ جی جیل تو ہوتی ہے مفلس اور لاوارث کے لیے۔ ورنہ سزا کا صرف نام ہوتا ہے۔ لوگ دن میں ایک بار وہاں حاضری لگوانے جاتے ہیں۔ ہر رات اپنے گھر میں آرام سے سوتے ہیں۔ ٹیلی فون، ٹیلی وژن اور اخبارات، نوکر چاکر، سب تمہارے پاس ہوں گے۔ بس چھ مہینے پورے کرتے ہیں۔“

میں نے مردہ دلی سے کہا ”یعنی چھ مہینے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”چھ مہینے تم آرام کر سکتے ہو“ سلامت علی طنز سے بولا۔ تمام معاملات طے پانے کے بعد میں نے خود کو بہت براعتِ سنس کیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ اب میرے ساتھ ملک رب نواز کے گھر میں دوستانہ سلوک ہو گا اور میری نگرانی پہلے جیسی سخت نہیں رہے گی تو مجھے فرار کے مواقع بھی حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ توقع سے بڑھ کر توقع رکھنے والی بات غلط ثابت ہوئی۔ رب نواز ایک غلطی ضرور کر رہا تھا مگر وہ اتنا بھی احمق نہیں تھا کہ مجھے آزاد کر دیتا۔ مجھ پر مسلح پراسی رہا اور میری نقل و حرکت اپنے بیلڈ روم تک محدود رہی۔

صبح میں نے فرید عباسی سے فون پر کہا کہ وہ عدالت میں میری پیشی پر اصرار نہ کرے ”پولیس آج میرا مزید تین دن کا فزیکل رہنما لے گی۔“

”لیکن تو ہے کماں؟“

میں نے کہا ”میں ملک رب نواز کے ذریعے پر ہوں۔“

”کیوں؟ مجھے پولیس نے وہاں کیوں پہنچا دیا؟“

میں نے کہا ”تو فکر مت کر۔ حالات صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔“

وہ بولا ”کوئی تجھ سے گمن پوائنٹ پر یہ سب کھلوا رہا ہے؟“

”ہرگز نہیں کیا تو میرے لیے سے اندازہ نہیں کر سکتا؟“

باقی سب لوگوں کو بھی بتا دیتا کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں پھر سب سے ملاقات ہوگی۔ فی الحال کوئی کچھ بھی نہ کرے۔“

فرید عباسی خاموش ہو گیا۔ اس نے بڑی دوراندیشی سے

کام لیا کہ شک پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں کی۔ اس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ جب میں رب نواز کے ڈیرے سے بات کر رہا ہوں تو یہ گفتگو رب نواز بھی سن رہا ہو گا۔

میں سارا دن ایک گھرے میں رہا۔ وہ ملک رب نوازی حویلی کا مہمان خانہ یعنی گیسٹ ہاؤس تھا۔ ظاہر ہے وہاں آرام و آسائش کے تمام لوازمات مہیا تھے اور کسی بھی چیز کے لیے میرا ایک اشارہ کافی تھا مگر اس کے باوجود میری حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔ ایک مسلح محافظ ہر وقت میرے سامنے بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا رہتا تھا اور اسے یقیناً یہ ہدایات ہوں گی کہ میں ہاتھ دھو کر دروازے کے علاوہ کسی اور دروازے کا رخ نہ کروں تو مجھے روک دے اور میرے نہ رکنے کی صورت میں مجھ پر گولی چلانے سے دریغ نہ کرے۔ بے شک اسے یہ ہدایات بھی دی گئی ہوں گی کہ گولی چلاتے وقت وہ صرف میرے پیروں کو نشانہ بنائے۔ رب نواز اس بات کا پابند تھا کہ مجھے زندہ سلامت سلامت علی کو لوٹائے۔

ایک نرس اور ایک ڈاکٹر نے مجھے ہر ممکن علاج معالجے کی سہولت فراہم کی۔ نرس سارا دن وہیں موجود رہی۔ ڈاکٹر تین بار آیا اور مجھے مختلف دواؤں کے انجکشن لگا کے چلا گیا۔ میری صحت جیت اگلیز تیز رفتاری کے ساتھ بحال ہو رہی تھی اور میرے زخم مندرل ہونے لگے تھے۔

مجھے ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ میں نرس کو پر غلام بناؤں اور پھر مقابلہ کروں کہ مجھے بحفاظت باہر نکلنے دیا جائے ورنہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ لیکن مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ ملک رب نواز کے لیے ایک نرس کی زندگی کی اتنی اہمیت ہوگی۔ چنانچہ میں نے بہتر اور مناسب موقع کا انتظار کیا۔

اگلے دن ایک وکیل نے رب نوازی موجودگی میں مجھ سے ملاقات کی۔ اس کے پاس گزشتہ دو سالوں کی تاریخ والے مختلف مالیت کے اسٹامپ پیپر تھے جن پر مختلف عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں پڑھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا کہ میں یہ زحمت نہ کروں۔ جو عبارت ایک پر تحریر ہے وہی دوسرے اسٹامپ پیپر کی ہے۔ صرف اس کی تاریخ الگ ہے اور اس میں قرض کی رقم مختلف ہے۔

ان تمام اسٹامپ پیپر کی رو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ میں نے یعنی شاہ عالم ولد محمد عالم نے مختلف مقامات کے لیے الگ الگ مواقع پر ملک رب نواز ولد ملک شاہ نواز سے قرض حاصل کیا۔ اس نے مجھ سے میں جنچیس رسیدوں پر دستخط لیے۔ ان پر گواہوں کے دستخط نہیں تھے ہمیں رب نواز نے

کہا کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں اور ضرورت پڑی تو دستخط کرنے والے بہت۔

میں نے ایسی مظلوم صورت بنائے رکھی جیسے میرے ساتھ زور زبردستی سے کام لیا جا رہا ہے اور میں دستخط کرنے پر مجبور ہوں ورنہ کاغذات بھاڑ کے ملک رب نواز کے منہ پر پارتا اور نکل جاتا۔ ہر انگریز منٹ کے ساتھ ایک رسید تھی۔ کم سے کم رسید دس لاکھ کی تھی اور زیادہ سے زیادہ جنچیس لاکھ کی۔ ان کی مجموعی مالیت مجھے بتایا گیا۔ تین کروڑ نوے لاکھ بنتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ خود ملک رب نواز بھی اس کاغذی کارروائی کی قانونی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتا ہو گا۔ کوئی شخص اگر سارے معاملہوں سے منکر ہو جائے تو اس کے خلاف دعوئی کے لیے دیوانی مقدمات دائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا اور تین کروڑ نوے لاکھ کی مالیت ہو تو مقدمہ صرف ہائی کورٹ میں جاسکتا ہے لیکن الگ الگ معاملے کرنے کا مقصد یہی تھا کہ جنچیس لاکھ تک کا مقدمہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں پیش کیا جاسکے۔ اس پر لاکھوں روپے مالیت کی اسٹامپ ڈیوٹی لازمی تھی اس کے لیے لاکھوں روپے وکیل کی فیس میں دینے کے باوجود سالہا سال کا انتظار بھی ناگزیر تھا۔ اس کے بعد ایک چانس ضرور تھا کہ میرے خلاف مجموعی مالیت کی ڈگری لی جاسکے اور وصولی کے لیے میری جائیداد اور اثاثے نیلام کرا کے اور میرے چیک اکاؤنٹ ضبط کرا کے عدالتی احکامات پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔ اگر ملک رب نواز یہ چانس لینا چاہتا تھا تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بصورت دیگر ملک رب نواز مجھے اذیت دیتا رہتا مواد و کتاب بھی اسے کیا ملتا۔

اس رات میں نے رہائی کے لیے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں اس کے لیے حالات زیادہ سازگار تھے ورنہ اگلی صبح عدالت کا دروازہ ہوا چھ دن کا فزیکل ریمانڈ ختم ہو جاتا تو پولیس کی تحویل سے نکل کے میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل حکام کے حوالے کر دیا جاتا۔ بے شک پولیس کی حراست کے بعد بیشتر لمبان کے لیے جوڈیشل ریمانڈ ایک بڑے عذاب کے جنم سے بہت کمزور رہے کے جنم میں منتقلی ہوتی ہے مگر میرے لیے یہ آسمان سے گرے گھوڑ میں اٹکنے کے مترادف ہوتا۔ پولیس کی حراست سے بھی فرار ہونا یقیناً آسمان نہ تھا مگر جیل سے فرار ہونا تو عملاً ناممکن ہو جاتا۔

سب سے اچھے مواقع مجھے ملک رب نواز کے گیسٹ ہاؤس میں حاصل تھے۔ رب نواز کوئی رسک نہیں لے رہا تھا

مگر میں مایوس نہیں تھا۔ میں نے کسی حد تک اپنے ذہن میں ایک پلان کو حتمی شکل دے دی تھی جس کے مطابق مجھے پہلے لالی کو قابو کرنا تھا۔ جو در حقیقت شاہ جنت کی بیٹی کو قابو کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ وہ مجھ سے کئی گنا طاقتور اور پھرتیلی تھی اور مردانہ وار بلکہ حیوانہ وار میرا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن میں نے اس کی کمزوریاں بھی ناٹ لی تھیں اور اب مجھے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

یہ موقع مجھے رات گئے ملا جب لالی میرے طلب کرنے پر کافی لے کر آئی۔ باہر سے اس کے آنے کی آہٹ سن کر میں سو آہن گیا۔ اس نے کافی کامک میرے قریب ایک میز پر رکھا اور کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑی رہی۔ اس کے ساتھ محافظ بن کے آنے والا کلا شکوف کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔

"کافی منگوا کے سو گیا۔" لالی نے عجیب سی غراہٹ کے ساتھ حلق سے آواز نکالی۔

محافظ نے کہا "سو گیا ہے تو جگاؤ۔"

لالی مجھ پر چمکی۔ اس کا ایک بازو میرے بازو پر جم گیا۔ میں نے خدا کا نام لے کر اسے ایک دم دبوچ لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ گارڈ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر پاتا میں نے لالی کو اس کے اوپر پھینک دیا۔ وہ چھ فٹ قد اور دو سو پاونڈ وزن کی اس مخلوق کے اچانک اوپر اڑنے سے سنبھل نہ پایا۔ وہ اپنی کلا شکوف سمیت نیچے دب گیا۔

میں نے بندرے سے ہست لگائی اور ان دونوں کے اوپر جا ہرا۔ وہ ابھی اٹھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ دوبارہ ٹرگے۔ میرا ہاتھ سیدھا کلا شکوف پر گیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

لالی بڑی پھرتی کے ساتھ اٹھ کے پلٹی تو میں بائیں پیروں پر اڑی ہو کر اٹھ گیا اور اپنا دایاں پیروں گھما کے لالی کے پیٹ پر رسید کیا۔ اس نے حلق سے ایک خوفناک غراہٹ کی آواز نکالی اور ٹوکڑا کے پیچھے ہٹی تو خالی ہاتھ رہ جانے والے گارڈ سے ٹکرائی جو مجھ پر حملہ کرنے کے لیے آگے آ رہا تھا۔ گارڈ دیوار سے ٹکرایا تو اس کا سر تیز آواز کے ساتھ دیوار پر لگا۔

لالی پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے دونوں بازو بڑے وحشتانہ انداز میں مجھے دبوچ لینے کے لیے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ میں ایک دم بیٹھ گیا اور نیچے سے کلا شکوف کا فولادی ہٹ پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے پیٹ میں سرمارنے ہوئے اسے اوپر

اٹھایا۔ وہ ایک جھج مار کے میرے اوپر سے گزری اور بیڈ سے ٹکرا کے فرش پر گر گئی۔

اب گارڈ میرے سامنے آگیا۔ میں نے کلا شکوف کا دست اس کے سر پر رسید کیا تو اس کی ایک ہی جھج نکلی پھر وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ہٹ کے دیکھا تو لالی مجھ پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا تھا اور اس کے وحشتانہ قوت رکھنے والے لمبے لمبے بازو مجھے بے بس کر رہے تھے۔

لالی نے مجھے دبان شروع کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری سانس رک جائے گی۔ میں نے ایک ہاتھ کی گننی پیچھے سے اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ پھر ایک پاؤں کی ایزی سے پیچھے کی طرف اس کی ٹانگوں کے بیچ میں شدید ضرب لگائی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کے بوجھ کو اپنی کمر پر اٹھالیا اور ایک دم آگے جھک گیا۔ میں نے اور آگے جھک کر سر کو زمین کی طرف پوں جھکا لیا۔ پیچھے میں سر کے بل قلابازی کھانے والا ہوں۔ لالی کا بوجھ آگے شفٹ ہوا تو میں نے سر زمین پر نکال کے ایک جھٹکا لیا اور لالی کی

گرفت سے نکل گیا۔ وہ کر کے بل سیدھی آگے گری اور ابھی پلٹی ہی تھی کہ میں نے کلا شکوف کا دست پوری قوت کے ساتھ اس کے سر پر مارا۔ سر کے پھٹنے سے اس کے پڑنے والی یہ ضرب فیصلہ کن ثابت ہوئی اور لالی ایک بھیاںک جھج کے ساتھ نیچے گر کے ساکت ہو گئی۔

اب صورت حال میرے کنٹرول میں تھی لیکن لالی نے اپنے حلق سے جھکی جانوروں جیسی آواز سن نکال کے مجھے کچھ تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گھر میں رہنے والوں کے کانوں تک بھی یہ جھج پکار گئی ہو۔

وقت ضائع کیے بغیر میں کلا شکوف اٹھا کے باہر نکلا اور سیدھا زینے کی طرف دوڑا۔ اس گھر کا نقشہ میرے ذہن میں تھا اور میں اب ایک پلان کے مطابق چل رہا تھا لیکن زینے سے اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ اوپر والا دروازہ باہر کی طرف سے لاگ ہے۔

میں نے دروازے پر دستک دی اور لالی جیسی آواز نکالنے کی کوشش کی "دروازہ کھول۔"

باہر سے کسی نے کہا "کون ہے؟"

میں نے کہا "میں ہوں۔ لالی!"

چند سیکنڈ گزر گئے انہی چند سیکنڈوں میں میری کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔

انتظار کے وہ چند سینکڑ ایک طویل عذاب ناک مرحلہ بن گئے۔ میں سانس روکے دروازے کے کھلنے کا منتظر رہا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں دروازے کی کسی جھری سے گاڑ اندر جھانک کے نہ دیکھ لے اور کامیابی کے سفر منزل کی جانب اٹھایا جائے والا پہلا قدم ہی ناکامی کی نذر ہو جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

باہر سے کسی نے دروازہ کھول کے اپنا سر اندر ڈالا اور بولا "کون ہے؟"

میں نے کہا "تمہارا اور بیٹن باپ" اور سر کو بالوں سے پکڑ کے ایک جھٹکے سے اندر کھینچ لیا۔ اس کے حلق سے گالی نکلے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر اس کا جسم نیچے اترنے والی میز پر اتنا جھک گیا تھا کہ اب میں بھی اسے لڑھک کر نیچے جانے سے نہیں بچا سکتا تھا۔

وہ منہ کے بل یوں زبے پر گرا کہ اس کا سر نیچے کی طرف تھا اور کشش ثقل اسے مسلسل آگے کی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جانے والی کلا شکوف اس کے پیچھے جا رہی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔

سیکھوئی گاڑ کا منہ زینے کی دھار پر سیدھا لگا تھا۔ اس کے سامنے والے سارے دانت ٹوٹ گئے تھے اور غالباً ناک کی بڑی بھی سلامت نہیں رہی تھی۔ وہ اذیت سے چلایا "ہائے میں مر گیا" مگر پھر اس کا سر اگلی میز چھو سے ٹکرایا تو وہ خاموش ہو گیا اور پھر آخر تک کسی بے جان لاش کی طرح گیا۔

مجھے شک ہوا کہ گاڑ غالباً گردن کی بڑی کے ٹوٹ جانے سے مر گیا ہے کیونکہ زینے سے فرش پر پیچنے کے بعد وہ بڑے عجیب انداز میں مڑا تھا اور بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر اتنا زیادہ پیچھے کی طرف گھوم گیا تھا کہ گردن کی بڑی سلامت ہوتی تو ایسے ناممکن زاویے پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا لیکن وہ عدالت کی بساط پر کام آجانے والا ایک حقیر زیادہ تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ جیونہا تھا جو ہاتھوں کی جنگ میں بیروں تلے سسلے بھی جاتے ہیں۔ زندہ رہنے اور جسم و جان کا رشتہ استوار رکھنے کی مشکل نے اسے ملک رب نواز کے در کی تمباکی پر مجبور کر دیا تھا جہاں خطرات کو ملک صاحب کی ذات سے دور رکھنے میں اپنی جان کی بازی لگانا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔

دروازے سے گزر کے میں نے گراؤنڈ فلور پر قدم رکھا تو میرے سامنے ایک اسٹور آگیا جہاں ہر قسم کا پرانا اور غیر ضروری سامان ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ سامان میں ایک آفس چیئر

ایک ایکسر سائز مشین، کسی کیسیکل کا گھرا نیلام ڈرہم چھوٹے بچوں کی دو پرانی سائیکلیں، دیوار کے سارے کھڑے ہوئے دو اسپرنگ والے میٹرلر جو درمیان سے کچھ دب گئے تھے۔ ایک بیڈرشل لمپ اور رائٹنگ ٹیبل کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔

میں ان چیزوں سے بچتا بچتا اس دروازے تک گیا جس کے بائیں جانب ایک طویل کارڈ بورڈ نظر آ رہا تھا۔ اسٹور اس کے بالکل آخری حصے میں تھا چنانچہ میں دائیں جانب لوہے کی گرل والی ایک کھڑکی دیکھ سکتا تھا جس کے شیشوں والے پٹ کبھی کھولے نہیں گئے تھے۔ ان پر میزوں کا یا شاید سالوں کا گرد و غبار جمع تھا۔ پیلے شیشوں سے باہر کا دھندلا سا اجالا جھلک رہا تھا۔ گرل اور فریم کے درمیان میزوں کے ان گنت جالے تھے اور کوڑا کچرا تھا۔ میرے لیے اس کھڑکی کو کھول کے باہر کے منظر کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔

کوڑیور میں مجھے دائیں طرف تین اور بائیں طرف چار دروازے نظر آ رہے تھے۔ دائیں جانب کے دروازے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے لوگوں کے بات کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دھیان سے سنا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بچن تھا۔ وہاں برتن اٹھا کے رکھے جا رہے تھے اور ملازم ایک دوسرے سے فحش مذاق کر رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا "جلدی کر حرامی ورنہ ملک صاحب تجھے گولی مار دیں گے" اور جواب میں دوسرے نے کہا "تو اپنا کام کر۔ چائے دم ہوگی تو لے کر جاؤں گا یا ایسے ہی گرم پانی لے جا کے سامنے رکھ دوں؟"

میں نے سکون کے ساتھ مناسب موقع کا انتظار کرنے میں خیریت جانی۔ میں اس وقت ایک فیصد کے چانس پر بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ چند منٹ کے بعد ایک باوردی وینر چائے کی زبانی دھکیلتا ہوا نکلا اور کارڈ بورڈ میں میری طرف پیٹھ کر کے چلنے لگا۔ اس نے بائیں جانب کا آخری دروازہ کھولا اور زبانی سمیت اندر غائب ہو گیا۔

میرے کانوں میں بلند آواز میں باتیں کرنے اور کسی کے زور سے قہقہہ لگانے کی آواز کے ساتھ کسی عورت کے خفگی سے چلانے کی آواز آئی "اتنی دیر کروی چائے لائے میں" میں سمجھ گیا کہ وہ ڈرائنگ روم ہے کیونکہ عورت کی آواز سے میں نے ملکانی کو پہچان لیا تھا۔ وہاں شاید ان کے مہمان جمع تھے جو بے فکری سے کہیں لگا رہے تھے۔

وینر کچھ دیر بعد خالی ہاتھ واپس آگیا۔ بچن میں تین ملازم تھے جو اب خاموشی سے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نکلا اور کوڑیور سے سیدھا گزرتا چلا گیا۔ باقی دو میں سے ایک چند منٹ بعد برآمد ہوا اور بالکل ساتھ والے دروازے میں ٹھہر گیا۔ جب وہ برآمد ہوا تو اپنی شلوار کا اندر بند باندھ رہا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ دوسرا دروازہ ملازمین کے استعمال میں رہنے والے ہاتھ روم کا تھا۔ بچن کے سامنے سے گزرنے بغیر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن بچن میں تین افراد موجود تھے اور یہ ناممکن تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر بھی مجھ پر نہ پڑے۔ میں نے کسی وینر سے وردی اتار کے خود پہنے اور پچیس بدل کے نکل جانے کے امکانات کا جائزہ لیا اور اس خیال کو مسترد کرنے پر مجبور ہوا۔ ملازموں میں سے ایک بھی میری طرح جارح نہیں تھا۔ طویل کارڈ بورڈ کو عبور کرتے ہوئے کسی بھی لمحے میرا سامنا گھر کے اس مالک سے ہو جاتا تو شور مچ جاتا۔

میرے ہاتھوں ایک بے تصور محافظ پہلے ہی ہلاک ہو چکا تھا۔ اب میں کلا شکوف کا استعمال صرف ڈرانے کے لیے اور اپنا راستہ صاف مانگنے کے لیے کرنا چاہتا تھا لیکن ملک رب نواز کے جال ٹارن اور محاذوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ منہ بے باز آئیں۔ وہ سب مسلح تھے اور ایسے ہی مواقع پر ان کی نمک حلائی اور وفاداری کی آزمائش ہوتی تھی۔ اگر وہ مجھ سے ڈر کے راستہ چھوڑ دیتے یا اپنی جان بچانے کے لیے کسی محفوظ کونے کھد رے میں دھک جاتے تو یہ زبانی اور نااہلی انہیں بعد میں بہت مہنگی پڑتی چنانچہ یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ مقابلہ ہوگا اور صرف ایک دوسرے کو ڈرا کے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہوگا۔ یہاں فرار کے راستے بھی نہیں تھے چنانچہ سامنے آجانے والے مرنے یا مارنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک مجھے یاد آگیا۔ یہ مجھے ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کرنے والے تھا نا انچارج انسپٹر سلامت علی کی آواز تھی۔ شاید وہ اپنے قیدی کو واپس لے جانے کے لیے آگیا تھا۔ مزم زہر حراست شاہ عالم کا مزید تین یوم کا رہائش حاصل کرنے کے لیے اسے جھپٹ کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب بہت واضح تھا۔ کچھ ہی دیر میں میرے فرار کا راز فاش ہونے والا تھا لیکن میری یہ حالت تھی کہ میں اپنی کوٹھری سے نکل کر زندان کی دیواروں کے اندر ہی جھپک رہا تھا۔ میرا دوبارہ پکڑا جانا یقینی تھا اور اس بار میری گرفتاری

زیادہ ٹھیک الزامات کی بنیاد پر ہوتی۔ میں نے لالی کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ ایک محافظ کو بے ہوش کر دیا تھا اور دوسرے کو مار ڈالا تھا۔

قانونی طور پر میں پولیس کی تحویل میں اور تھانے میں بند تھا چنانچہ ملک رب نواز کے گھر کی کسی واردات میں مجھے ملوث کرنا خود سلامت علی کو بھی مشکل میں ڈال دیتا مگر وہ گریب باراں دیدہ تھا۔ وہ اپنے تجربے اور اپنی شیطانی ذہانت سے کام لیتے ہوئے جائے واردات کو کسی ایسی لوکیشن پر لے جاتا جہاں کوئی کامیابی بنا کے باوجود جرم مجھ پر ڈالنے میں قیامت کوئی نہ ہوتی۔

رب نواز اچانک ہی کارڈ بورڈ میں طلوع ہوا۔ اس سے ایک قدم پیچھے انسپٹر سلامت علی نکلا۔ دلتواڑ کے باہر آنے تک اس کا باپ میری طرف کئی قدم بڑھ چکا تھا۔

اب میرے لیے نہ پائے رفیق نہ جائے ماندن والی صورت حال تھی۔ آگے کٹاؤں پیچھے کھائی۔ اب میں واپس جا کے اپنے زندان میں بند بھی نہیں ہو سکتا تھا اور آگے بڑھ کے سب کو گولیوں سے بھون بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ایک بھی ناز کرنا تو اس کی آواز کو بھی میں اوپر سے نیچے تک گونجتی اور تین افراد کی لاشیں پھلانگ کے بھی میں زندہ سلامت باہر نہیں جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مسلح پولیس ہر طرف سے کوٹھنی کو محصور کر گئی۔

میں نے ریشائی اور ماپوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا اور ماپوسی کے گھپ اندھیرے میں ذرا سی دیر کے لیے امید کی ایک کرن چمکی۔ سوچنے بیچنے کے لیے میرے پاس چند سینکڑ سے زیادہ نہیں تھے۔ میں نے آخری وقت میں فیصلہ کیا اور خدا کے آسمے پر جان کی بازی لگا دی۔ میں نے اس پرانے اسپرنگ میٹرلر کی طرف دیکھا جسے پرانا ہونے کی وجہ سے اسٹور روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا تھا۔

میٹرلر تھوڑا سا ترچھا تھا لیکن اسے نیچے سے مزید چند انچ آگے کھسکایا جاسکتا تھا۔ میں نے لات مار کے اسے آگے کیا اور جھک کر نیچے سے اندر ٹھس گیا۔ اس کے لیے مجھے چاروں ہاتھوں بیروں پر کتے کی طرح آگے جانا پڑا لیکن ساڑھے چھ فٹ لمبے میٹرلر اور دیوار کے درمیان کی وہ سرنگ میری پناہ گاہ بن گئی۔

مشکل سے پانچ سینکڑ بعد میں نے رب نواز کی آواز سنی۔ "یار تم تھانے دار ہو کے اتنا بھڑاتے ہو۔" "گھبرا نا نہیں ملک صاحب!" وہ بولا مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ملک رب نواز چنچ پڑا تھا۔

”اوئے“ اوئے یہ کیا؟

دلنواز نے چلا کے کہا ”کیا ہوا ڈیڈ!“
ملک رب نواز نے چیخ کے کہا ”... وہ... وہ... بھاگ گیا۔“

سلامت علی اور دلنواز ایک ساتھ چلائے ”بھاگ گیا؟“
”ہاں۔ ہاں“ یہ دیکھو۔ یہ بندہ مرا پڑا ہے ادھر۔ اور گیسٹ بھی کھلا ہوا ہے دلنواز تو باہر دیکھ۔ گارڈ سے پوچھ۔“
سلامت علی کے لیے میں اب واضح خبر ایٹ تھی ”ملک صاحب یہ کیسے ہو گیا؟ آپ تو کہتے تھے۔“

”اوئے بے وقوف۔ ابھی تیرے ساتھ آیا ہوں تو دیکھا ہے میں نے بھی اور تو نے سوال جواب شروع کر دیے۔ یا میرے مولا! اس... نے لالی کو بھی مار دیا۔ اس کے ساتھ جانے والے گارڈ کو بھی“ وہ چیخنے لگا۔

کوٹھی کے اندر ایک قیامت برپا ہوئی تھی۔ ملک جیج جیج کے جھجے فٹش گالیاں بک رہا تھا اور محافظوں پر چلا رہا تھا۔ سلامت علی کی اپنی حالت یقیناً غیر ہوئی مگر وہ ملک رب نواز کی کوٹھی کے اندر سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بار بار کی پوچھ رہا تھا کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ بندہ کھل گیا۔ کیا وہ انسان نہیں جن بھوت ہے کوئی؟

ملک بار بار کہہ رہا تھا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ خانے میں سے بندہ نکل گیا۔ دو دو محافظوں کے ہوتے بھاگے گئے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں ضرور کوئی سازش ہے۔“

”سازش کیسی ملک صاحب۔ اگر اس نے آپ کے محافظوں کو خرید لیا ہو تا تو وہ ایسے نہ مرے پڑے ہوتے۔“
ملک رب نواز غصے میں چلا مارا ”میں ان سب کی۔ ماں۔ کو۔ ان کی بن کو۔ کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”وہ تو بعد کی بات ہے ملک صاحب“ سلامت علی نے ہمت سے کام لیا ”مجھے بتائیں میں کیا جواب دوں گا؟“

”اوئے مار کیا تھا نے سے قیدی فرار نہیں ہوتے؟“

”نہیں ملک صاحب! میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میری وردی اتر جائے گی۔ مجھے گرفتار کر کے معطل کر دیا جائے گا۔ میری برطرفی ہو جائے گی۔ میں نے اسی بھروسے پر بندہ آپ کو دیا تھا۔“

”اوئے یار“ حوصلہ رکھ۔ ہم پکڑ لیں گے اسے۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔“ ملک رب نواز ہانپتے ہوئے بولا۔

”نہیں ملک صاحب! بندہ نکل گیا۔ اب وہ ہاتھ نہیں دے والا۔ میں اور آپ دونوں مارے گئے۔“ سلامت علی نے ایک گہری سانس لی۔

”میں... میں کیسے مار گیا اوئے؟“

”وہ میں بتا دوں گا۔ کہہ دوں گا کہ آپ نے کیا تھا اسے یہاں لاؤ۔ میری نظمی صرف اتنی ہوگی کہ آپ کی بات مانی۔ یہ الزام تو نہیں آئے گا کہ بندہ فرار کرادیا۔ لاکھوں وصول کر لیے۔“

”دیکھ سلامت علی! جوش سے نہیں ہوش سے کام لے۔ یہ وقت نہیں ہے ایسی باتیں کرنے کا۔ دیکھ نا“ میں صاف انکار بھی کر سکتا ہوں۔ تو کیسے ثابت کرے گا کہ جو تو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے؟ کون مانے گا تیری بات؟ خود سوچ۔“

”ملک صاحب“ آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔
”ہاں یار“ امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔ ایک پرسنٹ چانس نہیں تھا اس کے نکلنے کا۔ پتا نہیں کیسے نکل گیا وہ۔“
اس نے پھر مجھے گالیاں دینی شروع کیں ”خیر“ میں پتا کر لوں گا۔ مجھ سے بچ کے کہاں جائے گا وہ۔“

”ملک صاحب دو مرہر بھی ہوئے ہیں“ سلامت علی بولا۔

”دو نہیں ایک بندہ مرا ہے۔ دوسرا بے ہوش ہے۔ تو فکر مت کر یار۔ ابھی لالی ہوش میں آجائے گی۔ وہ سب بتا دے گی پتا چل جائے گا۔“

”لالی“ کیا خاک بتا دے گی۔ یہی بتائے گی تاکہ اس نے کیسے مارا اور کیسے قابو کیا سب کو اس سے کیا ہوگا۔“

رب نواز چلائے لگا۔ ”اول نواز دل نواز جلدی کر۔ کسی ڈاکٹر کو بلا۔ بے شک امبولینس منگوالے یا ایسا کہ ان کو اپنی گاڑی میں ڈال کے لے جا۔ کچھ پتا چلا ہا ہے۔“

دل نواز نے کہا ”باہر کسی نے کچھ نہیں دیکھا ڈیڈ۔ قسم کھاتا رہے ہیں کہ انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا“ دلنواز نے جواب دیا۔

رب نواز نے ایک اور گالی دی ”سب کو بلا۔ لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دوں گا میں۔ سارے تختے“ حرام“ اندھے کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ سب سو رہے ہوں گے۔ کیا گیسٹ سے گیا ہوگا۔ وہ دیوار پھانڈ کے گیا ہوگا۔“

سلامت علی نے کہا ”آپ ذرا تلاشی لیں۔ ہو سکتا ہے وہ باہر باغ میں یا کوٹھی کے کسی کمرے میں چھپا ہوا ہو۔ باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا ہو۔ کسی گاڑی میں گھس کے بیٹھ گیا ہو۔“

”یہ تو نے ٹھیک کہا یار میں خود جاتا ہوں۔“
سلامت علی نے کہا ”تلاشی کا کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں ملک صاحب“ آپ خود کو سنبھالیں۔“

دلنواز نے کہا ”ڈیڈ“ آپ کا بلڈ پریشر۔“

ملک نے ایک گالی دی ”میں گیا بلڈ پریشر جو میں کتنا ہوں وہ کرو۔ دیکھو دیر ہوگی تو یہ دوسرا بندہ بھی مر جائے گا۔ لالی بھی مر جائے گی۔“

دلنواز نے کہا ”اب جو ہوتا تھا ہو گیا ڈیڈ۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔“
اور اس وقت میں نے ملک کی آواز سنی ”کوئی“ آپ یہ مرنے لگا۔ نہیں“ غصہ مت کرو“ حوصلہ رکھو۔“

میں سیدھے کھڑے ہوئے میزبیں کے پیچھے ابھی تک اتنی محفوظ تھا۔ اسٹور میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ ہر چیز بھرا پانی جگہ پر تھی اور کسی کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا کہ میں نیل کی کوٹھی جیسے اس کمرے سے نکل کے اتنے قریب ایک اسٹور میں چھپ سکتا ہوں۔ انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ میں نکل بھاگا اور وہ آگے فرار کے تمام راستوں پر زور امکانات پر غور کر رہے تھے۔ یہ پیر بھل میں ڈھنڈورا شرمش کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ آہستہ آہستہ تفتیش کرنے والے دور جا رہے تھے۔ پوری کوٹھی میں ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی مگر مجھے فوری طور پر کوئی خطرہ نہ تھا۔

میٹریس کے پیچھے میں ساری آوازیں اس لیے سن رہا تھا کہ پہلے رب نواز اور سلامت علی یہ خانے میں دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے پھر وہ اوپر آگئے اور کوریڈور میں رگ کر چھتے چلائے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ آوازیں مجھ سے دور ہو گئیں۔

میں سیدھا لینا ہوا تھا اور کلا مشکوف میرے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میٹریس کے پیچھے فرش پر اتنی جگہ تھی کہ میں دیوار سے ٹک لگا کے آرام سے بیٹھ سکتا تھا مگر اوپر سے یہ فاصلہ کچھ کم تھا۔ چھ فٹ چوڑا میٹریس درمیان سے کچھ دب گیا تھا۔ میں نے کلا مشکوف کو فرش اور دیوار کے کونے سے لگا کے رکھا اور اس کی نوک میٹریس کے اندر چھک آنے والے حصے میں پھنسا دی۔ اب اوپر اتنی جگہ ہو گئی تھی کہ میں سیدھا بیٹھ کے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دے سکوں۔

وہ جگہ ایک گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ خفیہ کی سیڑھیوں کا راستہ اسٹور روم سے گزرنے کے بعد آتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں وہ آوازیں سنیں جن سے ظاہر ہوا تھا کہ ملازم نیچے پڑے ہوئے دوسرے ہوش افراد کو اٹھا کے اوپر نہیں لے گئے ہیں۔ ان میں ایک لالی تھی۔ اسے اٹھاتے ہوئے ملازم آپس میں مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔

اس کے بعد میں آوازوں سے کٹ گیا۔ اب جو کارروائی ہو رہی تھی، گھر کے باہر یا گھر کے اس حصے میں ہو رہی تھی جو مجھ سے بہت دور تھا۔ صرف کچھ من قبل تھا اور وہاں ملازم بھی فری ہو کے بات کرتے تھے۔ اگلے ایک گھنٹے میں مجھے نوکروں کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ تھانے دار نے گیسٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کو اور لالی کو گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو اور دوسرے نوکروں کو بہت ڈانٹا ڈنٹا تھا اور دھمکی دی تھی کہ سب سے تھانے لے جا کے تفتیش کی جائے گی مگر سب نے قرآن کی قسم کھا کے ایک ہی بات کہی تھی کہ انہوں نے کسی کو فرار ہونے دیکھا ہو تا تو وہ اسے روکنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے یا اسے گولی مار دیتے۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے غصہ کما کہ پچھلے آٹھ گھنٹے میں گیسٹ کھولا بھی نہیں گیا تھا چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بندہ درمیان دیوار پر چڑھ کے دائیں بائیں یا پیچھے والی کوٹھی کے بیک یا روڈ یا سڑک کی گلی میں اتر گیا اور موقع پا کے ادھر سے ہی باہر نکل گیا۔

تھانے دار نے تھانے سے اضافی نفری طلب کی اور انہوں نے مل کے کوٹھی کے باغ کا چٹا چٹا چھان مارا۔ انہوں نے درختوں پر چڑھ کے دیکھا اور پھمت پر جا کے دیکھا۔ وہ دائیں بائیں اور پیچھے بنی ہوئی کوٹھیوں میں گئے اور وہاں رہنے والوں سے پوچھا کہ انہوں نے کسی مشکوک آدمی کو اندر اترتے فرار ہوتے تو نہیں دیکھا مگر ان کا جواب نفی میں تھا۔

سلامت علی کی ذاتی نگرانی میں کوٹھی کے ہر بیڈ روم اور ہاتھ روم کی تلاشی لی گئی۔ انہوں نے بیڈز کے نیچے اور الماریوں میں دیکھا لیکن وہ کچن اور اسٹور کی طرف نہیں آئے انہیں یقین تھا کہ شاہ عالم یہ خانے کی قید سے نکل کے فرار ہوا تو سیدھا اوپر گیا ہوگا۔ اس کے لیے کوٹھی میں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ یہ ایک منطقی خیال تھا کہ وہ باہر نکلا اور ملازمین کی غفلت کے باعث کوئی دیوار پھانڈ کے فرار ہو گیا۔ رب نواز کی کوٹھی کے سامنے تو بڑک تھی لیکن پیچھے اور دائیں بائیں ایسی ہی دوسری کوٹھیاں تھیں۔

مجھے نوکروں کی باتیں سن کے یہ بھی پتا چلا کہ پولیس نے آج اس پاس کا وہ سارا علاقہ چھان مارا تھا اور وہ ابھی تک باہر موجود تھے۔ مجھے اس اسپرنگ والے گدے کے پیچھے دو گھنٹے گزر گئے تھے اور ابھی میرے لیے وہاں سے نکلنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ کوٹھی کے اندر ہر شخص ڈرا سا ہوا“ مشتعل اور شکاری کتے سے زیادہ چوس تھا۔ کوٹھی کے اندر

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں

قیمت: ۱۲۵ روپے

اسے چھوڑ دو، پلیز۔!

میں نے کہا "نہیں۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ تم اندر جاؤ اور کسی گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔ تب تک یہ میرے قبضے میں رہے گی۔"

ملکانی نے ایک گمری سانس لی "اوکے۔ میں چابی لاتی ہوں۔ تم وعدہ کرو کہ فریال کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟"

میں نے کہا "ملکانی۔ یہ یقین دہانی مجھے تم سے چاہیے کہ تم اپنی عقل کے گھوڑے غلط سمت میں نہیں دوڑاؤ گی۔ اگر تم نے رب نواز یا اس کے بیٹے، پولیس یا باہر کسی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ دوبندے مار چکا ہوں میں اب تک۔"

اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا "شاہ عالم۔ میں پاگل یا بے وقوف نہیں ہوں کہ فریال کی جان کو خطرے میں ڈالوں۔"

میں نے کہا "میرا بھی کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ کلا شکوف استعمال کر کے میں بہت سہلے نکل سکتا تھا۔ میری راہ میں جو بھی آتا اپنی جان سے جانا نہیں میں بلاوجہ کشت و خون سے گریز کرتا تھا۔"

اس نے کہا "میں چاہیے لے کر آتی ہوں۔"

فریال اب بری طرح رو رہی تھی اور خوف سے اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ میں نے اسے آزاد کر دیا اور خانساہاں کو حکم دیا کہ وہ بچن کی دیوار کے ایک کونے میں منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ جائے اس نے زبردستی آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے تعمیل کی۔

میں نے کہا "فریال، تمہاری سلامتی کا انحصار اب تمہاری ساس کے رویے پر ہے۔"

فریال ہاتھ جوڑنے لگی "ممی۔ اسے نکل جانے دیں۔ ورنہ یہ مجھے بھی مار ڈالے گا اور میرے بچے کو بھی۔"

ملکانی نے شفقت سے سہلایا۔ اب وہ بالکل پرسکون ہو چکی تھی اور اسے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ "فکر مت کر فریال۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح اسے یہ پھنسن گیا ہے مشکل میں ورنہ یہ حیوان نہیں ہے۔"

"ممی! آپ چابی لے آؤ" فریال نے دوتے دوتے کہا۔

تھاب۔ بچن سے ابھی تک ملکانی کی ڈانٹ ڈپٹ سنائی دی۔ پھر اس کی آواز میں ایک اور زنانہ آواز شامل ہو گئی۔ کسی عورت نے کہا "ممی۔ میں آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ رہی تھی۔"

میں سمجھ گیا "یہ آواز دنواڑ کی بیوی فریال کی تھی۔"

"کیا ہو گیا؟" ملکانی نے کہا۔

"ممی۔ دس ہزار روپے ہیں آپ کے پاس؟"

"ابھی چائیں؟"

"ہاں، میں ذرا جا رہی ہوں" فریال نے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟ دنواڑ آگیا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔"

میں نے مزید انتظار لا حاصل سمجھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ملکانی اپنی ہو کو دس ہزار روپے کے لیے بچن سے چلی جائے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر باہر قدم رکھا اور ایک جست میں بچن کے اندر پہنچ گیا۔ بچن میں صرف ایک ملازم تھا جو غالباً خانساہاں تھا۔ دنواڑ کی بیوی فریال کی پشت دروازے کی طرف تھی لیکن ملکانی کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی عجیب دہشت نمودار ہوئی اس سے پہلے کہ وہ بیچ مارتی، میں نے آگے بڑھ کر فریال کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ فریال چلائی "ممی!" مگر میری گرفت سے نہ نکل سکی۔

ملکانی کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی "تم۔!"

میں نے فریال کی گردن ایک بازو کے حلقے میں لے کر دبا لی "ہاں، میں۔"

فریال جھپٹنے اور ناظمیں چلانے لگی۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور پچھلی پچھلی آنکھیں حلقوں سے اٹپنے لگی تھیں "مجھے۔ مجھے چھوڑ دو۔" وہ بلبلاتی۔

ملکانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی "دیکھو شاہ عالم، فریال کو چھوڑ دو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی کی "باہر نکلنے کے بعد میں اسے چھوڑ دوں گا لیکن کسی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں اسے بھی مار دوں گا۔"

ملکانی نے کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ ماں بننے والی ہے۔"

میں نے کہا "میں صرف ایک بات سمجھتا ہوں۔ مجھے یہاں سے باہر جانا ہے اور اس میں تمہاری ہمدرد کر سکتی ہے۔"

ملکانی کا چہرہ تاریک ہو گیا "تمہاری مدد میں کروں گی۔"

میرے کانوں میں ملکانی کی آواز اچانک آئی تو میں چونک پڑا۔ وہ بچن میں ملازموں سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ اس کے سوالات عمومی نوعیت کے تھے۔ یہ چیز کھلی کیوں پڑی ہے۔ وہ چیز گندی کیوں ہے۔ ملغانی کا خیال نہیں پانچ کلو گھی ایک ہفتے میں کیسے ختم ہو گیا۔ کل گوشت کون لایا تھا؟ آنکھیں کھلی نہیں رکھتے۔ جو قصاب دے دے اس کی مرنی۔ مفت لائے ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ اور ہوشیار ملازم بڑی عاجزی کے ساتھ اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دے کر اپنا دفاع کر رہے تھے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے فرار ہونے دو گھنٹے چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ تلاش کرنے والے یقیناً اب تک میری بازیافت کی ہر امید سے کنارہ کش ہو چکے ہوں گے اور اب ان ٹھکانوں کا رخ کرنے کا سوچ رہے ہوں گے جہاں میرے پائے جانے کا کوئی امکان ہو۔ پھر۔ کیا مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکل جانا چاہیے یا ملکانی کے اگلے دورے کا انتظار کرنا چاہیے؟ ہو سکتا ہے آج وہ دوبارہ بچن میں نہ آئے۔ ایسی صورت میں مجھے مزید چوبیس گھنٹے اسی گناہ گاہ میں گزارنے پڑیں گے ابھی تک کہ میرے گھر تک تر ہوتے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ میرے لیے جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچنا ضروری تھا لیکن میرا ذہن مخالفت اور موافقت کے کشمکش و کڑے والے دلائل میں الجھا ہوا تھا۔

لیکن بلاخر میں ایک فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب رہا۔ باہر نکلنے کے لیے یہی وقت مناسب ترین تھا۔ گھر کی تلاشی سے مایوس ہو کر اسپیڈر سلامت علی اور ملک رب نواز باہر جا چکے تھے۔ دنواڑ اگر گھر میں تھا تو میری تلاش سے زیادہ اہم اور خطرناک معاملات سے منٹ رہا تھا۔ وہ لالی کو اور ایک بے ہوش محافظ کو اسپتال لے کر گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا یا اوپر کہیں ہوش میں آجائے والوں سے پوچھ گچھ میں مصروف تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مرنے والے سیکورٹی گارڈ کی لاش ابھی تک یہ خانے کی سیڑھیوں کے آخر میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کو تھکانے لگانے کا مرحلہ شاید اس کے بعد آئے گا۔ رب نواز فیصلہ کرے گا کہ لاش کو کیسے غائب کیا جائے؟

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ مجھے اسی وقت نکل جانا چاہیے۔ میں نے کلا شکوف اٹھائی اور میزبیں کے پیچھے سے نکل آیا۔ اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت میں لانے کے بعد میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ کوریڈور آخر تک خالی پڑا۔

لی فضا ایسی ہو گئی تھی جیسے گھر میں کہیں کوئی ملک سانپ موجود ہے جس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسے کہاں چھپایا گیا ہے مگر یہ خوف سب کے اعصاب پر سوار ہے کہ سانپ کسی بھی وقت نمودار ہو سکتا ہے۔

یہ سوال میرے ذہن میں شروع سے موجود تھا کہ آخر میں اس میزبیں کی پناہ میں کتنا وقت گزار سکتا ہوں۔ دو گھنٹے، چار گھنٹے، زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اگر مجھے چھینک بھی آجاتی تو کوئی نہ سنتا اور کسی پر بھی میری موجودگی کا راز فاش نہ ہوتا۔ میں چوبیس گھنٹے تک ٹھائے بیٹھ رہا۔ یہ مسئلہ تھا بحالت مجبوری اس محدود جگہ کو احتیاط کے ساتھ حوالے ضروری سے فراغت کے لیے استعمال کرنا پڑتا تو یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ سوال بھی میرے ذہن میں سر اٹھ رہا تھا کہ باہر نکلنے کے لیے میں کیا حکمت عملی اختیار کروں گا؟ کیا مجھے دشمن کے علاقے سے گزرنے کے لیے فائر کھولنا پڑے گا؟ کسی بے گناہ کی جان لینی پڑے گی؟ مگر میدان جنگ میں یہ کیا سوچنا کہ سامنے آکے رداست روکنے والا گندگار ہے یا معصوم، وہ تو بس دشمن ہوتا ہے۔ آپ نے اسے مارنے میں پہل نہ کی تو وہ آپ کو مار دے گا۔

ایک امکان یہ تھا کہ میں کسی کو پر غماں بنا کے نکل جاؤں۔ رب نواز یا دنواڑ کا ادھر آتانی الحال مشکل تھا لیکن ملکانی بچن میں آسکتی تھی۔ کسی ملازم کو پر غماں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ میرے ساتھ وہ بھی مارا جائے گا لیکن ملکانی کی اہمیت کسی طرح بھی رب نواز سے کم نہیں تھی۔ وہ رب نواز کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں تھی۔ اگر وہ قابو میں آجائے تو مجھے بحفاظت باہر لے جاسکتی ہے۔ بس یہی سب سے محفوظ اور مؤثر طریقہ ہے۔ میں نے سوچا لیکن ملکانی بچن میں کیوں آئے گی؟ وہ اکثر کام پر ملازموں سے بات کرتی ہوگی اور اسی طرح سب اپنے اپنے کمروں سے ہر حکم کی تعمیل کراتے ہوں گے۔

لیکن عامہ شاہ جسے سب ملک کی بیوی ہونے کے ناتے ملکانی کہتے تھے "ایک گھلو قسم کی عورت تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ خود کو بچن سے دور رکھے اور ملازموں کو اجناس کی خوردبرد کی کھلی چھٹی عطا کرے۔ وہ بار بار نہ سنی دن میں ایک دوبار بچن کا چکر ضرور لگاتی ہوگی اور ایک عام پاؤس وائف کی طرح بچن میں صرف ہونے والے آئے، کچھ، چینی کے اسٹاک کا جائزہ ضرور لیتی ہوگی۔"

میں نے کہا "ایک بار پھر سن لو۔ اگر کسی کو بھی میرے کچن میں ہونے کا پتا چلا تو نقصان میں تم بھی رہو گی۔ تمہیں دلنواز کے لیے دو سری بیوی تو مل جائے گی مگر یہ بچہ ضائع ہو جائے گا جسے فریال جنم دینے والی ہے۔"

فریال پھر زور زور سے رونے لگی اور ملکائی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ میں نے اس کے جسم میں کرزش کو واضح طور پر محسوس کیا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں بحفاظت باہر نکال دوں گی۔ آگے تمہاری قسمت۔"

میں نے کہا "تم مجھے صرف اپنی کوٹھی کے گیٹ سے گزرا دو۔ اس کے بعد تمہاری دتے داری ختم۔"

وہ بولی "ابھی باہر پولیس کھڑی ہے۔"

میں نے کہا "کھڑی رہے۔ تمہاری گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں۔ اور تمہیں کہیں جانے سے کون روک سکتا ہے؟ میں ابھی آتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے فریال سے کہا "ٹیک اٹ اپری!"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں پاگل ہوں کہ ان حالات میں اسے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔

میں نے کہا "میرا مطلب ہے گھبراؤ نہیں۔ اگر تمہاری سانس نے کوئی چالاک کیا نہ دکھائی تو تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤ گی۔"

"مجھے پانی۔۔۔ پینا ہے۔"

"ضروریہ؟" میں نے کہا۔

اجازت اس نے اپنے لیے نہیں، خانا ماں کے لیے لی تھی۔ اس کو عادت نہیں تھی کہ کچن میں سے گلاس تلاش کرے، 'فرج' کھولے اور پانی نکالے۔ اس نے خانا ماں کو حکم دیا "بابا، مجھے پانی پلاؤ۔"

بابا نے میری طرف مڑ کے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو میں نے سر ہلایا "پانی پلا کے پھر اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔"

اسی وقت ملکائی نمودار ہوئی۔ اس نے چابی میری طرف بڑھائی "باہر ایک بالکل نئے ماڈل کی نیو ٹاکڑی ہے۔"

میں نے کہا "ڈرائیونگ میں نہیں کروں گا، تم کرو گی۔"

اس نے اپنا ہاتھ پیچھے سمجھ لیا "چھا۔ اب اسے جانے دو۔"

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ باہر نکلتے ہی اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے اس گھر سے صرف ایک کلومیٹر دور کہیں اتار دو اور واپس آ جاؤ۔ تمہاری ہو تمہارے اچھے رویے کی اور تعاون کی ضمانت کے طور پر ساتھ جائے گی۔"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "اچھا، چلو۔"

میں نے فریال کو اشارہ کیا۔ وہ ایسے آگے بڑھی جیسے سزائے موت پانے والا چھائی گھاٹ کی طرف بڑھتا ہے۔ ہم ایک قطار میں آگے پیچھے چلتے ہوئے طویل کارڈور سے گزرے۔ عاصم سب سے آگے تھی۔ فریال درمیان میں تھی اور میں سب کے پیچھے تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ

کلا شکوف کسی کو دکھائی نہ دے چنانچہ اس کا رخ فریال کی جانب رکھتے کے بجائے میں نے اسے دائیں ہاتھ میں تھام کے نیچے جھکا رکھا تھا۔

اچھی ہم نے آدھا کارڈور طے کیا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور اندر سے لالی نمودار ہوئی۔ اس نے پہلے ملکائی کو دیکھا اور پھر مجھے۔ اچانک اس کے اعصاب کا تناؤ اس کی صورت پر ظاہر ہونے لگا۔

ملکائی نے اسے حکم دیا "لالی۔ اندر جا اپنے کمرے میں۔"

لالی کمرے ہاتھ رکھے سامنے کھڑی رہی اور مجھے غور قی رہی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی۔

ملکائی نے اپنا لہجہ سخت کر لیا "تو نے سنا نہیں؟ میں نے کیا کہا؟ چپ چاپ جا اپنے کمرے میں اور آرام سے بیٹھ۔"

لالی نے صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔ ملکائی کے حکم نے اسے مجبور کر دیا تھا ورنہ شاید وہ مجھے آسانی سے نہ جانے دیتی۔ میرا وجود اس کے نزدیک خطرے کی علامت تھا اور میرا

چہرہ ایک دشمن کا چہرہ تھا۔ ملکائی کا حکم اب تک دیے جانے والے احکامات کے برعکس تھا کہ اسے کچھ سوچنے کی اور اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جلی اور

سب سے آگے ہو گئی۔ کارڈور کے اختتام پر وہ سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئی اور ملکائی اگلے ہاتھ کی طرف چلتے لگی۔

ہم تقریباً ایک ساتھ اس طویل برآمدے میں طلوع ہوئے جس کے وسط میں بلند دیواروں میں طرز کے ستونوں والا پورچ تھا۔ گیٹ کی فصیل یہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔

ملکائی باوقار انداز سے چلتی ہوئی گیٹ سے اندر آنے والے راستے کی طرف بڑھی جو آگے آگے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ سیاہ سنگ مرمر کے ٹائل والا راستہ سیدھا کوٹھی کے پائیں جانب والے محلے حصے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں

اس وقت بھی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک بالکل نئی سفید رنگ کی نیو ٹاکڑی اور دوسری تین سال پہلے کی نیلی شیراؤ۔ اس راستے کا جو حصہ دائیں طرف گھوم کے پورچ تک اور پھر آگے باہر نکلتے والے راستے کی طرف جاتا تھا

اس پر دو فٹ چوڑے اور لمبے سفید ٹائل تھے۔ آگے باہر جانے والے حصے پر بھی سیاہ پتھر تھے۔

درمیان میں لان تھا جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ دونوں گیٹ بند تھے اور چونکہ درمیان کے مطابق کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی کلا شکوف کرسی کے سارے کھڑی تھی۔

ملکائی کو دیکھتے ہی وہ مستعدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کلا شکوف اٹھائی مگر ملکائی نے ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

وہ اطمینان سے کار تک گئی اور لاک کھول کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ رب نواز کی دوسری بیوی اور دلنواز کی سوتیلی ماں تھی۔ اس نے خود مجھے پتیا تھا کہ شادی سے پہلے وہ بیکچر تھی اور سوشالو جی بڑھاتی تھی۔ اس کی عمر

تیس سے پچیس سال کے درمیان ہو گی۔ اب اس کا بدن بڑھ چکا تھا اور اس کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ پُر اعتماد تھی اور اچھے کپڑے پہنتی تھی۔ اس کا جادو کسی بھی مرد پر چل سکتا تھا۔ اس کے

مقلے میں کم عمر اور زیادہ خوبصورت خطوط کی مالک فریال کا حسن بھی ماند پڑ جاتا تھا۔

ملکائی نے میرے لیے گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔ میں نے فریال کو آگے بڑھ کے پہلے بیٹھے کا اشارہ کیا۔ پھر میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ملکائی نے گاڑی اشارت کی۔ اسے تھوڑا سا رپورس میں لیا اور گیٹ کی طرف بڑھی۔

کوٹھی میں آنے اور جانے کے راستے الگ الگ تھے تین ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سہولت کی خاطر وہ سب ایک ہی گیٹ کے آنے جانے کے عادی تھے۔ شاید باہر جانے والے راستے کا گیٹ اس وقت استعمال کیا جاتا ہو گا جب ڈرائیو

سے بروی آئی بی قسم کے مہمانوں کی گاڑیاں آگے پیچھے ایک دوسرے میں آ جاتی ہوں گی۔

ابھی ہماری گاڑی دروازے سے دور تھی کہ گیٹ کھل گیا اور سامنے سے ایک بیکسیسرو واندرا آئی۔ اسے دلنواز پکارا تھا۔

"دل نواز! گیا" ملکائی نے کہا۔

میں نے ایک ہاتھ کلا شکوف پر رکھا "اسے سمجھاؤ کہ کوئی بے وقوفی یا مردانگی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور تم بھی یہ خیال رکھنا کہ۔"

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں باہر پہنچا دوں گی۔"

پھر وہاں سے بالکل سامنے آگے رک گئی۔ دلنواز نے دند اکسریں میں سے کار کے اندر مجھے "اپنی بیوی کو اور ملکائی کو

دیکھتے ہی بیویشن کو سمجھ لیا تھا۔ وہ نیچے اترتا اس کے ہاتھ میں رہا اور تھا۔

ملکائی نے گاڑی سے باہر جھانک کے کہا "دلنواز۔ راستہ چھوڑو۔"

وہ رکے بغیر آگے آیا۔ اس نے چنچ کے کہا "میں تجھے گولی مار دوں گا۔"

ملکائی نے بھی دھاڑ کے کہا "میں کبھی ہوں دلنواز پاگل مت بنو۔ اپنی گاڑی ہٹاؤ سامنے سے۔"

دلنواز کی آنکھوں میں غصہ و غضب کے شعلے بھڑک رہے تھے اور وہ مجھے بیوی یا ماں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر ٹنگی لگایاں بک رہا تھا۔ ملکائی کی اوچی آواز نے اس کا جنون کچھ کم کیا "آپ فکر مت کرو می!"

"مجھے مت سمجھاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" ملکائی نے غصے میں الگ بگلا ہو کے کہا "خود یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہاری بیوی اور تمہارے ہونے والے بچے کی جان خطرے میں ہے۔"

دلنواز پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ نے رہا اور کو اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ شیشے کا گلاس ہوتا تو ٹکری کر جی ہو جاتا۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی معنی خود بند ہو رہی تھی اور کھل رہی تھی۔ وہ ایسے سانس لے رہا تھا جیسے ایک میل دوڑ کے آیا ہو لیکن بالا خرماں کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

اس نے خون آشام نظروں سے میری طرف دیکھا "میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ جس دن بھی تو میرے ہاتھ آ گیا، میں تیری۔"

ملکائی نے کہا "تم کوئی بے وقوفی نہیں کرو گے دلنواز جس سے ہماری جان خطرے میں پڑے۔ تم کسی کو فون نہیں کرو گے۔ تم ہمارے پیچھے بھی نہیں آؤ گے۔"

دلنواز نے پھر وہاں میں مکا چلا کے کہا "میں اس۔۔۔ کو چھوڑوں گا نہیں۔"

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح وہ اپنی بے بسی کی فرسٹریشن کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ پلٹ کے غصے میں غیر موجود فٹ پال کو بیروں سے کٹ مارتا اپنی پیچرو کی طرف گیا اور اسے تھوڑا سا پیچھے کر کے سائیڈ سے نکال لے گیا۔ پیچرو جب میرے پاس سے گزری تو مجھے پیچھے والی کھڑکی کے ساتھ اس کا رڈ کا چہرہ چکا ہوا نظر آیا جسے میں نے زمین دوز خانے میں ٹاک آؤٹ کیا تھا۔ شاید دلنواز اسے اسپتال لے گیا تھا۔ اس کا رڈ کے سر ایک پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی۔

فریال نے بھی اس کے گزری تو میں نے اپنے دل میں کامیابی

اور فتح مندی کے غور کو ایک خواہش بن کے بیدار ہوتے دیکھا۔ دلوانے مجھے صورت حال پر مکمل کنٹرول اور کامل اعتماد کے ساتھ فرار ہوتے نہیں رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اگرچہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے مگر ذہنی طور پر دلوانے نے خود کو اس جیلر سے زیادہ بے دست و پا محسوس کیا جس کو قیدیوں نے دروازہ کھولانے کے بعد باندھ کے ڈال دیا ہو اور اب اس کی نظروں کے سامنے سے قہقہے لگاتے مہرجوش الوداعی مصافحے کرتے اور اسے گالیاں دیتے گزرتے جا رہے ہوں۔

”اب بتاؤ کہ ہر جانا ہے؟“ عاصم شاہ نے گاڑی سڑک پر لانے کے بعد پلٹ کے پوچھا۔ اس کے ایک جھٹکے سے اس کے شانوں تک تراشیدہ بال چہرے پر آئے اور دوسرے جھٹکے سے والیں ہو گئے۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ملک رب نواز کی کوٹھی کا گیٹ بند ہو گیا تھا۔ فوری طور پر دلوانے کے باہر آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں نے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا۔ اگلی اسٹریٹ سے پھر بائیں جانب موڑا اور سیدھا چلنے کا کہا۔ عاصم تعیل کرتی رہی۔ میں نے کھانکھوف کا میگزین خالی کیا اور باور و نڈ کا ٹین دیا۔ شیشہ پھسل کے تھوڑا سا نیچے گیا۔ آگے پیچھے سڑک پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے میگزین کو باہر پھینک دیا۔

اب میں روڈ سامنے مٹی تھی، میں نے گاڑی رکوائی ”یہاں سے تم واپس جا سکتی ہو۔“ میں نے کہا ”تم نے ثابت کر دیا ہے کہ خوبصورت عورت ذہین اور سمجھ دار بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ بولی ”مجھے یقین ہے شاہ عالم۔ کہ زندگی میں ہم پھر کسی جگہ آئے سامنے ہوں گے۔ اس وقت اگر صورت حال آج کے برعکس ہو تو تم بھی اسی طرح سمجھ دار ہونے کا ثبوت دیتا۔“

”میں یقیناً تمہیں مایوس نہیں کروں گا“ میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھانے کے گھوڑا کپار منٹ کھولا۔ اس میں ایک ریوالور موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ ”تم چالاک بھی ہو اور خوش قسمت بھی“ اس کے چہرے پر شدید مایوسی اور فحاشیت آمیز بے چارگی تھی۔

میں نے کہا ”میرا یہ عقیدہ ہے کہ تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر رائیگاں جاتی ہے۔ دراصل ابھی مجھے قدرت کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت تمام نہیں ہوئی تھی ورنہ تم میرے نیچے اترتے ہی گھوڑا کپار منٹ سے ریوالور نکال کر

میرے سر میں گولی مار دیتیں۔ میرا نصرت و کامرانی کا سارا غور ایک سوراخ سے خون کے ساتھ بہہ جاتا۔ اس کے باوجود لیڈر، اتنی اہم سوری کہ میں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ یہ میری مجبوری تھی۔“

میں نے دروازہ بند کیا اور نیچے اتر کے صائبر کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کو موڑ لے اور واپس ہو جائے۔ میں اسے آگے میں روڈ کی طرف جانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جہاں اپنی ٹریفک تھی کہ وہ شور مچا کر کسی کو میرے پیچھے لگا سکتی تھی۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ گاڑی کو یوڑن دیا اور گاڑی اسی راستے پر دوڑنے لگی جس پر آئی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر سڑک کی طرف چل پڑا۔

چند منٹ بعد میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا خود کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ میں پولیس کی اور رب نواز کی قید سے زندہ سلامت نکل آیا ہوں۔ میرے وجود میں عزم اور حوصلے کی ایک نئی قوت انگڑائی لے رہی تھی اور زندگی کا اعتماد میرے جسم میں جوش اور دنوں کے لمہزن کے دوڑ رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی کو شیم کے آفس لے جانے کا فیصلہ کیا اور پھر آدھے راستے میں اپنا ارادہ بدل دیا۔ ایک تو اس وقت شیم کا یا آزاد صاحب کا دباں ملنا بھی غیر یقینی تھا۔ پھر شیم کا گھر اور آفس پولیس کے نقطہ نظر سے پہلی جگہ ہو سکتے تھے جہاں میں جاتا۔ جیسے چوبے دان سے نکلنے والا چوبہ سیدھا اپنے نل کارخ کرتا ہے۔

میں نے ٹیکسی کو فرید عباسی کے گھر کی طرف موڑ لیا۔ فرید گھر پر نہیں تھا۔ رخصتی مجھے دلچسپ کے اتنی حیران ہوئی کہ بات کرنا تک بھول گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے میرے سر پر سیٹنگ نکل آئے ہوں۔

میں نے کہا ”میں وہی ہوں۔ جو شاہ عالم تھا“ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟“

وہ چونکی ”تم... تم تو پولیس کی تحویل میں تھے۔ فرید گئے ہیں تمہاری پیشی کے لیے۔“

میں نے کہا ”باہر ایک جیسی کھڑی ہے۔ اسے کرایہ ادا کرو۔ میری جب میں پیسے نہیں تھے اس لیے میں ادھر آ گیا۔“

اس نے سر ہلایا ”تم بیٹھو“ میں اسے پیسے دیتی ہوں۔“ میں ایک صوفے پر پاؤں اور ہاتھ پھیلا کر اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا اس طرح مجھے گہرا خوشی دینے والا ذہنی اور جسمانی سکون محسوس ہو رہا تھا اور ایک آرام طلب اندر کی

تھکن میرے جسم کو مغلوب کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مہینوں کے لیے پر مشقت اور مسلسل جاری رہنے والے سفر کے تھکا دینے والے عذاب سے گزر کے بالآخر اپنے گھر اپنے بیڈ روم میں اور کسی کی نرم گرم چاہت بھری جاں فزا خوشی میں پہنچ گیا ہوں۔ میں غنڈ کی غالب آنے والی خواہش سے لڑ رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اپنے ستر کو یہاں ختم نہ کروں۔

رخصتی نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا اور میرے سامنے کے بیٹھ گئی ”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

میں نے کہا ”کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ وہ بولی ”ذرا آئینے میں صورت دیکھو اپنی۔ تم آدمی نہیں بہت لگ رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے عمر قید کاٹ کے نکلے ہو۔“

میں نے کہا ”ہاں۔ ایسا تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے۔“ وہ بولی ”چلو خیر باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے تم نرا جوہ کے انسان بن جاؤ۔ میں تمہارے لیے فرید کے پڑے نکال دیتی ہوں۔“

میں نے کہا ”نہیں رخصتی۔ میں جاؤں گا۔“ ”کہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں اس حالت میں نہیں جانے دوں گی۔“

میں نے کہا ”میں جا رہا تھا شیم کی طرف۔ پھر اس لیے نہیں گیا کہ مجھے حاش کرنے والے سب سے پہلے وہاں دیکھیں گے۔ فرید عباسی وکیل ہے میرا۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔“

”تو امت ڈرو۔“

میں نے کہا ”ذرا بات نہیں رخصتی۔ جتنا تم لوگوں نے میرے لیے کیا ہے اور کر رہے ہو“ اس کے بعد تم میری وجہ سے مشکل میں پڑو یہ میں نہیں چاہتا۔“

”ایسا مت کہو ناصر۔ جو کچھ تم نے میرے لیے کیا تھا۔“ ”میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔“

وہ بولی ”تن میں جو کچھ بھی ہوں، جہاں بھی ہوں، تمہاری وجہ سے ہوں۔“

میں نے کہا ”یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں رخصتی۔“

”نہیں ناصر۔ میں کیسے بھلا دوں کہ اس وقت جب میں تمہیں شاہ عالم اپنا شوہر سمجھتی تھی۔ تم نے صورت حال سے کوئی ناخاموش فائدہ اٹھانے کا سوچا بھی نہیں۔ انٹائم نے میری حفاظت کی۔ تم نے اپنے آپ کو بھی نہیں مجھے بھی سنبھالا۔ تم نے مجھے عذاب کے ایک جہنم سے نکالا اور وہ سب دے دیا

جس پر شاہ عالم کی حیثیت سے تم اپنا قبضہ جاری رکھ سکتے تھے۔“

”اب ان باتوں کا کیا ذکر۔“

”نہیں ناصر۔ میں کیسے بھلا سکتی ہوں تمہارا یہ احسان۔ آج میں اس گھر میں آباد ہوں تو یہ تمہاری کوشش کا نتیجہ ہے۔ میری زندگی کی ساری خوشی تمہاری ہی دی ہوئی ہے۔“ ”ایسا مت کہو۔ سب سے بڑا احسان تو تم نے کیا تھا مجھ پر۔ اس وقت جب کوئی مجھے شاہ عالم ماننے کو تیار نہ تھا صرف تمہاری گواہی نے شاہ عالم کو ایک نئی زندگی دی۔ میں تو حالات کا قیدی تھا۔ تم نے مجھے اس قید سے رہائی دلائی تھی۔ میں نے وہی کیا جو شاہ عالم تو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میں ناصر عظیم تھا۔ میں تمہارا شوہر بن جانا تو تمام عمر خود کو اپنا چرو دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ آج میں تم سے نظر ملا کے بات کر سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔“

”اچھا اب باتیں چھوڑو۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔“ اس نے مجھے حکم دیتے ہوئے کہا ”جا کے چہرے سے یہ بالوں کا جنگل صاف کر دو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہارے داڑھی مونچھوں کے اور سر کے بال کتنے بے ہنگم طریقے پر بڑھ گئے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کہ ناصر عظیم بن کے تم کیسے لگتے ہو؟“

”رخصتی مجھے مجبور مت کرو۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا ”ناصر عظیم کو یہاں نظر بھی نہیں آتا چاہیے۔ شاہ عالم کی بیوی سے اس کا کیا تعلق؟“ وہ کچھ پاپوس ہوئی ”کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھ سے ملو گے بھی نہیں؟“

میں نے کہا ”ملوں گا۔ اپنے وکیل کی بیوی کی حیثیت سے کیس نہ کیس تمہاری اور میری ملاقات ضرور ہوگی۔ زندگی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔ ناصر عظیم کا شاہ عالم کی سابقہ بیوی کے گھر میں آنا جانا ہو سکتا ہے۔ ہمارے فیملی ریلیشن ہوں گے مگر ابھی نہیں ملاؤ مجھے کچھ پیسے دے دو۔“ وہ کچھ خفت زدہ نظر آئے ”میرے پاس تو ابھی مشکل سے چار سو بڑے ہوں گے۔“

میں نے ہنس کے کہا ”بابا مجھے صرف ٹیکسی کا کرایہ چاہیے۔ نیلم کے گھر تک جانے کے لیے۔“ اس نے مجھے ایک ہزار پچاس دے دیے ”یہ رکھو۔ جاتے ہوئے اپنے لیے کچھ بھی لیتے جاؤ۔“

میں نے کہا ”تھینکس!“

وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی اور اس وقت تک

دیکھتی رہی جب تک میں نظر آتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے جیون کی تشویش تھی۔ یہ سب خدا کا خاص کرم تھا کہ اس نے مجھے اخلاقی مزاحمت کی توفیق دی ورنہ اس وقت جب رخصتی مجھے اپنا شوہر تسلیم کرتے ہوئے خود کو میرے حوالے کرنے پر مصر تھی میں اس سے ایک شوہر کا حق وصول کر لیتا تو شاید وہ میرے لیے کچھ بھی نہ کرتی۔ وہ بھری عدالت میں میرے منہ پر طمانچہ مار کے کہتی کہ یہ دھوکے باز، جھلساز جو میرا شوہر بن رہا ہے، ناصر عظیم ہے اور آج میں اپنا سب کچھ گناہ کے جیل کاٹ رہا ہوں۔ یہ جو آج پھر مجھے ناصر عظیم کی زندگی جیسے کاموں مل گیا ہے۔ یہ رخصتی کا عطا کردہ ہے۔

سڑک پر آ کے میرا اعتماد پھر کچھ متزلزل ہونے لگا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے خطرہ میرے چاروں طرف دھونیں کی طرح بھرا ہوا ہے اور اس کے احساس سے مفر ممکن ہی نہیں۔ راہ چلتے لوگوں کی نظریں مجھے سوال کرتی محسوس ہوتی تھیں کہ تم کون ہو؟ شاہ عالم یا ناصر عظیم؟ اچانک سامنے سے ایک پولیس موٹر سائیکل نمودار ہوئی تو میں زور سے ہو گیا جیسے وہ میری ہی گرفتاری کے لیے وہاں آئی تھی۔

میں چلا رہا تھا کہ مجھے ایک خالی رکشا نظر آگیا۔ اس کے رکشے ہی میں اندر بیٹھ گیا تو ڈرائیور صاحب نے خاصا برا مانا "پہلے پوچھ تو لو بھائی جی کہ رکشا خالی ہے اور میں نے کدھر جانا ہے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے بھائی جی کہ رکشا خالی نہ ہوتا تو تم میرے اشارے پر رکشے کیوں؟ اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ جانا کدھر ہے۔ تم نے فکر اشارہ نیلم کا کدھر دیکھا ہے؟"

"توبہ کوئی۔ اللہ ان بچہروں کے گھرنہ رکھائے" اس نے ایک عام ٹرکھٹے روئے کا مظاہرہ کیا۔

میں نے کہا "اچھا چلو۔ راستہ میں بتانا ہوں۔"

رکشا کی سواری خاصی صبر آزما ہوتی ہے۔ وہ رکشا بھی خیر سے ایسا تھا کہ جتنا آگے چلتا تھا اس سے زیادہ دائیں بائیں ہلتا تھا۔ معمولی سے گڑھے میں بھی رکشا ایسے اچھلتا تھا کہ اندر میں اچھل پڑتا تھا۔ دوبار میرا سر اوپر کیڑوں کو سپور کرنے والے پائیوں سے ٹکرایا۔ رہی سہی کسر اس کے میٹر نے پوری کی جو دھڑکی رفتار سے چلتا تھا مگر ایک بہت بڑے اور جان لیوا عذاب سے گزرنے کے بعد مجھے یہ سب محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا اور میں بڑی بے چینی سے اس سفر کے اختتام کا انتظار کر رہا تھا۔

رکشا میں نیلم باؤس کے گیت پر رکاوٹ سیکیورٹی گاڑنے اسے اشارہ کیا "اوتے آگے لے جاؤ رکشا کو۔"

رکشا والا اس سے بھی زیادہ ٹیڑھا ثابت ہوا "اوتے تو کھڑا رہ چپ کر کے اور اپنا کام کر۔ ادھر تو پارکنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے کیا؟"

میں نے اسے کرایہ دے کے چٹا کیا مگر اس کے بعد ایک نیا مرحلہ آگیا۔ سیکیورٹی گاڑنا تھا اور مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس نے مجھے روک دیا۔

میں نے کہا "میں ناصر عظیم ہوں۔ نیلم کا دوست۔"

"ام کسی دوست کو نہیں جانتا۔ میڈم گھر پر نہیں آے۔"

میں نے کہا "اچھا تو بانو خالہ کو بلاؤ۔"

وہ چونکا "بانو خالہ کو؟"

"ہاں۔ تم کچھ اونچا سنتے ہو۔ بانو خالہ کو بتاؤ میرا نام۔ انٹرکام پر بات کرو۔" میں نے دو گھنٹہ ملازمین کے نام لیے جو خانہ سالن اور بٹری تھے۔ اس کے بعد مشکل آسان ہو گئی۔ بانو خالہ نے خانہ سالن کو گیت پر مجھے رہیو کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ مجھے یوں اندر لے گیا جیسے میں بھی گھر کا مالک ہوں۔ ظاہر ہے یہ پروٹوکول دیکھ کے خود سیکیورٹی گاڑنے بھی مجھ سے معافی مانگی۔

"ہائے ہائے" بانو خالہ مجھے دیکھ کے چونک پڑیں "ارے بیٹا، یہ تم ہو۔ میں نے تو کہا کہ ناصر کا نام لے کر کون جنگلی گھس آیا گھر میں۔"

میں نے فرط مسرت سے جنگلیوں جیسی آواز میں نکالیں۔

"جنگلیں ماریں اور بانو خالہ کو گود میں اٹھا کے دائیں کرتے لگا" میں جنگلی ہوں بانو خالہ۔ بھوت ہوں۔ بابا بابا۔ اب تم کیا کرو گی۔ میں نے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔"

وہ ہنسنے ہوئے غصہ ہونے لگیں "ارے چھوڑو مجھے۔ یہ کیا تماشا کر رہے ہو نوکروں کے سامنے۔"

میں نے انہیں اتار دیا۔ "آج میں بہت خوش ہوں خالہ!"

انہوں نے اپنی سانس پر قابو پائے کہا "اوہو ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "آج شاہ عالم مر گیا۔"

انہوں نے بیٹے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے اللہ۔ کون مر گیا ہے اور تم اس پر یوں خوشی منارہے ہو تو یہ کہو تو یہ!"

"وہ ایک شیطان تھا خالہ۔ اس نے قبضہ کر رکھا تھا مجھ پر۔ آج میں آزاد ہوں۔ بالکل آزاد" میں نے ناپتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "بتائیں بیٹا، تم کیا کہ

رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

میں نے کہا "چھوڑو خالہ۔ یہ بتاؤ نیلم کہاں ہے؟"

"لو۔ نیلم کیا اس وقت گھر میں ہوتی ہے۔ وہ تو بخار میں بھی چس جائے شوٹنگ کے لیے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے شوٹنگ کہاں ہوگی اس کی۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ بتاؤ رکشیں کہاں لے گا؟"

"جانے، مجھے کیا پتا بیٹا؟"

میں نے کہا "بانو خالہ۔ اگر آپ کو ایمر جنسی میں ضرورت نہ جائے تو آپ کیسے رابطہ کریں گی نیلم سے۔"

"نیلم فون ڈائری میں اسٹوڈیو کے نمبر ہیں۔ کسی سے پوچھوں گی۔" بانو خالہ نے سادگی سے کہا۔

"رائٹ!" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

نیلم فون ڈائری نیلم کے کمرے میں اس کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر موجود تھی۔ اس میں سارے اسٹوڈیو کے اور تمام اہم فلمی شخصیات کے فون نمبر خاصی ترتیب سے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے تین اسٹوڈیو میں بات کی۔ چوتھی جب بات کرنے والے نے کہا "ہاں۔ میڈم سیٹ پر ہیں۔"

میں نے کہا "میں ان کے کمرے سے بات کر رہا ہوں۔"

"میڈم" بھی نہیں آئیں۔ ثابت چل رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم میڈم کے سیکریٹری پر نہیں کوئی نام دو کہ وہ فوراً گھر فون کرے، ایمر جنسی ہے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ رکشیں کو میرا پیغام دیور ہونے اور پھر رکشیں کے کہیں سے فون کرنے میں دس منٹ تو ضرور لگیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسٹوڈیو میں تلاش کرنے سے وہ نہ ملے۔ وہ فرید عباسی کے ساتھ میری تلاش میں بٹل رہا ہو اور ایسا ہی ہوا۔ میں فون سے لگا بیٹھا تھا اور انتظار کی کوفت سے گزر رہا تھا کہ کھنٹی بجی اور دوسری طرف سے میرے "ہیلو" کہتے ہی نیلم نے جیج ماری۔

"ناصر۔ تم۔ تم کب آئے؟"

میں نے کہا "اف اتنے زور سے چلائی ہو کہ میرا کان خراب کر دیا۔ آدھا گھٹنا ہو گیا مجھے آئے۔"

وہ گھبراہٹ میں بولی "دیکھو میں آتی ہوں ابھی ایک گھنٹے میں۔"

میں نے کہا "تم اطمینان سے اپنا کام منٹا کے آؤ۔"

وہ بولی "تم کہیں جانا تم۔"

میں نے کہا "اب کہاں جانا ہے۔"

"تمہارا کچھ بھروسا نہیں۔ اچانک روانہ ہو جاؤ۔"

میں نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ قیامت بھی آجائے میں تمہارے واپس آنے تک کہیں نہیں جاؤں گا۔ رکشیں کہاں ہے؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ مخاطب لہجے میں جواب دیا "وہ گیا ہے تمہارے ہی ایک ضروری کام سے۔"

خانہ سالن کے آس پاس دوسرے لوگ بھی موجود تھے جو اس کی بات سن سکتے تھے اس لیے نیلم نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ رکشیں میرے جوائنٹل ریڈانہ کے سلسلے میں فرید عباسی کے ساتھ کورٹ گیا ہوا ہے۔

فون کرنے کے بعد میں نے ایک راتے وقار ملازم کو طلب کیا اور اس سے پوچھا "میں ان گھنٹے سال ہو گئے کام کرتے۔"

اس نے سوچ کے کہا "دس سال سے زیادہ ہو گئے جناب۔"

میں نے کہا "تمام کیا ہے تمہارا؟"

"محمد بخش جناب۔ بخشو کہتے ہیں سب لوگ۔"

میں نے کہا "محمد بخش۔ یہاں کوئی بار ہے۔"

"باربر۔" اس نے میرے سر اور داڑھی میں مونچھوں پر ایک پرجوش نگاہ ڈالی "مل جائے گا جناب۔ نزدیک تو کوئی نہیں۔ مارکیٹ تک جانا پڑے گا آپ کو۔"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ باربر یہاں آجائے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا جناب۔ بس پیسے زیادہ لے گا گھر آنے کے۔"

میں نے کہا "کیسے لاؤ گے اسے؟ یکسی میں۔"

وہ بولا "ایک گاڑی ہے جناب۔ میڈم نے ملازمین کو دے رکھی تھی ایسے ہی بازار کے کاموں کے لیے۔ رکشیں صاحب نے واپس لے لی۔"

میں نے کہا "اس کی چابی کہاں ہے؟"

"بانو خالہ کے پاس ہوگی۔"

میں نے کہا "جا کے میرا نام لو۔ چابی مل جائے گی۔ کیا نام ہے میرا؟"

وہ تھوڑا سا زور سے ہوا "نام۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم ہے میرا نام۔ سب ملازموں کو بتا دو۔ ایک بات اور۔ فی الحال میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا اس لیے گیت پر چوکیدار سے کہہ دو کہ خواہ گورنریڈل چل کے مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ اس سے کہہ دو کہ یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ گھر میں میڈم ہوں گی۔ رکشیں صاحب

ہوں گے لیکن میں نہیں ہوں۔“
”سمجھ گیا جناب!“ وہ جانے لگا۔
میں نے کہا: ”ایک بات اور۔“
وہ رک گیا۔ ”جی سر۔“

میں نے کہا ”بارہ کو ساتھ لے کر آؤ تو اسے سروٹ کوارٹر کی طرف لے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا۔ اسے ڈرائنگ روم میں مت بٹھانا۔“

اس نے سر ہلا کر جی جناب کہا اور چلا گیا۔ میں بیڈ پر لیٹ کر اپنی زندگی کے اس انقلاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج میں پھر ناصر عظیم تھا اور مجھے اپنی زندگی ماضی کے سب رشتوں کے ساتھ اور مستقبل کے سارے خوابوں پر اختیار کے ساتھ واپس مل گئی تھی۔ شاہ عالم جسے مرے ہوئے زمانہ ہو گیا تھا مگر وہ ناصر عظیم کے قالب میں زندہ تھا۔ آج بیشک کے لیے اس دنیا کی نظریں او جھل ہو گیا تھا۔

بے شک یہ سب ویسے نہیں ہوا تھا جیسے میں نے بیان کیا تھا مگر خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں نے ہوس سے اور دنیا سے بیشک کے لیے غائب ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ مشکل اور خطرناک ہی نہیں کسی حد تک فکری بھی تھا لیکن اب جو کچھ ہوا تھا بالکل فطری اور حقیقی تھا۔ شاہ عالم کو پولیس نے پرانے مقامات کے سلسلے میں گرفتار کیا تھا۔ عدالت نے دوبار اس کا تین تین دن کے لیے جسمانی ریمانڈ پر مقرر کیا۔ دن جب اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجے کے لیے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانا تھا وہ پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا۔ کیسے فرار ہو گیا؟ یہ عدالت کو بتائیں گے تھا۔ انچارج انسپلر سلامت علی یا اس کے سرپرست اور افسر اعلیٰ اسے

ایکس پی و لا اور شاہ وہ کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اسے چھاننے کی حالات سے ملک رب نواز کے گھر کی بجیل منتقل کر دیا تھا جہاں اس کی گمرانی پر ایک غیر انسانی مخلوق لائی گئی تھی ساتھ کلا شکوف رکھنے والے دو مسلح محافظ مامور تھے۔ مگر اس نے ایک گاڑ کو ہلاک کر دیا اور باقی کو ناک آؤٹ کر دیا پھر اس نے گھر کی مالکن ملک رب نواز کی نصف بہتر ملکانی کو اور اس کی بہو کو پر غمال بنایا اور نکل گیا۔ کوئی بھی اس کا راستہ نہ روک سکا۔

رب نواز کے قبضے سے فرار ہو کے شاہ عالم کہاں گیا؟ یوم شمسے پہلے اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا۔ اسے آسمان کھا گیا یا زمین نکل گئی۔ کچھ بتائیں اس دنیا سے وہ ایسے غائب ہو گیا جیسے وہ کوئی جاوید گر تھا یا جن بھوت تھا۔ اب میرے لیے یہ بھی ضروری نہیں رہا تھا کہ میں کسی

لاوارث لاش کے حصول اور اسے شاہ عالم قرار دینے کے لیے کوئی پتہ چلاؤں اور قانونی طور پر اس معاملہ کو شخص کے شاہ عالم قرار دیے جانے والے کی سرکاری طور پر تدفین کا ثبوت دینا کے سامنے پیش کروں۔ اگر پولیس کو شاہ عالم کی گمشدگی کے مسئلے سے جان چھڑانی ہوگی اور اس کے خلاف چلنے والے کیسوں کی فائل کلوز کر لی ہوگی تو وہ خود ہی یہ سب کچھ کرے گی۔

میرے لیے اگلا مرحلہ تھا ناصر عظیم کی شناخت قائم کرنے کا لیکن اس میں مجھے کوئی دشواری پیش آنے کا امکان نہیں تھا۔ ایک بار جب مجھے رب نواز نے داڑھی والا جن سمجھتے ہوئے عدالت کے کمرے میں بنگامہ کر دیا تھا تو میں نے پیر اسٹار نیلم اور شہرت یافتہ نیک نام ڈاکٹر کمال جیسے معتبر معزز اور مستند گواہ عدالت میں پیش کر دیے تھے اور خود کو ناصر عظیم ثابت کر کے رب نواز کی ساری غلط فہمی دور کر دی تھی۔

تاہم اتفاقات کے لیے دنیا بہت چھوٹی جگہ تھی اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اس بات کے امکانات بہت زیادہ تھے کہ ملک رب نواز اور ناصر عظیم کا آمتا سامنا ہو جائے لیکن ایک بار میں اس کے سامنے ناقابل تردید ثبوت پیش کر چکا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور یہ بات وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس شہر میں شاہ عالم جیسا ہی دوسرا موجود ہے مگر وہ شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہے جس کا شاہ عالم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شاہ عالم کی سابق شریک حیات رخشدہ کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس راز سے آشنا تھے کہ ناصر عظیم نے کن حالات کے تحت اپنی زندگی کے چند ماہ شاہ عالم بن کر گزارے تھے لیکن وہ سب میرے اپنے لوگ تھے۔ یہ بات ر میں جانتا تھا اور ڈاکٹر کمال فاروقی جانتا تھا چنانچہ اقرار اور نیلم جانتی تھیں کہ اپنی بد قسمتی یا بے وقوفی کے باعث ناصر عظیم کتنے دن شاہ عالم کی زندگی جیسے پر مجبور ہوا تھا مگر کچھ ایسے مہیاں بھی تھے جو کچھ نہیں جانتے تھے اور پوری نیک نیتی اور یقین کمال کے ساتھ حلف اٹھا کے کہہ سکتے تھے کہ یہ وہی ناصر عظیم ہے جسے وہ بچپن سے جانتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مشہود کی فیملی۔ ہاسی ہیر اور ڈاکٹر انجم کمال کی فرشتہ سیرت اسٹنٹ کوئن اور دو چنگ منبر مجھے دس سال سے جانتے تھے۔ چنانچہ ناصر عظیم کو ملک رب نواز سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جب ملازم نے مجھے باہر کی آمد کی اطلاع دی تو میں تقریباً غور کی کیفیت میں تھا۔ سروٹ کوارٹر میں جا کے میں

نے بارہ سے کہا کہ وہ میرے بال تراش کر چھوٹے کرے اور داڑھی صاف کر کے مجھے کلین شیو بنا دے تو وہ کچھ چونک کر زب لب مسکرایا لیکن پھر کچھ بولے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
آدھے گھنٹے بعد میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تو غور کو بچان کے مجھے ایک انجان سی خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے آپ سے بھی چھڑا ہوا تھا اور مجھے ایک حسب حال شعرا د آیا۔

اسے دوست کسی ہوم ڈیرین کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے مجھے ایسا محسوس ہونا تھا جیسے زندگی کے طلب گار خطرات سے بھرے ہوئے ناامیدی کے تاریک جنگل کا سفر اچانک امید کے ہر تحفظ اجالے کی منزل پر پہنچ کے تمام ہو گیا ہے۔ میں نے خود کو اتنا ہی ہکا پھکا اور سبک دوش محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے مجھے اپنے ماضی کی یادوں کی سرزمین سے جوڑنے والا کیل بھل گیا ہے اور وہ فریخت، اکیلے پن اور مایوسی کا احساس دلانے والا وقت بے وجود ہو گیا ہے جو میرے ماضی اور حال کے درمیان ایک عمیق خلا کی طرح ناکمل تھا۔

میں نے غسل کے بعد گیسٹ بیڈ روم کی وارڈ روب میں جھانکا تو وہاں مجھے اپنے مطلب کے کپڑے مل گئے تین مختلف سائز کی شرٹس میں سے ایک مجھے ٹھیک آئی۔ ایسا ہی پتوں کے انتخاب میں ہوا۔ کپڑے بدلنے کے بعد جب میں ایک بالکل نیا انسان یعنی پرانا ناصر عظیم بن چکا تھا میں نے گہری دیکھی۔ نیلم سے میری بات ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کو اپنے شوٹنگ کے شیڈول سے فرصت نہیں ملی اور وہ شات مکمل کر کے ہی آ پائے گی۔

میں نے بانو خالد سے کافی یا چائے کی فرمائش کرنے کا سوچا مگر پھر بیڈ کی آغوش راحت نے مجھے تنہا لیا اور میرا سر تکیے سے لگاؤ تھک مجھ پر غالب آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ باہر سے نیلم کے اور رئیس کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو وہ باتھوں میں ہاتھ دالے الان پر آہستہ آہستہ چل قدمی کر رہے تھے۔ وہ دونوں اتنے پرسکون اور ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے کہ مجھے یہ منظر دیکھ کے خوشی ہوئی اور میں کچھ دیر رئیس کی زندگی کے اس انقلاب کو دیکھتا رہا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتا

رہا۔
نیلم کے لیے چاہے جانے کی کیفیت کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھی اس کے بزاروں پر ستار اور لاکھوں مداح تھے۔ ان میں ایسے بھی بہت تھے جنہوں نے ٹوٹ کے نیلم کو چاہا تھا اور دل کی گمرانی سے نیلم کو بار بار کیا تھا مگر وہ اتنے خوش نصیب نہ تھے کہ جواب میں انہیں بھی نیلم کی نگاہ التفات میسر آتی۔ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ سیکڑوں میں ایک دو یقیناً ایسے تھے کہ انہیں وہ اپنے شریک حیات کے طور پر قبول کر لیں مگر وہ صرف پرستار تھے۔ وہ کسی ایکٹریس سے شادی کو اپنے لیے معاشرتی طور پر گھائلے کا سودا سمجھتے تھے۔ وہ صرف چند راتوں کی خلوت کے طلب گار تھے۔ بالفاظ دیگر صرف ہوس پیش ہی تھے۔ باقی وہ سب تھے جن کو نیلم کی توجہ بھی حاصل نہ ہو سکی۔

رئیس کا معاملہ اس کے برعکس تھا کہ وہ نیلم کے مداحوں میں شامل تھا اور نہ اس کے پرستاروں میں۔ شاید وہ اتنی اونچی پرواز کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر نیلم کی نگاہ نے کیا کام لا جواب کیا کہ اس کو لاکھوں مردوں میں انتخاب کیا اور پھر یہ ثابت کیا کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور محبت وہ پھول ہے جو کسی صحن گلشن میں نہ کھلے مگر پھر کی چٹان میں یا ریگ صحرا میں کھل جائے۔

رئیس کے ساتھ وہی وہاں حضرت ہوئی کے ساتھ ہوا تھا کہ آگ لینے کو جائیں پیپیری مل جائے۔ وہ میرے ساتھ نیلم کے گھر آتا جاتا رہا اور شاید ہر مرد کی طرح اس حسین عورت کے بارے میں سوچتا بھی رہا ہو۔ یہ نامکن تھا کہ کوئی مرد نیلم کے اتنا قریب جا کے اسے دیکھے اور خواہش اس کی آتش شوق کو نہ بھڑکائے مگر اس نے بھی تصور میں نہ سوچا ہو گا کہ انجانے میں محبت کی خاموش چنگاری نیلم کے دل میں چپکے چپکے سنگ رہی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ تنہا سوال شاید رہا ماضی کے ان دقیق مسائل سے زیادہ مشکل ہو گا جن پر فیثا غورٹ تمام عمر غور کرتا رہا اور جس کا جواب شاید کمپیوٹر کے دور کا کوئی سائنس دان بھی نہیں دے سکتا۔ بس بھی کوئی ایسی ناقابل فہم نظر نہ آنے والی اور دوسروں کو محسوس نہ ہونے والی بات جس نے نیلم کے دل کے خوابیدہ تاروں کو جھیر دیا اور محبت کے لغوؤں کو جگا دیا۔

چنانچہ وہ رہیں جو تمام عمر احساس محرومی اور احساس کمتری کا شکار رہا اور وقت گزاری کے لیے شوہن مزاج لڑکیوں سے دل لگی میں محبت کا کھیل کھیلتا رہا۔ اب نیلم کا محبوب تھا اور اس کی محبت کے سندھ کی گمرانی میں اتنا ڈوب

گیا تھا کہ میرے لیے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار تھا۔ وہ بالکل لپٹے بھٹے ہو گئے تھے۔ دنیا جتنا چاہے اس انوکھے پیار پر حیران ہو مگر بہار تو ہوتی ہی انوکھا ہے۔

جب میں نے کھنکار کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو چونک کر انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر نلیم پلٹ کے میری طرف بے اختیار لپکی۔ مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر رک کے اس نے مجھے غور سے نظر ہٹا کے دیکھا۔ اس کا چہرہ فطرتاً اور مسرت سے ہنستا رہا تھا۔ وہ ناصر عظیم کو اپنے اصل روپ میں اپنے مقابل دیکھ کر گزرے ہوئے وقت کی یادوں کی حسین دلدلوں میں گم ہو گئی تھی۔

بالآخر میں نے مسکرا کے کہا ”یہیے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھا اور میرے ہاتھ پر ایک بوسہ دیا جس میں ماسٹا کی محبت تھی۔ من کا پیار تھا۔ دوستی کی مخلصانہ وارفتگی تھی اور اپنائیت کا باسیت بھرا انداز تھا۔ رہیں ہمارے قریب کھڑا خیر کے ساتھ مسکراتا رہا۔

وہ بولی ”میں ناصر عظیم کو دیکھ رہی ہوں۔ بہت عرصے بعد۔“

میں نے کہا ”ایک شعر سنو گی۔“

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا بس یہی بات ہے اچھی فرے ہرجائی کی وہ بولی ”تم نے بہت اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔ اب میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔“

میں نے کہا ”تم تو خود مجھے چھوڑ جاؤ گی۔“

وہ میری بات نہیں سمجھی ”میں کیوں چھوڑ جاؤں گی؟“

”اور کیا۔ چھوڑ کے جا ہی رہی تھیں لندن۔ میں نے پکڑ لیا کراچی ایئر پورٹ پر اور اب تک روک رکھا ہے۔“

وہ شرما کے ہنسی ”ہم آئے تو تم گہری خند میں تھے۔ ہم نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”سو چا خلوت کے کچھ لمحات اور ساتھ گزار لیں۔ اس کے بعد تو کتاب میں یہ مستقل بڑی رہے گی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو تم۔“

رہیں بولا ”اس کا دل چاہ رہا ہے گالیاں کھانے کو۔ اس کے بغیر داغ کا ہاضمہ خراب رہتا ہے سالے کا۔“

میں نے کہا ”ابھی میں چپ کے نہیں دیکھ رہا تھا تو قسم اللہ کی پیار سے۔ بہت اچھا لگا مجھے یہ سین۔ پتلونے حوریں لنگور خدا کی قدرت۔ لیکن جوڑے اگر آسمانوں پر بنتے ہیں تو خدا نے شاید اس سے اچھا جوڑا آج تک نہ بنایا ہو۔ دس

سال سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں تم دونوں کو۔ کتنا وقت لگا قدرت کو اس فاصلے پر پہنچنے میں اور جو فیصلہ اتنا سوچ سمجھ کے کیا جائے وہ کتنا صحیح ہو گا۔“

نلیم نے میرا بازو تھام لیا ”چلو اندر چل کے باتیں کرتے ہیں۔“

میں نے کہا ”تم لوگ چائے پی چکے؟“

”تمہارے ساتھ پھر نہیں گئے۔“ نلیم بہت خوش تھی اور بات بات پر ہنس رہی تھی ”چھا تم لوگ یہاں بیٹھو۔ میں باؤ خواہد سے کھتی ہوں۔“

میں نے کہا ”میں تو کافی پیوں گا۔“

رہیں میرے ساتھ ٹیرس میں بڑے ہوئے کشن والے بید کے صوفے پر بیٹھ گیا ”چتا تو مجھے چل گیا تھا تیرے فرار ہونے کا۔“

میں نے کہا ”مجھے کیسے پتا چل گیا۔“

”ابے یار کورٹ میں ایک سنسنی بھیلی ہوئی تھی۔ مجسٹریٹ نے کئی بار پوچھا کہ ملزم کہاں ہے تو ایس ایچ او نے بڑی مشکل سے کہا کہ سر آج اسے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر مجسٹریٹ نے کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تم ملزم کو لائے گیوں نہیں؟ انسپکٹر سلامت علی نے پہلے ٹالا کہ ملزم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر پھر فرید عباسی بھی اس کے پیچھے پڑ گیا کہ عدالت کو کچھ بتاؤ۔ کیا تمہارے جسمانی تشدد کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہے؟ یا تم نے اسے مار دیا ہے۔ عدالت میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بالآخر انسپکٹر نے تسلیم کیا کہ ملزم حراست سے فرار ہو گیا ہے۔ فرید عباسی نے اسے جھوٹ قرار دیا تو سلامت علی نے کہا کہ ملزم کے کچھ ساتھی اسے تھانے سے زبردستی چھڑا کے لے گئے۔ فرید عباسی نے پوچھا کہ کیا تھانے پر مسلح افراد کے حملے کی اس واردات کا اندراج ہو چکا ہے؟ وہ کیا بتانا آئیں یا میں شائیں کرتا رہا۔ ایس ڈی ایم تجربہ کار اور پولیس شناس لوگ ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ عدالت تمہیں دو گھنٹے دیتی ہے۔ دو گھنٹے بعد میں ملزم کو پیش کر دیا اس کی حراست سے فرار کا ریکارڈ لاؤ۔ سلامت علی تو عدالت سے بھاگ گیا۔ اس کے ایک ماتحت نے کہا کہ انچارج صاحب ریکارڈ لینے کے لیے تھانے ہی گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں لوٹ کر نہیں آئے۔ انہیں کچھ مصلحت دی جائے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ عدالت کا وقت ختم ہونے تک مصلحت ہے اس کے بعد تھانہ انچارج کے خلاف غفلت اور تاہلی کے الزام میں مقدمہ درج کیا جائے۔ عدالت برخواست ہونے سے پہلے ہی اسے انیس پلاؤ اور شاہ

پیش ہو گیا اور اس نے بتایا کہ انسپکٹر سلامت علی کو غفلت رہنے اور اوپر فرض میں کوتاہی برتنے پر معطل کر دیا گیا ہے اور اس معاملے کی پوری طرح چھان بین کی جائے گی۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ تھانے کے عملے کو بھی معطل کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ زیر حراست ملزم کو فرار کراتے میں کس شخص کا ہاتھ ہے۔ ان سب کے خلاف مقدمات درج کیے جائیں اور ایک مہینے بعد رپورٹ عدالت میں پیش کی جائے۔ فرید عباسی نے اچھا خاصا ہنگامہ کیا کہ پولیس نے میرے ٹیبل کو تشدد سے ہلاک کر دیا ہے۔ ان کے خلاف قتل کا مقدمہ درج نہ ہوا تو وہ بالی کورٹ سے رجوع کرے گا۔ حراست سے فرار کی کمانی جھوٹ ہے جو پولیس انسپکٹر سلامت علی کو بچانے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ اس معاملے میں عدالت عالیہ کی سطح پر انکوائری تیسرے مقرر ہونا ضروری ہے۔“

”پولیس تو پھینس گئی۔“ میں نے کہا۔

”فرید عباسی ایک دو دن میں بالی کورٹ میں پولیس کے خلاف درخواست دے گا اور یہی موقف اختیار کرے گا کہ پولیس نے میرے ٹیبل کو اپنے ہیمنہ تشدد سے ہلاک کر دیا ہے اور اب اس قتل کو چھپانے کے لیے حراست سے فرار کی کمانی گھڑی گئی ہے۔ پولیس کو حکم دیا جائے کہ وہ شاہ عالم کو عدالت میں پیش کرے۔“

میں نے کہا ”فرید عباسی کے لیے یہ اپنی دکالت کی دکان چکانے کا بہترین موقع ہے۔ وہ پولیس کا فخر کس بلائے۔“

”یہی مشورہ اسے شہنم نے دیا تھا۔ وہ تجھ سے بات کرے گا پہلے۔“ رہیں نے کہا۔

نلیم جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھی رہیں سے کہا ”اب چھوڑو یہ سب۔ جان بچ گئی تو خدا کا شکر ادا کرو۔“

میں نے کہا ”وہ تو میں کہہ رہا ہوں لیکن یہ سب بھی ضروری ہے۔“

”کیوں ضروری ہے۔“

میں نے کہا ”جھوٹ اگر مسلسل اور بار بار بولا جائے تو بالآخر دنیا اسے سچ مان لیتی ہے۔ میرے معاملے میں بہت زور و شور کے ساتھ مسلسل یہ بات کہی جاتی جا رہی ہے کہ پولیس نے اسے ہلاک کر دیا اور لاش غائب کر دی۔ ہم یہ جھوٹ بار بار اخباروں میں پولیس کے تو پبلک اس پر آسانی سے یقین کر لے گی کیونکہ پراسرار طور پر کسی کا غائب ہونا ایک بے معنی بات ہے۔ پولیس تشدد سے لوگ ہلاک ہوتے ہی رستے ہیں پھر

ہمارے سیاسی کلچر میں سرکاری کریمیں، وقدر رضا و رغبت ہر اسان کرنے اور راستے سے ہٹانے کے لیے ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے اور سیاسی قتل بھی ہماری سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ابھی شاہ عالم کی سیاسی حیثیت اخبارات کی حد تک برقرار ہے۔ چنانچہ اس کے قتل کو ایک سیاسی سازش بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ملک رب نواز کے سوا باقی سب مان لیں گے کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا یا کر دیا گیا۔“

”آخر کیا ضرورت ہے اتنا لمبا جکر چلانے کی۔“ نلیم بولی۔

”ضرورت ہے نلیم۔ اس کا ایک ناکہ تو مجھے ہو گا۔ لوگ جان لیں گے کہ اب شاہ عالم نہیں رہا۔ ناصر عظیم کے مستقبل کا تحفظ شاہ عالم کے عدم وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاہ عالم کے لیے صرف یہ فرض کر لینا کافی نہیں ہے کہ وہ لا پتا یا غائب ہو گیا ہے۔ مفزور ہے یا روپوش ہے کیونکہ ایسی صورت میں اس کے کہیں زندہ پائے جانے کے امکانات بالی رستے ہیں۔ چنانچہ یہ لازمی ہے کہ شاہ عالم کے زندہ نہ ہونے پر لوگوں کو یقین آجائے اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کی موت کو ثابت کر دیا جائے مگر اس کا ثبوت کوئی نہیں۔ دوسرا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کے نہ ملنے پر وادیا کیا جائے اور مسلسل یہ کہا جائے کہ اسے پولیس نے قتل کر کے اس کی لاش کو غائب کر دیا ہے۔ ظاہر ہے پولیس۔ اس کی نفی کرے گی لیکن لوگوں کا یہ ہے کہ وہ پولیس کے انکار کو بھی اقرار سمجھتے ہیں اور ہر عرصے کو بے بنیاد جھوٹ جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے موقف کو بے آسانی مان لیا جائے گا اور کسی ثبوت کے بغیر بھی تسلیم کر لیا جائے گا کہ شاہ عالم کو مروا دیا گیا۔ اس نے موائیا۔ کیوں موائیا اور کیسے موائیا۔ ایسے سوالات ہمیشہ اٹھنے میں لیکن لیاقت علی خاں سے لے کر آج تک ہونے والے کسی قتل کے سلسلے میں نہ ایسے سوالات کا کوئی جواب ملا ہے اور نہ کسی قتل کا معاملہ ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ عالم کا قتل بھی اسی فہرست میں شامل ہو جائے گا جس میں شہید ملت کے بعد ڈاکٹر خان صاحب اور امیر محمد خان آف کالا باغ کے بعد بھی کئی نام شامل ہو چکے ہیں اور یہ فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ کرنے والے تو اس فہرست میں ذوالفقار علی بھٹو اور فیاض الحق کے نام بھی شامل کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں شاہ عالم جیسے معمولی حیثیت کے سیاست دان کا نام بھی مارے جانے والوں میں لکھ دیا گیا تو یہ کوئی ناقابل یقین بات نہیں ہوگی۔“

رہیں سوچ کے بولا ”پھر بھی ہمارے رب نواز جیسے

گیا تھا کہ میرے لیے اس کا

لوگ کہتے تھے میں ہی جلا رہا ہوں گے۔

میں نے کہا ”ٹھیک کرتا ہے تو مگر ہو سکتا ہے بعد میں خود پولیس اپنی جان چھڑانے کے لیے اور شاہ عالم کے سارے عیس ختم کرنے کے لیے کہیں سے اس کی لاش بھی برآمد کرے اور پوسٹ مارٹم سے اسے شاہ عالم ثابت بھی کر دے۔ اگر پولیس نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم کچھ کریں گے۔ کبھی نہ کبھی شاہ عالم کی تدفین بھی کرا ہی دیں گے۔ فی الحال ہمارے لیے یہی کنفیوژن کافی ہے اور ناصر عظیم اس سے پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ یہ محنت کا پھر ختم ہوا۔“ نیلم نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”اب تم شاہ عالم کے بارے میں سوچ رہی نہیں۔ جو ہونا تھا ہوا۔ اب تم ناصر عظیم ہو تو بس ناصر عظیم رہو۔ شاہ عالم کا نام بھی مت لو۔“

ہم نے رات کا کھانا بھی اوپن ٹیرس پر ہی کھایا اور پھر دیر تک اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے گرفتاری کے بعد ملک رب نواز کی حراست میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتائی۔ نیلم بڑی نفرت آمیز دلچسپی کے ساتھ سنتی رہی اور بیچ میں میرے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا اظہار بھی کرتی رہی اور ملک رب نواز پر فحاشی ہوئی رہی۔ رئیس ہر بات کرید کرید کر پوچھتا تھا اور بار بار مشتعل ہو کر ملک رب نواز کو گالیاں دینے لگتا تھا۔ قسم اللہ کی پیارے۔ اس کی تو میں نے غصے میں وہ بھول جاتا تھا کہ وہاں نیلم بھی موجود ہے اور نیلم ہر بار اسے توکتی تھی کہ یہ کیا بد تمیزی ہے۔

ہماری باتیں شاید ساری رات جاری رہیں مگر درمیان میں بانو خالہ نے جانی والے دروازے کے پیچھے آکے کہا ”اے بیٹا اس کا فون آیا ہے۔ اسے کیا نام ہے اس کا اچھا سا۔ وہ جو اخبار میں ہے۔“

نیلم اٹھی ”جینم کا فون ہے۔“

رئیس نے اسے روک دیا ”ایک منٹ ٹھہرو۔ کچھ تفریح لیتے ہیں۔“

اس نے ایک کارڈ پلس فون کا ریسیور مجھے تھما دیا اور خود اندر جا کے باتیں کرنے لگا ”جینم۔ کوئی خبر؟“

جینم نے پوس لیجے میں جواب دیا ”کچھ نہیں۔“

”میں نے بھی آج سارا دن جھک ماری۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔“

جینم نے کہا ”صبح دیکھا۔ سارے اخباروں میں شاہ عالم کے لاپتہ ہونے کی خبریں کالم کی سرخی ہو گئی۔ کہ پولیس نے شاہ عالم کو خدا خواستہ حراست میں تشدد سے ہلاک کر دیا

ہے۔“

”اس میں خدا خواستہ والی کوئی بات نہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے جینم اور خبر سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

”خبر تو محض پولیس پر دیاؤ پڑھانے کے لیے ہے تاکہ وہ شاہ عالم کو عدالت میں پیش کریں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ پولیس ایسا نہیں کر سکتی۔“

”کیوں نہیں کر سکتی۔“ رئیس تلخی سے بولا۔

”اس لیے کہ شاہ عالم کوئی عام لاوارث ملزم نہیں تھا۔ اس کا ایک ایجنٹ ہے۔ وہ بلیک لیڈر شمار ہوتا ہے۔“

”یہ سب باتیں دل کی تسلی کے لیے ہیں۔ مجھے اب کوئی امید نہیں رہی کہ وہ کہیں ہے۔“

جینم کچھ خوف زدہ ہو گئی ”ایسا مت کہو۔ تم دیکھنا کل تک پولیس اسے ضرور عدالت میں لے آئے گی۔ میں نے بہت سخت اداریہ لکھا ہے۔“

”بھڑ میں کیا تمہارا اداریہ۔ کون پوچھتا ہے تمہارے اداریے کو بلی۔ میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔ خدا کرے غلط ہو۔“

وہ نموس ہونے لگی ”کیا سنا ہے؟“

”ایک افواہ ہے کہ پولیس نے اسے رب نواز کے حوالے کر دیا تھا۔“

”پولیس ایسا نہیں کر سکتی؟“

”پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے بھی اس پر یقین تو نہیں کیا مگر جس شخص نے یہ بتایا تھا وہ رب نواز کا خاص آدمی ہے۔ اس نے کہا۔“

جینم گھبرا گئی ”کیا کہا اس نے؟ پولو۔“

”چھوڑو۔ تمہیں صدمہ ہو گا۔“

جینم نے مجھ کو کہا ”بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟“

”تم ابھی رونے لگو گی۔“

جینم چلائی ”یہی کیا بات ہے آخر۔ مجھے پریشان کیوں کر رہے ہو۔“

رئیس نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا ”جینم۔ وہی ہوا

بالآخر جس کا ڈر تھا۔ رب نواز نے اسے مروا دیا ہے۔“

جینم نے پھر چلا کے کہا ”بھوت بکتے ہو تم ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”آئی ایم سوری جینم۔ لیکن رب نواز کا وہ خاص بندہ

جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

جینم رونے کے قریب ہو گئی ”میں نہیں مان سکتی۔ آخر

اس نے تم سے یہ بات کیوں کی۔“

”اوہو۔ بات تو وہ کسی اور سے کر رہا تھا۔ میں نے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ عالم کو پولیس اب عدالت میں کمان سے لائے گی۔ اس کی تلاش بھی نہیں لے گی کسی کو۔“

جینم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“

اب میں نے کہا ”بالکل نہیں ہو سکتا جی۔ ہو سکتا ہے نا۔ نہ لے بندہ خود مل جائے۔ بلکہ لی چکا ہو اب تک۔“

جینم کے ذہن کو کیسا جھٹکا لگا ہوگا اس کا اندازہ میں کر سکتا تھا۔ میری آواز سن کر اس پر سخت سا طاری ہو گیا ہوگا کیونکہ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر چلانے لگی ”تمہ؟ شرم نہیں آتی تمہیں۔ ذلیل۔ کیسے۔“

میں نے ہنس کے کہا ”تکتے شیریں ہیں تمہارے لب کہ ناصر عظیم گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔“

”یہ رئیس تمہارے ساتھ بیٹھ کے بکواس کر رہا تھا۔“

”جی۔ اور میں سب سن رہا تھا گویا۔“

”اسے تو میں وہاں آکے ٹھیک کر دوں گی۔“ اس نے سخت طیش میں کہا ”منحوس شکل اور منحوس زبان والا۔ رئیس خبیث!“

میں نے کہا ”یہ اس کی صحیح تعریف ہے۔“

”تم کب آئے کیسے آئے اچھا میں وہیں آتی ہوں۔“

میں نے کہا ”دیکھو۔ میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔ تم صبح آؤ اپنا کام ختم کر کے۔“

”مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اب اس کا لہجہ خوشی سے معمور تھا۔

میں نے کہا ”فی الحال صرف اتنا سن لو کہ میں واقعی رب نواز کی قید میں تھا مگر نکل آیا وہاں سے۔“

”کیسے نکل آئے۔“

”زور بازو سے اور کیسے۔“

”تم ٹھیک تو ہونا؟“ وہ سخت جذباتی ہو رہی تھی۔

میں نے کہا ”میں ایک سو ایک فیصد ٹھیک ہوں اور نیلم

کے گھر میں ایک سو ایک فیصد محفوظ ہوں۔“

”ناصر۔ کسی نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا تو نہیں

تھا۔“

میں نے کہا ”میں تک کسی کے خیال کی رسائی بھی

نہیں نہیں۔“

”پھر بھی تم احتیاط کرو۔ ابھی کچھ دن گھر سے مت

نکل۔“

”یعنی ایک قید سے نجات پانے کے دوسری قید پر رضا و رغبت قبول کر لوں۔ ذرا کی وجہ سے باہر نہ جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ صبح مجھے تمہارے ساتھ جانے اپنے آفس دیکھنے ہیں۔“

وہ الجاہت سے بولی ”ناصر میرا بہت دل چاہ رہا ہے ابھی آئے کو۔“

میں نے کہا ”اگر تم بھی مجھ پر یہ تشدد کرنا چاہتی ہو تو آجاؤ۔ پہلے مجھے پولیس نے جگائے رکھا پھر رب نواز نے۔ اب کیا تم بھی سوئے نہیں دو گی؟ میں فینڈ کی سخت کی کا شکار ہوں جینم۔“

”دک۔ اوکے۔ میں صبح آ جاؤں گی۔ شب بخیر!“

میں نے کہا ”شب بخیر۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

میری دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں ابھی جا کے فرار چندا سے ملوں مگر میں نے اسے تقاضائے دانش مندی کے خلاف سمجھتے ہوئے خود کو قائل کیا کہ اس وقت سو جانے سے رات بھر میں میری ذہنی اور جسمانی توانائی کی میٹری پوری طرح چارج ہو جائے گی اور میں نئی زندگی کی دلدار صبح کا استقبال زیادہ پرجوش انداز میں کر سکوں گا اور میرے لیے ناصر عظیم کی حیات نو کے معمولات کو اختیار کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔

جینم صبح سات بجے ہی آ موجود ہوئی۔ گہری پرسکون فینڈ سے جاگ کے میں نے بیڈ روم کے دروازے پر اس کے بے قرار ہاتھوں کی دستک سنی اور پھر اس کی آواز۔ میرے آنکھیں کھول کے بیڈ چھوڑنے تک اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کر دیا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو اس کے اندر آنے سے پہلے اس کی خوشبو کا جھونکا اندر آیا پھر میں نے اسے خوشی سے جھگڑائی مسکراہٹ اور بے تاب مدوش آنکھوں کے ساتھ اپنے مقابل دیکھا۔ اس نے وہی نظروں ازل اس پر سن رکھا تھا جو ایک طرح سے اس کی پہچان اور اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ مروان کا کاروائی لمبی سیاہ شرٹ جس کا اوپر والا ایک

پٹن بیٹھ کھلا رہتا تھا یا غیر موجود ہوتا تھا اور جس میں اس کی گردن اور اس کے نیچے تک نظر آنے والی شفاف جلد کا احاطہ

پن زیادہ خیرہ کن ہو جاتا تھا۔ کندھے پر پھیلے جیسا بیک اور نیچے سفید شلوار کے ساتھ جو گرز۔ اس نے بیٹھ کی طرح اپنی مخصوص فریم و گارڈ کی اوزر شانوں تک تراشیدہ بالوں کے سرسراے پھلنے رشیم کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ کچھ دیر مجھے مسکراتے دیکھنے والی محروم نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر بولی ”واؤ!“

مداری ☆ 171 ☆ گیارہواں حصہ

مداری ☆ 170 ☆ گیارہواں حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

[illegible]

میں نے خود کو تخت بے بس محسوس کیا "جینہ" تم اور میں اچھے دوستوں کی طرح روکتے ہیں۔"

"اور پیار بھی کر سکتے ہیں۔ کیا دوستی پیار کی راہ میں حاصل ہو سکتی ہے یا پیار ہو تو دوستی نہیں ہو سکتی۔ تمہاری منطق بھی عجیب ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی "چلو اب پہلے تمہارا دعوے کا تیار ہو جاؤ۔ میں دیکھوں نیلم یا نہیں پھر ہم ناشتا کریں گے۔ میرا تو بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔"

ناشتے کے بعد نیلم نے مجھ سے معذرت کر کے "آج میرا بہت بڑی شیدول ہے۔ رات کو ملاقات ہوگی۔ رہیں رہے گا تمہارے ساتھ۔"

رہیں بولا "میں اسے گھر میں باندھ کے رکھوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

میں نے کہا "نہیں یا آج بہت کام ہیں۔"

رہیں بولا "اے رہنے دے سارے کام ابھی۔ کچھ دن باہر مت جا۔"

"یہی مشورہ خاتون بھی دے رہی تھیں۔" میں نے جینہ کی طرف دیکھا "لیکن میرے لیے کسی قیدی کی طرح گھر میں بند رہنا ناممکن ہے۔"

نیلم نے کہا "ایسے کون سے ضروری کام ہیں آخر۔"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو مجھے اپنے لیے جوتے اور کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ روزمرہ کے استعمال کے لیے پھر مجھے بینک جانا ہے۔ بینک پر یاد آیا۔ میرا سامان رکھا ہے۔"

رہیں نے کہا "کچھ سامان تو جبر الیڈ ایک سوٹ کیس میں ڈال کے لے گیا تھا۔ باقی میں ہوکل سے اٹھا لیا تھا۔ تیرے کمرے میں پڑا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں؟"

میں نے کہا "اس میں دو بینک ڈرافٹ ہیں دو لاکھ پانچ سو کے۔ لندن میں عاقل خان نے بنوائے تھے۔ ایک نیلم کے نام پر ہے وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادے گی۔ دوسرا تیرے نام پر ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

میں ٹیکسٹ پیڈ روم تک گیا جہاں میں رات کو سویا تھا۔ وہاں ایک کونے میں میرے دو سوٹ کیس رکھے تھے اور ان کے اوپر بریف کیس رکھا ہوا تھا میں نے بینک ڈرافٹ نیلم اور رہیں کے حوالے کر دیے۔

نیلم نے کہا "میرا قارن ایجنسیز اکاؤنٹ ہی ہے۔ کیا تمہیں ایک لاکھ پانچ سو نکوانے ہیں۔"

میں نے کہا "پانچ سو کا میں کیا کروں گا؟"

"بینک سرکاری شرح پر لے گا اور بازار میں دو گے تو ایک لاکھ روپے زیادہ مل جائیں گے۔"

رہیں نے سر ملایا ”دولاکھ پانچ مارکیٹ میں نوٹے لاکھ کے ہوں گے بینک سے انھاری لاکھ ملیں گے“

میں نے کہا ”یار میں کسی لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اب کون بازار جا کے مٹی ہو کر گڑے سودا کرے؟“

نیلیم نے کہا ”پھر میں یہ بینک ڈرافٹ جمع کر ادیتی ہوں اپنے اکاؤنٹ میں اور تمہیں پینتالیس لاکھ کا چیک دے دیتی ہوں۔ تم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر ادیتا یا کیش لے لینا۔ جیسی تمہاری مرضی۔“

رہیں نے کہا ”ایک چیک مجھ سے بھی لے لے۔“

میں نے کہا ”آخر ایسی افرا تفری کیا ہے؟ کہ لیں گے بعد میں حساب۔ ابھی تو میرے اپنے اکاؤنٹ میں اس سے کہیں زیادہ رقم پڑی ہے۔“

”وہ مجھے معلوم ہے کہ تم غریب اور پھٹو نہیں ہو۔ مگر حساب تو حساب ہے۔“ نیلیم نے کہا اور پینتالیس لاکھ کا چیک لکھ کر مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا ”واٹ از دس۔ بینک تمہیں دے گا چوالیس لاکھ اور تم مجھے دے رہی ہو پینتالیس۔“

وہ بولی ”میں بازار سے پانچ خریدتی۔“

”لیکن تم بازار سے کیش خرید رہی ہو۔ ضرورت پڑے گی تو میں تم سے ایک لاکھ نہیں دس لاکھ بھی مانگ لوں گا۔“

میں نے چیک اسے واپس کر دیا ”مگر ایسے نہیں لوں گا۔“

نیلیم نے دوسرا چیک چوالیس لاکھ کا لکھا پھر اتنی ہی رقم کا چیک رہیں نے بھی دیا ”اتفاق سے اپنے اکاؤنٹ میں بھی اتنی ہی رقم ہے۔ میں نے رہیں خانے کی فروخت سے حاصل ہونے والی ساری رقم ڈال دی تھی۔“

میں نے کہا ”تو نے رہیں خانہ بیچ دیا؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”رہیں خانے میں اب کیا تھا۔ لمبے اور راکھ۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔“

میں نے کہا ”اداس مت ہو۔ قدرت جو کرتی ہے اچھا کرتی ہے۔“

نیلیم نے بات بدلنے کے لیے کہا ”اور کہاں جانا ہے تمہیں؟“

میں نے کہا ”کمال کے اسپتال جاؤں گا سب سے ملنے پھر شہنشاہ کے ساتھ جا کے اپنے آفس دیکھنے ہیں۔ ناصر عظیم کی زندگی کا میدان بہت مصروفیت کا ہے۔“

نیلیم نے کہا ”ابھی میں رہیں کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ یہ مجھے اسٹوڈیو چھوڑ کے گاڑی واپس لے آئے گا۔“

”گاڑی تو ہے میرے پاس بھی۔“ شبنم کچھ برا مان کے بولی۔

نیلم مسکراتے گئی ”مجھے معلوم ہے لیکن میری گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں اندر بیٹھا ہوا آدمی نظر نہیں آتا۔“

نیلم کے جانے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو صرف نو بجے تھے میں شبنم کے ساتھ باغ میں ٹھٹھارہا اور اسے گزشتہ دو دن کی روداد سناتا رہا۔ وہ ایک بہت خوب صورت اور خوشگوار دن تھا۔ اجلی ٹیلاہٹ والے آسمان میں سفید کبوتروں کی ٹولی جو پرواز تھی۔ فضا میں صبح بھاری کی آواز گئی اور مک تھی۔ درختوں سے اور سبزے سے ایک دلاؤز نمناسک خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر مالی لان کو فوارے سے پانی دے رہا تھا اور شونخ سبز رنگ کی گھاس پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وسیع باغ اور لان کے آخری حصے کی تفصیل کے ساتھ سیکورٹی گارڈز اسلحہ اٹھائے بے نیازی سے کھڑے تھے۔ ان کی ڈیوٹی انتہائی سخت اور بیزار کن تھی۔ وہ آپس میں بات نہ کر سکتے تھے اور کچھ نہ ہونے کے باوجود سارا دن چوکس رہنے پر مجبور تھے کہ کچھ ہونہ جائے۔

میں نے شبنم سے کہا ”تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ سو جاؤ۔“

وہ بولی ”میں الو ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔“

میں نے کہا ”میری بات مانو۔ ایک بجے تک میں رئیس کے ساتھ بینک کے سب کام نمٹا کے آجاؤں گا پھر ہم یعنی میں اور تم چلیں گے کہیں بیٹھ کے کھانا کھائیں گے پھر تم مجھے کچھ شاپنگ کرا دینا۔ میرے پاس استعمال کے لیے ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں ہیں۔ اس کے بعد اگر وقت بچا تو وہ آفس دیکھیں گے جو تم نے میرے لیے ڈیکورٹ کرا دئے ہیں۔“

وہ بولی ”وقت کی کوئی کمی نہیں۔ رات تک بہت ٹائم ہے۔“

”آج رات تو میں قمر کے گھر میں رہوں گا۔“

”اور چندا کے ساتھ۔!“

میں نے کہا ”لیس چندا اور ڈاکٹر کمال فاروقی۔ تم جانتی ہو کہ یہی میری فیملی ہے۔ اس میں رئیس اور نیلم کو اور شامل کرلو۔“

”یعنی میں کسی خانے میں فٹ نہیں ہوتی۔“ وہ تلخی سے بولی۔

میں نے کہا ”کیا بات کرتی ہو۔ تم سے اچھا دوست کون ہے میرا۔ جتنی مدد تم نے کی ہے میری اس بُرے آشوب دور میں

کسی نے نہیں کی۔ تمہارے احسانات کا بہت بار ہے مجھ پر۔ اتنا کہ میں اتارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میرے لیے سب سے زیادہ قابل اعتبار مشیر ہو۔“

وہ مایوسی سے بولی ”رہنے دو یہ دل خوش کرنے والی بیکار باتیں۔“

”خبنم میں جو کہ رہا ہوں دل سے کہہ رہا ہوں۔“

وہ بولی ”مگر دل سے وہ بات نہیں کہہ رہے ہو جو میں سنتا چاہتی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ محبت تمہیں مجھ سے بھی نہیں تھی مگر بے رخی اور لافعلی کا یہ انداز پہلے نہ تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے تم جانتے ہو مجھے میرے ساتھ ایسا رویہ رکھتے ہو کہ میں بدل ہوں گے تمہارا پیچھا چھوڑوں۔“

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ”ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے خبنم میرے دل میں تمہاری بڑی قدر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اب تمہارے بغیر میری زندگی اتنی ہی ادھوری ہوگی جتنی قریب چندا کے بغیر۔ یا نلیم اور فرید عباسی کے بغیر۔“

”غلط۔ تمہارے دل میں میرے لیے وہ جگہ نہیں جو چندا کے لیے ہے۔“

”بالکل غلط۔ دراصل یہی تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تمہیں وہی عزت اور احترام بھی دینا چاہتا ہوں جو چندا کو حاصل ہے لیکن تم شاہ عالم کی زندگی والے پرانے مقام پر رہنے کی آرزو مند ہو۔ اس معاملے میں وضاحت میں پہلے کرچکا ہوں لیکن آج پھر دو ٹوک الفاظ میں کوئی لگی لپی رکھے بغیر بات پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں شاہ عالم کی طرح میرا مطلب ہے پہلے کی طرح تمہارا جذباتی استحصال نہیں کروں گا۔“

”کھل کے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرے جسم سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔ اب تمہیں مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔“

”خدا کے لیے خبنم اپنی حیثیت اور مقام کو دیکھو۔ اپنے آپ کو اتنا آسان حاصل کیوں بناتی ہو۔ شاہ عالم کے لیے یا کسی اور کے لیے۔“

”میں کسی کے لیے آسان حاصل نہیں ہوں۔“ وہ برہمی سے بولی ”زبان سے کوئی کچھ بھی کہتا رہے لیکن کس میں ہمت ہے کہ خبنم کو بری نیت سے چھوئے کی ہمت بھی کرے۔“

میں نے کہا ”خدا نے تمہیں وہ حسن دیا ہے کہ جس پر تم جتنا ناز کرو کم ہے تمہارے پاس ذہانت کی طاقت ہے اور آگے بڑھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے تمہاری جرات اور

حوصلہ مندی نے تمہیں وہ قوت نصیر دے دی ہے جس سے کام لے کر تم سارے زمانے کو مطیع کر سکتی ہو۔“

”میں ایک شاہ عالم کو نہیں جیت سکتی کیونکہ وہ اب ناصر عظیم بن گیا ہے۔“ خبنم نم لہجے میں بولی ”ناصر عظیم کے لیے میں کچھ نہیں۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔“

میں نے کہا ”آخر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تمہاری قدروں و منزلت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔“

”دیکھو۔ ایسے الفاظ سے مت کھیلو۔ ایک بات بتاؤ مجھے۔ تم کسے زیادہ چاہتے ہو؟ مجھے یا چندا کو؟“

”یہ کیا فضول سوال ہے ایسے ہی رہیں سوال کرے مجھ سے کہ تمہارا زیادہ اچھا دوست کون ہے۔ میں یا کمال فاروقی۔ تو میں کیا جواب دوں گا اسے؟ تمہاری بات کا بھی یہی جواب ہے میرے پاس کہ تمہاری اہمیت اپنی جگہ ہے۔ چندا کی اپنی جگہ۔“

خبنم پر جیسے ضد سوار ہو گئی تھی کہ وہ مجھ سے اپنی مرضی کا جواب حاصل کرے رہے گی۔

”مگر ایک مرد کی حیثیت سے تمہیں چندا میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ اگر موقع ملے تو تم کسے شریک حیات بناؤ گے۔“

میں نے اپنا سر پکڑ لیا ”خدا کے لیے خبنم۔ ایسے سوال مت پوچھو مجھ سے جن کا میرے پاس جواب ہی نہ ہو۔ ابھی تو میں نے شادی کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔ میں واقعی بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا اگر یہی سوال چندا مجھ سے پوچھ بیٹھے۔ حالات اور مستقبل پر کس کا اختیار ہے۔ کیا معلوم کل کیا ہو۔ جب وقت آئے گا تو نہ جانے کیا صورت حال ہوگی۔ ہو سکتا ہے میں ٹاس کرلوں۔ تم دونوں کو چھوڑ کے کسی تیسری سے شادی کرلوں یا شرعی طریقے سے تم دونوں کو عقد میں لے آؤں۔“

آہستہ آہستہ خبنم کا موڈ خراب ہونا چلا گیا ”ناصر۔ کوئی حد ہوتی ہے بے وقوف بنانے کی۔ میں جاری ہوں۔“

میں نے اسے پکڑ کے بھالایا ”ایسے روٹھ کے مت جاؤ۔ پہلے سمجھ لو کہ میں تمہیں کیا سمجھانا چاہتا ہوں۔ ماضی کو بھول جاؤ۔ پہلے جو ہوا غلط تھا اور غیر اخلاقی تھا۔ وہ تمہاری عزت نفس کا سودا تھا۔ جو رویہ شاہ عالم نے تمہارے ساتھ روا رکھا اس پر آج ناصر عظیم شرمندہ ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو ناصر عظیم کی ملکیت مت سمجھو۔ تم کسی کے پاؤں کی جوتی، شرٹ یا چنٹ نہیں ہو کہ جیسے چاہے استعمال کرے۔ جیسے چاہے رکھے اور جب دل بھر جائے تو کسی کو

دے دے یا پیچک دے۔ تم میرے لیے میری زندگی کی طرح قابل قدر اور اہم ہو۔ تمہاری حفاظت میرے لیے اتنی ہی ناگزیر اور لازمی ہے جتنی اپنی زندگی کی۔“

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی ”اور اگر میں اپنی زندگی کا راستہ الگ کرنا چاہوں۔ کسی اور سے تعلق استوار کرلوں؟“

میں نے کہا ”ویسے تو تم عاقل و بالغ اور خود مختار ہو۔ اپنا برا بھلا خود سمجھتی ہو اور اصولاً میں تم پر کوئی زبردستی کا اختیار نہیں رکھتا لیکن تمہارا انتخاب غلط ہوگا تو میں تمہیں بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اتنا عرصہ دوست رہنے کے بعد مجھے وہ حق حاصل ہو گیا ہے جو ایک بھائی کو ہوتا ہے کہ وہ بہن کو غلط راستے پر نہ جانے دے یا ایک باپ کو ہوتا ہے کہ وہ بیٹی کو روکے اور تمہارا رد و عمل انتقامی نوعیت کا ہوا تو مجھے دکھ ہوگا اور مایوسی ہوگی۔ اسے میں اپنی بد بختی کی طرح قبول کروں گا۔“

وہ میری باتوں سے سخت بد مزہ اور بیزار ہو گئی تھی مگر کسی بات کو غلط نہیں کہہ سکتی تھی ”میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری بات مان کے سو جانا چاہیے۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک۔ لیکن ایک آخری بات سن لو خبنم۔ یہ جو ہماری زندگی ہے۔ یہ بہت مختصر ہے۔ پتا نہیں ہمارا ساتھ کب تک ہے اور کہاں تک ہے۔ اس رفاقت کے زمانے کو اچھا اور قابل فخر ہونا چاہیے۔ باعث ندامت نہیں۔ ہم تمام عمر ساتھ رہیں خدا کرے۔ مگر مستقبل کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم ایسے روہ جا سکیں۔ تمہیں زندگی میں کوئی رفیق سفر مل جائے جس پر تم فخر کر سکو۔ یہ کہہ سکو کہ ناصر عظیم کیا تھا۔ ایک بہت ہی معمولی آدمی۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”میرا داغ زیادہ خراب مت کرو۔ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ یہ بات آج ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اب اس موضوع پر ہمارے درمیان کبھی بات نہیں ہوگی خبنم۔“

خبنم سونے چلی گئی تو میں نے اخبارات دیکھے۔ خبنم اپنے اخبار کی ایک کاپی ساتھ لائی تھی۔ اس میں صفحہ اول پر سر کالمی سرخی کا عنوان تھا ”شاہ عالم پولیس کی تحویل میں ہلاک!“ بیچے خبر کے متن میں وہی تھا کہ معدودہ ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شاہ عالم کو پولیس نے حراست کے دوران تشدد کر کے ہلاک کر دیا ہے۔ چنانچہ اسے

آج جھلسٹ کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا۔ اندر اداسیے میں بھی خبنم نے اس موقف کو دہرایا تھا۔ فرید عباسی کے بیان کو موضوع بنایا تھا اور حکومت سے اعلیٰ ترین سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔ دوسرے اخبارات میں نے ایک ملازم کو بھیج کر منگوائے۔ ان سب میں اس افسوس ناک واقعے پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا کہ پولیس کی خود سری ’چیرہ دہستی‘ اور لاقانونیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب اس کا نشانہ عام آدمی ہی نہیں شاہ عالم جیسے سیاست دان بھی ہو رہے ہیں جو معاشرے میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سب نے پولیس کے خلاف سخت زبان استعمال کی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مجرموں کو سخت سزا دی جائے۔ بالا اتفاق رائے یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ شاہ عالم کے فرار کی کہانی ایک سفید جھوٹ ہے اور درحقیقت شاہ عالم کو قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔

اخبارات کا یہ موقف میرے مقاصد کی تکمیل میں بے حد معاون تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شاہ عالم کی روپوشی کے معاملے کو نظر انداز کر کے اخبارات اس کی موت کو یقینی ثابت کرنے کا تاثر قائم کریں اور خبنم کی کوشش سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

میں اخباروں کو الٹ پلٹ ہی رہا تھا کہ رئیس آگیا۔ وہ نلیم کی شاہی سواری یعنی ہجیرو کو واپس لے آیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کے پوچھا ”وہ بلا بین کے چھٹنے والی چلی گئی۔“

میں نے کہا ”وہ رات بھر جاگی تھی۔ میں نے کہا سو جاؤ۔“

”تجھے تو اس نے بالکل ہی مار دیا۔ اخبار پڑھا تو نے۔“

میں نے کہا ”پڑھا ہے۔“

”قسم اللہ کی پیارے۔ تیرے ہوٹل سے غائب ہو جانے کے بعد بڑی کڑ بڑ پھیل گئی تھی۔ وہ سالا ہوٹل کا بغیر مجھے تیرا سامان دینے پر تیار نہ تھا۔ میں نے کہا بھی کہ میں شاہ عالم کا سیکرٹری ہوں مگر اس نے بھی اپنی کی۔ جب تک پولیس نہیں آئی اس نے مجھے سامان نہیں اٹھانے دیا۔ برا حرامی پن کیا سالے نے۔“

میں نے کہا ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا لہجہ۔ رویہ اور زبان سب بدل گئے ہیں اچانک۔“

”اے ہاں یار۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”وہ مجھے پڑ گئی ہے میرے۔ کتے کی دم کو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ گھٹی ہے مجھے شرفانہ طور طریقے اور اپنی کیس سٹھاکے

رہیں خاموشی سے ستارہ بھر پولا ”دیکھ نیا۔ اس نے کیسے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا۔ ایک بگڑے ہوئے لاوارث شخص کو فرش سے اٹھا کے عرش پر بٹھا دیا۔ مجھے بالکل بدل دیا۔ میرے حال پر اتنی توجہ اور مہربانی کی کہ میں خود بدل گیا۔ میری آج کی زندگی میرے گزرتے ہوئے کل سے کتنی مختلف ہے۔ میرے انداز و اطوار میرا لب و لہجہ میری عادات اور میری شخصیت سب میں ایک ایسا انقلاب آیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دیکھ کے حیران ہوتا ہوں۔“

”تو بڑا خوش قسمت ہے رئیس۔“

”ہے نہیں یار۔ ہم نے تو بیشہ خود کو انتہائی بد نصیب اور دنیا کی نظر سے گرا ہوا سمجھا تھا۔ کوئی اوقات ہی نہیں تھی اپنی مگر نیلم کی محبت دے کر تقدیر نے ساری زندگی کے نقصان کی تلافی کر دی ہے۔“

میں نے کہا ”اسی میرے گئے تو کتنا حیران ہوگی۔“

”ساری دنیا کی طرح وہ بھی مجھے غما۔ جاہل اور بگڑا ہوا“ بد حال اور بد کردار سمجھتی تھی اور ٹھیک ہی سمجھتی تھی۔ پیر تو بہت کمایا میں نے ادھر ادھر کے دھندوں سے مگر شرافت اور عزت کی زندگی سے اپنا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک تیرے سوا کسی شریف آدمی نے بھی منہ نہیں لگایا تھا۔ بتائیں نیلم نے کیا دیکھ لیا مجھ میں۔“

”اس نے اپنے مستقبل کا تحفظ دیکھ لیا اور میرے اندر کے آدمی کو پہچان لیا جو بہت بھروسے کے قابل ہے۔ دس سال سے جانتی تھی وہ ہم دونوں کو اور وہ کوئی بے وقوف جذباتی عورت بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے اپنی زندگی کی باگ ڈور تیرے ہاتھ میں دی ہوگی۔ اگر بھی تو نے اس کے اعتماد کو دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں قتل کردوں گا تجھے۔“

وہ ہنسنے لگا ”تو جانتا ہے پارے میں شادو کا دیوانہ تھا۔ کتنا چاہتا تھا اسے۔ اس کی خاطر جان بھی دے سکتا تھا اگر وہ کہتی۔ یہ محض ڈانٹا لگ نہیں۔ حقیقت ہے لیکن جب اس نے مجھے اور تو نے اسے پسند کر لیا تو میں نے اپنے پار کی قربانی دی اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے حساب برابر کر دیا۔ نیلم کے معاملے میں تو پیچھے ہٹ گیا۔“

”یار ایسی بات نہیں۔ وہ تجھ سے شادی نہ کرتی تو کسی اور سے کرتی یا میں نہ کرتی مگر ہمارے درمیان کوئی دو سرا رشتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی ایسا ہی سوچتی ہے۔“

رہیں نے گاڑی کا رخ ماسی بھر اور ڈاکٹر رانجھا کے

اس گھر کی طرف موڑ لیا تھا جو میں نے خریدا تھا اور ان کے نام کر دیا تھا۔ اس گھر میں جو کچھ بھی تھا میں نے لیا تھا۔ ان کے پاس ایک گاڑی تھی۔ وہ بھی میں نے خریدی تھی لیکن یہ سب پیسے کا کھنٹ تھا۔ آج اتنے عرصے بعد ان کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس خیال سے شرم آ رہی تھی کہ دو سال سے میں نے ان کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔ انہیں میں اپنے ماں باپ کی جگہ سمجھتا تھا لیکن کاروبار حیات کی مصروفیات نے مجھے ایسا سر کیا تھا کہ میں یہ رشتہ بھی بھولتا ہوا تھا۔

ان کی رہائش اور والی منزل پر تھی۔ نیچے ہیر کلینک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مریض اس وقت بھی آتے تھے جب وہ ڈاکٹر رانجھا نہیں صرف رانجھا شریعت فروش تھا اور مختلف پھلوں سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج اور مغزیات کو گھوٹ کے شربت میں شامل کرتا تھا اور بیماری کی نوعیت یا شدت کی مناسبت سے شربت کا فارمولا بدلتا رہتا تھا۔ آج وہ مستند ڈاکٹر اور حکیم بنا ہوا تھا۔ اس نے حکمت کے ساتھ ہومیو پتھی کی چند کتابیں پڑھ لی تھیں اور ایلو پتھی پر دوا ساز کیمپوں کی شائع کردہ کتابوں سے دواؤں کے نام یاد کر لیے تھے۔ وہ ہر مریض کو اس کی خواہش اور پسند پوچھ کر دوا دیتا تھا۔ ہومیو پتھی پر اعتقاد ظاہر کرنے والے کو فرانس اور جرمنی سے درآمد کردہ دوائیں تجویز کر دیتا تھا اور اس کے پاس ایلو پتھی کی دواؤں کا پورا اسٹور تھا جہاں وہ عام استعمال کے ولایتی شربت اور گولیاں رکھتا تھا۔ اب اس نے مرض کی تشخیص کے لیے کرائے جانے والے مختلف قسم کے ٹیسٹ کی رپورٹیں پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہر لیبارٹری کی رپورٹ کے پیچھے ہوتے فارم پر پہلے ہی درج ہوتا تھا کہ ٹارل رپورٹ کیا ہوئی ہے۔

آج ڈاکٹر رانجھا کا کلینک مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی اور بچے بھی۔ رانجھا بلاشبہ عطائی تھا مگر اس کی پرکٹیں بہت سے مستند ڈاکٹروں سے زیادہ چلتی تھیں۔ وہ دواؤں کے مقابلے میں بہت محتاط تھا۔ تو بے فیصد مریضوں کو عام امراض لاحق ہوتے تھے اور وہ اس کی دوا سے ٹھیک ہو جاتے تھے کیونکہ شفا دینے والا تو بہر حال خدا ہے۔ باقی دس فیصد پیچیدہ امراض والوں کو وہ کسی اسپیشلسٹ کے پاس بھیج دیتا تھا۔ دوسری احتیاط وہ انجکشن کے معاملے میں کرتا تھا اور عام طاقت کے یعنی ملٹی ڈاکٹس والے لی کیلیکس کے سوا کوئی انجکشن نہیں لگاتا تھا جس سے کسی مریض کو ری ایکشن ہونے کا امکان ہو۔

تمام مریض اپنے اپنے نمبر کے مطابق ڈاکٹر کے پاس

جانے کے پابند تھے۔ چنانچہ میں سیدھا اندر گیا تو کچھ لوگوں نے دے دے الفاظ میں احتجاج کیا مگر پھر یہ سمجھ کے خاموش ہو گئے کہ شاید میں مریض نہیں تھا۔ کوئی ڈاکٹر تھا میڈیکل ریپ یا ڈاکٹر رانجھا کا کوئی جاننے والا۔

ڈاکٹر رانجھا اس وقت بھی کانوں سے آگے لگائے کسی مریض کے سینے کے اندر کی آوازیں سن رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا ”او میاں فی ذرا صبر کرو۔ دیکھتے نہیں میں ایک مریض کا معائنہ کر رہا ہوں۔“

میں نے بد تمیزی سے کہا ”میں تمہارا معائنہ کرنے آیا ہوں۔“

اس جواب پر رانجھا کا چوکنا لازمی تھا۔ شاید وہ سمجھا ہو گا کہ محکمہ صحت کے کوئی اہلکار اس کے میڈیکل پریکٹس کے لائسنس یا اس کی ڈگری چیک کرنے آ گیا۔ اس نے ناک پر چشمہ جمائے میری طرف دیکھا اور چند سیکنڈ دیکھتا رہا۔ پھر وہ چلا ”او سٹ اوئے تو ناصر ہے؟“ اس نے چلا کے کہا اور اسٹیک پچھوڑ کے اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کے وہ بے تابانہ میری طرف آیا اور اس نے مجھے گلے لگالیا۔

اس کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شاید دو سال میں اس کے سر پر چند بال اور کم ہو گئے ہوں۔ اس کے چہرے پر عمر کی لکیریں بچھ اور گہری ہو گئی ہوں مگر مجھے اس میں کچھ بھی بدلہ ہوا نہیں لگا۔ وہ جسمانی طور پر بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ اس نے عادت کے مطابق نہایت بے تکلفیاس پس رکھا تھا۔ اس کی قمیص ہرے رنگ کی اور ریشمی تھی۔ پتلون نیلے رنگ کی اور اس نے زرد رنگ کی چوڑی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے جسم سے آج بھی خس کے عطری کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی کیونکہ اس نے عطریں ڈوبا ہوا روٹی کا چھاپا اپنے کان میں لگا رکھا تھا۔

”اوئے ناصر۔ یہ تو ہے۔ بڑا سچا اللہ بھی سبحان اللہ۔ خیر سے آج کدھر چین چڑھ گیا۔“ اس نے والمانہ انداز میں مجھے کئی بار دیا اور چوما اور اس دوران زیر معائنہ مریض دم بخود بیٹھا رہا۔

میں نے کہا ”کیسے ہو تم۔“

”او یار ہمیں کیا ہوتا تھا بھئی۔ دیکھ لے تیرے سامنے ہیں مگر تو مت بدل گیا ہے۔“

میں نے کہا ”ماسی، ہیر کیسی ہے۔“

”اوئے مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ جا کے دیکھ خود۔“ اس نے مجھے پیار سے ڈانٹا ”اور چل کے بیٹھ۔ میں آتا ہوں ابھی تھوڑی دیر میں۔ میرا کھینک ایک بچہ بند ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”آج میں اتنی دیر نہیں رک سکتا۔“

اس نے محبت سے میری گھر پر ایک مکا مارا ”چل بکواس نہ کر۔ اتنے دن بعد آیا ہے تو کیا کھڑے کھڑے چلا جائے گا اور وہ جانے کب دے گی تیری ماسی۔ ابھی اوپر جا کے یہ بات کہنا ذرا پھر تیری خوب خاطر کرے گی وہ اور تو اکیلا آیا ہے یا وہ بھی ہے تیرے ساتھ۔ تیری دوہنی۔“

میں نے ہنس کے کہا ”کون دوہنی۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔“

”چھا ایسے ہی بھر رہا ہے خیر۔ چل چنگا ہے آزادی کے مزے لوٹ لے جب تک ٹائم ہے۔“

میں نے کہا ”رہیں آیا ہے میرے ساتھ۔“

”چھا؟ وہ تیرا یار۔ کہاں ہے۔“

میں نے رہیں کو بھی اندر بلالیا۔ ڈاکٹر رانجھا نے اسے بھی گلے لگالیا ”یہ تو آجاتا ہے یار چھ مہینے بعد پھر گانے“

رہیں بولا ”دیکھو آج تمہارے حرامی چر کو بھی لے آیا۔“

رانجھا ہنس ”تو خود کون ساحلی ہے۔ چلو اوپر جاؤ۔ آرام سے بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔ پھر کھانا کھائے کھائیں گے۔ خبردار جو جانے کی بات کی۔“

میں نے رہیں کو آگے بھیجا اور خود پیچھے کھڑا رہا۔ حسب توقع ماسی بھر نے رہیں کا استقبال اپنی یار بھری گالیوں سے کیا ”رہیں؟ آگیا تو خبیث خیال لگایا تجھے میرا کیسے۔ کہاں غائب رہتا ہے مینوں۔“

رہیں ہنسنے لگا ”لو ماسی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی تو آیا تھا۔“

ماسی نے اس کے ایک دو ہنر مارا ”دو مہینے کی بات ایسے کرتا ہے ذلیل جیسے دو دن پہلے آیا تھا۔“

رہیں بولا ”اسے کچھ نہیں مٹی ہو جو سانوں نہیں آتا۔ تمہارا ناصر۔“

وہ اداس ہو گئی ”اسے میں کیا کہوں۔ اللہ اسے خوش رکھے وہ جہاں بھی ہے۔ ہم تو دعا کرتے رہتے ہیں خدا سے۔ وہ بھول گیا ہے ہمیں تو اس کا گدہ بھی اپنی تھری سے کرتے ہیں۔“

”ماسی۔ اگر وہ آجائے تو اسے جوتے مارو گی؟ وعدہ کرو تو میں اسے لے آؤں۔ اسی جوتے سے اس کا سر منڈا کر دیتا۔“

ماسی نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”تیرے بس میں ہوتا تو پہلے نہ لے آتا۔ وہ اب نہیں آئے گا رہیں۔ ہم سمجھتے تھے اللہ نے اس عمر میں اولاد دے دی۔ بڑی غلط فہمی تھی

ہماری۔“
 رئیس نے پھر کہا ”نہیں تم بتاؤ۔ کتنے جوتے مارو گی؟“
 اس وقت میں اچانک پیچھے سے نکل آیا اور ماسی کے سامنے جھک گیا ”میں آگیا ہوں ماسی۔ مارو مجھے کتنے جوتے مارنے ہیں۔“
 ایک لمحے کے لیے ماسی کو حیرت کے صدمے نے غمزدہ کر دیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر ایک جھج مار کے مجھ سے لپٹ گئی ”ناصر۔ تو ناصر ہی ہے یا میرا خیال ہے مجھے دھوکا دے رہا ہے۔“
 میں نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا ”میں ناصر ہی ہوں ماسی۔“
 وہ میرا سر اپنے سینے سے لگا کے زار و قطار رونے لگی ”کہاں چلا گیا تھا تو بے شرم بے حیا۔ کہاں مر گیا تھا۔ مجھے ہمارا خیال بھی نہیں آیا۔ ایک بار بھی نہیں سوچا کہ ماسی ہیر کا کیا حال ہوگا۔ تو بھول گیا تھا ہمیں۔ اپنے ماں باپ کو بھول گیا تھا کیسے۔ خون سفید ہو گیا تھا تیرا۔ بے غیرت۔ بے ایمان۔“
 ماسی مجھے اپنی پیار بھری گالیوں سے نوازتی رہی اور روتی رہی۔ میں نے اسے بہت دلاسا دیا بہت تسلی دی۔ اس سے بار بار معافی مانگی اور بالآخر ماسی کی بے قرار روح کو قرار آگیا۔ اس نے مجھے آگاہ میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے ایک پیڑھی پر بیٹھ کے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اب اس کے چہرے پر خوشی کے جذبات کا رنگ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔
 میں نے کہا ”ماسی میں یہاں نہیں تھا۔“
 ”چل جھوٹ مت بول میرے سامنے۔ رئیس بتاتا رہتا تھا مجھے تیرے بارے میں سب۔“ اس نے پاؤں کی جوتی اتار کے مجھے دکھائی۔
 میں نے کہا ”تمہارے سر کی قسم۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔“
 ”یا ہر تو ابھی گیا تھا دو مہینے پہلے۔ اس سے پہلے تو کیا کر رہا تھا۔ سب معلوم ہے مجھے۔“
 میں نے رئیس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلا کے واضح کیا کہ ماسی کو حقیقت حال کا کوئی علم نہیں۔ یعنی اسے نہیں معلوم کہ اس کا بیٹا ناصر کتنا عرصہ شاہ عالم بن کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوا تھا اور سب سے دور ہو گیا تھا۔
 میں نے کہا ”اب یہاں باقاعدگی سے آؤں گا ماسی۔“
 ”یہ بھی جھوٹ ہے۔ مجھے پتا ہے تو نہیں آئے گا۔ تو

اب بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ بہت مصروف رہتا ہے۔ تجھے کہاں یاد آئے گی اپنی ماسی ہیر کی۔ رائے سے ملتا تھا۔“
 میں نے کہا ”ہاں۔ پہلے اسی کو سلام کرنے گیا تھا۔“
 ماسی بار بار رونے لگتی تھی اور پرانے وقتوں کو یاد کرتی تھی جب ہم سب اکٹھے رہتے تھے اچانک اس نے پوچھ لیا۔
 ”ناصر وہ کہاں ہے؟ نیلم۔“
 میں نے کہا ”اسی گھر میں ہے اور کہاں۔“
 ”اسے دیکھنے کو بہت دل کرنا ہے۔“
 رئیس بولا ”اسے دیکھنا کیا مشکل ہے ماسی۔ کسی سنیما پر جا کے ٹکٹ لو اور فلم میں دیکھ لو۔“
 ماسی نے پھر جوتی اتار لی ”نا اب اس عمر میں فلم دیکھنے جاؤں گی میں۔“
 میں نے کہا ”وہ خود آئے گی ماسی۔ ورنہ میں آپ کو اس کے پاس لے چلوں گا۔ میں اب اسی کے گھر میں ہوں۔“
 ماسی نے خوشی سے کہا ”شادی کئی ہے تم دونوں نے۔ بڑا اچھا کیا۔“
 میں نے کہا ”میں نے اس سے شادی نہیں کی ماسی۔“
 اس نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا ”کیوں نہیں کی؟“
 ”اس کی شادی رئیس سے ہو رہی ہے۔“
 ماسی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے فارسی بولی ہو ”کیا کہہ رہا ہے تو؟“
 میں نے کہا ”رئیس سے پوچھ لو اور چاہو تو میرے ساتھ چل کے خود نیلم سے پوچھو۔“
 ماسی کچھ چپ ہو گئی ”لیکن۔ وہ تو تیرے ساتھ۔“
 میں نے کہا ”نہیں ماسی۔ وہ بڑی بہن کی طرح میرا خیال رکھتی تھی۔ رئیس اور نیلم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ چند دن میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔ ہم آپ کو بھی لے چلیں گے۔“
 گزرے ہوئے وقت کے سارے حالات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے بھی ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ماسی نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی اور ہمیں بچن میں اپنے پاس ہی درہی بچھا کے بٹھالیا تھا۔ اس کی خواہش تو یہی تھی کہ نیلم سے میں شادی کرتا مگر رئیس کے انتخاب کو بھی ماسی نے نیلم کا بڑا دانش مندانہ فیصلہ قرار دیا ”بھئی جیسا ناصر و سیا رئیس۔ یہ ذرا لوف ہے مگر اب کام کاج کرنے لگا ہے تو ٹھیک ہو جائے گا۔“
 میں نے کہا ”شوہر کتنے کی دم ہو پھر بھی بیوی سیدھا کرتی

ہے۔“
 ”وہ بڑی سیانی لڑکی ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ تیرے بھائی ہیں کہ وہ تیرے جیسے کئے اور مذہب حرام سے شادی کر رہی ہے۔ پرانے کروت اب چھوڑ دے اور شرافت کی زندگی گزارنے کا عہد کر لے۔“
 رئیس نے خفگی سے کہا ”ماسی میں اب وہ پرانا والا رئیس نہیں ہوں۔“
 ماسی نے کہا ”مرنے لڑتا ہے اب بھی؟“
 ”کہاں ماسی۔ وہ سب خواب و خیال کی باتیں ہو گئی ہیں۔ اب تو میں بہت شریف اور ذہین دار بن گیا ہوں۔“
 میں نے کہا ”نیلم نے بتا دیا ہے ماسی۔“
 ماسی نے کہا ”مجھے ایک بات بتا۔ کیا شادی کے بعد بھی وہ اسی طرح فلموں میں ناچے گی دو سہوں کے ساتھ۔ تیری بیوی بننے کے بعد بھی کام کرے گی۔“
 میں نے کہا ”ماسی اس نے شادی کے فیصلے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی۔“
 ماسی خوش ہو گئی ”لقد خوش رہ گئے تم دونوں کو۔ وہ بڑی ٹیک لڑکی ہے۔ بھولتے ہیں کتنے جو اس کے بارے میں اتنی سیدھی بات کرتے ہیں۔“
 ماسی نے میری آمد کی خوشی میں کھانے کے ساتھ کڑو کے میٹھے چاول بھی پکائے تھے جو میں بہت شوق سے کھاتا تھا۔ ایک کچے رائجھا ٹھیک بند کر کے لایا اور بولا ”ہاں بھئی ناصر اب سنا کیسی گزر رہی ہے؟“
 میں نے کہا ”بہت اچھی گزر رہی ہے۔“
 ماسی نے کہا ”رائے تو نے کچھ سنا۔ وہ نیلم تھی نا۔“
 ”بھئی کا کیا مطلب ہے۔ ہے فلموں میں۔“ رائے بھائی نے کہا۔
 وہ بولی ”وہ شادی کر رہی ہے رئیس۔“
 رائے نے صرف شادی کی بات سنی اور مجھے مبارکباد دینے لگا ”او بھئی واہ تے واہ۔ رب نے ملائی جوڑی اور خوب ملائی۔“
 میں نے اس کا رخ رئیس کی طرف کر دیا ”اسے مبارک باد دو۔ شادی اس کی ہو رہی ہے نیلم سے۔ میری نہیں۔“
 رائے کا منہ فرط حیرت سے کھلا رہ گیا ”رئیس سے؟“
 ایک بار پھر مجھے یہ پتا چلا کہ میری شادی نیلم سے کیوں نہیں ہو سکتی تھی اور رئیس کی کیوں ہو رہی ہے۔ باتیں برسوں کی تھیں اور ہمارے پاس وقت کم تھا پھر مجھے جنم کا بھی خیال تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ ادھر بہر را بھیا

دونوں رئیس اور نیلم کی شادی کی خبر سن کے بہت جوش میں تھے اور اس شادی کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے تاکہ وہ اس میں بھرپور طریقے سے شرکت کر سکیں۔
 دو بجے میں نے جنم کو فون کیا تو مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ ابھی سو رہی ہے۔ میں نے بانو خالہ سے کہا کہ جب وہ جاگے تو اسے پیغام دے دیں کہ میں چار بجے تک گھر آؤں گا۔ رئیس نے نیلم سے بات کی اور اسے بتایا کہ ہم کہاں ہیں پھر نیلم نے ماسی بہن سے بات کی اور ماسی بہن نے اسے جو دو سہوں نما نے بوتوں جھپٹنے کی دعا میں دینا شروع کیا تو نیلم کو جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ دس چندرہ منٹ بعد جب نیلم نے وعدہ کر لیا کہ وہ بھی آج ہی حاضری دے گی تو ماسی نے اسے معاف کیا۔
 میں اور رئیس بہت جلد پھر آنے کا اور باقاعدگی سے آتے رہنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔ ماسی دروازے پر کھڑی ہو کے پھر رونے لگی ”ایسا نہ ہو کہ اب جاؤ تو پھر سالوں نہ آؤ۔“
 میں نے کہا ”ماسی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔“
 ”کھا میرے سر کی قسم۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔
 ”تمہارے سر کی قسم ماسی۔ میں آؤں گا۔ تمہیں شادی کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“
 وہ رئیس سے غلط ہو گئی ”تو بھی سن لے۔ اگر اکیلے اکیلے شادی کی تا تو ساری عمر تیری شکل نہیں دیکھوں گی۔ زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔“
 رئیس نے بھی اس کے سر کی قسم کھائی ”تج رات وہ خود آئے گی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ میں بھی آؤں گا۔“
 ”اور تو ناصر۔“ ماسی نے کہا ”تو بھی ساتھ آئے گا؟“
 ”نہیں ماسی۔“ میں نے کہا ”میں آج نہیں آسکتا۔ مجھے کام ہے کچھ۔ چند دن تو میں بہت مصروف رہوں گا۔“
 رائے بھائی نے تک میرے ساتھ آیا ”تیری گڈی تو بہت شاندار ہے بھئی۔“
 میں نے کہا ”یہ نیلم کی گاڑی ہے اچھا خدا حافظ!“
 ”خدا حافظ۔“ وہ بولا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔
 آج میرے دل پر سے احساس جرم و ندامت کا ایک بوجھ ہٹ گیا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے اپنے ماضی کے بڑے کا ایک اور نوا ہوا بل جوڑ دیا ہے۔
 رئیس کو اسٹوڈیو جانا تھا۔ نیلم کی ڈائری اس کے پاس

تھی اور نیکم کو اپنی ویش کا کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے اسے اسٹوڈیو کے اندر سیٹ پر لے جا کے چھوڑا اور واپس ہو گیا۔ ساڑھے تین بجے میں نیکم کے گھر پہنچا تو جینم منہ سجائے بیٹھی تھی اور ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

”یہ تمہارا ایک بجائے؟“

میں نے کہا ”دو بجے فون کیا تھا میں نے تو تم سواری تھیں۔“

”تم دیکھا کرتے تھے مجھے خود آگے“

میں نے کہا ”کوئی بات نہیں اگر وہ ہو گئی۔ یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا؟“

”اور کیا بھوک بیٹھی رہی۔“ اس نے رسالہ پھینک دیا۔

میں نے کہا ”میں نے بھی کھالیا۔ ہم آج ماسی بیر اور ڈاکٹر راجھائی کی طرف چلے گئے تھے۔ آ رہی ہو؟“

”میں کب سے تیار بیٹھی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پہلے تو تم مجھے کچھ کپڑے جوتے دلو دو۔“ میں نے کہا ”اپنی پسند سے۔“

اس کا سوا کچھ ٹھیک ہوا اور وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ اگلے پورے دو گھنٹے ہم نے مال کی مختلف دکانوں سے شاپنگ میں گزار دیے۔ جینم نے میرے لیے کوئی ایک درجن شیش اور اتنی ہی پتوئیں خریدیں پھر میں نے چار سوٹ خریدے اور درجن بھر تانیاں لیں۔ جینم خوش ہو گئی کہ میں نے ہر چیز اس کی پسند کے مطابق لی تھی لیکن لباس کے معاملے میں اس کی چوائس پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔

شام کے چھ بجے ہم نے شیزان میں چائے پی۔ مجھے ہر لحاظ سے ڈر تھا کہ نہیں کوئی جینم کا جانے والا نہ مل جائے مجھے اس کے ساتھ دیکھنے والے کا ذہن خود بخود شاہ عالم کی طرف جاسکتا تھا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے صورت حال کی کوئی ناقابل فہم وضاحت پیش کرنی پڑے کہ میں شاہ عالم نہیں اس کا ہم صورت ناصر عظیم ہوں۔ کسی کا ذہن بھی اس اتفاق کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ جینم کا ایک شناسا شاہ عالم ہے تو دوسرا اس کی کاربن کاپی ناصر عظیم۔

میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا تو جینم ہنسنے لگی ”یہ رسک تو ہمیشہ رہے گا۔“

میں نے کہا ”ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے جینم۔ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ میں ناصر عظیم کی بالکل بدگمانہ شناخت بنا کے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا

ہوں۔ اگر شاہ عالم کے کسی دشمن کو یہ شک بھی ہو گیا کہ ناصر عظیم ہی اس کا ذیلی کیٹ بنا ہوا تھا تو میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔“

”کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں ملنا ہی نہیں چاہیے۔“

میں نے کہا ”زندگی آزمائشوں کا نام ہے۔ ہم بھی سال چھ مہینے نہ ملیں تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا مگر مجبوری میں حالات سے سمجھو انکارنا پڑتا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے مگر سال چھ مہینے بعد بھی یہی حالات ہوں گے۔ جینم کے لیے ناصر عظیم آج اجنبی ہے تو اس وقت بھی ہو گا۔“

میں نے کہا ”ہلے لوگ شاہ عالم کو بھول جائیں پھر ہم ان کے درمیان شناسائی کی کوئی صورت نکال لیں گے۔“

”کیا صورت نکال لیں گے۔“

میں نے سوچ کے کہا ”ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ میں تمہارا اخبار خرید لوں۔ جینم کا ایک پرنس میں اور ہنڈر

جو ایک مثالی جینم خان بنو رہا ہے اور کمال اسپتال کو کروڑوں کی ڈومیشن دے دینا ہے۔ کوئی اخبار کیوں نہیں خرید سکتا جس کے مال اور انتظامی طاقات اچھے نہیں اور اسے بطریق احسن چلانے کے لیے تم جیسی باصلاحیت ایڈیٹر کو سہجہ کیوں نہیں رکھ سکتا۔ ہم ایک ٹیم بن جائیں گے۔“

”حق تو یہ تب بھی لگے گا۔“

میں نے کہا ”ہاں مگر ایک فطری اتفاق۔“

”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب کہ ایسا فرض کرنا ہی بالکل غلط ہے۔ آزاد صاحب کے لیے یہ اخبار ان کی اوندھ کے جیسا ہے۔ کئی لوگ اسے خریدنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ سب کو ایک ہی جواب ملا ہے کہ اوندھ برائے فروخت نہیں ہوتی۔“

میں نے کہا ”چلو ہم کچھ اور فرض کر لیتے ہیں۔ شر کا ایک متحمل شخص اخبار نکالنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے تجربہ کار لوگ وہ ادھر ادھر سے کھینچے گا وہ جینم کو چیف ایڈیٹر بنا دیتا ہے دینی خواہ پر۔ نہیں۔ ایڈیٹر۔ چیف ایڈیٹر تو پھر وہ خود ہو گا۔“

جینم ہنسی ”یہ مزید ناممکن ہے کہ میں تمہاری ماتحت اور ملازم بن گئے رہوں۔“

میں نے کہا ”ناصر عظیم کے جو آئندہ کے منصوبے ہیں اور وہ خیالی پٹاؤ پکانے کے منصوبے نہیں ہیں۔ تم ان میں جی

تر اور بن سکتی ہو۔ اسے مفروضہ مت سمجھو۔ میں جینم کی سنجیدگی سے ایک ”فردے رہا ہوں۔ سوری۔“ آخر کا لفظ میں غلط بول گیا۔ جینم انوائٹ کر رہا ہوں کہ میرے لیے یہ ذمے داری تم سنبھال لو۔“

”تم سیریس ہو۔“

میں نے کہا ”میں اس سے زیادہ سیریس ہوں جتنا مجھے ہونا چاہیے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آزاد صاحب کے اس اخبار میں تم اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہی ہو۔ بے شک ذاتی کارکردگی کی بنا پر تم نے صحافت کی دنیا میں اپنی نمایاں پہچان بنالی ہے مگر اس اخبار میں کیا ہے تمہارا مستقبل۔ تم اس سے کہیں زیادہ اور بڑے چیلنج قبول کر کے اپنے POTENTIAL کا بھرپور استعمال کر سکتی ہو اور بہت بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتی ہو۔“

”شاید تمہاری بات غلط نہ ہو۔“ وہ بولی ”لیکن میری اصل وابستگی جذباتی ہے اور آزاد صاحب کے ساتھ ہے۔ اخبار کسی اور کا ہونا تو میں تمہاری پیشکش بالکل غیر مشروط طور پر قبول کر سکتی تھی مگر میں آزاد صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔“

”جی ایم سوری۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

وہ کچھ سنجیدہ ہو گئی ”بے شک آزاد صاحب کے اخبار کو مسائل درپیش ہیں لیکن میں کوشش کر رہی ہوں کہ آزاد صاحب کو قابل کر لوں۔ وہ اخبار کو حالات کے نئے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اس میں یاخون انجیکٹ کریں۔ بہتر مالی وسائل کے ساتھ اخبار کا نیا سیٹ اپ ہو۔ سازو سامان نیا ہو۔ نئے لوگ رکھے جائیں اور اس کی پالیسی کو کاروباری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ آزاد صاحب نے اپنی عمر اس اخبار کو دی ہے۔ اب اس عمر میں وہ اپنی سوچ نہیں بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ اخبار بھی پرانی ڈگر پر چل رہا ہے اور آہستہ آہستہ تیزی اور DECAY کے عمل میں ختم ہو رہا ہے مگر آزاد صاحب اسے اپنے شوق کے لیے چلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد تم چاہو تو اسے کاروبار بنالینا۔ اب انہیں کون سمجھائے۔ میں بھی گزارا کر رہی ہوں بس۔ ان کی اپنی حالت تم جانتے ہو۔ وہ زیادہ تیار رہنے لگے ہیں۔“

میں نے کہا ”جینم اب اپنے آفس جاتا ہے۔“

اس نے اپنی کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی میں وقت دیکھا ”چلو پہلے تمہیں تمہارے آفس دکھا دوں۔“

جینم نے میرے لیے دو آفس لیے تھے۔ ایک میرا

کاروباری آفس تھا جو کسٹروڈ پر پلازا سنیمیا سے کچھ آگے ایک کنٹرول بلڈنگ کے آدھے فلور پر پھیلا ہوا تھا۔ اس فلور کا رقبہ دس ہزار فٹ کے قریب تھا۔ چنانچہ میرا آفس پانچ ہزار مربع فٹ پر تھا۔ اس کا رخ بین روڈ کی طرف تھا۔ سیکنڈ فلور تک آنے جانے کے لیے ایک ہی زینہ استعمال ہوتا تھا اور ایک ہی لفٹ کو اس فلور کے دونوں پارٹز استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں تقریباً پانچ سو اسکوائر فٹ کا لاؤنج تھا جس میں لفٹ کا دروازہ کھلتا تھا۔ میرا آفس لاؤنج میں دائیں جانب تھا۔ بائیں طرف ایک گارمنٹس فیکٹری تھی جہاں چھوٹے بچوں کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ دونوں آفس بالکل الگ تھے اور ہمارے کام کی نوعیت بھی بالکل الگ تھی۔

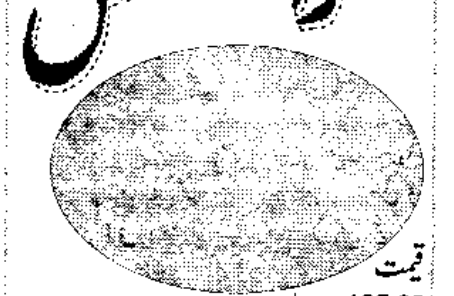
جینم نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے سڑک کی طرف لہائی کے رخ پر پھینکی ہوئی چھ فٹ بڑی بالکونی میں لے گئی ”ادھر آج اپنے ساتن بورڈنگا کتے ہیں۔ اس کے لیے سڑک کی۔“ بالکونی کی پوری دیوار ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تو ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ تم نے تو

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول

راکھش

راکھش سید



قیمت 125.00 روپے

اپنے ہاگیا قریبی کسٹال سے طلب فرمیں

علی ہیلن پبلیکیشنز ۳۰ مینیکلیٹ اردو بازار لاہور ۵747414

نیشنل بک ڈسٹریبیوٹر

نیشنل بک ڈسٹریبیوٹر

واقعی کمال کی جگہ انتخاب کی ہے۔
”مجھے اگر معلوم ہو کہ تمہارے کاروباری ادارے اور کنسرکشن کمپنی کا نام کیا ہے تو میں بورڈ بھی ملواؤں گی۔“ وہ خوش ہوئی۔

میں نے کہا ”نام سوچ لیں گے کوئی اچھا سا۔ فی الحال میں اس آفس کا نصف حصہ استعمال کروں گا۔ یعنی ایک ہال اور ایک چھوٹا کمرہ“ ہال میں اسٹاف بیٹھے گا۔ کمرے میں اپنے لیے ڈیکوریت کرائوں گا۔ پہلے تقریراتی کمپنی کا کام شروع ہوگا۔“

”تم نے اس کا کرایہ تو بچھای نہیں۔“
میں نے کہا ”کرایہ جو بھی ہو مجھے منظور ہے کیونکہ ایسی جگہ شاید پھر ڈھونڈنے سے نہ ملے۔“ پھر میں نے پوچھا۔
..... ”تم نے اب تک کہاں کہاں ادائیگی کی ہے اور کتنی؟“

”یہ سارا حساب فرید عباسی کے پاس ہوگا۔ اسی نے کرائے نامے وغیرہ بنوائے تھے اور سائن کیے تھے۔ رسیدیں بھی اس کے پاس ہیں۔“

میں نے کہا ”اب اس جگہ کو فرنش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم کسی انٹیریر ڈیکوریشن کی خدمات حاصل کرلو۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔ تم اسے گائیڈ کرنا۔ میرا خیال ہے کہ پندرہ دن میں کام ختم ہو جانا چاہیے۔“

”بالکل ہو جائے گا۔ اب تم دو سرائے آفس بھی دیکھ لو۔ وہ تمہارا پرائیویٹ آفس ہے۔ برنس آفس سے بالکل الگ ہے اور گڑھی شاہو میں ہے۔“

اپنا پرائیویٹ آفس مجھے زیادہ پسند آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے جنم نے پوری طرح ڈیکوریت اور فرنش کر دیا تھا۔ آفس میں ایک باروٹا کھڑا تھا جو کسی گھری گھری اسٹنڈی جیسا لگتا تھا۔ اس میں ایک بہت خوب صورت آفس ٹیبل تھی جس کی شکل کچھ گردے جیسی تھی۔ اندرونی حصے میں میرے لیے ایک گلدے دار دیوالونگ چیز لگائی گئی تھی اور باہر کی طرف ایک نیم دائرے میں مسمانوں کے لیے چار کرسیاں تھیں۔ مخالف سمت کے ایک کونے میں ایک مختصر سا مگر آرام دہ اور نئے فیشن کا صوفہ سیٹ تھا جس کے ساتھ ایک نازک سی گلاس ٹاپ سینٹر ٹیبل تھی۔ صوفہ سیٹ ایک گول قالین پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں دی وی تھا اور زالی کے نیچے مجھے میں ڈش ریپور اور وی سی آر نظر آ رہے تھے۔ آفس ٹیبل پر ٹیلی فون، فیکس مشین اور آفس کے دیگر لوازمات نے کمرے کی آرائش کو مکمل کر دیا تھا۔ دیواروں کو

خوب صورت فریم والی تصویروں سے سجایا گیا تھا اور کمرے میں ہر جگہ بے حد نفیس اور حسین ڈیکوریشن پیش نظر آ رہے تھے۔ اس کمرے کی کجاوت میں خوش ذوق کا بہترین مظاہرہ نظر آتا تھا۔ ہر چیز جدید اور قیمتی لگتی تھی اور مجموعی تاثر میں تکمیل کا احساس ہوتا تھا۔

میرا اٹھنا اور چہرے کے تاثرات دیکھ کے جنم خوش ہوئی ”کیسا اچھا پرائیویٹ آفس؟“
میں نے کہا ”اس کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔“

”میں تمہارے ٹیسٹ کو سمجھتی ہوں۔“ اس نے دعوے سے کہا۔

میں نے کہا ”اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں خود بھی یہ آفس سجاؤں اس سے بہتر اسباب نہیں لاسکتا تھا۔“
”یہ سب تمہیں پسند نہ آتا تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی۔“

میں نے کہا ”یہ تو اتنا خوب صورت آفس ہے کہ میرا خیال چاہتا ہے اپنا سامان لے کر یہاں آجاؤں۔ یہاں تو میں رہ بھی سکتا ہوں۔“

”ہاں۔ تم یہاں رک سکتے ہو۔ اپنے مسمانوں کو کھانے پر مدعو کر سکتے ہو اور پرائیویٹ میٹنگ کر سکتے ہو۔“ جنم نے کہا۔

جنم کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ پرائیویٹ آفس کا تصور اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ شاید شاہ عالم نے اپنی ذاتی مصروفیات کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اپنے سیاسی دفاتر اور کاروباری آفس سے الگ کوئی عشرت گاہ بنا رکھی ہوگی۔ جہاں وہ دنیا کی نظر سے چھپ کے اپنی عیاش فطرت کے تقاضوں کی تسکین کے اسباب تلاش کرتا ہوگا۔ میں شاہ عالم نہیں تھا چنانچہ مجھے یہ آئیڈیا قدرے اٹوٹھا اور غیر معمولی نظر آ رہا تھا لیکن اچھا بھی لگا تھا۔

سات بجے کے قریب میں نے جنم کو اس کے آفس ڈراپ کرنے کی چٹکنش کی تو اسے اپنی گاڑی یاد آئی جو نیلم کے گھر میں کھڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ جنم کے جانے کے بعد میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور آئینے میں پھر اپنی نئی شخصیت کو دیکھ کے مطمئن ہوا۔ اب یہ ضروری تھا کہ میں جلد از جلد اپنی نئی زندگی کی مصروفیات اختیار کر لوں اور شاہ عالم کی زندگی کے معمولات سے دور ہو جاؤں۔ اس کے لیے سب سے اہم یہ حقیقت تھی کہ میرا جنم سے کوئی تعلق ان لوگوں کے سامنے نہ آئے جو ان کے مراسم کی نوعیت سے واقف تھے۔

یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ جنم کے پاس مجھ سے ملنے کے لیے صرف دن کا وقت تھا کیونکہ اس کی رات تو اخبار کے دفتر میں گزرتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ترک تعلق کا یہ ڈراما کیسے چلے گا۔ نہ جنم مجھ سے ملنا چھوڑ سکتی تھی اور نہ میں اس پر انحصار کر سکتا تھا لیکن اب اس فیصلے پر سختی سے عمل کرنا ہم سب کے مفاد میں تھا اور ناگزیر ہو گیا تھا۔

اسی طرح میرا فرید عباسی اور شاہ عالم کی سماجی شریکیت دیرت رخصتی سے یکسر یگانگی اختیار کرنا بھی ناصر عظیم کی زندگی کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ضروری تھا۔ سچے سینے بعد جب لوگ شاہ عالم کو پھر بھول جائیں اور اس کے زندہ نہ ہونے کے ناقابل تردید ثبوت سامنے آجائیں تو کسی اتفاق کے آسرے پر میں اپنے حالات کو ایسی ترتیب دے سکتا تھا کہ ناصر عظیم کا جنم سے بھی رشتہ استوار ہو جائے اور فرید عباسی سے بھی۔ جنم ایک اخبار کی ایڈیٹر تھی اور اس کے تعلقات کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ چنانچہ یہ ناممکن نہیں تھا کہ کسی عرصے پر وہ ناصر عظیم کے ساتھ بھی شناسائی کا رشتہ استوار کر لے۔ اس کے جاننے والوں میں شرکی تمام قابل ذکر شخصیات کے ساتھ ناصر عظیم بھی شامل ہو سکتا تھا۔ ایسے ہی فرید عباسی وکیل تھا۔ وہ ایک مشہور لا فرم کی نمائندگی کرتا تھا چنانچہ یہ اتفاق بھی ناممکن نہیں تھا کہ ناصر عظیم اپنے قانونی مسائل اس فرم کے سپرد کر دے تو فرید عباسی کے ساتھ اس کی دوستی ہو جائے۔

سارا دن میں نیلم کی گاڑی لے کر پھرتا رہا تھا۔ ظاہر ہے نیلم کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسٹوڈیو میں اور کسی فلم کے سیٹ پر اسے گاڑی پیش کرنے والے بہت تھے۔ وہ بے شمار کردہتی وہ خود ڈرائیور بن کے جنم کو کہیں بھی لاتا لے جاتا۔ میں اپنی خوش قسمتی تصور کرتا لیکن یہ انتظام عارضی تھا۔ مستقل ضرورت کے لیے مجھے اپنی ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔

کمال کے اسپتال جانے کے لیے بھی میں یہی گاڑی لے سکتا تھا مگر میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور سڑک تک جا کے ایک ٹیکسی لے لی۔ سڑک پر چلتے ہوئے اور لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں ابھی تک اعتماد کی کمی کا شکار تھا۔ میرے لا شعور میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ کہیں کوئی مجھے شاہ عالم نہ سمجھ لے۔ میرا صرف حلیہ بدلا تھا۔ چہرہ وہی تھا اور اسے بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ لوگ اب شاہ عالم کو بھی بھول چکے تھے۔ آج کے اخبار میں پھر اس نے

خبروں میں جگہ پائی تھی لیکن اس سے عام لوگوں کے جذبات نہیں بدلے تھے۔ ان کا مجموعی رد عمل وہی عرصہ درجی کا تھا۔ یہ صورت حال میرے حق میں جاتی تھی اور مجھے کسی کے عمومی رد عمل سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا۔

میں کمال اسپتال پہنچا تو رات پوری طرح شریر سایہ فگن ہو چکی تھی۔ یہ اسپتال میں داخل مریضوں کے لیے کھانے کا وقت تھا۔ ان کے لیے جلدی کھانا کھانے کے جلدی سو جانے کا معمول سردی گرمی میں وقت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ دور سے میں نے اسپتال کی کھانے کی ٹرائی کو دیکھا جو وارڈز کے کوریڈور میں کھڑی تھی۔ رات کی ڈیوٹی والا اسٹاف مریضوں کو کھانے کی ٹرے ان کے بیڈز تک لے جانے کے دے رہا تھا۔

میں آفس کے انتظامی ہلاک اور وارڈ نمبر ایک کے درمیان سے گزر کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا جہاں رہائشی کوارٹروں کے چار ہلاک تھے۔ ہر ہلاک میں دو کوارٹرز تھے اور انہی میں ایک میں کمال کی رہائش تھی۔ اس کے مزاج کی فقیرانہ شان اور اس کی زندگی کا پُر قناعت انداز بعض اوقات مجھے بھی حیران کر دیتا تھا۔ اس کوارٹر میں صرف دو کمرے تھے جن میں سے ایک کو ان کا بیڈ روم سمجھا جاسکتا تھا۔ دوسرے کو انہوں نے بیٹھنے کے قابل بنالیا تھا لیکن ان دو کمروں میں بھی سامان کم سے کم تھا۔ اس گھر میں کوئی پُرعیش ڈرائنگ روم نہیں تھا اور اسباب ضرورت بھی عام استعمال کا تھا۔ مجھے بعض اوقات ان کی زندگی بے حد خشک ویران اور غیر دلچسپ لگتی تھی۔ وہ ہزار کن حد تک اپنے معمولات کے اسیر تھے اور گھونٹے پھرنے بھی بہت کم جانتے تھے عمروہ اس میں خوش تھے۔

گھر کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے قمر کے چلانے کی آواز آ رہی تھی وہ اپنے اٹھوٹے فرزند کی کسی حرکت پر ناراض ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو قمر پڑ پڑ کرتی دوپٹہ سنبھالتی آئی اور دروازے سے سر نکال کے بولی ”توون ہے؟“ پھر اس نے مجھے دیکھا اور اس نے خوشی سے ایک چیخ ماری ”بھائی۔“ اور باہر نکل کے مجھ سے ٹپٹ گئی۔

”بھائی۔ یہ تم ہو۔“ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے اپنی آنکھوں پر۔ ”اس نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا۔“
میں نے اس کے سرو کپڑا سے چپکلی دی ”یقین آجائے گا۔ چل اندر۔“

وہ مجھے سمجھنے کے اندر لے گئی ”فہمو۔ پہلے میں تمہیں جی بھر کے دیکھ تو لوں۔ کتنے عرصے بعد تم کو پھر ویسے ہی دیکھ رہی

ہوں۔ جیسے تم تھے۔ بھائی تم اب آگئے ہو تاہم کے لیے؟“
وہ میرے سینے پر سر رکھ کے رونے لگی۔
میں نے اسے تسلی دی ”ارے پاگل۔ میں گیا ہی کب تھا۔“

”نہیں بھائی۔“ وہ روتے ہوئے بولی ”تم کس چلے گئے تھے۔ کبھی آتے تھے تو اتنے انجینی بن کے آتے تھے کہ پچھانے نہیں جاتے تھے۔“

میں نے کہا ”اب میں آگیا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ رومت یا جھوٹ بول رہے ہو تم بھائی۔ تم پھر چلے جاؤ گے۔“ وہ اسی طرح روتی رہی۔

کمرے میں کھڑا ہوا دو سال کا بچہ اپنی ماں کو ایک انجینی کے گلے لگ کر روتا دیکھ کے خود بھی رونے لگا تھا۔ میں نے قمر کے آنسو پونچھے اور بچے کو گود میں اٹھایا تو اس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ میں نے گھبرا کے اسے قمر کے حوالے کر دیا ”یہ تو انجین کا بچہ ہے۔ دیکھنے میں انسان کا بچہ نظر آتا ہے۔“

قمر آنکھیں پونچھ کے مسکرانے لگی ”بیٹا یہ تو ماں ہیں۔“

مائی لانے والے جاؤ ان کے پاس۔“
لیکن بچے نے مجھے ماما تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ماں سے چھٹ گیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”تو مونی ہو رہی ہے قمر۔“

وہ شرملا کے ہنسی ”میں نے آج اخبار پڑھا تھا۔ روز تو فرصت نہیں ہوتی مگر آج انہوں نے کہا کہ تمہارے بھائی صاحب نے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ پولیس کو چکماوے کر فرار ہو گئے ہیں۔“

میں نے کہا ”مگر اخبار تو کچھ اور ہی لکھ رہے تھے۔“
وہ بولی ”مجھے پتا تھا وہ سب غلط ہے۔ کمال نے ہی کہا ہے کہ یہ ناصر کا کوئی اور ڈراما ہے۔ فرار ہونے کا منصوبہ تو وہ بنا ہی رہا تھا۔ ہوٹل سے نہ ہوا پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا۔ اب دیکھ لینا کسی دن اچانک ”جائے گا کوئی یا نہیں بدل کے۔“ میں نے فرید عباسی کو بھی فون کیا تھا کہ یہ حراست میں پولیس تشدد سے ہلاکت کا کیا چکر ہے تو اس نے بھی کہا کہ شور مچانا ضروری ہے کہ مار دیا۔ مار دیا۔“

”تو نے خود دیکھا تھا۔ میں تھانے میں کتنے آرام سے مسانوں کی طرح مقیم تھا۔“

”اسی لیے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ بھائی نے مل ملا کے یا پیسہ خرچ کر کے کوئی چکر چلایا ہے اور پولیس نے خود بھائی کو فرار کرا دیا ہے۔ کمال بھی یہی کہہ

رہے تھے کہ پولیس نے مجھانہ غفلت نہیں برتی۔ صرف الزام لیا ہے اپنے سرگرم اس الزام کو قبول کرنے کی پوری قیمت بھی وصول کی ہوگی۔“

میں نے قمر کی خوش فہمی کے ظلم کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر میں اسے حقیقت بتاتا تو حاصل کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہ روتی اور پریشان ہوتی۔ ”میں کیا بندوبست کر کے نکلا تھا۔“
”کل سے اب تک تم کہاں تھے بھائی؟“

میں نے کہا ”نیلیم کے گھر میں روپوش تھا۔ اپنا طلیہ اور لباس بدل کے میاں آیا ہوں۔“
وہ ڈر کے بولی ”اگر کسی نے تمہیں پچان لیا بھائی؟“

”نہیں پچانے گا۔ اب میں وہی ہوں کہ ہم تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اور ہوں۔“ میں نے کہا۔

”خدا کے لیے اب کسی نئی ابھن میں مت پڑنا۔ بس تم میاں آ جاؤ اور ہمارے ساتھ ہی رہو۔“
میں نے اس کی تجویز کو گول کر دیا ”کمال ابھی تک مصروف ہے۔“

”ان کا تو یہی ہے آ جاتے ہیں مغرب کے بعد لیکن رات کو کسی بھی وقت کوئی ایمر جسی ہو تو جانا پڑتا ہے۔“ قمر نے کہا ”میں تمہارے لیے چائے پانی ہوں۔“
میں نے کہا ”مجھے چائیکل مل گئے تھے۔“

”مل گئے تھے بھائی۔ تمہارا وہ دوست دے گیا تھا۔“ وہ بچن سے بولی ”ابھی ایسے ہی رکھے ہیں۔ تم نہیں آئے تھے تو دل بہت اداس تھا۔“

میں نے کہا ”تو جانتی ہے اچھی طرح کہ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

بچے نے بچن میں کوئی جر گرائی پھر اپنی تو قلمی آواز میں شور کرنے لگا ”مئی گندی بچی۔ ہم بولی کو ماری ہے۔“
میں نے بچن میں جا کے اس سے دوستی کرنے کی پھر کوشش کی ”تو ہم باہر چلتے ہیں۔ چننا دیکھیں گے۔“
وہ فوراً میرے پاس آ گیا۔ قمر بھی ”باہر جانے کے لیے فوراً تیار ہے۔“

میں نے کہا ”تم اسے بولی کیوں کہتی ہو؟“
وہ بولی ”دراصل نام بدل دیا ہے اس کا۔ اب یہ محبوب الحق ہے۔ اسپتال میں ایک بزرگ آئے تھے۔ بہت عرصے سے بیمار تھے۔ میاں ایک مہینے رہے اور ٹھیک ہو گئے۔“

ایک پیسہ خرچ نہیں ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور بڑی دعا میں دیں۔ ایک دن اسے دیکھا تو بولے کہ اس کا نام کیا ہے۔ کمال نے بتایا تو بولے اس کا نام محبوب الحق رکھ دو۔

بہت مبارک ہے۔ میں ان سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔ ان کی عمر شاید سو سال ہوگی مگر چہرے پر ایسا نور تھا اور ایسی جلالی شخصیت تھی ان کی کہ دل میں خود بخود تعظیم کے جذبات پیدا ہوتے تھے کمال تو قائل نہیں ہیں ایسی باتوں کے مگر میں نے کہا کہ محبوب الحق ہی اچھا نام ہے۔“

”مجھے پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔
اس نے چائے بنا کے میرے سامنے رکھ دی ”ایک رات تم آئے تھے بھائی۔ چند اسے ملنے۔“
میں نے کہا ”ہاں۔ اس کا کیا حال ہے؟“

”تم نے کیا محسوس کیا تھا؟“
قمر چائے کا کپ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا بیٹا اپنے کھلونوں میں مصروف ہو گیا تھا ”چند بہت عجیب بولی جا رہی ہے۔ کمال کہتے ہیں کہ اس پر اسپتال کا ماحول اثر انداز ہو رہا ہے اور وہ اکیلے پن کا شکار ہے۔ تمام وقت اپنے کورٹریں بند رہتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کہیں آتی جاتی نہیں۔ دور دور رہتی ہے۔“

میں نے کہا ”اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی میں تنہائی کا عذاب بہت سخت ہے۔ میاں وہ اس لیے نہیں آتی ہوگی کہ تمہاری پراسیسی میں غلط نہ پڑے۔ خود اس کے پاس اسپتال کے سوا کوئی مصروفیت نہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ کرے تو کیا کرے۔“

ہم باتیں کر رہے تھے کہ کمال آ گیا۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوا ”تو آگیا الو کے پیچھے۔ مرا“

میں نے کہا ”کسی بد خواہ کے چاہنے سے مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سوار کے بچے۔“

وہ ہنسنے لگا ”بچی کہا تھا میں نے قمر سے کہ عکرمت کرو۔ تمہارا بھائی بہت ڈھنچ چیز ہے۔ مرنے تو ہیں غیرت مند۔ یہ بھی کوئی سوچا سمجھا ڈراما ہو گا تم کو کچھ لینا۔“
میں نے کہا ”کہتے ہیں نا والی راوی می شناسو۔ ولی کو ولی بچی بتا ہے۔ دیکھ لے میں آگیا۔“

قمر اس کے لیے چائے لینے چلی گئی تو وہ بولا ”قمر کا بھی عجیب حال تھا۔ ویسے مانتی تھی کہ پولیس کی حراست سے تیرا فرار ہو جانا کسی طے شدہ پلان کے مطابق ہو گا لیکن مجھ سے چھپ چھپ کے روتی تھی اور نمازیں پڑھ پڑھ کے تیرے سے دعا کی کرتی تھی۔ اگر وہ تھانے جا کے تجھ سے نہ ملی ہوتی اور اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا کہ تیرے ساتھ وہاں وہی آتی پتی ٹریٹ منٹ ہو رہا ہے تو شاید میرے یا فرید عباسی کے

سمجھانے سے نہ سمجھتی کہ حراست میں تشدد سے ہلاکت کی بات ہے بنیاد ہے۔“

میں نے کہا ”تو بہنوں کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتا۔“
”اس سے زیادہ عجیب حالت چندا کی رہی۔ اس نے خبر کو منفی انداز میں قائل یقین سمجھ لیا تھا اور کم محم ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی طور پر وہ اتنی اب سیٹ ہے کہ اس کا دماغ کام کی طرف بالکل متوجہ نہیں۔ وہ کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کی آنکھیں غلامی دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے ایک دو بار خود کلامی بھی کی لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ دو بار ایسا ہوا کہ وہ میرے ساتھ چلتے چلتے رک گئی اور کچھ سوچنے لگی۔ ہمارے پیچھے ایک نرس دو آئیں اور انکسشن لے گئے چل رہی تھی۔ وہ چند اسے ٹکرائی اور اس کے ہاتھ سے ٹرے گر گئی۔ اس کے بعد میں نے چندا کو زبردستی کمر بچھ دیا۔ وہ اسپتال میں رہتی تو زیادہ خرابی ہوتی۔ مریضوں کو انڈر کرنے کا کام ایسا نہیں کہ آدمی عمل توجہ اور یکسوئی کے بغیر کر سکے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کورٹریں جا کے دیکھا تو وہ منہ لینے پڑی تھی اور کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ میں نے پاس بیٹھ کے اسے بہت دیر تک سمجھایا کہ ”اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔ ناصر تشدد کرنا تو دور کی بات ہے پولیس اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتی۔“

”وہ مسلسل روتی رہی۔ وہ پوچھتی رہی کہ ”اب ناصر کیا کرے گا؟ وہ کب تک مفروز رہے گا؟ اور کیسے روپوش رہے گا؟ ساری عمر کون روپوش رہ سکتا ہے؟“ بالآخر وہ چکڑا جائے گا کہیں نہ کہیں۔ کیا پھر اس کے لیے زیادہ مصیبت نہیں ہوگی؟ کیا اس کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ٹاپ کے وکیل کرنا اور عدالت میں اپنی صفائی پیش کر کے ان جھوٹے مقدمات سے جان چھڑا لیتا؟ کیا کوشش کر کے ضمانت پر رہائی حاصل کرنا اس کے حق میں بہتر نہیں تھا؟“ چندا کا ذہن جو سوچ رہا تھا وہی سوالات کی صورت میں اس کی زبان پر آ رہا تھا اور وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ میں ناصر کو جانتی ہوں۔ وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ فرار دہائی بات غلط ہے اس کا تو مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ حراست میں ناصر کی ہلاکت والی خبر صحیح ہوگی مگر چندا کا ذہن اس امکان پر سوچنے ہوئے ہی ڈرتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ شدید ذہنی غلط فہمی پریشانی اور مایوسی خوف اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ میں نے بڑی کوشش کر کے اسے ایک ٹریکولار زبردے دیا تاکہ وہ سو جائے لیکن چندا پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جاتی رہی اور

اپنے خوف زدہ کرنے والے خیالوں سے لڑتی رہی۔ سچ بتاؤں مجھے تو اس کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس کا ڈیپریشن اتنا بڑھ جائے کہ وہ خودکشی کر لے۔ میں یہ بات پہلے سے محسوس کر رہا ہوں کہ اعصابی دواؤں اس کو ذہنی طور پر خراب کر رہا ہے۔

میں نے کہا ”خرابی سے تیری کیا مراد ہے؟“

”وہ شدید بیزار رہنے لگی ہے۔ بہت بد مزاج اور چڑی ہوتی جا رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجھلا جاتی ہے۔ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے تو کسی حد تک ناجائز پریشان کرتے ہیں اور انہیں کنٹرول کرنا پڑتا ہے لیکن مریض تو مریض ہے۔ اس کی غلط بات بھی سنی پڑتی ہے۔ دو ایک بار وہ مریضوں پر برس پڑی۔ یہ رویہ اسپتال میں نہیں چل سکتا۔ دراصل اس خرابی کا ذمہ دار بھی اسپتال ہے۔“

”چند اے تو بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ یہ کام شروع کیا تھا۔“

کمال نے سوچ کے کہا ”شوق اور جذبہ ایک تو ہوتا ہے طبعی۔ ہم جیسے لوگ ہیں جو اور کچھ سوچتے ہی نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی ماحول دیکھا ہے۔ گھر میں اماں آیا بھی ڈاکٹر تھے۔ خدمت خلق کرتے کرتے مر گئے۔ اس میں نام اور پیرہ بھی بہت کمایا اور سب میرے لیے چھوڑ گئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خون میں یہ شوق شامل تھا لیکن چندا نے ایک رد عمل کے طور پر یہ پیش اختیار کیا تھا۔ کرنل خان کی وفات کے بعد وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ تو بھی اسے وعدے کر شاہ عالم کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کوئی مصروفیت تلاش کرنے کی کوشش میں اسپتال جوائن کر لیا۔ وہ اکیلی کہیں اور جا کے رہ بھی نہیں سکتی تھی مگر یہ بہت مشکل کام ہے برادر۔ سخت اعصاب تھکن اور صبر آزما۔ خدمت خلق کا سارا شوق کچھ عرصے بعد ایک بڑا ذلت تجربہ بن جاتا ہے جب آدمی کو چوبیس گھنٹہ بیماری اور موت ہی دیکھنے کو ملے۔ یہاں تو دن رات کا معاملہ ہے۔ دوسرے اسپتالوں میں یہ ہوتا ہے کہ آپ نے آٹھ دس گھنٹے ڈیوٹی کی اور اس ماحول سے نکل آئے۔ یہاں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔ ماحول بدلنے کے لیے کہیں جانے کا کوئی سوال نہیں۔ ہر وقت وہی ایک کام ہے۔ روتے چلاتے خست حال اور خست تن مریضوں سے نمٹنا۔ ان کے گرد بہ صورت زعموں سے خون پیپ صاف کرنا۔ گلے مزے بیمار گوشت کی تراش خراش اور سسکتے ترپتے انسانوں کو مڑتے ہوئے دیکھنا۔ چندا کا تروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ مزید پرانہ یہ ہوئی کہ اس کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں۔

جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دوست احباب نہیں۔ سوسائٹی نہیں اور ماحول سے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ گھبرا گئی ہے اس کام سے اور اگر اس نے فوراً کوئی صورت نہ نکالی تو اس کا مکمل تروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ اسے کسی نفسیاتی اسپتال کے کلینک میں داخل کرنا پڑ جائے گا۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر عاشق کا کلینک ایک مثالی جگہ ہے۔“

”ہوگی۔ مگر کیا ضروری ہے کہ وہ نویت آئے۔“

”تو اسے نکال اس ماحول سے۔ اس کی کچھ مدد کر۔ اسے کہیں لے جا۔“

”مثلاً کہاں؟ بمبکتویا ہو تو لولو۔“

وہ بولا ”تو اپنی جان بچانے کے لیے ایسے سوال کر رہا ہے؟“ کمال بگڑنے لگا۔

”نہیں یار۔ چندا میری بھی ذمہ داری ہے۔“ میں غلط

کہا۔ وہ بولا ”اس کی کچھ دل جوئی کر۔ اس کو کسی تقریب یا ایڈیشن پر اپنے ساتھ لے جا۔ اسپتال کے ماحول سے اسے نکالنے کی ایک صورت یہ ہے کہ تو اسے اپنے کام میں شریک کر لے۔“

”میں تو ابھی ایسا کوئی کام نہیں کر رہا ہوں۔ جس میں چندا میرے لیے کچھ بھی کر سکے۔“

”تیرا سٹیم خانے کا پراجیکٹ کب شروع ہوگا آخر۔“

میں نے کہا ”غیر یقیناً بہت جلد۔ انشاء اللہ۔“

”تو چندا کو اس کے انتظامی امور سونپ دے۔ اس پراجیکٹ کی ڈیزائننگ سے تکمیل تک ہر مرحلے میں چندا کو ذمہ داری میں شامل کر لے تاکہ اس کو مصروفیت بھی ملے اور اس کی توجہ اسپتال سے بالکل ہٹ جائے۔ یہ کام ابھی کے بس کا نہیں۔“

میں نے کہا ”یہ تو میرے لیے بھی بہت اچھا ہوگا اگرچہ میری مدد کرنے کے لیے میرے ساتھ آجائے۔ میں تو چاہتا تھا کہ نہ اس کا تفسیر میں ہو اور نہ اس کی رہائش۔“

کمال نے مجھے غور سے دیکھا ”تو اسے اپنے ساتھ لے جا۔“

”میری مراد ایک ہی گھر سے نہیں تھی۔“ میں نے

جلدی سے وضاحت کی۔

”آخر تو اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا الو کے بچے۔“

میں نے کہا ”شادی ابھی نہیں یار۔ ذرا پہلے وہ نارمل ہو جائے اور میری طرف سے اس کا دل صاف ہو جائے۔“

مجھے پھر وہی پہلے والا ناصر عظیم خان مان لے۔“

”یہ کیا مشکل ہے۔ اگر تو شرافت کا جامہ پہن لے۔“

میں نے کہا ”وہ اس وقت ہے کہاں شرافت کے جامہ پہن؟“

”کہاں ہوگی اپنے کو اور رڑ کے سوا۔ اسپتال سے آتی ہے تو رڑ میں قید ہو جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”کیا میں اسے باہر لے جاؤں ڈر کے لیے؟“

”یہ بڑی اچھی ابتدا ہوگی۔“ کمال بولا۔

”نہیں۔ یہ تو شرف چانے لگی۔“ اب ایسی بھی آفت نہیں آ رہی ہے

کہ تو اتنے ہی چلے جاؤ بھائی۔ وہ جو میں نے کھانا پکا لیا ہے

اس کا بھوکا۔“

”وہ میں صبح اٹھتے ہی کھا لوں گا ناشتے سے پہلے۔“ کمال

بولا۔

میں نے کہا ”ورنہ میں دایس آ کے دو سرائز کروں گا۔

کچا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ بیض۔ بہن کا دل رکھنے کے لیے

بھائی جان پر کھیل جائے گا۔“

میں نے کہا ”فکرت کر۔ ہم تجھے مرنے نہیں دیں

گے۔ تو اتنا بڑا اسپتال چلا رہے ہیں۔“

”میسوس تاک اتفاق یہ ہے کہ آج میں پیدل ہی ہوں۔

میرے پاس کوئی سواہی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کمال نے چایاں میرے سامنے رکھ دیں۔“ لے جانی ہے

تو اپنی یہ سپرٹائس حاضر ہے۔ ہم خود بھی اس میں ٹھوٹے

ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”تھینک یو۔ وہ سمجھے گی یہ

SPONSORED دعوت آپ نے گھر میں کبھی ہے۔“

میں نے دروازے کو دستک دیے بغیر آہستہ سے دھکیلا

تو وہ کچھ چلا گیا۔ میں خاموشی سے اندر چلا گیا اور برآمدے

میں چھپ گیا۔ ایک کمرے میں تاریکی تھی۔ دوسرے میں

درخت کی ٹہنی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا

تو مجھے ایک یہ حرکت کسی حد تک غیر اخلاقی لگی۔ یہ ہو سکتا تھا

کہ ایک عین وہ کیڑوں کی طرف سے بے پروا کسی ایزی پوز

میں بیٹھ جاتی یا کیڑے بدل رہی ہوتی مگر اس نے باہر کا دروازہ

دیکھ کر نہیں کیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کمال یا قمر میں سے کوئی

کہ وقت بھی سیدھا اندر آ سکتا ہے۔

وہ ستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند

تھیں اور دایاں ہاتھ پیشانی پر ڈال رکھا ہوا تھا۔ میں بے پاؤں

سے بڑھا اور اس سے چار فٹ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا مگر

سے نہ چلا۔

”چند۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ اس بری طرح اچھلی جیسے میں نے اس کے کان کے پاس رکھ کر ریو لور چلا دیا ہو۔ ”کدہ۔ کدہ۔ کون؟“ اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا اور اٹھ کے سیدھی بیٹھ گئی پھر اس کی نگاہ نے مجھے دیکھا اور اس کا وجود جیسے پتھر کا ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا خوف دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ یہ حقیقت نہیں خیالوں کا سراپ ہے۔

چند ا کا چہرہ مستابو تھا۔ اس پر اندیشوں کے اور تفکرات کے افسردہ سائے صاف نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد رنج و الم کے سرمئی حلقے سے بڑ گئے تھے اور اس کے لبوں کی مسکراہٹ اب بھی ہوئی تھی۔ وہ بے ترتیب اور کسی حد تک شکن آلود اور بے قرینہ لباس میں تھی اور اس کے بال پریشان تھے۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا ”چند۔ کیا بات ہے؟“

اس نے پک جھپکائے بغیر مجھے دیکھنا جاری رکھا ”تم آگے ہو یا میری نظریں مجھے دھوکا دے رہی ہیں؟“

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ہاتھ

ٹھنڈا اور زندگی کی حرارت سے محروم تھا ”اس میں بے یقینی

کی کون سی بات ہے؟“

”لیکن۔ لیکن۔ تم تو۔“

میں نے کہا ”کیا ہو گیا ہے تمہیں چند۔ یہ تم نے اپنی کیا

حالت بنا رکھی ہے؟“

چند ا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے

بال پیچھے کیے اور دوپٹہ اٹھالیا ”تم اچانک سامنے آ گئے۔ تو

مجھے یقین نہیں آیا اور پھر اتنے عرصے بعد میں نے تمہیں

ایسے دیکھا۔ تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی پرانا خواب دیکھ رہی

ہوں۔ کب آئے تم؟“

میں نے کہا ”ایک گھنٹہ ہو گیا ہے مجھے آئے ہوئے۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ

ہوا ہوگا۔“

میں نے کہا ”میں کمال اور قمر کے ساتھ تھا۔“

اس نے مجھے نظر جمائے دیکھا ”تم پولیس کی تحویل سے

فرار ہو کے آئے ہو؟“

میں نے کہا ”میں نہیں۔ پولیس کی حراست سے شاہ عالم

فرار ہوا ہے۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”ناصر عظیم ابھی تک شاہ

عالم کی حراست میں ہے۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ وہ بھی آزاد ہو گیا ہے۔ میں بیش

کے لیے تمہارے پاس آگیا ہوں چندا۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔ اس کی بات بھی کرنا نہیں چاہتا۔
”کیا یہ تمہارے اختیار میں ہے؟“ وہ سپاٹ لمبے میں بولی۔

”ہاں اب ہے۔ میں واقعی لوٹ آیا ہوں۔“
وہ سر ہلا کے بولی ”میں کیسے مان لوں۔ تم کہتے ہو۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تم اپنی زندگی جیسے کے حق سے بہت پہلے محروم ہو چکے تھے۔“
میں نے کہا ”میں نے یہ حق پھر حاصل کر لیا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔“

وہ مجھے اسی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی ”مجھے کل بھی یقین نہیں تھا کہ تم پولیس کی حراست سے فرار ہو گئے ہو۔ مجھے اس وقت بھی یقین نہیں ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہی حقیقت ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے ناصر۔“
میں نے کہا ”اب خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ چلو اٹھو۔“
”اٹھ کے کیا کروں؟“

”میرے ساتھ چلو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ بہت کچھ کہنا ہے اور بہت کچھ سننا ہے تم سے۔“
وہ مایوسی سے بولی ”میں ناصر۔ مجھے ڈر لگتا ہے باہر جاتے ہوئے اور تم باہر جاؤ گے تو تمہیں پولیس پکڑے گی۔“
”پولیس اب مجھے نہیں پکڑ سکتی۔ فرار شاہ عالم ہوا ہے تو وہ ناصر عظیم کو کیوں پکڑے گی۔ اٹھ کے پکڑے بدلو۔ تیار ہو جاؤ۔“

اس نے پھر پیس و پیش کیا ”دیکھو۔ جو باتیں کرنی ہیں یہاں بیٹھ کے کرو۔ باہر جانا کیا ضروری ہے۔“
میں نے کہا ”باہر جانا ہے حد ضروری ہے۔“
”میرا دل نہیں چاہتا۔“

میں نے کہا ”دل کی مت مانو۔ عقل کی بات سنو۔ مجھے سب بتایا ہے کمال نے کہ کیسے تم نے تارک الدنیا ہو کے اس کو اڑیں بند کر لیا ہے خود کو۔ قہر نے بتایا ہے مجھے کہ تم نے خود کو زندگی کی خوشیوں سے دور کر لیا ہے۔“
وہ اداسی سے مسکرائی ”وہ ایسے ہی پریشان ہوتے رہتے ہیں۔“

”نہیں چندا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسے کھڑا کر دیا ”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“
”ساتھ چلنا ہوگا؟“ اس نے جیسے خود سے پوچھا ”نہر

کہاں تک؟“
میں نے کہا ”جہاں بھی میں کہوں۔ جہاں تک بھی میں چاہوں۔ تم کو میرا ساتھ دینا پڑے گا چندا۔ تمہیں میری قسم۔“

اس کے بعد چندا نے مزاحمت ترک کر دی۔ اس نے دس منٹ میں لباس بدلا اور ہلکا سا میک اپ کر کے بولی ”اب بتاؤ کہاں جانا ہے؟“
میں نے کہا ”میرے پاس گاڑی نہیں ہے آج سہم بدل جاؤں گے اور تھک جائیں گے تو ٹیکسی میں بیٹھ جائیں گے یا ٹائٹے میں۔“

”بہت آہستہ چندا کے بے رونق بے جان چہرے پر شادمانی کی مسکراہٹ صبح کی پہلی کرن کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ ہم چلنے گئے اور باتیں کرتے گئے۔ چندا کالج اور دویہ پہلے تاریختی مایوسی اور افسردگی کا آئینہ دار تھا تو رفتہ رفتہ اس میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی مئی یہاں تک کہ وہ بالکل نارمل ہو گئی۔ وہ اعتماد کے ساتھ بات کرنے لگی۔ مسکراتے لگی اور ہنسنے لگی۔“

میں نے اسے سب بتا دیا۔ اپنی گرفتاری سے رہائی تک پیش آنے والے واقعات اسی طرح سنا دیے جیسے وہ پیش آئے تھے۔ میں نے اسے اپنے مستقبل کے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا اور اپنے عزائم سے بھی۔ وہ رات بڑی دل فریب اور نظر نواز تھی۔ آسمان پر چودھویں شب کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ روشن تھا اور شاید یہ میرے احساس کی کرشمہ سازی تھی کہ مجھے ساری فضا حسین لگ رہی تھی۔ رات کا وجود آتما زبہار کی خوشبو سے معمور تھا اور ماحول میں زندگی کا سارا حسن سمٹ آیا تھا۔

ہم بدل چلتے چلتے کئی میل دور نکل آئے تھے۔ اب چندا بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ وہ مجھے ایک پرسکون یا معتد اور محفوظ مستقبل کے حراطہ مستقیم پر گامزن رہنے کی ضرورت سمجھا رہی تھی اور مجھے قائل کر رہی تھی کہ میری زندگی کا سب کے ساتھ اس کا کتنا حق بنتا ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری رفاقت کا اعجاز میاں آتی جلدی اپنا رنگ دکھائے گا۔ ذرا سی دیر میں چندا وہی پرانی چندا بن گئی تھی۔ اس کی ساری اداسی افسردگی اور مایوسی دیکھتے دیکھتے ایک دلوازا ادائے حسن میں ڈھل گئی اور وہ ایک بار پھر وہی چندا بن گئی جس کو اپنے ناز و انداز اور آداب دلبری سے ناصر عظیم کو مجبور و محکوم رکھنا آتا تھا۔ یہ تبدیلی اتنی تیزی سے رونما ہوئی تھی کہ خود میں حیران رہ گیا۔

رات کے دس بجے جب چندا نے کہا کہ اب اس سے مزید نہیں چلا جاتا اور وہ تھک کے گرنے والی ہے تو ہم شملہ راجی کو عبور کر چکے تھے۔ ہم ایک اوپن ائیر ریسٹورنٹ میں ٹھکے کے لیے جا بیٹھے۔
وہاں میں نے چندا سے کہا ”چندا میں چاہتا ہوں تم یہ اسپتال کا کام چھوڑ دو۔“

وہ ہنس پڑی ”پھر کیا کروں؟ شہنم کی طرح صحافت کروں یا نیہر کی جگہ فلموں میں آ جاؤں۔ وہ تو ریٹائر ہو رہی ہے۔“
میں نے کہا ”یہاں تم اپنی صلاحیت کو اور اپنے آپ کو ضائع کر رہی ہو۔ تمہاری زندگی کے مقاصد میں صرف ایک نرس بن کے زندگی گزار دینا تو شامل نہیں تھا۔ جو کام تم کر رہی ہو وہ کوئی بھی نرس کر سکتی ہے۔“
وہ بولی ”میرا تو خیال ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔“

”تھک ہے۔ تم کچھ نہیں کر رہی ہو سوائے اپنی عہدیتوں کو ضائع کرنے کے۔ اسپتال کا بیمار ماحول تمہیں بیمار بنا رہا ہے۔“
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں جتنے ڈاکٹر کمال کے۔“
”نہیں میں یہ کام نہ کروں تو کیا کروں؟“
”تم میرے ساتھ آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔
”تمہارے ساتھ؟“

”ہاں۔ تم میری پارٹنر بن جاؤ۔ مجھے ایک با اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے۔ قابل مشیہ ایک رازدار سیکریٹری اور ایک اٹھ دوست کی ضرورت ہے۔“

وہ بولی ”لیکن ابھی تو تم خود بھی کچھ نہیں کر رہے ہو۔“
”میں نے اپنا پانا بڈنگ اینڈ کنسرکشن کا کام پھر شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں شہنم خانے کی تقریر ترمیم اور تنظیم کے سارے کام مرحلہ وار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی ٹیکس کی منزل آئے گی۔ پہلے تشکیل کا مرحلہ ہوگا۔ شہنم خانے کا نقشہ اور ڈیزائن تیار ہوگا پھر تعمیر کا مرحلہ آئے گا۔ اس کی عمارت مکمل ہوگی۔ تعمیر کے بعد زمین کے مرحلے میں بلڈنگ کے لیے ضرورت کا سارا سامان فراہم کیا جائے گا۔ آخری مرحلہ ہوگا تنظیم کا یعنی اس کے انتظامی معاملات کو سنبھالنے کا۔ یہ سارے کام میں آگیا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے مجھے تمہارے جیسے کسی مستند اور شریک کار کی ضرورت ہے۔“

وہ بڑے غور سے میری بات سنتی رہی اور سوچ میں پڑ گئی۔ ”کیا تم واقعی مجھے اس کا اہل سمجھتے ہو؟“
”چندا۔ کیا میں تمہیں سمجھتا نہیں؟ مجھے تمہارا جواب ہاں میں چاہیے۔“
اس نے ایک گہری سانس لی ”میں تمہیں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔“

”میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم وہ جگہ چھوڑ دو۔ جہاں تم رہتی ہو۔ اس کو اڑنے کے تمام ادیان ماحول سے نکل آؤ۔“
وہ کچھ حیران ہوئی ”میرے پاس تو رہنے کی وہی ایک جگہ ہے۔“
میں نے کہا ”تمہاری رہائش کے لیے میں نے ایک جگہ لی ہے۔ وہ میرا پرائیویٹ آفس تھا مگر میرا خیال ہے کہ تم وہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔“
”کس کے ساتھ؟“ اس نے براہ راست سوال سے گریز کیا۔

”کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ تم اپنی حفاظت خود بھی کر سکتی ہو لیکن میں چوہیں گھٹنے کے لیے سکیورٹی گارڈ رکھ سکتا ہوں۔ تم ایک بار چل کے وہ جگہ دیکھو پھر تم خود ہی قائل ہو جاؤ گی۔“
”ایک بات پوچھوں ناصر۔“
”ضرور پوچھو۔“ میں نے کہا۔

وہ میز پر آگے جھک کے بولی ”یہ اچانک تمہیں میری زندگی میں آنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟“
میں نے کہا ”یہ دلچسپی ویسے تو ہمیشہ سے تھی لیکن اس کی فوری وجہ تمہاری یہ حالت ہے جس کا ذمہ دار میں خود کو سمجھتا ہوں۔ میں اپنی کوتاہی یا غلطی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری بدقسمتی نے یا گردش حالات نے ہمارے تعلق میں جو دوری پیدا کر دی تھی، میں اسے مٹانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں سب کچھ پھر پہلے جیسا ہو جائے۔“
اس نے ایک آہ بھری ”وقت جو گزر جاتا ہے وہاں کیسے آسکتا ہے؟“

”سکتا ہے چندا۔ اگر ہم چاہیں۔“
میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ نہ جانے کہاں سے اٹھ کے کچھ لوگ ہمارے قریب آ گئے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور انہوں نے ہماری میز کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کے چار حاند عزائم ان کی صورتوں پر تحریر تھے۔ ان میں سے دو افراد کے چہرے میرے دیکھے ہوئے تھے۔

وہ پیر سجان شاہ کے مرید اور ملازم تھے اور اس کے سالے اسے ایس بی دلاور شاہ کے ماتحت تھے۔ انہوں نے میری گرفتاری اور اغوا میں اہم کردار ادا کیا تھا اور شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ مجھے شاہ عالم فرض کرتے ہوئے پھر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں نے اپنا اعتماد بحال رکھا اور اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ کیا بات ہے؟

چند اے خوف کو اپنے جبر سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”ناصر! جھگڑا مت کرنا۔“

میں نے اسے تسلی دی ”میں صرف ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا چاہتے ہیں؟“

ان میں سے ایک آگے بڑھا ”وہ ان سب کے مقابلے میں صحت مند تھا اور اس کی بڑی بڑی موٹھیں تھیں۔ اسے بائیں ہاتھ سے ایک موٹھ کو مروڑنے کی عادت تھی۔ اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اپنی بد معاشی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔“

اس نے بڑے سیٹ لہجے میں کہا ”شاہ عالم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“

میں نے حتی الامکان سخت حیران نظر آنے کی کوشش کی۔

”شاہ عالم! کون ہے شاہ عالم؟“

وہ ایک قدم اور آگے آیا ”میرے ساتھ ڈراما مت کرو۔“

میں نے سخت لہجے میں کہا ”آخر تم ہو کون؟“

”شاہ عالم! میرا نام راؤ سکندر ہے۔“ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

”مگر میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔“ میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

اب چندا نے مداخلت کی ”ان کا نام ناصر عظیم ہے۔“

”ہاں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔

راؤ سکندر کے جارحانہ انداز نہیں بدلے ”بھوت بولتے ہو تم۔ تم ایک مفرور مجرم شاہ عالم ہو۔“

میں نے برہمی سے کہا ”مجھے کوئی ضرورت نہیں جھوٹ بولنے کی۔ غلط فہمی نہیں ہوتی ہے۔“

راؤ سکندر نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی ”چلو تمہارے چلو۔ سب معلوم ہو جائے گا کہ تم کون ہو غلط فہمی کے بیچ۔“

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ”تم ہوتے کون ہو مجھے اس طرح زبردستی تمہارے لے جانے والے؟ میں

ایک آزاد اور امن پسند شہری ہوں اور میرا نام شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہے۔“

چند اے بھی شور مچایا ”یہ کیا بد معاشی ہے۔“

راؤ سکندر نے اسے غمور کے دیکھا ”تم چپ کر کے بیٹھو بی بی۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔“

چند اے نے زیادہ اونچی آواز میں کہا ”یہ وارنٹ کے بغیر تم کسی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔“

”ایک مفرور مجرم کو ہم کہیں بھی دیکھیں تو گرفتار کر سکتے ہیں۔“ راؤ سکندر بولا۔

میں نے کہا ”کس نے دیا ہے تمہیں گرفتاری کا اختیار؟“

چند اے نے کہا ”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم پولیس والے ہو؟“

راؤ سکندر نے جب سے ایک کارڈ نکالا ”میں سی آئی اے کا سب انسپکٹر ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

اونچی آوازوں کے شور نے دھڑا دھڑکی میزوں پر بیٹھے ہوئے بست سے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میری صورت سے کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ کا اظہار نہ ہو اور میں صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچاؤں۔ مجھے تمہارے جانے میں کوئی عار نہیں تھا کیونکہ میں بہر حال یہ ثابت کر سکتا تھا کہ مجھے پہچاننے والوں نے غلطی کی ہے اور میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔ میرے پاس اپنے شناختی کارڈ اور دوسرے دستاویزی ثبوت بھی تھے۔ ایک بار پہلے میں نے عدالت میں جج کے سامنے یہ غلط فہمی رفع کرنے کے لیے دو مستند گواہ طلب کر لیے تھے۔ اس وقت بھی میرے لیے ڈاکٹر کمال فاروقی اور قلموں کی سپر اسٹار نیلم کو بلانا مشکل نہیں تھا مگر میں چاہتا تھا کہ بات اس حد تک نہ بڑھے۔

سب انسپکٹر راؤ سکندر اپنی بات پراڑا ہوا تھا اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے اپنے تمام تر قانونی اور غیر قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن ضرور لے جائے گا مگر میری پریشانی دور کرنے میں قدرت نے میری مدد کی۔ پہلے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے دو چار اٹھ کے ہمارے قریب آگئے اور انہوں نے معاملہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

یہ روز مرہ مشاہدے کی بات ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں پبلک کا ووٹ ہمیشہ پولیس کے خلاف ہوتا ہے۔ لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ قانون کے نام پر پولیس ہمیشہ لا قانونیت کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی طاقت کے عمل پر غلط کام کرتی ہے۔

وہاں جمع ہونے والوں میں تین گورنمنٹ کالج کے لڑکے تھے جو بست جو شیلے تھے اور میری حمایت میں بولنے لگے تھے مگر ان کے ساتھ آنے والے ایک پروفیسر نے انہیں روک دیا اور اپنا تعارف کرا کے معاملہ ختم کرا دیا۔

”انسپکٹر راؤ سکندر! میں گورنمنٹ کالج کا پروفیسر احسان قادری ہوں۔“ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا ”کیا میں یہ مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد کر سکتا ہوں۔“

راؤ سکندر نے باولہ تاخو سے پروفیسر سے معافی کیا مگر اسے مداخلت کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا ”آپ اپنا کام کریں جناب اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔“

میں نے اپنا کارڈ نکالا ”آخر یہ کیا دھاندلی ہے۔ یہ زبردستی مجھے شاہ عالم بنا رہے ہیں۔ میرا شناختی کارڈ دیکھیں میں ناصر عظیم ہوں۔“

پروفیسر نے میرا شناختی کارڈ لے کر غور سے دیکھا ”یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انسپکٹر!“

راؤ سکندر کے کچھ بولنے سے پہلے ایک شخص نمودار ہوا ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ جنٹلمین ”آپ لوگ اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔ میں اس ہوٹل کا مالک فرمان علی ہوں۔“

میں نے پروفیسر سے شناختی کارڈ لے لیا ”مسٹر فرمان! یہ کیا غذا گردی ہے آخر؟ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں کھانا کھانے آیا تھا۔ مجھے یہ لوگ زبردستی پکڑنا چاہتے ہیں کہ تم شاہ عالم ہو۔ حالانکہ میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔“

فرمان علی نے لوگوں کو واپس ان کی میزوں پر بھیج دیا۔

”آپ پریشان مت ہوں زبردستی کون گرفتار کر سکتا ہے آپ کو۔ راؤ سکندر! تم بھی ذرا میرے ساتھ آفس میں آؤ۔ آپ بھی آئیں ناصر صاحب! اخا توں! آپ ہمیں تشریف رکھیں اور گھبراہٹیں نہیں! ابھی سارا معاملہ سیٹل ہو جائے گا۔“

راؤ سکندر کا اعتماد اب تذبذب میں بدل گیا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے والا نہیں تھا ”یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔“

”تم مجھے جانتے نہیں انسپکٹر راؤ سکندر!“ فرمان علی نے ناگوار سی سے کہا ”میں بھی پہلے پولیس میں تھا۔ میں ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہوں۔“

راؤ سکندر زیادہ متاثر نہیں ہوا مگر فرمان علی اپنے آفس کی طرف چل پڑا تھا۔ میں نے چند اے سے کہا ”تم بیٹھو دو منٹ۔ میں آتا ہوں“ اور فرمان علی کے پیچھے ہو لیا۔ اس کا آفس ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں بنا ہوا کمرہ تھا۔ مجبوراً راؤ

سکندر کو بھی وہاں آنا پڑا۔

”آپ تشریف رکھیں“ فرمان علی نے مجھے ایک کرسی پیش کی ”راؤ سکندر! تم بھی بیٹھو۔ تمہیں کسی ایجنٹے ہوٹل میں جا کے شریف لوگوں کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔“

”یہ شریف آدمی نہیں ہے۔“

”میرے لیے سب معزز گاہک ہیں“ وہ سختی سے بولا ”تم اپنے معاملات باہر لے کر دو۔ تمہیں کسی کو گرفتار کرنا ہے تو اپنی کارروائی باہر کرو۔ اور اندر کچھ کرنا ہے تو پہلے مجھ سے بات کرو۔ مجھے وارنٹ دکھاؤ“ یہ میری گندول اور ریپوٹیشن کا سوال ہے۔“

میں نے کہا ”فرمان علی صاحب! ہم اکثر یہاں آتے ہیں۔“

راؤ سکندر معنی خیز انداز میں مسکرایا ”ڈی ایس پی صاحب! اس شخص پر اعتبار مت کریں۔ یہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔“

”مگر یہ شاہ عالم نہیں ہے“ فرمان علی نے کارڈ اسے دکھایا۔

میں نے کہا ”شاہ عالم ایک سیاست دان تھا۔ اسے مرے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ ایک بار پہلے بھی مجھے اس لیے پکڑ لیا گیا تھا کہ میری صورت اس سے ملتی ہے۔ مگر میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک بزنس من ہوں اور بلڈر ہوں۔ میں نے جنسٹریٹ کے سامنے دو گواہ بلائے تھے جو مجھے شناخت کر سکتے تھے۔ وہ مجھے پچھلے دس سال سے جانتے ہیں۔“

”کون ہیں وہ گواہ ناصر صاحب!“

میں نے کہا ”ایک تو قلموں کی سپر اسٹار نیلم ہیں۔“

وہ چونکا ”نیلم جاتی ہی آپ کو؟“

”میرے لیے وہ بڑی بہن کی طرح ہیں۔ آپ ان کے گھر فون کریں۔ وہ ابھی آجائیں گی دس منٹ میں۔ ورنہ ان کا سیکریٹری ریمیں آجائے گا۔ ان کے گھر کے سارے نوکر مجھے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمال اسپتال کے ڈاکٹر کمال فاروقی ہیں۔ آپ انہیں بلا لیں۔“

فرمان علی کو میرے پریقین لہجے نے متاثر کیا ”اب بولو“ تم کیا کہتے ہو سکندر۔ گواہوں کو بلانا ضروری ہے؟“

راؤ سکندر اپنی بات پراڑا رہا ”مجھے بلانا ہوگا ہم تمہارے میں طلب کریں گے ہم انہیں گرفتار تو نہیں کر رہے ہیں۔ ان سے صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلیں۔“

”کیوں چلوں میں تمہارے ساتھ آخر؟“ میں نے جگو کے

”کما“ میرے ساتھ بیوی ہے میری۔ اسے بھی تھانے لے جاؤں؟“

اچانک راؤ سکندر کے ایک ساتھی نے قریب آ کے اس کے کان میں کچھ کہا۔ راؤ سکندر کا جارجانہ پھر بحال ہو گیا ”اچھا! یہ بات ہے؟“ اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور پھر فرمان علی سے مخاطب ہو گیا ”دیکھ لیں جناب! یہ شخص کتنا جھوٹا ہے۔ جسے یہ اپنی بیوی بتا رہا ہے، وہ ایک نرس ہے اسی کمال! اسپتال میں۔ ڈاکٹر کمال اس کا دوست ہے۔ یہ اسپتال کی نرس کو عیاشی کے لیے لایا ہے اور بکواس کر رہا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔“

میں نے میز پر ٹکٹا مارا ”بکواس تم کر رہے ہو۔“
راؤ سکندر کے ساتھی نے کہا ”جناب! میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نرس ہے۔ جب ایک بار میں بیمار ہو کے کمال! اسپتال میں داخل ہوا تھا تو اس نے میری بیمار داری کی تھی۔ مجھے اس نرس کا نام یاد نہیں مگر یہ وہی ہے۔“
میں نے کہا ”یہ کمال! اسپتال کے مالکوں میں شامل ہے جسے تم نرس سمجھ رہے ہو۔ یہ کرمل خان کی بیٹی ہے اور نرس کیا کسی کی بیوی نہیں ہو سکتی؟“

فرمان علی چکر میں پڑ گیا ”میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ آپ لوگ باہر طے کر لیں تو اچھا ہے۔ راؤ سکندر! تم ہوٹل کے اندر کچھ نہیں کرو گے۔“

میں نے کہا ”ہم یہاں کھانا کھانے آئے ہیں اور کھانا کھا کے ہی جائیں گے۔“

راؤ سکندر اپنی کامیابی پر مسکرایا ”ٹھیک ہے۔ میں باہر ملوں گا تم سے اور دیکھوں گا تمہیں بچانے کون آتا ہے؟“

میں نے کہا ”تمہاری ساری خوش فہمی دور ہو جائے گی انسپکٹر۔ تم جانتے نہیں کہ نیکم تمہارے کن اعلیٰ افسران سے بات کر سکتی ہے اور ڈاکٹر کمال کی پہنچ کہاں تک ہے۔ فرمان علی صاحب! میں دو فون کروں گا۔ ایک نیکم کو دوسرا ڈاکٹر کمال کو۔“

”ضرور کریں“ فرمان علی مجھ سے متاثر ہو چکا تھا۔

میں نے نیکم کو فون پر اس ”غلط فہمی“ کے بارے میں بتایا اور اسے ریٹورنٹ کا فون نمبر دے دیا۔ اس نے دوسری طرف سے مجھے پہلے ڈانکا کے میں اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے خود کو مشکل میں ڈال رہا ہوں اور پھر مجھے تسلی دی ”فکرمات کرو“ میں دیکھتی ہوں کون ملتا ہے اس وقت۔“

میں نے کہا ”اس انسپکٹر کا تعلق سی آئی اے سے ہے۔“

”سی آئی اے کے ایک ایس پی سے میری اچھی شناسائی ہے۔ بس دعا کرو اس سے رابطہ ہو جائے۔“

میں نے کہا ”اتنی سی بات کے لیے ایس پی کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم خود آ جاؤ تو یہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی۔ اس ریٹورنٹ کے مالک فرمان علی خود بھی ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہیں۔“

”ڈرا فون دو اسے“ نیکم نے کہا۔
نیکم نے دو منٹ فرمان علی سے بات کی ہوگی کہ وہ ریٹائرڈ غلطی ہو گیا۔ یہ اس کے لیے بڑے اشتیاق اور اعزاز کی بات تھی کہ اتنی بڑی قلم اشار خود چل کے اس کے ریٹورنٹ میں آ رہی تھی۔ وہ بڑی نیاز مندی سے اسے یقین دلاتا رہا کہ اس کے آنے تک نامہ عظیم کو کچھ نہیں ہوگا۔

اس نے فون رکھ کے کہا ”جی انسپکٹر صاحب! نیکم خود آ رہی ہے گو ای دینے۔ اب تو شک کی بات نہیں رہی۔“
راؤ سکندر نے جس بات کو اپنی افسرانہ انا کا مسئلہ بتایا تھا، وہ ایک بے بنیاد غلط فہمی ثابت ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ خوش نہیں تھا مگر اب اس کے لیے بھی حالات سے سمجھوٹا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ”فرمان صاحب! شک کرنا پولیس کا کام ہے۔“

”کیا میں دوسرے گواہ ڈاکٹر کمال کو بھی طلب کروں انسپکٹر؟“ میں نے کہا۔

سب انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا ”وہ آپ کی مرضی۔ ویسے ضرورت کوئی نہیں۔“

میں نے فرمان علی سے کہا ”نیکم جہاں جاتی ہے، لوگ پہچان لیں تو جمع لگ جاتا ہے۔ کوشش کریں کہ اسے پریشانی نہ ہو۔“

اس نے مجھے یقین دلایا ”ریٹورنٹ کے اندر ان کا پورا خیال رکھا جائے گا۔“

سب انسپکٹر راؤ سکندر کو اب وہاں مزید قیام کرنا اپنی منجی محسوس ہو رہا تھا مگر نیکم کے شوق دیدار نے اسے بھی روکے رکھا۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ قریب ہی ایک میز پر موجود رہا لیکن نیکم خود نہیں آئی۔ اس کے بجائے کسی اعلیٰ افسر کا فون آ گیا اور ریٹورنٹ کے مالک نے راؤ سکندر کو آفس میں بلا کے ریپورر تھما دیا۔

وہ جب فون پر بات کر کے نکلا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس نے بڑی خفت کے ساتھ میری ٹیبل پر آ کے مجھ سے رسمی معذرت کی اور اپنے تین ساتھیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ غلط فہمی کسی کو بھی ہو سکتی

ہے اور جب حقیقت سامنے آجائے تو بات ختم ہو جاتی چاہے مگر نہ جانے کیوں اکثر پچھلے درجے کے پولیس افسران اسے قراغ دل نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں عار محسوس نہ کریں۔

ہمارا خوش گو اور موڈ بھی راؤ سکندر کی پریشان کن دخل اندازی سے خراب ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہتے لیکن اس کے بعد چندا بھی کچھ خاموش ہو گئی تھی۔

میں نے کہا ”ایک معمولی واقعہ پر اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ بولی ”ان میں سے ایک نے مجھے بھی پہچان لیا تھا ناصر!“

میں نے کہا ”پھر کیا ہوا۔ تمہیں تو اسپتال آنے والے ہزاروں مریض پہچانتے ہوں گے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟“

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے لیے شاہ عالم سے جان چھڑانا کبھی آسان نہیں ہوگا۔ یہ دہری شناخت تمہارے لیے مسائل پیدا کرتی رہے گی۔“

میں نے کہا ”کچھ عرصے ایسا ضرور ہو گا مگر بالآخر شاہ عالم کی شناخت تم ہو جائے گی۔ ماضی کا بھولا ہوا افسانہ رہ جائے گی۔ اور اس وقت تک ناصر عظیم کی شخصیت دوبارہ بھرپور انداز میں سامنے آجائے گی۔“

ہم واپسی میں بھی پیدل چلتے رہے۔ میں نے چندا کی تحسین کے خیال سے نیکی لینے کی تجویز پیش کی تھی مگر چندا نے کہا ”مجھے گھلی رات کی تازگی میں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے تمہارا یہ ساتھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

اچانک چندا میرے کچھ قریب آگئی ”ناصر! کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔“

میں نے رک کے دیکھا۔ میرے پیچھے پیدل آنے والے بہت لوگ تھے مگر ان میں سے کسی پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا ”غالبا وہ ہم سے تمہارا۔ کوئی ہمارا پیچھا کیوں کرے گا؟“

”وہ پولیس والا مجھے برا کینہ پرور لگتا تھا شکل سے۔“
میں نے کہا ”اگر وہ اپنی مزید بے عزتی کرانا چاہتا ہے تو ضرور آئے۔“

چند اہر چند قدم کے بعد مزے کے پیچھے دیکھتی تھی۔ وہ ایک انجانے سے اضطراب میں مبتلا تھی۔ ”کومت“ چلتے رہو۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔“
میں نے اسے غور سے دیکھا ”کون ہے وہ؟“
”ایک شخص ہمارے پیچھے چل رہا ہے۔ تقریباً سو قدم کے فاصلے سے۔“

میں نے کہا ”پیچھے تو بہت لوگ ہیں۔“
”اس نے جنز کی پتلون پہن رکھی ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کی اور بڑے بڑے خاتون والی چمک کی شرٹ ہے۔“ چندا نے بتایا۔

میں نے کہا ”تمہیں کیسے شک ہوا کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ ہم سے سو قدم پیچھے تو اس کے علاوہ بھی کسی لوگ ہوں گے؟“

”ہم بہت آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ کئی دوسرے لوگ تیز چلتے ہوئے ہمیں کراس کر گئے ہیں مگر وہ ٹھٹکا ہوا آ رہا ہے۔ اور دو تین بار میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ چور سا بن گیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔“

میں نے کہا ”اوکے ہم چیک کر لیتے ہیں۔ آگے ایک آکس کریم بار لے رہے ہیں وہاں رک جائیں گے۔“

چمن آکس کریم کے اندر بیٹھنے کی جگہ محدود تھی۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کے آکس کریم کھا رہے تھے یا فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ بیڈن روڈ پر ون وے ٹریفک تھی مگر بہت سے لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی اندر لے آئے تھے۔ اس نے ٹریفک جام ہو رہا تھا اور آگے کیڑی ہوم ریٹورنٹ تک گاڑیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے چندا کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود آکس کریم لینے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ چیک کی ٹی شرٹ والا آدمی سامنے ڈرائی فروٹس کی دکان پر کھڑا ہے۔

اب چندا کی بات مجھے ٹھیک ہی نظر آ رہی تھی۔ چیک شرٹ والا ہمارے پیچھے یہاں تک آ گیا تھا۔ شاید ہم سے کچھ دور رہنے کے لیے اس نے آکس کریم نہیں کھائی اور تقریباً پیچاس قدم کے فاصلے پر واقع ڈرائی فروٹس کے اسٹور پر رک گیا جہاں سے وہ بہ آسانی ہم پر نظر رکھ سکتا تھا۔

تاہم ابھی میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اتفاق نہیں تھا۔ ایک شاہراے عام پر کسی کا کچھ دور ساتھ چلنا اور بار بار نظر اتنا لازمی طور پر یہ ثابت نہیں کرتا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ میں اس کے دل میں شک بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اسے گھورنے سے گریز کیا۔ ہم چمن آکس کریم شاپ پر اس لیے کھڑے تھے کہ ہمیں شیشے کے کپ خالی کرنا تھے مگر وہ ڈرائی فروٹ شاپ پر بلاوجہ

کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مختلف قسم کے بادام چیک کیے پھر شاید بھاؤ کاؤ کرتا رہا اور جب تھوڑے بادام لے لیے تو ممکن ہے اور دوسرے میوے دیکھنے لگا۔ وہ ہماری طرف سے بالکل نا متعلق ظاہر کرتا تھا مگر اس کے اندر کچھ اور چھل کھاتے تھے۔ وہ بھی جانتے ہوئے ہماری طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا اور پھر فراغت سے بادام پستے پھیل پھیل کے کھاتا رہا۔

وہ چھبیس ستا میں برس کا مناسب نقوش والا نوجوان تھا جس نے بھارتی اداکار ایش کپور اسٹائل کے بال بنا رکھے تھے اور غیر ارادی طور پر وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے انہیں پیچھے کرتا رہتا تھا۔ اپنے درمیانے قد اور اوسط وزن کے ساتھ وہ عام لوگوں میں بالکل غیر نمایاں تھا۔

محض اپنے شک کی تصدیق کے لیے میں نے پلٹ کے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی تک اس جیسے کسی نوجوان کے ٹہلنے ہوئے چمن آکس کریم تک آنے سے کچھ ثابت نہیں ہوا تھا۔ خود ہم ان بے شمار جوڑوں میں شامل تھے جو تقریباً یہاں تک پیدل آ جاتے تھے۔ تاہم واپسی میں بھی وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ چلتا تو پھر سوچا جاسکتا تھا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے۔

”وہ پھر پیچھے آ رہا ہے۔ چندا نے چند قدم چل کے مجھے مطلع کیا۔“

میں نے کہا ”اب ہم سیدھے راستے پر نہیں جائیں گے۔ ذرا آڑے ہیں کہ وہ کہاں تک ہمارا ساتھ دیتا ہے۔“

”دیکھو ناصر۔ ایک مشکل سے توجان بچ گئی۔ اب کسی اور مصیبت میں مت مبتلا۔“

میں نے ہنس کے کہا ”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہاں بھی قصور میرا تھا؟“

”میرا مطلب تھا۔ جب تک وہ خود کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے اس سے الجھنا مت۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتا ہے؟“

میں نے کہا ”یہ ہم اس سے پوچھ سکتے ہیں۔“

کسی وجہ کے بغیر میں مال روڈ کی طرف گیا اور درمیان کی ایک سڑک سے گھوم کے دوبارہ بیڈن روڈ پر آ گیا۔ چندا کے چہرے سے اب کچھ ٹھنکن کا احساس ہونے لگا تھا چنانچہ میں اس کھیل کو زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ چیک شرٹ والا نوجوان بھی کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم یہ جیکریں چلا رہے ہیں۔

ایک موڑ پر میں پلٹا اور تیزی سے آگے بڑھا تو چیک شرٹ والا نوجوان اچانک میرے سامنے آ گیا۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔

”نوجوان! تم بہت دیر سے ہمارا پیچھا کر رہے ہو۔“

وہ گھبرا گیا ”میں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ”آخر تم کیا چاہتے ہو؟“

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے دائیں بائیں دیکھا ”وہ دراصل۔۔۔ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔“

میں نے ابھی سے کہا ”بات کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آؤ مجھے گھٹنے سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہو۔“

اس نے اب خود کو سنبھال لیا تھا ”آئی ایم سوری۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔ دراصل میں آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ اپنی وائف کے ساتھ تھے۔“

میں نے کہا ”یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میرے ساتھ میری وائف ہیں؟“

وہ مزید نفوس ہوا ”آئی ایم سوری۔ میں غلط سمجھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج آپ کا گھر دیکھ لوں گا تو پھر کسی روز حاضر ہو جاؤں گا۔“

”تمہیں ایسا کیا کام پڑ گیا تھا مجھ سے؟“

اس نے پھر دائیں بائیں دیکھا ”بات یہ ہے شاہ عالم صاحب!“

میں نے کہا ”ایک منٹ۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔“

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا ”جی۔۔۔!“

میں نے کہا ”ہاں۔ اگر تم مجھے شاہ عالم سمجھ کے کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تمہیں صورت کی مشابہت سے دھوکا ہوا ہے۔ میرا نام ناصر عظیم ہے شاہ عالم نہیں۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کو کئی بار ملک رب نواز کے ساتھ دیکھا ہے۔“

میں نے کہا ”اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے لیکن تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا شاہ عالم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔“

اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا ”آپ مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔“

اس کے لیے میں کچھ ایسی بے بسی اور مظلومیت تھی کہ میں شش روٹھ میں پڑ گیا ”آخر بات کیا ہے؟“

میرے حوصلہ افزا رویے نے اس کی آنکھوں میں پھر چمک پیدا کر دی ”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے شاہ صاحب!“

میں نے کہا ”پھر وہی شاہ صاحب! میں بتا چکا ہوں تمہیں کہ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔ میں نے سخت لہجے میں کہا ”بلاوجہ میرا پیچھا مت کرو۔ فی الحال میں تمہاری اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے چند نوٹ نکال کے اس کی طرف بڑھاؤ۔“

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ”میں آپ سے خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔“

”پھر کیا چاہیے؟“ میں نے نوٹ واپس رکھ لیے ”اگر بے روزگاری کا مسئلہ ہے تو میں تمہاری کیا مدد کروں۔ میں کوئی صنعت کار یا اعلیٰ سرکاری افسر بھی نہیں ہوں کہ میری سفارش سے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔“

وہ شدید اضطرابی کیفیت میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہوں۔

میرے انکار کے باوجود اس کے یقین میں کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ میں شاہ عالم ہوں۔ یہ میرے لیے سخت تشویش کی بات تھی۔ ایک گھنٹے میں یہ دو سراموں کا کہنا طبع بد لے کے باوجود شاہ عالم کو بچان لیا گیا تھا۔ میرے انکار کے باوجود انسپکٹر راؤ سکندر کا اصرار باقی رہا تھا اور اس نوجوان کا رد عمل بھی مختلف نہ تھا۔

میں نے کہا ”اب تم میرے پیچھے آئے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔“ اور چندا کے ساتھ واپس چل پڑا۔ وہ اپنی صورت پر زمانے بھر کا درد و کرب لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔ شاید آہستہ آہستہ اسے اپنے یقین کے غلط ہونے کا اعتبار آنے لگا تھا۔

اب میں نے بہتر سمجھا کہ واپسی کے لیے کوئی رکشایا عیسکی لے لوں۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اور میرا تقریبی موڈ بھی غارت ہو چکا تھا۔

خود چندا ذہنی طور پر ڈسٹرب تھی۔ ”پتا نہیں وہ کیا چاہتا تھا؟“

میں نے کہا ”وہ کچھ بھی چاہے۔ میں اب شاہ عالم نہیں رہا تو اس کی بات بھی کیوں سنوں؟“

”تمہارا انکار کوئی تسلیم نہیں کرتا تم نے دیکھ لیا۔“

”ہاں یہ بات بڑی خطرناک ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ طبع بد لے سے صورت نہیں بدلتی۔ تمہارے لیے آگے چل کے بھی مسائل پیدا ہوں گے۔ تم کسی کس کو انکار کرو گے؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اور میں کیا کروں۔ میں نے چہرے سے داڑھی صاف کرا دی۔ بال کٹوا کے ہیزا سٹائل بدل لیا۔“

”مگر اب تمہارا چہرہ پر انے شاہ عالم کا چہرہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا ہی تھا۔ داڑھی مونچھوں اور بڑے بڑے بالوں کے ساتھ تم پھر بھی مختلف نظر آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ شاہ عالم کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ پر جو تصویر ہوگی وہ ایسے ہی چہرے کے ساتھ ہوگی جیسا اب تمہارا ہے۔“ چندا بولی۔

میں نے تسلیم کیا کہ چندا غلط نہیں کہتی ”تمہارا خیال ٹھیک ہے مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس مصیبت سے نجات کی یہی ایک صورت ہے کہ میں انکار کرتا رہوں اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے والوں کو بتاتا رہوں کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔“

چندا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا ”مجھے ذرہ بے ذرہ انسپکٹر بعد میں تمہارے لیے پریشانی پیدا نہ کرے۔“

میں نے کہا ”ناصر عظیم کی شناخت بہت مضبوط خالوں پر استوار ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے۔“

”میری کیا فکر۔“

”راؤ سکندر کے ایک ساتھی نے تمہیں صحیح شناخت کیا تھا۔ وہ مزید تفتیش کے چکر میں پڑ جائے تو اسپتال آسکتا ہے۔“

میں نے کہا ”میں کمال سے کون گا کہ وہ راؤ سکندر کا کوئی بد دوست کرے جس سے وہ رک جائے۔“

”اگر اسے دلاور شاہ کی حمایت حاصل ہوگی تو شاید اس کو تفتیش سے روکنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ کیونکہ دلاور شاہ سالہاں پیر سجان کا اور پیر صاحب کی سیاسی حلقوں میں بہت اونپر تک رسائی ہے۔“

میں نے کہا ”میری مانو تو کل ہی تم یہ جگہ چھوڑ دو۔“

وہ ہنسنے لگی ”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”اس میں مشکل کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر کمال کبھی نہیں مانیں گے۔“

میں نے کہا ”تم اس اسپتال کے بیمار ماحول سے نکل جاؤ۔ یہ اسی کا آئیڈیا تھا۔ میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا ساتھ دے کر تم اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال بھی کر سکتی ہو اور زیادہ خوش رہ سکتی ہو۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری ضرورت بھی ہے۔ یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔“

وہ ہنس پڑی ”تمہاری عرضی موصول ہو گئی۔ اب ہم غور کریں گے۔“

میں نے کہا ”جتنا غور و خوض ہو گیا وہ کافی ہے۔ زیادہ مت سوچو۔ اتنا عرصہ تم نے کمال کے لیے کام کیا۔ اب اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کام کا نفسیاتی دباؤ کتنا زیادہ ہے۔ میں تمہیں مزید اس ماحول میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہیں کام ہی کرنا ہے تو میرے ساتھ رہ کر کام کرو جس میں تمہارے لیے دلچسپی بھی ہو اور حصول مقصد کا احساس بھی۔ ابھی جو کام تم کر رہی ہو وہ ڈاکٹر کمال کا مقصد حیات ہے۔ تم صرف اس کی مدد کر رہی ہو کیونکہ اس سے بہتر کوئی مصروفیت دستیاب نہیں۔“

”میں تمہیں انکار نہیں کر رہی ہوں۔“

”پھر یہ پس و پیش کس لیے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے آفس تیار ہیں۔ میرے پاس ایک پرائیویٹ آفس بھی ہے جہاں تم رہ سکتی ہو۔“

”اور تم خود کہاں رہو گے؟“

”میں نیلم کے ساتھ ہوں اور وہ مجھے ہرگز اجازت نہیں دے گی کہ میں اور کہیں جا کر رہوں۔ اب رہیں بھی وہیں ہے اور اگلے ایک مہینے میں صورت حالات بہت تبدیل ہو جائے گی۔ نیلم نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ نئی فلمیں سائن نہیں کر رہی ہے۔ اس کے پاس جو فلمیں ہیں وہ مکمل ہونے کے قریب ہیں۔ پھر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس وقت تک ان دونوں کی شادی بھی ہو جائے گی۔“

”یہ شادی بھی بہت عجیب ہوگی۔ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔“

میں نے کہا ”شادی وہ کر رہے ہیں تو آپ اتنا کیوں سوچ رہی ہیں خاتون؟“

وہ ہنسی ”خیال تو آتا ہے تاکہ قدرت نے آسمان پر یہ کیسا عجیب جوڑا بنادیا۔“

”میرا خیال ہے جوڑے سب عجیب لگتے ہیں مگر سب سے عجیب ہوتا ہے رفاقت کو جو بھانے کا وہ جذبہ جس کے سہارے لوگ ایک عمر نبھی خوشی گزار لیتے ہیں۔ باہمی افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کرنے کی خواہش دو مختلف نظر آنے والے انسانوں کی زندگی کو ہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے ابھی سب کو دیکھنے میں یہ لگتا ہے کہ ہر لحاظ سے ناقابل فہم نظر آنے والی یہ شادی کیسے کامیاب ہوگی۔ مگر میں بتاؤں ”اسے کامیاب بنانے کی نیلم۔“

چند اٹنے مجھ سے اتفاق کیا ”رہیں تو ایسے ہی ہے۔“

”ایسے ہی سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”ہو گا۔ غیر فتنے دار پہل میں بدلنے والا۔“

میں نے کہا ”اسے میں تب سے جانتا ہوں جب کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور دوست تھے اور وہ ایک نیم خانے کا نفرت انگیز مکروہ اور سفاک ماحول تھا جس میں ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے آج اس بات کو۔ تقریباً پچیس سال۔ زندگی کی ایک چوتھائی صدی۔ وہ ہو گا ہے اور اس کا موڈ بھی بدلتا رہتا ہے۔ وہ شوقین مزاج ہے اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ایک فقیر منش آدمی ہے۔ اس کے پاس لاکھوں ہوں تب بھی اس کی ضروریات انتہائی محدود رہتی ہیں۔ کھانے پینے کی اس نے کبھی فکر نہیں کی۔ جو مل گیا کھالیا جو مل گیا پین لیا۔ لیکن یہ جو تم کہہ رہی ہو تاکہ وہ غیر فتنے دار ہے، یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ نیلم اس کی تنہا اور بے مصروف زندگی میں رونما ہونے والا سب سے حسین انقلاب ہے۔ اس کی تقدیر کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اب تم دیکھنا خود رہیں کی شخصیت میں کیسا انقلاب آ گیا ہے۔ وہ خود کو بدل رہا ہے۔ نیلم کی مرضی اور خواہش کے مطابق۔ اس نے اپنی ذات کی نفی کر دی ہے اور خود کو نیلم کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کا عہد کر لیا ہے۔ جب ایک آدمی اس حد تک اپنی زندگی کو دوسرے کے حوالے کر دے۔ جیسے گندمی ہوئی فنی خود کو کھمار کے ہاتھوں کے سپرد کر دیتی ہے کہ اب تیری مرضی جس شکل میں چاہے مجھے ڈھال۔ تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔“

”افوہ کیا زبردست انداز و کالت ہے۔“ چندا ہنسی۔

میں نے کہا ”دراصل اس شادی سے میں بہت خوش ہوں۔ یہ دو بے شمار زندگیوں کا ایک دوسرے کا سہارا بننے کا عہد ہے جس کی بنیاد قطعی غیر مادی ضروریات پر ہے۔ اس احساس کی شدت پر ہے کہ ان کی اپنی ادھوری اور بے مقصد زندگی کا خلا صرف اسی طرح پُر ہو سکتا ہے جب وہ ایک دوسرے کی تکمیل کو اپنا مقصد بنالیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات کو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین اور آسمان جب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں تو کائنات کا وجود سمجھ میں آتا ہے۔ تو رہیں اور نیلم کے ایک ہو جانے کے بعد ان کو ایک مقصد حیات مل جاتا اور ان کی مشترکہ جدوجہد کا ایک سمت میں ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے۔“

ہم باتیں کرتے کرتے اتنا آگے آ گئے تھے کہ اب کمال اسپتال تک پیدل جانا مشکل نہیں رہا تھا چنانچہ جب بالآخر

ایک نیکی ہمارے قریب آ کے سلو ہوئی تو میں نے اسے ہاتھ پاؤں کے رخصت کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک ناخوشگوار واقعے کے اثرات نے چندا کے خوشگوار موڈ کو متاثر نہیں کیا ہے اور ایک طویل فاصلہ پیدل طے کرنے کے باوجود وہ ٹھنکن کا اظہار کرنے سے گریزاں بھی ہے۔ یہ ایک مثبت تبدیلی تھی اور میں مطمئن تھا کہ صرف تین گھنٹے کی رفاقت میں چندا کی شخصیت کے وہ بند در پیچ کھل گئے ہیں جن سے احساس حس کی روشنی اور امید کی تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ میں کوکشی جاری رکھتا تو اس کی باہمی احساس دل شکستگی اور تنہائی کو دور کر کے اس کی زندگی کا پھر انہی آرزوؤں کے شوخ رنگ اور جذبات کی وہی آب و تاب دے سکتا تھا جو اس کی فطرت کی تشکیل کے بنیادی عناصر تھے مگر جی پر گردش حالات اور حادثات زمانہ نے افسردگی اور روپائی کی گرد زوال دی تھی۔

ہم رات کے ایک بجے واپس پہنچے تو کمال اور قمریہ پور کوئی قلم دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے گگ تھے اور سامنے مونگ پھلی کے چھلکے چترا تو فوراً ہی معذرت کر کے اپنے کوارٹر میں سونے چلی گئی۔

کمال نے مجھے دعوت دی ”آ مونگ پھلی کھا مگر ہم ہے ابھی۔“

قمریہ ”میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔“

میں نے کہا ”نیلم نے فون تو نہیں کیا تھا؟“

”اس کے دو فون آچکے ہیں۔“ کمال نے مطلع کیا ”تیسرا فون رہیں کا تھا۔ کہہ رہا تھا ان دونوں کا فون اب کسی تھانے سے آئے گا۔ پولیس پکڑ چکی ہوگی، آوارہ گردی کے الزام میں۔ اور پھر وہی ہو گا جو آج اخبار میں ہے۔“

میں نے کہا ”آج اخبار میں ایسی کون سی خبر تھی۔“

”پولیس نے کل رات ایک نوجوان جوڑے کو آدمی رات کے بعد کہیں گھومتے پھرتے پکڑا۔ فی الحال میں یہی کہوں گا۔ گھومتے پھرتے کیونکہ پولیس نے بھی ایسے ہی شرفنازہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آوارہ گردی یا غرضی جیسے قاتلی اعتراضات نہیں کئے۔ پولیس والوں نے حسب روایت ان سے نکاح نامہ طلب کیا۔ غالباً جو کچھ ان کی جیب میں تھا وہ پہلے ہی خرچ کر چکے ہوں گے ورنہ مقررہ فیس دیتے اور سب بھی خوشی اپنی اپنی راہ لیتے۔ انہیں تھانے جانا پڑا۔ وہاں تھانہ انچارج بھی غالباً چھانے بیٹھے تھے اور کچھ خوشگوار موڈ میں تھے۔ اختیارات کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنا تو خیر کوئی بات ہی نہیں مگر انہوں نے ایک پریکٹیکل جوک کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کون ہو؟ میاں بیوی، بھائی

بھن گزن یا عاشق معشوق؟ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ وہی ہیں جو تھانے دار صاحب نے آخر میں فرمایا۔ تھانے دار صاحب مجسم ہوئے اور بولے کہ ہمیں تمہارا یہ جہاد کا جذبہ یعنی ظالم حکمران کے سامنے کلہ حق کھانا پسند آیا مگر تم لوگ صرف عشق پر اکتفا کیوں کیے پھر رہے ہو؟ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ انہوں نے عرض کی کہ جہاں پناہ یہ ظالم سانج درمیان میں ٹانگ اڑا رہا ہے ورنہ ہم کب کا ایسا کر چکے ہوتے اور اپنی زندگی عین شرع کی پابندی کرتے ہوئے گزارتے۔ تھانے دار صاحب نے گالی دے کے کہا ”ایسی کی جیسی اس ظالم سانج کی اس کی دیدہ دلیری اتنی بڑھ گئی ہے کہ فلموں سے نکل کے اب حقیقی زندگی میں بھی دخل اندازی کرنے لگا ہے۔ ہم یہ قلم نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری شادی آج ہی ہوگی بلکہ آجی۔“ اب دولہا دلہن بڑے سٹیٹے کیونکہ ایسا تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ دونوں نے عرض کی کہ بادشاہ سلامت ہمارے والدین بھی تو ہیں۔ وہ بہت غلی غبارہ کریں گے۔ تھانے دار نے کہا کہ جب شادی ہو جائے گی تو وہ کتنی دیر غل غبارہ کریں گے اور لا حاصل غل غبارے کی تمہیں پروا بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہم نے دو پتھرے ہوئے دلوں کو ملائے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم ایسا ضرور کریں گے بصورت دیگر کیا میں تم پر حدود آرزوئیں کی فرد جرم عائد کر کے ایف آئی آر میں لکھ دوں گا کہ تم نشے میں دھت سرعام فاشی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ قلم کی مار صرف صحافی کی نہیں ہوتی۔ ہم چاہیں تو اس سے بڑھ کر بھی لکھ سکتے ہیں کہ تم دونوں قابل اعتراض حالت میں بائے گئے۔ ثبوت گواہ سب ہماری جیب میں رہتے ہیں۔ صبح شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے اور تمہارے خاندان کی وہ تو بالکل ہی کٹ جائے گی، ٹانگ۔ اب بولو، تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ وہ جو نادر شاہ نے دلی کے ساتھ کیا تھا یا وہ جو جمہوریت اور انسانی حقوق کا چیپٹن امریکی زمانہ عراق کے ساتھ کر رہا ہے؟ مرے کیا نہ کرتے کو تو ال کے حکم پر عقد منسوب کے لیے تیار ہو گئے کو تو ال نے سرکاری اہلکاروں کو حکم دیا کہ آج تھانے میں رسم جھمزدل کے بجائے نکاح کی تقریب ہوگی۔ اس کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ سرکاری اہلکار تحصیل حاکم کے لیے دوڑے۔ نصف شب کو ایک نکاح خواں کے گھر چھاپا مارا اور اسے کشاکش کشاکش اٹھالائے۔ دو گواہان کہ پیش در تھے اور ہر کیس میں پولیس کی طرف سے پیش ہونے کو بوجہ افتخار جانتے تھے۔ جائے واردات پر حاضر کیے گئے اور تھانے دار صاحب

نے کمال فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ملزمان کو رشتہ مناکحت میں باندھ دیا۔ میاں بیوی ہو جانے والوں کے متعلقہ اباؤں کو صبح دم بگا کے تھانے طلب کیا گیا اور تھانے دار کے ساتھ تھانے کے سارے عملے نے اسیں شادی خانہ آبادی پر دلی مبارک باد دی۔ تھانے دار صاحب اس وقت تک بیٹھے میں تھے اور اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور ساس کے منصب اعلیٰ پر فائز ہو جانے والی ایک عورت سے کہا کہ لے بھی چاندی بنو اب تیرے حوالے اس نے واویلا کیا کہ حضور یہ کیا میں تو اپنی بہن کی چندے آفتاب چندے مانتا ہوں دختر نیک اختر کو لانا چاہتی تھی۔ یہ کلہوئی بیچ میں کہاں سے آگئی۔ کو تو ال نے ڈنڈا بجا کے کہا کہ اب تو اس پر صدمے واری جا رو نہ ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں خوش کرنے کے قصہ مختصر فریقین اس وقت تو سینے پر صبر کی سل رکھ کے تھانے سے گئے مگر جاتے ہی بادشاہ وقت سے کو تو ال کی شکایت کوی۔ اس وقت تک کو تو ال کا نشہ اتر چکا تھا۔ اسے اپنی زبردستی کا اندازہ ہوا مگر ایک تھانے دار کا سو فیاد ہی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ صاف کر گیا کہ اس نے یہ نکاح بدروز بازو کرادیا تھا۔ اس نے کہا کہ میاں بیوی خود مع قاضی برضا و رغبت تھانے میں حاضر ہوئے تھے کہ اپنے سایہ عاطفت میں ہمارا نکاح پڑھوایا جائے کیونکہ باہر اس شرعی فریقے کی ادائیگی میں ہماری جان جانے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ دونوں عاقل و بالغ تھے اور اس کا و خیر میں قانونی قیامت بھی کوئی نہ تھی اس لیے ہم نے تقریب عروسی حدود تھانہ میں منعقد کرنے کی اجازت دی تو کیا غلط کیا؟ یہی خوابوں نے ظالم سماج کے ان ٹیکے داموں کو سمجھایا کہ اس بلا کو خان جیسے تھانے دار سے پرگانہ لیں ورنہ اس کا کیا ہے زیادہ سے زیادہ معطل ہو جائے گا۔ کب بحال ہوا؟ یہ ہمیں علم بھی نہ ہوگا۔ اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ اور اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ کیا معلوم اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو۔ صبر شکر سے کام نہیں لوگے تو بچتاؤ گے تھانے دار تمہارے سارے خاندان کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو نادر شاہ نے دلی کے ساتھ کیا تھا بانی زمانہ۔

قمر کا ہنسنے ہنسنے برا حال ہو گیا مگر کمال بڑے موڈ میں تھا۔ اس نے یہ واقعہ ایسے سنایا کہ مجھے بھی ہنسی آئی "یار وہ تھانہ کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھانہ دار نہ چلا جاتا۔"

وہ بولا "مجھے تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے الو کے پیچھے ہمیں جتا ہم صبح ہونے سے پہلے تیرا بندوبست نہ کویں

تو کہنا۔"

میں نے کہا "آج تو ہم ایک بار نہیں دو بار پکڑے گئے۔"

"دوسری بار کس نے پکڑا؟" وہ کچھ حیران ہوا۔

"راہ چلتے ایک نوجوان گلے پر گیا کہ تم شاہ عالم ہو۔ میرا ایک کام کرو۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹالا۔ قائل وہ پھر بھی نہیں ہوا" میں نے اسے بتایا۔

ساری بات سن کے کمال بھی فکر مند ہو گیا "یہ تو آثار اچھے نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے بھی اصل پریشانی یہی ہے۔ اگر قدم قدم پر مجھے ثابت کرنا پڑا کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ پہلے یہ تھا کہ میں داڑھی اور مونچھیں لگا کے چہرہ بدل لیتا تھا اب یہ بھی نہیں کر سکتا۔ میں روپوشی بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ دنیا کے کام بہر حال نشتا نہیں۔"

"یہ مسئلہ تو کھڑا ہوتا رہے گا اور مانا کہ ناصر عظیم کے گواہ بہت مستحضر ہیں اور ہر وقت ہر جگہ حاضر ہو سکتے ہیں مگر دال میں کالا تو ہے۔ کوئی پیچھے بڑ جائے تو اسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دیکھنا مشکل نہیں ہوگا" کمال بولا۔

میں نے کہا "کیوں۔ وہ کہاں سے لائے گا شاہ عالم کو؟"

پھر نیلی فون کی ٹھنکی نے مداخلت کی اور کمال نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہاں خیر سے دونوں بدھو گھر کو آئے" اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

دوسری طرف سے رئیس خفا ہونے لگا "ابے یہ کیا معصیت ہے آخر تو شرافت سے نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "یار کوئی مجھے رہنے دے تب نا۔ اور اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر میری صورت اللہ میاں نے شاہ عالم جیسی بنا دی۔"

"جب تک یہ شاہ عالم کا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا تو آرام سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔ مجھے دنیا کو فیس کرنا بھی چاہیے۔ منہ چھپانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

دوسری طرف سے ریسیور نیلم نے لے لیا "مجھے کمال نے بتایا ہے کہ تم دونوں پیدل گئے تھے؟"

"ہاں ذرا گھومتے پھرتے چلے گئے" باتیں کرتے ہوئے۔

وہ نامحانہ انداز میں بولی "تم اچھے خاصے سمجھ دار ہو۔"

پھر یہ بچوں جیسی حرکت کس لیے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کہیں مت آؤ جاؤ مگر ذرا احتیاط سے کام لو۔ خود کو کم سے کم ایک سپوز کرو میری گاڑی لے لو۔"

"گاڑی میں ایک دو روز میں خرید لوں گا۔"

"بابا مجھے معلوم ہے تم ایک نہیں دس گاڑیاں لے سکتے ہو مگر پھر بھی میری گاڑی استعمال کرو۔ بہت سے لوگ اسے بیچتے ہیں۔ کسی کا دھیان تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ اس کے پیٹھے بھی سیاہ ہیں۔ تم نظر نہیں آؤ گے پھر ہر جگہ تمہارا جانا ضروری نہیں۔ اور جانا ضروری ہو تو گھر سے نکلو اور سیدھے وہاں جاؤ۔ ادھر اوپر حرمت پھو بلاؤ۔"

میں نے کہا "لیس سرا"

"ابھی کچھ دن تم آرام سے بھی بیٹھ سکتے ہو۔ ایسے کون سے کام ادھر رہے پڑے ہیں آخر؟"

میں نے پھر کہا "لیس سرا"

"میں جانتی ہوں کہ بے کار بیٹھنا تمہارے لیے بہت مشکل ہے اور جنہیں بڑی جلدی ہے۔ ناصر عظیم کے منصوبے شروع کرنے کی۔"

میں نے کہا "لیس سرا"

وہ بولتی رہی "لیکن ابھی تم کمال اسپتال کے اندر ہی رہ کے بہت سے کام کر سکتے ہو۔ وہاں لیبارٹری بن رہی ہے اور جو ساز و سامان تم نے عطیہ کیا تھا وہ نصب ہو رہا ہے۔ یہ کام تم اپنی گمرانی میں کرو تو کمال کی کافی مدد ہوگی۔"

میں نے جو بھی بار کہا "لیس سرا"

وہ خفا ہونے لگی "تم میری بات کو مذاق میں ٹال رہے ہو۔ اب خدا خدا کر کے حالات صحیح بنج پر آئے ہیں تو خدا کے لیے کچھ سیریس ہو جاؤ۔ اپنے لیے اور ہمارے لیے نئی پریشانیاں مت پیدا کرو۔ مہینے دو مہینے میں شاہ عالم کے معاملات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ اس وقت تک احتیاط سے کام لینے کا کہہ رہی ہوں میں۔"

میں نے کہا "یہ تو میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے لیے پریشان ہونا چھوڑ دو لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم صبح ادھر آ جاؤ۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"اچھا میری اماں۔ میں ہاتھ جوڑ کے مانتا ہوں کہ میں ایک نا سمجھ بچہ ہوں۔ کل سے وہی ہو گا جو تم چاہو گی" میں نے کہا۔

"میں نے ایک نئی بات سوچی ہے ناصر!"

"وہ کیا؟"

"تم صبح آؤ پھر بتاؤ گی" وہ بولی۔

"صبح تک میں کوئی نئی حماقت نہ کر بیٹھوں۔ ابھی بتا دو۔"

وہ بولی "تم برا مان رہے ہو۔ دیکھو ناصر! مجھے اپنی پریشانی کی کوئی فکر نہیں مگر یہ جو مجھے ذرا ذرا سی بات پر ان پولیس افسروں کو مدد کے لیے فون کرنا پڑتا ہے نا؟ یہ مجھے گراں گزر رہا ہے۔"

میں نے واقعی برا مان کے کہا "اچھا آئندہ نہیں کویں گا تم سے۔"

"تم سمجھتے نہیں ناصر۔ ایک تو میں دیسے ہی ایکٹریس ہوں۔ لاکھ اہم سنی مگر میری اوقات تو کچھ بھی نہیں۔ اہم ہوتا ہے سیاست کا کوئی مہم۔ کوئی پروڈکشن۔ یہ معمولی حیثیت کے انتظامی افسران میرا کام اس لیے نہیں کرتے کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں یا میری عزت کرتے ہیں وہ مجھ پر مہربانی کرتے ہیں تاکہ مجھ سے مہربانی طلب کر سکیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟"

میں نے کہا "آئی ایم سوری! یہ بات مجھے بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔"

وہ بولی "تمہارے لیے میں کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہوں ناصر! میں کسی بات میں بے عزتی محسوس کر کے تھذیب کا مظاہرہ نہیں کروں گی مگر میں جنہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہوتی ہے۔ زبان خلق مجھے جو چاہے کہے میں بردا نہیں کرتی مگر ان سب کی نظریں جو میرے اپنے ہیں اور خود میری نظریں مجھے عزت ملنی چاہیے۔ آخر تم مجھے اپنی بڑی بہن کی جگہ مجھے ہو مجھے ہو کیا ہو یا نہیں؟"

میں نے کہا "جتنی عزت میں تمہاری کرتا ہوں کسی اور کی نہیں کرتا۔"

"پھر وعدہ کرو مجھ سے کہ محتاط رہو گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"اچھا شب بخیر۔ اب سو جاؤ اچھے بچوں کی طرح۔ صبح ملاقات ہوگی" اس نے فون بند کر دیا۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے میں نے حساب لگایا تو لندن میں رات نو بجے کا وقت تھا۔ اگرچہ امکان کم تھا کہ سوئی اور عاقل گھر پر ملیں مگر میں نے عاقل کا لندن کا نمبر ملا لیا۔ ڈیڑھ گھنٹی کے بعد ہی ریسیور اٹھایا گیا اور میرے کانوں میں عاقل کی "ہیلو" کی آواز آئی۔

میں نے کہا "ہم تمہارے قائم مقام سر محترم بول رہے ہیں۔"

وہ خوش ہو کے بولا "السلام علیکم سر صاحب! خوب فون کیا آپ نے؟"

میں نے کہا "میں تو ڈر رہا تھا کہ پتا نہیں تم اس وقت ملو نہ ملو۔"

وہ بولا "ہم واقعی نہ ملتے، بس ایک اتفاق ہے کہ ہم جانیس کے ورنہ آج بھی مجھے ڈنر کے لیے باہر جا رہے تھے۔"

"پھر گئے کیوں نہیں؟"

"اُمی حضرت! کیا عرض کروں۔ میں نے توشادی کی تھی یہ دیکھ کر کہ ساس سر یا ساندھاج کا بھگڑا کوئی نہیں۔ پہلے تو سر کے عہدے پر آپ فائز ہو گئے بلکہ قابض ہو گئے۔ رہی سی کمر اس بڑھیا لینڈ لینڈی نے پوری کردی۔ اس نے سونی کو بیٹی بنایا بیٹھے بھانکے حالانکہ اچھا بھلا میرے جیسا ہر صفت بننا دستیاب تھا۔ اب ہر وقت بڑی بی کا لکچر چلتا ہے۔ ہر معاملے میں بی کی طرف داری۔ اب میں ولایت میں ہوں تو کیا ہوں تو ایک خالص پاکستانی شوہر۔ کیا مجھے چوہی پر ظلم اور زیادتی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اوہر ہم نے کسی بات پر لڑنا شروع کیا اوہر ساس حاضر ایک جانبدار رفیقی بن کے فوراً بی کی طرف داری شروع بات سے بغیر۔ قسم خدا کی! لڑنے کا بالکل مزہ نہیں آتا۔ بس میں لحاظ کر جاتا ہوں ورنہ صاف کہہ دوں کہ چل نکل بڑھیا! ہمیں ڈھنک سے لڑنے بھی نہیں دیتی۔ لڑیں گے نہیں تو زندگی کیسے گزرے گی۔"

میں نے کہا "کہیں باہر جا کے لڑ لیا کرو۔"

وہ بولا "کیا کروں بار۔ ایک تو مجھے لڑنا نہیں آتا۔ سونی باہر ہے اس کام میں۔ کسی وجہ کے بغیر بھی لڑ سکتی ہے بلکہ بیٹھ بے وجہ ہی لڑتی ہے! شاہ! اللہ۔"

"تم الزام لگا رہے ہو میری چھوٹی سی بھولی بھالی بہن پر؟"

"ہاں۔ تم اسے بتادو! پھر دیکھو کیا زبردست وجہ بنتی ہے لڑائی کی۔ خیر ہماری چھوڑو! اپنی سناؤ۔"

میں نے کہا "میں ان بفضل خدا سب خیریت ہے۔ زندگی معمولی کے مطابق گزر رہی ہے۔"

"خیر یہ تو مت کہیں آپ۔ میں اتنا لا تعلق اور بے خبر بھی نہیں ہوں وہاں کے معاملات سے۔ پاکستان کے اخبارات سب ملتے ہیں۔"

"پھر تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"ضرورت گئیے نہیں۔ آخری اہم اطلاع یہ تھی کہ شاہ عالم پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا۔"

"اس خبر میں کوئی مداخلت نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "تو کیا تم ابھی تک پولیس کی حراست میں ہو؟"

"میں تو ناصر عظیم ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"پولیس نے پکڑا تھا شاہ عالم کو۔ تین دن اپنے پاس آرام سے رکھا پھر ملک رب نواز کے حوالے کر دیا کہ اب آپ اپنے معاملات طے کر لیں۔ اس نے اپنے گھر کے خانے میں رکھا تھا بڑے سخت حفاظتی انتظام کے ساتھ گھر شاہ عالم کو موقع مل گیا مارو ہار کر کے نکل جانے کا۔ اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔"

"چلو اچھا ہے خدا کرے اب تمہارا اس سے کبھی واسطہ نہ پڑے۔ یہ بتاؤ تم لندن کب آرہے ہو؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ابھی تو آیا کوئی پروگرام نہیں۔"

"مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق تم سب لوگ اسی ہفتے میں لندن پہنچ رہے ہو، میری آج ہی ریکس سے بات ہوئی تھی۔"

میں نے بات سمجھ کے کہا "وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں کہ میں نے براہ راست گھوڑے کے منہ سے سنا ہے تو یہ خود دیکھا میں نے فرمایا ہے؟"

"ہاں، تمہیں نہیں معلوم؟"

"یہ پروگرام آج ہی بنا ہو گا۔ ابھی نایم کہہ رہی تھی کہ صبح آؤ تو ایک بات بتاؤں گی وہ یہی بات ہوگی۔"

وہ بولا "میں نے سارا اسپینس ختم کر دیا۔"

"مجھے خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ وہ لندن جا رہے تھے شادی کے لیے جب میں نے انہیں کراچی میں پکڑ لیا تھا اور واپس لاہور لے گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ ایسے معاملات گزرتے کہ ان کا پروگرام خود بخود منور ہو جاتا چلا گیا۔"

"یہ شادی میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"آجائے گی! میں تو دنیا کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔"

"یہ شادی چلے گی؟" وہ بولا۔

"بے وقتی اور جمالت کی بات زہر گنتی ہے مجھے۔ یہ شادی چلے گی نہیں دوڑے گی۔ ہم سب سے زیادہ خوش رہیں گے وہ ہم پر تھا۔"

"سونی نے تو جب سے سنا ہے اس کی نیند بھوک اڑ گئی ہے۔ اتنی ایکساٹپڈ ہے کہ اور کوئی بات ہی نہیں کرتی۔"

"وہ خود ہے کہاں؟"

"اوپر۔ اپنی اماں کے پاس اور کہاں۔ ورنہ اتنی دیر کن سے بات کر سکتا تھا میں؟"

میں نے کہا "ان معاملات کا کیا ہوا؟"

"میں اوہری آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے ایک راستہ تو نکال لیا ہے۔ اسمگلرز کے گروہ کے ایک رکن سے رابطہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں معلوم کر کے بتاؤں گا۔ دراصل ان کے بھی آپس میں لنک ہوتے ہیں۔ اسمگلنگ کا پورا نظام انتہائی مضبوط اور مربوط ہے۔ سب کے علاقے بنے ہوئے ہیں اور راستے مقرر ہیں۔ اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ برطانیہ سے پاکستان کی طرف کون سا مان لے جا سکتا ہے۔ ہر دن کے قوانین اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ نوادرات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا منشیات کی اسمگلنگ سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہیروئن تو چھپائی جاسکتی ہے۔ نوادرات کو ایسے نہیں چھپایا جاسکتا۔ خیر نکل آئے گی کوئی صورت۔"

میں نے کہا "جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ شریف آدمی سے زیادہ قابل اعتبار ہوتے ہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کسی کی نیت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی اور جب کام ہی غیر قانونی ہو تو شرافت کیسی۔ مال جس کے حوالے کیا جائے، وہی غائب ہو جائے تو میں یا تم کیا کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم مہر کر سکتے ہیں۔"

وہ بولا "میں بھی ایسے آنکھیں بند کر کے مال کسی کو نہیں دوں گا۔"

"پھر کیا کرو گے۔ ضمانت طلب کرو گے۔ سیکیورٹی ڈیپازٹ لو گے۔ اس طرح نہیں ہوتا اس طرح کے کاموں میں۔"

عاقلاً نے کہا "تم نے بھی کوئی بندوبست کیا ہے؟"

"مجھے کیا کرتا ہے؟"

"یار! مال وصول کر کے کہاں لے جاؤ گے، کہاں رکھو گے اور سب سے بڑی بات یہ کہ چوری ہو جائے والا مال حکومت پاکستان کو واپس کیسے کرو گے کیا بتاؤ گے کہ یہ مال تمہیں کہاں سے ملا اور کیسے ملا؟ اصول تو یہ ہے کہ چور وہی جس کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہو۔"

میں نے کہا "دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو۔"

وہ ہنسا "مسئلہ کشمیر کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

مگر میرے جواب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ہی سونی لائن پر آگئی اور شور مچانے لگی۔ "کیا ہے یہ سب آخر بھیا! آپ نے کیا ایکٹیوٹی شروع کر رکھی ہے وہاں اور کچھ بتاتے بھی نہیں۔ میں اخبار دیکھ دیکھ کے پریشان ہوتی رہتی ہوں۔"

میں نے کہا "خبر دالے ایسے ہی لکھتے رہتے ہیں۔ تو فکر مت کیا کر۔ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"فون کرنا تو تب بھول ہی گئے ہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "عاقلاً خان میں تا تیرے ساتھ۔"

"نہیں بھیا۔ آپ سب لوگوں سے دور رہنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "اُنہوں پاکستانی رہتے ہیں لندن میں۔"

"رہتے ہوں گے، میں کسی کو نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "پریشان مت ہو۔ بس اب چند روز میں ہم سب تیرے ساتھ ہوں گے۔ میں اور چند! ریس اور نیلم یعنی دولہا دلہن۔"

"کیا یہ خبر سچ ہے بھیا!"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تیرا میاں سچا ہے کہ جھوٹا۔ مجھے تو اسی نے بتائی ہے یہ بات۔ ویسے شادی کنفرم ہے۔"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا، ہم خوب بلا کھائیں گے لیکن بھیا۔"

میں نے کہا "لیکن کیا؟"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شادی لندن میں نہ ہو۔ اپنے پاکستان میں ہی ہو۔ یہاں تو پھر ویسی ہی شادی ہوگی جیسی ہماری تھی۔ نہ گانا بجانا نہ شور شرابا اور نہ باجا کا جانا۔ لوگ بھی وہی چار ہوں گے۔ کیوں نہ ہم لاہور آجائیں اور وہاں روایتی انداز میں دھوم دھام کی شادی ہو۔"

میں نے کہا "اور عین نکاح کے وقت پولیس آجائے سونی کو پکڑ لے۔"

"سونی! اب کسے یاد ہے؟ ویسے بھی میں اب بیٹی ہوں۔ مسز عاقلاً۔ لندن سے آؤں گی تو کسی کی مجال ہے جو مجھے سونی کہے میں ثابت کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ ثابت کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھ! میں کب سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں! ناصر عظیم ہوں مگر جس دلیل میں خود میں نے مجبوری میں قدم رکھ دیا تھا، اس سے باہر نکلا اب میرے لیے کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے تو کوئی مجبوری نہیں پھر کیا ضرورت ہے خود کو اس عذاب میں

والے کی جس سے میں دن رات دو چار ہوں۔ وہی زندگی گزارنے کی جو سزا مجھے ملی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میری دایہی بھی اب میرے اختیار میں نہیں رہی۔ پھر تو کیوں ایسا سوچتی ہے۔ دایہی کے راستے کی طرف مجھے غلطی سے بھی نہیں دیکھنا ہے۔ خدا نے مجھے ایک نئی زندگی گزارنے کا جو موقع دیا ہے اس پر خدا کا شکر ادا کرو اور سونے کے سائے سے اس کے تصور سے اور خیال سے بھی خود کو دور رکھ۔ چل چھوڑیہ باتیں یہ بتاؤں بھریا کرتی ہے؟

”ابھی تو کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔ بس گھریٹ کر رہی ہوں۔ عاقل نے ایک بڑی لی کو لگا دیا ہے میرے پیچھے۔ جیسے بچوں کی گورنس نہیں ہوتی، وہ ایسے ہی صبح سے شام تک میرے ساتھ رہتی ہے اور مجھے انگریزی سکھاتی ہے۔“

میں نے کہا ”وہ تو سکھاتی ہے تو سیکھتی ہے یا نہیں؟“

”اب آپ آئیں گے تو خود ہی دیکھ لیتا“ وہ ہنسی۔

یہ کوئی بون گھننے کی کال تھی۔ جب میں نے ریسور کھا تو دیکھا کہ کمال کو نیند آگئی ہے۔ قراس سے پہلے ہی اپنے بچے کو سلاتے سلاتے خود سو گئی تھی۔ میں نے ایک چادر اٹھائی اور سونے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ایک صوفے کے کٹن کا کچھ بنایا اور قالین پر دراز ہو گیا۔ میرے خیالات چند منٹ لاہور اور لندن کے درمیان بھٹکتے رہے پھر تھکن اتنی تھی کہ نیند مجھ پر غالب آگئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو دن خاصا ٹھنک آیا تھا۔ کمال تو معمول کے مطابق ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کے اٹھ بچے اپنا چھوٹا کھانا کھا کر گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور میرے جانگنے کے انتظار میں تھی۔

مجھے دیکھتے ہی بولی ”انٹھ گئے آپ بھائی۔ میں تو سمجھی دوپہر تک سوئے رہو گے۔ ناشتا بھی نہیں کرو گے۔“

میں نے کہا ”تو نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟“

وہ شرارت سے ہنسی ”میں نے کیا“ اس نے بھی نہیں کیا ہے۔ چندانے۔“

”چندا آج اسپتال نہیں آئی؟“

قرمشتی رہی ”نہیں بھائی“ آج موڈ نہیں بنا اس کا۔“

”تو اس میں دانت ٹکانے والی کون سی بات ہے؟“

”یہ موڈ والی بات آج ہی کی ہے اس نے ورنہ تو یہ حال تھا کہ بخار میں بھی آرام سے نہیں لیٹتی تھی کہ گھر میں بوریٹ ہوگی۔ کام میں دل تو لگا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب سے وہ آئی ہے اس نے ایک دن بھی اسپتال میں نہیں کیا بھائی!“

میں نے کہا ”مجھے معلوم ہے تو کیا ثابت کرنا چاہتی

ہے۔“

”بھائی“ جو مجھے معلوم ہے وہ ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس نے آخری دھلا ہوا کپڑا لٹکی پر پھیلا دیا۔

میں نے کہا ”چندا اب اسپتال چھوڑے گی۔ یہ جگہ بھی چھوڑے گی“ میں نے کہا۔

”پھر کہاں جائے گی کیا کرے گی بھائی؟“

میں نے کہا ”تو نے داری وہ میری سنبھالے گی۔ رہائش کا انتظام اس کے لیے میں نے کر دیا ہے۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر چل پڑی ”میں تو کہتی ہوں بھائی دو بول بھی پڑھا ہی لو تاکہ تمہارا کام ہی کیا وہ تمہیں بھی سنبھال لے۔“

میں نے کہا ”میرا بھی وہی حشر کرنا چاہتی ہے تو جو ڈاکٹر کمال فاروقی کا ہوا۔ اچھا بھلا آدمی تھا میرا دوست۔“

”تو اب کیا ہے؟“

میں نے کہا ”دو بول کا کتا۔ گھر کا نہ گھات کا۔ گھر میں ہو تو اسپتال کی فکر اور اسپتال میں رہے تو گھر کا خیال۔“

”بھائی“ گھر کی کوئی فکر نہیں انہیں۔ گھر چل رہا ہے جو ہیں گھننے اسپتال ہے بس۔“

میں ہاتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا ”تو شکایت کر رہی ہے؟ کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ کمال ایک مشنری ہے جس نے اپنی زندگی کو ایک مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے۔“

”خدا خواہ مدت ڈانٹو مجھے میں کوئی شکایت نہیں کر رہی ہوں مگر جو ہے سو ہے کمال نے خود پر تو دنیا کے عیش و آسائش کو حرام کر رکھا ہے۔ اپنا سکہ چین سب قربان کر دیا ہے اسپتال پر۔ میں اپنے لیے کچھ بھی نہیں مانگتی۔ بنگلہ کو بھی“ تو کر چاکر۔ زیور گہرا“ ان سب کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں مگر اس بچے کو دیکھ کر میں متفکر ہو جاتی ہوں۔ کیا یہ بھی ایسے ہی رہے گا۔ اسی دو کمروں کے کوارٹر میں۔ گورنمنٹ اسکول میں پڑے گا جہاں سب عام لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں؟ بس سے آئے گا جائے گا۔ کمال کے نزدیک تو قناعت کا یہی تصور ہے۔“

میں نے اسے تسلی دی ”ایسا نہیں ہوگا۔ آدمی خود سختی جھیل سکتا ہے“ اولاد کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔“

”سوچو بھائی“ پانچ کروڑ کا ٹرسٹ تھا جس سے یہ اسپتال چل رہا ہے۔ وہ سب بیسہ کمال کو ملا تھا۔ لیکن اس میں سے اب ہمیں کیا مل رہا ہے؟ اتنی ہی تنخواہ جتنی دوسرے ڈاکٹر لے رہے ہیں۔ چندانے اپنا سب کچھ اسپتال کو دے دیا۔ تم

دوست جو ہوئے۔“ وہ رونی شکل بنا کے پرانے والے لگی۔

”جائیں جلدی سے نمائیں“ ناشتا بالکل تیار ہے۔“

میں نے قمر کے پاس جا کے اس کے بالوں کو سہلایا۔

”دوست سے زیادہ مجھے اپنی بہن کا خیال ہے۔ تو قمر مت کر۔“ میں بھی بات کروں گا اس سے مگر کہیں تو اس بات کو لے کر گھر میں بھڑکامت شروع نہ کرنا۔“

”ایسے بھڑکا کرنے والی ہوتی ہیں تو اب تک سب ٹھیک کر چکی ہوتی بھائی!“ قمر نے اچانک خود کو سنبھال لیا اور دروازے کی طرف دیکھ کے بولی ”آؤ۔ چندا!“

میں نے پلٹ کے چندا کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اچانک میرے ماضی کی خیمیں یادوں کے اہم سے ایک بیکر تصور کی طرح نکل آئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے وہ بے داغ سفید لباس پہنا تھا جس میں اس کا ملکوئی حسن پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نمائی کرتا تھا۔ اس نے سر سرائے ریشم کی سفید شلوار کے ساتھ وہ سفید قمیص پہنی تھی جو اس کے بدن کی دلکشی کو بڑی نزاکت اور دلکشی کے ساتھ ایسے سامنے لاتی تھی کہ دیکھنے والی نظر ایک پر تقدس سرزمین پر غرق ہو جاتی تھی۔ اس نے سفید دوپٹے کے ساتھ بھٹلاتے ٹھون والے لیے لیے سفید آویزے پہنے تھے جو زلف کی موہوم گھنٹی چھاؤں میں شرارت سے جھولتے تھے تو مسکراتے ہوئے لگتے تھے۔ سادگی میں بڑکاری کا یہ انداز میرے لیے نیا نہیں تھا مگر میں نے اسے عرصے بعد چندا کا یہ روپ دیکھا تھا کہ میں مسحور سا کھڑا رہا۔

بالآخر قمر نے مجھے یاد دلایا ”آپ نہانے جا رہے تھے بھائی“ بھول گئے؟“

میں نے چونک کے خفت سے کہا ”ہاں“ میں گزیرے ہوئے وقت کی ایک نظروں از تصویر کے نظارے میں گم ہو گیا تھا۔“

قمر نے کہا ”آج تو چندا ایچائی نہیں جا رہی۔“

چندا کے چہرے پر ایک حیا آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اب تم دونوں بہن بھائی باتیں ہی کرتے رہو گے یا ناشتے کی فکر بھی کرو گے۔“

میں نے چکی بجائے کہا ”تم بیٹھو۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔“

ایک مدت سے چندانے خود کو روز و شب کی مصروفیات میں بالکل بھلا رکھا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اور اپنی ذات میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے جب دیکھا اسپتال کی اسی بد وضع اور بے رونق نرس کی یونیفارم میں

”ابھی کتنا کیا ہے۔“

”اس کا ڈر مت کر۔“

”ڈر کیسے نہ کروں۔ اسپتال کو ملنے والے ڈویشن کا کوئی حساب نہیں۔ توسیع کے ساتھ خرچ بڑھتا جا رہا ہے تو مدنی بھی پہلے سے بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ اسپتال کا سب کو خیال ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ جس نے اپنا سب کچھ اسپتال کو دے دیا ہے اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ تعریف ہوتی ہے ڈاکٹر کمال فاروقی کی ہماری قربانی کسی شمار میں نہیں آتی۔ ہمیں تو تنہا غم مدت بھی نہیں ملے گا۔“

قرمشت جذباتی ہو رہی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ اس کی سوچ کا یہ انداز غلط نہیں ہے مگر میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے شوہر کے سامنے منہ بات کی قہرمت لے کر کھڑی ہو جائے۔ شادی سے پہلے خود قمر ایک بوتیک چلاتی تھی اور اس کے پاس اپنے اسمگلر باپ کا چھوڑا ہوا اچھا خاصا پیسہ تھا جو اس نے سب شادی کے بعد کمال کے سپرد کر دیا تھا اور حسب توقع کمال نے وہ بھی ٹرسٹ کے فنڈ میں شامل کر دیا تھا۔ قمر نے جب سے شادی کی تھی مسلسل اپنی قربانیوں کے نتیجے میں ملنے والی تنگ دستی ہی دیکھتی تھی۔ شادی کے بعد کچھ عرصے تک محبت میں سب کچھ بچے رہے کا جذبہ سرخو رہا مگر آج دو سال بعد جب وہ صرف ایک ہاؤس وانف اور ایک بچے کی ماں تھی اس کے احساس محرومی کا شکوہ زباں پر آ گیا تھا۔ شاید قمر خود بھی وہ سب کچھ چاہتی تھی جو وہ بچے کے نام پر مانگ رہی تھی۔

میں نے کہا ”قمر“ حوصلے سے کام لے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کمال کو تیری قربانی کا احساس ہوگا۔“

وہ مایوسی سے بولی ”کب احساس ہوگا بھائی“ چاہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تو مرنا جینا اسپتال کے لیے ہے۔ بیوی بچوں کی حیثیت تو ثانوی ہے۔“

میں نے کہا ”قمر“ کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیسے بات کر رہی ہے؟ اتنی جلدی گھبرا گئی ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ آخر تو مجھ اسپتال کی مالک ہے۔“

”خاک مالک ہوں بھائی۔ ایسے رہتے ہیں اسپتالوں کے مالک۔ شہر میں کتنے ہی اسپتال ہیں۔ ذرا ان کے مالکوں کے خاندانہ بات دیکھیں۔“

”وہ سب کمرشل اسپتال ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے کھولے گئے ہیں۔“ میں نے خشکی سے کہا ”ان کا کمال اسپتال سے کیا مقابلہ؟“

”آپ تو انہی کی حمایت کریں گے بھائی۔ ان کے

دیکھا لیکن اسپتال کی ڈیوٹی سے فراغت کے بعد بھی وہ کپڑے ایسی بدلتی اور مجبوری کے ساتھ پہنتی تھی کہ زندگی میں اس کی عدم دلچسپی واضح ہو جاتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ کپڑے شوق سے یا آرائش کے لیے نہیں پہنتی بلکہ ضرورتاً جو مل جائے پہن لیتی ہے۔ اس کے کپڑے عموماً بڑے ترتیب، شکن آلود اور پیلے ہوتے تھے۔ لباس کے انتخاب کے معاملے میں وہ پہلے جتنی خوش ذوق تھی، اب اتنی ہی بے پروا ہو گئی تھی۔ اس کے بال بھی سیاہ اور لمبے تھے اور پیلے وہ ان کو بڑے سینے سے بناتی تھی مگر وہ وقت بھی آیا جب اس نے بالوں کو توندنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

میری گزشتہ رات کی باتوں کا رد عمل اب واضح انداز میں سامنے آ رہا تھا۔ چند پھر برائی چنداٹنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ تھی اور اس نے درمیانی مدت کی کئی حادثات کو آنے والے وقت میں کوئی جگہ نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ ایک بڑی خوش آئند ابتدا تھی جس کے ساتھ ہی چندا کی خود اعتمادی کا نیا دور شروع ہو گیا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے گئی اور اسپتال کے توسیعی منصوبے کی تفصیلات بتانے لگی۔ کرنل خان کے ترکے اور چندا کے عطیے سے تعمیر ہونے والا کرنل خان وارڈ ہر طرح سے مکمل ہو چکا تھا اور اس میں سولہ بیڈز پر بچے زیر علاج تھے۔ خان اعظم کے نام کی تختی وارڈ کے باہر بڑے نمایاں مقام پر لگی ہوئی تھی۔ چندا کی خواہش پر یہ وارڈ صرف بچوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

پھر میں نے لیبارٹری کی بلڈنگ دیکھی جو مکمل ہو چکی تھی مگر اس میں ابھی مشینوں کی تنصیب کا کام چل رہا تھا۔ چندا نے مجھے مختلف شعبے دکھائے جن میں ایکس رے مشین، سی ٹی اسکینر اور ایم آر آئی مشین لگائی جا رہی تھی۔ یہ لیبارٹری کا نصف حصہ تھا۔ بقیہ نصف حصے میں بلڈ بینک تھا اور پیتھالوجیکل لیبارٹری تھی۔ یہ حصہ مکمل ہونے کے بعد استعمال کے قابل تھا لیکن فی الوقت اس کا باقاعدہ افتتاح نہیں ہوا تھا۔

”ابھی اس کے لیے عملے کا انتخاب ہو رہا ہے“ چندا نے کہا ”اس کے باوجود خود اپنے دست مبارک سے لیبارٹری کا افتتاح کرو گے۔“

”میں ان چوٹلوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”تمہارے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”میں تو اس نمائندگی کے بھی تخت خلاف ہوں جس میں میرے نام کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ سب میرا

عطیہ کردہ ہے۔“

”یہ سب بھی بے حد ضروری ہے۔ تم نے کبھی غلطی میں چندہ جمع کرنے والوں کو دیکھا ہے؟ وہ کیا کرتے ہیں؟“

”کیا کرتے ہیں؟“

”وہ وصول ہونے والے چندے کا اعلان لاؤڈ اسپیکر پر کرتے جاتے ہیں۔ فلاں صاحب نے اتنی رقم دی ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ فلاں گھر سے اتنا عطیہ موصول ہوا ہے۔ بڑا اک اللہ۔ اس سے دوسروں کو تحریک ہوتی ہے۔ کچھ لوگ شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیا۔ کچھ لوگ کسی سے مقابلے پر بڑھ کے چندہ دے دیتے ہیں۔ وہی پہلنی نام کی تختی سے ہوتی ہے۔ ہر اسپتال میں کسی نمایاں جگہ پر لکھا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر و توسیع میں کس نے کتنی مدد کی۔ اسے دیکھ کر دوسرے بچے والوں کی غیرت جاتی ہے۔ ان میں بھی کار خیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”اس فہرست میں سب سے اوپر کمال کا نام ہونا چاہیے۔“

”کمال نے پانچ کروڑ کا ٹرسٹ اپنے والدین کے نام پر قائم کیا تھا۔ جب اسپتال مکمل ہو جائے گا تو ہم داخلم کے مرکزی راستے پر لاؤنج میں یہ تختی لگائیں گے کہ یہ اسپتال کس کے عطیے سے قائم ہوا۔ اس میں ظاہر ہے کمال کے والدین کا نام آئے گا۔ اس کے بعد کرنل خان کا نام آئے گا پھر تمہارا۔“

”اس میں قمر کا نام بھی آنا چاہیے اور تمہارا بھی۔“

”بالکل آئے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے DONORS ہیں۔ ہم نے ایک اصول بنایا تھا کہ ایک لاکھ سے اوپر عطیہ دینے والے کا نام اس فہرست میں ڈیپلے کیا جائے۔“

”تم نے میری تجویز کے بارے میں کچھ سوچا؟“

وہ چلتے چلتے رک گئی ”میں نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”یہ تو اتنی بڑی خوش خبری ہے کہ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ ایک عمارت کے مطابق تمہارے ساتھ کوئی بد تمیزی نہیں کروں“ میں نے خوشی سے بے قابو ہو کر کہا۔

اس کا چہرہ گلابی ہو گیا ”یاد ہے ناب تمیزی کی سزا کیا ہوتی تھی؟“

میں نے کہا ”میں تو بھول ہی گیا ہوں جو ڈو کرائے کے سارے داؤ بیچا؟“

”میں خود آؤٹ آف پریکٹس ہوں“ وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

”وہ بھی کیا وقت تھا جب خان اعظم خود ہمیں ٹریننگ دیتے تھے اور اپنی نگرانی میں ہمارے درمیان مقابلہ کراتے تھے۔“

چندا کے چہرے پر اُو اسی جھلکنے لگی ”پلو کسی بہانے تم نے انہیں یاد تو کیا۔“

میں نے کہا ”آج میں جو کچھ بھی ہوں انہی کی وجہ سے ہوں۔ میری ساری کامیابیاں انہی کی مرہونِ منت ہیں۔ میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔“

”تم جب سے آئے ہو؟“ ایک بار بھی ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے نہیں گئے۔“

میں نے شرمندگی سے کہا ”آج ضرور جاؤں گا۔“

لیبارٹری کے اندر ایک ننھا ٹھنڈک بھی ہر طرف چلی ہوئی لکڑی کے جھلکے پیلے ہوئے تھے۔ فرش پر موزیک کا ڈیزائن نمایاں کرنے کے لیے گھسائی ہوئی تھی۔ اس کا سفید مینا سا کینچڑیائی کے ساتھ باہر جمع ہو گیا تھا۔ دروازوں اور دیواروں پر رنگ و روغن کا کام آخری مراحل میں تھا۔ ایک کاربینٹر کھڑکیوں، دروازوں میں لاک اور پنڈل وغیرہ فٹ کر رہا تھا۔ الیکٹریشن ہر کمرے میں سوچ بورڈ فٹ کر رہے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے ایک ہفتے میں یہ سارے کام ختم ہو جائیں گے۔ چندا جہاں سے بھی گزرتی، کام کرنے والے موڈ ہو گئے۔ چندا ایک نے اسے ہاتھ اٹھا کے سلام بھی کیا اور اس نے ایک دو جگہ رک کے کام کرنے والوں کو ہدایات بھی دیں جس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کام کی نگرانی براہِ راست چندا ہی کر رہی تھی۔

باہر آکے میں نے کہا ”تم نے اسپتال چھوڑ دیا تو کمال کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ تم نے اس کا کافی کام سنبھال رکھا تھا۔“

”اس کا اصل کام تو کون نے اور اس کے شوہر نے سنبھال رکھا ہے۔ میرے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ آہستہ آہستہ کمال کے ساتھ مخلص اور DEVOTED ساتھیوں کی پوری ٹیم جمع ہو گئی ہے۔ ہر ایک اپنے کام ذمے داری سے کرتا ہے۔ کسی کو نگرانی کی یا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”تمہیں کسی کو چارج دیتا ہو گا؟“

”میرے ذمے کوئی مخصوص شعبہ نہیں تھا۔ جیسے کون سے سپرد دوں گے، ان کی وصولی، خرید اور تقسیم کے سارے

کام ہیں۔ وہ اسٹور کی نگرانی ہے، اس کا شو ہر چارج باہر کے سارے کام دیکھتا ہے۔ ایمرٹنس کی مرمت، بلڈنگ کی دیکھ بھال، بیڑوں کی خریداری، انتظامی امور براہِ راست کمال کے پاس ہیں۔ میں سب کی مددگار تھی، جس نے جو کہا کر دیا۔“

”پھر بھی تم رستہ تو کمال کو مطلع کر دیتی؟“

”ہاں“ اسے بتا دوں گی کہ میں اسپتال میں کام نہیں کر سکتی۔ ویسے وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔“

میں نے کہا ”وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا سوچتا تھا۔ تم کچھ عرصہ اور اسی ماحول میں گزاریں تو زیادہ بیمار ہو جائیں۔“

چندا مسکرائی ”تمہارا مطلب ہے ذہنی طور پر۔ جسمانی طور پر تو میں ٹھیک ہوں۔“

یہ وقت اسپتال میں آؤٹ ڈور مریضوں کے لیے تھا۔ اولیٰ ڈی کے شعبے میں روز کی طرح مفت علاج کی سولت حاصل کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک آٹھ دس ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر عام قسم کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو دیکھتے تھے اور انہیں دوا میں لکھ کر دیتے تھے جو اسپتال کی ڈسپنسری یا اسٹور سے انہیں بلا معاوضہ مل جاتی تھیں۔

آنے والوں میں اکثریت غریبوں کی تھی جو تانگے، رشتے یا بس دیگر سے وہاں پہنچتے تھے۔ کوئی کسی کی کار میں یا ٹیکسی میں آتا تھا تو چوکیدار گاڑی کو اندر جانے دیتا تھا مگر مریض کو اتارنے کے بعد گاڑی کو واپس باہر جانا پڑتا تھا کیونکہ اسپتال کے احاطے میں اتنی بڑی فاصل جگہ نہیں تھی جہاں کار پارکنگ آریا بنایا جاسکتا۔ لیبارٹری اور ڈائینٹک سینٹر کے لیے پچھلے حصے میں جگہ نکالی گئی تھی۔ سامنے کی طرف اب مشکل سے اتنی جگہ بچی تھی کہ وہاں دو نئے وارڈ بنالے جائیں۔ اگر درمیان کے باغ کو بھی ختم کر دیا جاتا تو دو اضافی وارڈوں کے لیے متقاضی نکل آتی۔ اسپتال کے لیے مستقبل میں بہت سے توسیعی منصوبے تھے جن کے لیے اضافی فنڈز ہی نہیں مزید زمین بھی درکار تھی۔

ہم سامنے والے حصے میں پہنچے تو مجھے فلیم کی گاڑی نظر آئی جو آفس کی سائڈ میں کھڑی تھی۔ رئیس گاڑی کے ساتھ آیا تھا اور اندر کمال کے دفتر میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ خلاف معمول وہ سجدہ تھا۔

”کیا کر رہا ہے تو؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”کوئی خاص کام نہیں، ویسے کام بہت ہیں۔“

”تو چل میرے ساتھ۔“

میں نے کہا ”کہاں۔ میرا خیال تھا کہ آج چندا کو اپنے آفس دکھاؤں۔ چندا نے اسپتال چھوڑ دیا ہے۔ یہ اب میرے ساتھ کام کرے گی۔“

”بڑی اچھی بات ہے۔“ رئیس بولا ”مگر ابھی تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ چندا کے سامنے کوئی بات کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ ”کوئی حرج ہے اگر چندا بھی ساتھ چلے؟“

”حرج تو کوئی نہیں۔ مگر فائدہ بھی کوئی نہیں۔ یہ بلاوجہ پریشان ہوگی۔“ رئیس نے کہا۔

چند ا خود بھی ایک آؤٹ کر گئی۔ ”میرا خیال ہے کہ آج میں یہاں کے معاملات سے نمٹ لوں۔“

میں نے کہا ”اپنی پبلنگ بھی شروع کر دو۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ کوارٹر چھوڑنے کے میرے ساتھ جانا ہوگا۔“

”اس کی اتنی جلدی کیا ہے؟“ چندا نے کہا اور رئیس مسکراتے لگا کیونکہ مدعا کچھ اور ہونے کے باوجود ہمارے کسے ہوئے الفاظ کا مطلب کچھ اور نکلا تھا۔ چندا جھپٹ کر دوسری طرف چلی گئی اور میں رئیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”تیری صورت پر بارہ کیوں بچے ہوئے ہیں؟ کیا ہونے والی بیوی نے صبح صبح تجھے سے تواضع کی ہے۔“

وہ ہلکے بولا ”جیواں مت کہ۔ یہ سب تیری وجہ سے ہو رہا ہے سالے!“

میں نے کہا ”کیا نیلم ابھی تک کل رات کی بات پر برہم ہے؟“

وہ بولا ”نیلم کو کچھ نہیں ہوا۔ تجھے کچھ خشم کی خبر ہے؟“

میں نے کہا ”اتفاق ہے کہ کل سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔“

”اتفاق کے بچے۔ وہ اسپتال میں داخل ہے۔“

میں چونک رہا ”اسپتال میں۔ کیوں؟“

”وہ ڈاکٹر عائشہ کے نفسیاتی اسپتال میں داخل ہے۔“

”تو مجھے بتا کیوں نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟“

”ختم اللہ کی پیارے“ مجھے معلوم ہوتا تو تجھے ضرور بتاتا۔“

میں نے کہا ”تجھے یہ کیسے پتا چلا کہ خشم ڈاکٹر عائشہ کے نفسیاتی کلینک میں زیر علاج ہے؟“

”یار فون کیا تھا ڈاکٹر عائشہ نے۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر عائشہ نے کسے فون کیا تھا؟ اس کے

پاس نیلم کا نمبر نہیں تھا اور وہ کسی ناصر عظیم کو نہیں جانتی۔“

رہیں سوچ میں رہ گیا ”یار میری اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ فون آیا تھا گھر پر اور بات کی بھی بانو خالہ نے۔“

پتا نہیں ان سے کسی نے کیا کیا؟“

میں نے کہا ”عائشہ نفسیاتی اسپتال سے فون آنے کا لازمی مطلب یہ تو نہیں کہ خود ڈاکٹر عائشہ نے ہی فون کیا تھا۔“

”پتا نہیں یار۔ کسی نے بانو خالہ کو پیغام دیا کہ یہ بات نیلم کو فوراً بتادی جائے۔ انہوں نے اسٹوڈیو میں فون کر دیا۔“

نیلم کی ان سے بات ہوئی۔ پھر نیلم نے مجھ سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر عائشہ کا نفسیاتی کلینک کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے۔ وہ بولی کہ خیمہ وہاں داخل ہے۔ تم فوراً چلے جاؤ اور فون کرنے کی ضرورت نہیں جاتے ہوئے ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے نیلم سے پوچھا تھا کہ خیمہ کو کیا ہوا ہے تو اسے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ کیونکہ بانو خالہ کو کچھ پتا نہیں تھا۔ ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”رہیں۔ میں وہاں نہیں جاسکتا۔“

”کیوں نہیں جاسکتا؟“

”اے گھامڑا! ڈاکٹر عائشہ مجھے شاہ عالم سمجھتی ہے۔ جب کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میرا خیمہ سے کیا تعلق؟“

رہیں گرم ہو گیا ”تو کیا سمجھتا ہے سالے ڈاکٹر عائشہ تیری شکل دیکھتے ہی پولیس کو فون کر دے گی۔“

میں نے کہا ”شاہ عالم کے فرار کی خبر اس نے بھی پڑھی ہوگی۔“

”مگر وہ اسپتال میں پولیس کو نہیں بلائے گی۔“

میں نے کہا ”نہیں رہیں۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تو جا کے خیمہ کو دیکھ آ۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔“

میری بات رئیس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے گاڑی کو باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار میں کھڑا کیا اور اسپتال کے اندر چلا گیا۔ جب رو کے شیشے اس حد تک سیاہ تھے کہ باہر سے مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ جب تک کوئی قریب آئے اور شیشے سے ٹک لگا کے نہ دیکھا، مجھے پتہ نہیں چلا تھا۔

میرا ذہن خیمہ کی بٹاری کی نوعیت کے بارے میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ ابھی گزشتہ روز وہ میرے ساتھ تھی تو بالکل نارمل تھی پھر اچانک اسے کیا ہو گیا تھا؟ میں بار بار کھائی کی گھڑی کو اور اس گیٹ کو دیکھتا رہا جس سے رئیس اندر گیا تھا۔ اندر سے میٹھیوں کی اور ان کے تیارواروں کی آمدورفت جاری تھی۔ دس منٹ بعد ایک ایمرپلینس باہر آئی

اور خاموشی سے ایک طرف چلی گئی۔ میں انتظار کے ہر لمحے کو ایک گھڑی کی طرح کاٹتا رہا اور پریشان کن خیالات کی یلغار سے الجھتا رہا۔

باہر گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ وقفے وقفے سے سڑک کے کنارے ترجہی کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کوئی گاڑی نکلتی تھی تو فوراً ہی اس کی جگہ دوسری گاڑی لے لیتی تھی۔ رئیس نے گاڑی کو قطار کے آخر میں کھڑا کیا تھا اور کسی حد تک ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی کیونکہ گاڑی اس حد سے آگے کھڑی تھی جہاں ”نورنگ“ کا بورڈ نظر آرہا تھا۔ بورڈ پر بنا ہوا تیر کا نشان یہ ظاہر کرتا تھا کہ گاڑیاں بورڈ کے دائیں طرف کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ بائیں طرف نہیں۔ لیکن تقریباً ایسے ہی بورڈ سے آگے گاڑیاں موجود تھیں۔ پارنگ کی جگہ نہ ملنے کے باعث لوگ بورڈ کو نظر انداز کر دیتے تھے اور مقررہ حد سے آگے گاڑی کھڑی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ٹریفک پولیس کا کوئی افسر بھی نہیں تھا کہ خلاف ورزی پر چالان کا خطہ ہوتا۔

ابھی میں یہ جائزہ لے رہا تھا کہ ایک ٹریفک سارجنٹ نمودار ہو گیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل بالکل گاڑی کے برابر لاکے روکی اور اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا جو میرے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی مقررہ حد سے آگے تھی لیکن اس میں ایک ڈرائیور ٹائپ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بند شیشوں سے میں ٹریفک سارجنٹ اور ڈرائیور کے درمیان ہونے والی بحث کو صرف دیکھ سکتا تھا۔ سارجنٹ باہر ٹریفک سائن کی طرف اشارہ کرتا تھا اور ڈرائیور معلوم نہیں اپنے دفاع میں کیا دلیل دیتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی کوئی بھی دلیل وزن نہیں رکھتی تھی۔ اس نے واضح قانون شکنی کی تھی اور اب کوئی وجہ اس حرکت کا جو اذرا ہم نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے اب اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی کیونکہ اسنے قریب آکے سارجنٹ نے مجھے اندر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر یار میری طرف اٹھتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ گھر جاؤ بچو! ابھی آتا ہوں تمہاری طرف بھی۔

بالآخر یہی ہوا۔ پہلی گاڑی کے ڈرائیور نے مجھ کو ہر گز کے شک نہ کر لیا تھا کیونکہ سارجنٹ نے اس کا چالان نہیں کیا تھا۔ ڈرائیور کی صورت کے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے اس کو مجبوری میں کڑوا کر ملا چکا ہے لگتا پڑا ہوا اور سارجنٹ کے یوں پڑھائی سے بھرپور فائدہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے آہستہ سے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پاور ونڈو کا کٹن دبا کے شیشہ

تھوڑا سا نیچے کیا اور پوچھا ”کیا بات ہے؟“

”بات بھی بتائیں گے شیشہ ہوا۔ ذرا باہر تشریف لاؤ۔“

سارجنٹ نے چالان تک پھر نکالتے ہوئے کہا۔

اب انکار کی تمنا کس بھی نہیں تھی۔ ابھی تک سارجنٹ نے میرا چہرہ دیکھنے کے باوجود کسی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے آتے ہی وہ مجھے پہچان جائے گا اور پھر وہی ہوگا جو میں نہیں چاہتا تھا مگر نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ حالات کے پیش نظر میرا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ میرے خاموشی سے گرفتار ہوجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بھی پہلے سارجنٹ سے کب مکا کروں گا لیکن میرا سودا بڑا ہوگا۔ یہ معاملہ صرف ٹریفک کے ایک قانون کی معمولی خلاف ورزی کا نہیں تھا۔ میں سارجنٹ سے کہوں گا کہ گاڑی میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ پھر اس سے صاف بات کروں گا کہ وہ مجھے نہ دیکھنے کے عوض کیا نذرانہ قبول کرے گا۔ اگر وہ پانچ دس ہزار لے کر خاموشی سے رخصت ہوجائے گی تو شک کو فائدہ مند سمجھتے ہوئے فرض کر لیتا ہے کہ اس نے آج شاہ عالم کو دیکھا ہی نہیں تو یہ باعزت سمجھتا دوں کہ اس آئے گا بصورت دیگر اس کی فرض شناسی کا جذبہ جاگ اٹھا تو مجھے اس جذبے کو ناک آؤٹ کر کے سلا تا پڑے گا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی تک اس نے گاڑی کے نمبر پر نظر نہیں ڈالی ہے چنانچہ بعد میں گاڑی کا سراغ لگانا اتنا آسان نہیں ہوگا اور بغرض محال اس نے سراغ گیری کی اور نیلم کے گھر پہنچ گیا تو وہاں صاف انکار کرنا بھی آسان ہوگا اور اس کی کسی افسر اعلیٰ سے بات کر کے اس ”غلط فہمی“ کو رفع کرنا بھی ممکن ہوگا۔

نیچے اترنے کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ”جیرو میں بیٹھنے والوں کی بھرپور تحوت کا مظاہرہ کیا“ ”کیس۔ کیا مسئلہ ہے؟“

وہ غالباً ہر روز ایسی ہی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا عادی ہو چکا تھا۔ گاڑیاں ہر روز ٹریفک سائن سے آگے کھڑی ہوتی تھیں اور وہ ملاقات کے اوقات میں ہر روز جکر لگا کے دوچار گاڑیوں کے چالان کر سکتا تھا یا چالان نہ کرنے کے احسان کی قیمت وصول کر سکتا تھا۔ ہر پھیرے میں اس کے سو پیاس کھرے تھے۔

اس نے ٹریفک سائن کی طرف اشارہ کیا ”یہ دیکھا ہے جناب نے؟“

میں نے کہا ”گاڑی حد سے آگے کھڑی ہے۔“

اس نے کہا ”یہ جرم ہے۔“

☆ مدار 209 ☆ گیارہواں حصہ

☆ مدار 208 ☆ گیارہواں حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے تسلیم کیا "بالکل جرم ہے۔"
"آپ کا چالان ہوگا۔"

میں نے اپنا پرس نکالا "چھوڑو سرجی۔ جتنا جرم نہ چاہو
میںیں وصول کرو، نہیں کیوں کورٹ پچہری میں کھیل خوار
کرتے ہو۔"

وہ کامیابی سے مسکرایا "آپ بندے سیانے ہو۔"
میں نے اسے بعد احرام سو کا نوٹ پیش کیا جو اس نے
شکریہ ادا کیے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنی موز سائیکل کی
طرف بڑھا۔ میں صرف سو روپے میں جان چھوٹ جانے پر
بہت خوش اور مطمئن تھا۔ سار جٹ نے مجھے شناخت نہیں
کیا تھا ورنہ شاید پانچ دس ہزار میں بھی میری گلو خلاصی نہ
ہوتی۔ اس معمولی واقعے سے مجھے ایک سبق اور ملا تھا کہ
آئندہ مجھے اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا ہوگا کہ میرا کہیں
بھی پولیس سے رابطہ نہ پڑے۔ مجھے معمولی اور روز مرہ کے
ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی سے بھی بچنا ہوگا ورنہ کہیں
کوئی پولیس من مجھے ضرور پہچان جائے گا۔

ابھی میں سار جٹ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک
گاڑی میرے بالکل قریب دروازے سے اندر داخل ہوتے
ہوئے رک گئی اور میں نے اپنے مقابل ڈاکٹر عائشہ کا پیشہ
مسکرائے والا شفیق چہرہ دیکھا۔
"جیلو شاہ عالم!" ڈاکٹر عائشہ نے کھڑی سے جھانک کے
کہا "میں کیوں کھڑے ہو؟"

سار جٹ نے گھوم کے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنا دل
ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور سار جٹ
کی نظر ملی پھر اس نے موز سائیکل کو کھانگی لگا لی اور گھوم کے
واپس چلا گیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا اور ڈاکٹر عائشہ کی طرف
بڑھا۔ "میں ابھی آیا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا "جھا اندر آؤ، بڑا اچھا ہوا تم مل گئے۔
مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ کی گاڑی آگے بڑھ کے اسپتال میں داخل
ہو گئی۔ اب میں باہر بیٹھ کے رئیس کی واپسی کا انتظار نہیں
کر سکتا تھا۔ میرے لیے اندر جا کے ڈاکٹر عائشہ سے بات کرنا
ضروری اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں نے پیرو کے دروازے کو
لاک کیا اور محتاط انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

اسپتال کا نقشہ میرا دیکھا ہوا تھا چنانچہ میں سر جھکانے
سیدھا ڈاکٹر عائشہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ گاڑی پارک
کر کے کمرے میں بیٹھی ہی تھی کہ میں بھی پہنچ گیا۔

انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا "ٹیک اسے
سیٹ پلیز!"

عادت کے مطابق وہ اردو میں آدھی بلکہ بعض اوقات
اس سے بھی زیادہ انگریزی ملا کے بات کرتی تھیں۔ میں نے
شکریہ ادا کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ نے مجھ سے
معذرت کی اور پہلے چند قائلوں میں کچھ دیکھا۔ پھر اپنی دراز
میں سے ایک ریڈر نکال کے کچھ لکھا اور ایک جین دبا کے
انٹرکام پر کسی کو طلب کیا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے چشمہ اتار کے میز پر
رکھا اور کرسی کی پشت کا سارالبا "سووی میٹ اگین!"
میں نے کہا "ذرا بہت چھوٹی جگہ ہو گئی ہے ڈاکٹر عائشہ!"
وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی "وہ لڑکی پھر میرے پاس آئی
ہے، ختم!"

میں نے کہا "وہ صحیح جگہ آئی ہے۔"
"لیکن اس مرتبہ حالات تمہارے لیے زیادہ خراب
ہیں۔"

میں نے کہا "شاید!"
"YOU ARE A FUGITIVE" ڈاکٹر عائشہ
نے کہا "یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی جب تم باہر
اس پولیس من سے بات کر رہے تھے۔"
میں نے کہا "پھر آپ نے مجھے قانون کے حوالے کیوں
نہیں کیا؟"

"اس کی بہت سے وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ
کہ میں نے اخبارات میں مقننہ باتیں پڑھی تھیں۔ میں سچ
نہیں کر سکتی کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے
کہ میں خود کو کسی لیگل پرائلیم میں INVOLVE کرنا نہیں
چاہتی لیکن تیسری وجہ جو میرے لیے سب سے اہم تھی خود
جینم ہے۔ جنہیں پولیس کے حوالے کر کے میں اس کی مدد
نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ جنہیں پولیس
نے گرفتار کیا ہے تو پابوس ہو کے وہ نہ جانے کیا قدم اٹھائی۔
اس کی یہ حالت جنہیں PROTECT کر کے کے چکر میں
ہو گئی۔"

میں نے چونک کے کہا "مجھے بچانے کے لیے؟"

"ہیں۔ ڈونٹ پوٹو!"

میں نے کہا "مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا ڈاکٹر عائشہ!"
انٹرکام کا بزر بجا تو ڈاکٹر عائشہ نے ریسیور اٹھایا "ہیں۔
رپورٹر۔ ابھی جو اخبار والا آئے اسے تبادو کہ شی از او کے!
اور میں فی الحال کسی سے نہیں ملوں گی۔ ڈاکٹر سارہ سے کہہ دو

کہ وہ پریس والوں کو مطمئن کرے اور انہیں بتا دے کہ جینم
کو ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا اس لیے وہ ملے پر اصرار نہ
کریں۔"

میں نے کہا "کیا میں بھی اسے نہیں دیکھ سکتا۔"
"ولے ناٹ۔ ہم اور اس کے کمرے میں جاسکتے ہیں۔"
یہاں مسلسل مداخلت ہو گئی اور تمہارے لیے بہت رسک ہے
کہ جنہیں کوئی صحافی دیکھ لے۔ اس کے لیے تو تم ایک خبر ہو
مگر میرے لیے براہم کھڑی ہو جانے گی۔ انہوں نے درازوں
کو لاک کیا اور کھڑی ہو گئیں۔ "تم دو!"

میں ان کے پیچھے پیچھے کسی حد تک اس کی آڑ میں چلا
رہا۔ اس وقت وہاں کوئی جرنلسٹ نہیں تھا چنانچہ کسی اور نے
میری صورت پر غور نہیں کیا یا مجھے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ شاہ
عالم کا نام ایک مخصوص حلقے میں شیطان کی طرح شہرت ضرور
رکھتا تھا جس میں سیاست دان، وکیل اور صحافی یا پولیس
والے شامل تھے مگر عام آدمی کے لیے جو اپنے کام سے کام
رکھتا تھا شاہ عالم کا نام کسی اشتہاری مجرم کا نام نہیں تھا جسے
سب لوگ ہر جگہ شناخت کر سکتے ہوں۔

جینم اوپر والی منزل پر اسی کمرے میں تھی جس میں وہ
پہلے بھی کچھ دن گزار چکی تھی۔ میں ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ
کمرے میں پہنچا تو جینم بیڈ پر سکون کی کمری نیند میں تھی اور
دینا واپس سے بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں بجلی سی روشنی
تھی اور پتھکے آواز طریقے سے گھوم رہا تھا۔ کمرے میں بیڈ
کے علاوہ دو کرسیاں تھیں۔ ڈاکٹر عائشہ نے ایک کرسی آہستہ
سے اٹھائی اور مجھے اشارہ کیا کہ میں دوسری کرسی اٹھا لوں۔
ہم بیڈ سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ! اب آپ کوچ بتانے میں کوئی
حرج نہیں۔ میں یہاں ایک دوست کے ساتھ آیا تھا۔ اسے
میں نے اندر بھیجا تھا کہ جینم کو دیکھ آئے اور خود باہر اس کی
واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ میں آپ
کے لیے مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔"
"تمہارا وہ دوست کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کیا آپ معلوم کر سکتی ہیں۔ ورنہ واپس
جا کے وہ مجھے غیر موجود بنائے گا تو پریشان ہوگا۔"
"میں دیکھتی ہوں۔" ڈاکٹر عائشہ باہر نکل گئی۔

میں تقدیر کے اس کھیل پر حیران تھا۔ میں نے شاہ عالم
کی شخصیت کو پیچھے چھوڑ دیا تھا مگر وہ کسی آسیب کی طرح میرا
پیچھا کر رہا تھا اور مجھ پر غالب آ رہا تھا۔ گزشتہ شب میں چندا
کے ساتھ تھا تو یکے بعد دیگرے دو اتفاقات ایسے ہوئے تھے

کہ میں نے بڑی مشکل سے ناصر عظیم کو محفوظ رکھا تھا۔ آج
پھر حالات ایسے تھے کہ میں شاہ عالم ہونے سے انکار نہیں
کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر عائشہ کے لیے میں شاہ عالم ہی تھا اور انہیں
کسی صورت قائل نہیں کر سکتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔
میں شاہ عالم نہ ہوتا تو دوبارہ جینم کے لیے پریشان ہو کے یہاں
کیوں آتا؟ مجھے پورا یقین تھا کہ بد قسمتی کے کسی اتفاق سے
پولیس مجھے یہاں گرفتار کر لے تو ڈاکٹر عائشہ کی گواہی میرے
خلاف جائے گی اور انہوں نے مجھے شاہ عالم قرار دیا تو یہ ان
کے نزدیک سچی بات ہوگا۔

ڈاکٹر عائشہ چند منٹ کے بعد آئی اور میرے سامنے بیٹھ
گئی "تمہارا دوست واقعی باہر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے
اسے اپنے آفس میں بٹھا دیا ہے۔"
میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ! جینم کو کیا ہوا تھا؟"

"جو کچھ جینم کے ساتھ ہوا۔ افسوس ناک ہی نہیں
شرمناک بھی ہے۔ آئی ڈونٹ نوک پولیس والے اتنے
BRUTE کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاید اندر سے ہم سب وحشی
ہوتے ہیں۔ پولیس فورس میں جانے سے پہلے وہ بھی ہمارے
جیسے نرم دل رکھنے والے اور ڈرو نوک پولیس کے نام سے
کانپنے والے اور تشدد سے نفرت کرنے والے عام انسان
ہوتے ہیں مگر وردی بین کے اور تھانے میں کچھ عرصہ رہ کے
ان کی فطرت میں ایک حیوانی تبدیلی آ جاتی ہے۔ وہ اپنے جیسے
بے بس انسانوں پر بڑی سفاکی سے ظلم کرتے ہیں۔ ان کے
جسموں کو تشدد سے پامال کرتے ہیں اور توڑتے چھوڑتے ہیں۔
انسان کو ہلاک تک کر دیتے ہیں۔ انہیں خیال ہی نہیں آتا کہ
کبھی وہ خود بھی انسان تھے۔"

"یہ پولیس کی بربریت کا نتیجہ ہے؟" مجھے طیش آنے
لگا۔

"ہیں۔ جینم کا زوس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اس کا
ایک ساتھی جینم کو یہاں لایا تو اس پر ہسٹریا کے دورے
پڑ رہے تھے۔"

"لیکن اس زوس بریک ڈاؤن کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟"
"ہیں۔ پولیس جینم کو تفتیش کے لیے لے گئی تھی۔
انہوں نے جینم سے بوجھا کہ شاہ عالم فرار ہو کے کہاں گیا؟
ظاہر ہے، جینم نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تو انہوں نے اپنی
روایت کے مطابق قہر ڈوگری کے طریقے استعمال کیے۔"
میرا خون کھولنے لگا "انہوں نے اس پر جسمانی تشدد
کیا؟"

"جسمانی بھی۔ لیکن جسمانی سے زیادہ نفسیاتی۔ میٹل

ٹارچ کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی۔
”اوہ مائی گاڈ!“ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
”اور یہ سب میری وجہ سے ہوا؟“

”تمہیں فخر ہونا چاہیے اس لڑکی پر۔ اور اپنے آپ سے شرم آتی چاہیے کہ تم نے اسے عذاب میں مبتلا کیا“ ڈاکٹر عائشہ نے پڑھلاست لہجے میں کہا۔

میں نے ندامت سے سر جھکا لیا ”اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں ساری عمر اپنے آپ کو معاف نہ کرتا۔“

”تمہیں تذر کرنی چاہیے اس لڑکی کی۔ ایسی قوت برداشت اور مستقل مزاجی کے ساتھ محبت کرنا کوئی آسان نہیں ہوتا۔“

میں نے کہا ”کیا اس نے آپ کو کچھ بتایا؟“
”ہاں۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ وہ کوئی فوٹو گرافر ہے۔“

میں نے کہا ”اس کا نام باہر قار تو نہیں ہے؟“
”نہیں۔ یہی نام بتایا تھا اس نے اپنا تم جانتے ہو اسے؟“

میں نے کہا ”میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ شبنم کے ساتھ بہت مخلص ہے۔“

”اس نے مجھے بتایا کہ پولیس نے کل رات اسے گھر سے آفس جاتے ہوئے راستے سے ہٹ کر لیا۔ یوسی قانونی طور پر اس کو گرفتار کرنا اور تفتیش کے لیے تھانے لے جانا بہت مشکل بود سبچر تھا۔ چنانچہ انہوں نے شبنم کو ”ان آفیشی“ گرفتار کر لیا۔ قانونی طور پر اسے KIDNAPING کہا جائے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ شبنم کہاں ہے ورنہ شاید صحافی ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ کسی تھانے میں اس کے ساتھ اخلاقی بھرموں جیسا سلوک کیا گیا۔ اس کا بھی گواہ کوئی نہیں چنانچہ شبنم کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی اور کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکتی۔“

”کیا اس نے تمہیں بتایا۔؟“
”ہاں۔ اس نے سب بتایا۔ رات بھر میں انہوں نے سب کچھ کیا۔ انہوں نے کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا جس کا ثبوت ہو۔ کوئی ایسی زیادتی نہیں کی جو میڈیکل ایگزامینیشن میں ثابت ہو لیکن انہوں نے اس سے کہیں زیادہ کیا جس کا تم تصور کر سکتے ہو۔ وہ رات بھر شیطان بنے رہے۔ انہوں نے شبنم کو بالکل بے لباس رکھا اور خود بھی اس کے سامنے ننگے ہو کے آتے رہے۔ انہوں نے دل کھول کے بے شرمی اور فحاشی کا مظاہرہ کیا اور شبنم کو ساری رات ہراساں کرتے

رہے۔ یہ دھمکی دیتے رہے اور ڈراتے رہے کہ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ انہوں نے کسی زیر حراست ملزم پر شبنم کے سامنے غیر انسانی تشدد کیا اور شبنم نے کئی گھنٹے تک اس کا رونا چلانا، ترہنا اور اذیت برداشت کرنا دیکھا۔ پہلے انہوں نے اسے ننگا کر کے الٹا لٹکا اور اسے مارتے رہے۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکری کی طرح چلاتا رہا اور الٹا لٹکا ہوا پھرتا رہا۔ اس کا پیشاب پاخانہ خطا ہوتا رہا اور وہ اپنے ہی جسم کی غلاہٹ میں تھڑھکیا۔ پھر انہوں نے اسے فرش پر لٹکا کے زیادتی کا نشانہ بنایا۔ شبنم کو دکھانے کے لیے تین پولیس والوں نے اس پر جھسی تشدد کیا اور شبنم سے کہتے رہے کہ اس کی باری بھی آنے والی ہے۔ پھر وہ شخص خون اگلنے لگا۔ پولیس نے اسے بدترین عذاب سے گزارا اور شبنم اس کا چیخا چلانا سنتی رہی اور اسے مرنے ہوا دیکھتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ شخص مر گیا۔ وہ نوجوان آدمی تھا اور کار چوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ شبنم کے اعصاب تو اس کی موت دیکھ کر ہی جواب دے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے شبنم کے ساتھ اپنے گھناؤنے کھیل شروع کیے۔ شبنم کا کہنا ہے کہ وہ تعداد میں چار یا چھ تھے۔ ان سب نے شبنم کے سامنے ناقابل بیان فحاشی کی۔ وہ شبنم کے جسم سے کھیلے رہے اور اس کے تقدس کی پامالی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے عملاً شبنم کو بے آبرو نہیں کیا مگر اس کے سارے بدن کو گندہ اور ناپاک کر دیا۔ انہوں نے شبنم کے جسم کے بازو حصوں کے ساتھ بے شرمی کی انتہا کر دی اور اس دوران میں مسلسل بیک پوچھتے رہے کہ تمہارا کماں ہے؟ شبنم نے ساری رات اس انسانیت سوز شیطانی یلغار کا مقابلہ کیا مگر تھمارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ پولیس والے یہ ظاہر کرتے رہے جیسے وہ شبنم کو کچھ عرصہ اپنے پاس رکھیں گے پھر دوسروں کے حوالے کر دیں گے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ وہ کہاں گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی بے آبرو لاش کسی چھان چور کے ہاتھ پر مل جائے گی۔ کوئی صحافی عورت کتنی ہی تو بے کیوں نہ بن جائے۔ رہتی تو ایک عورت ہی ہے۔ اور جب کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہو گا تو کوئی ان کا کیا بگاڑے گا۔ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ انہوں نے شبنم کی بے بسی کا کس حد تک ناجائز فائدہ اٹھایا ہو گا۔ شبنم کو بالآخر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ محض دھمکیاں دے رہے ہیں اور اسے ہراساں کر رہے ہیں۔ اگر وہ کچھ کرنے والے ہوتے تو انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کسی کا ڈر تھا۔ شبنم کو انہوں نے سڑک

سے اٹھایا تھا تو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا مگر غالباً ان کے کسی افسر اعلیٰ کو اس اغوا کا علم تھا۔ افسران بالا کی آشریاد کے بغیر ماتحت یہ کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ اس افسر اعلیٰ نے کہا جو گا کہ زبانی کلامی جو چاہو کرو مگر عملاً شبنم کے ساتھ کوئی جسمانی زیادتی نہیں ہوئی چاہے۔ ورنہ بعد میں سب مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جسمانی گزند سے محفوظ رہی مگر جو ذہنی تشدد اس نے برداشت کیا وہ حد سے زیادہ تھا۔ اس کے نتیجے میں بڑے بریک ڈاؤن ہونا تو معمولی بات ہے۔ وہ بالکل بھی ہو سکتی تھی۔“

میں سخت شاک کی کیفیت میں بیٹھا رہا ”یہ تو لا قانونیت کی انتہا ہے۔“

”تم اس کے خلاف کیا کر سکتے ہو۔ آواز تک نہیں اٹھا سکتے۔“ ڈاکٹر عائشہ نے کہا ”تم شبنم سے زیادہ بے بس ہو۔ اس واقعے کے خلاف رپورٹ ابھی تک نہیں لکھوائی گئی ہے۔ اس کا علم گئے پنے صحافیوں کو ہے۔ وہ سنجیدہ اور ذمے دار لوگ ہیں۔ میری ان سے بات ہو چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رپورٹ ضرور لکھوائی جانی چاہیے مگر اس کا انحصار شبنم کے رویے پر ہے۔ فیصلہ بہر حال وہ خود ہی کرے گی۔ ابھی تو خود شبنم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ تھے اور اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی تھانہ تھا مگر اندر باہر سے سارے تھانے ایک جیسے لگتے ہیں۔ آج کل ایسی لا قانونیت کا مظاہرہ بھی عام سی بات ہو گئی ہے جس کے خلاف نہ دابہ نہ فریاد۔“

میں نے کہا ”میرا خیال ہے کہ میں اس واقعے کے ذمے داروں کو پکچان سکتا ہوں۔“

”لیکن تم سامنے نہیں آ سکتے۔ تم خود رو پوش ہو۔“
”شبنم کے ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہو گا کہ وہ کسی پر شک ظاہر کرتی ہے یا نہیں“ میں نے کہا۔

”کیا میں تم سے ایک درخواست کر سکتی ہوں؟“
میں نے کہا ”آپ حکم کریں۔“

”میرے لیے دوبارہ یہ آزمائش کی صورت حال پیدا مت کرنا۔ میں کسی قانونی مشکل میں پڑنا انور نہیں کر سکتی۔ مجھے کام کرنا ہے اور اپنی گندول کی بہر حال فکر ہے۔ مجھ پر یہ الزام نہ آئے کہ میں قانون کے خلاف کام کرتی ہوں۔ آج میں نے تمہیں اس لیے بچایا کہ میں مریض کے انٹرنسٹ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں تمہیں گرفتار کر دیتی تو شبنم کی قربانی رائیگاں جاتی اور اس کا منفی اثر شبنم کے ذہن پر بہت برا ہوتا۔ تمہیں بچانے کے لیے اس نے بہت ٹارچر برداشت کیا

تھا۔“

میں نے کہا ”یہ آپ کا احسان ہے مجھ پر۔“
”مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ لیکن کل جو شبنم کے ساتھ ہوا وہ کل بچر ہو سکتا ہے۔ اور اگلی بار اس بربریت کا شکار کوئی اور بھی ہو سکتا ہے جو تمہیں اتنا ہی عزیز ہو۔ یہ رشتوں کی زنجیریں آدمی کے ارادے کو سب سے زیادہ کمزور کرتی ہیں۔ تم بھی بالآخر مجبور ہو جاؤ گے۔“

میں نے کہا ”میں نے سیاست کے اس کھیل کو خیر یاد کر دیا ہے جس میں میری حیثیت خطر کی سیڑھی پر رکھے ہوئے پیادے جیسی ہو گئی تھی جسے ناپید ہوا ہاتھ اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اب میں نے مزید استعمال ہونے سے انکار کر دیا ہے تو بڑے بڑے شاطروں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں ایک معمولی پیادے کی بغاوت سے ان کی بازی مات نہ ہو جائے۔“

”ایسا تو ہوتا ہے ایسے کھیل میں۔ کیا تمہیں کھیل میں شریک ہونے سے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا؟“

میں نے کہا ”اندازہ ہونے کے باوجود میں مجبور تھا۔ لیکن جب تک میں کھیل میں شامل تھا مجھے استعمال کرنے والے ہاتھ ہی میرے محافظ تھے۔ اب میں اس دلدل سے نکھنا چاہتا ہوں تو مجھے ہر طرف دشمنی کے خارزار پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شبنم کے ساتھ جو بھی ہوا بالکل غیر متوقع نہیں تھا مگر ایسے پھنکڑے مجھے بے حوصلہ نہیں کر سکتے۔“

ڈاکٹر عائشہ نے سر ہلایا ”وش پوری بیسٹ آف لک۔ تم جب تک چاہو یہاں رک سکتے ہو مگر میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو بھی بچاؤ اور شبنم کو بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پولیس بالآخر شبنم کو یہاں LOCATE کر لے۔ ابھی شاید وہ سرکاری اسپتالوں میں دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ شبنم کے اس ساتھی باہر قار کی دوراندیشی ہے کہ وہ اسے یہاں لے آیا۔ یہ ذرا گتنام سا اسپتال ہے۔ لیکن پولیس کو انڈر ESTIMATE مت کرو۔ شبنم تمہارے لیے ایک جال ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ شبنم کی اس حالت پر تم خود بے چین ہو کے دوڑتے ہوئے آؤ گے۔ اور تم آگے ہو۔ اگر یہ کوئی مشورہ یا سرکاری اسپتال ہوتا تو اب تک تم پکڑے جا چکے ہوتے۔“

میں نے کہا ”یو آر رائٹ۔ مجھے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔“
”میری مانو تو تم یہاں مت روکو۔ شبنم کو اب کوئی خطرہ نہیں۔“

میں نے کہا ”جینم آپ کے پاس ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں۔“
 ”پھر تم جاؤ۔ کیونکہ خدا خواست پولیس یہاں آ پہنچی تو میں کسی طرح بھی تمہیں نہیں بچا سکوں گی۔ جینم ابھی سو رہی ہے اور شام تک سوئی رہے گی۔ آج رات بھی ہم اسے SEDATION میں رکھیں گے۔ کل دیکھیں گے کہ اسے جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں“ وہ باہر جانے کے لیے اٹھی۔

میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا ”آپ جیسے خیر خواہ کی بات نہ مان کے میں مزید خرابی کے اسباب پیدا نہیں کر سکتا۔“
 ”تم تھوڑی دیر یہاں رکھ۔ پہلے میں دیکھ لوں گا ہر کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے۔ میں تمہیں ابھی اپنے آپس سے فون کرتی ہوں“ ڈاکٹر عائشہ نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

میں جینم کو دیکھتا رہا۔ اپنی تمام بلند ہستی اور قوت ارادی کی مضبوطی کے باوجود وہ مجھے ایک چھوٹی سی سہمی ہوئی بچی لگی جس نے بریت کے جنگل کی ایک سفاک رات کا سفر اکیلے طے کیا تھا اور خوف زدہ کرنے والے ہر درندہ صفت عفریت کا مقابلہ کر کے سلامتی کی منزل تک تو پہنچ گئی تھی لیکن اس کے بعد بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کی بے زبانی صدا دیتی تھی کہ دیکھو مجھے جو ویدہ عبرت نگاہ ہو۔ اور میری سنو کہ میرا یہ حال صرف محبت نے کیا۔ وہ محبت جو مجھے شاہ عالم سے مل گئی ہے اور رہے گی۔

سرخ گلاب کے نیچے اس کا جسم بالکل ساکت تھا اور چہرہ کچھ زرد نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے بدن میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ شاید لاشعوری طور پر اس نے میرے لمس کو محسوس کیا تھا۔ اس کی حالت نے مجھے افسردہ بھی کیا اور میرے وجود میں ایک خواہش کو بھی بیدار کیا کہ میں اس ظلم اور لاقانونیت کے ذلتے داروں کو سزا دوں مگر وہ لوگ بے چہرے تھے اور اپنی شناخت رکھنے کے باوجود وہ پوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سینٹ کا بزرگ آہستہ سے بولا تو میں نے ریسپونڈ اٹھایا ”ہی۔ یو لین کم“ ڈاکٹر عائشہ کی آواز آئی ”ابھی مجھے کوئی مشکوک چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے۔“
 میں جینم پر آخری نظر ڈال کے باہر نکلا اور ڈاکٹر عائشہ کے آفس میں پہنچ گیا جہاں رہیں میرا خضر تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے اپنے سامنے اسی نوجوان کو دیکھا جس نے گزشتہ شب مجھے شاہ عالم سمجھ کے

میرا تعاقب کیا تھا۔ اس وقت میں نے جھڑک کے اسے بھاگایا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں، ناصر عظیم ہوں اور اس کی ایک نہیں سنی تھی، اب اس کی نظر مجھ پر جم گئی۔ لیکن میرے لیے اس سے نظر ملانا مشکل ہو گیا۔ فوری طور پر ڈاکٹر عائشہ کے کمرے سے فرار بھی مشکل تھا کیونکہ چائے کا ایک کپ میرے انتظار میں تھا۔
 ”جینم شاہ عالم!“ ڈاکٹر عائشہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا ”چائے پو۔“

میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا اور اس نوجوان سے نظریں چرا تا رہا جس کے سامنے اب میرا بھوت پوری طرح کھل گیا تھا۔

ڈاکٹر عائشہ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کے کہا۔
 ”دیکھو اسلم“ مجھے تمہارے حالات سے پوری ہمدردی ہے لیکن مجھے بتاؤ ”میں کیا کروں؟ تمہاری ماں کی باری ایسی نہیں ہے کہ ہفتہ دس دن یا مہینے دو مہینے کے علاج سے وہ صحت یاب ہو جائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انہیں چھ مہینے سے ایک سال تک مسلسل علاج کی ضرورت ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے فرض کرو میں تم سے کوئی فیس نہ لوں، تمہاری والدہ کو جزل وارڈ میں ایک بیڈ بھی دے دوں لیکن دواؤں کا انتظام تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اور اگر دواؤں کا بندوبست نہیں ہوگا تو پھر ان کو یہاں لٹا کر رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟“

ڈاکٹر عائشہ کی بات اسلم نام کے اس نوجوان نے ضرور سنی ہوگی مگر وہ میری طرف متوجہ تھا ”سر آپ شاہ عالم ہی ہیں نا؟“

میرے کچھ کہنے سے پہلے ڈاکٹر عائشہ نے کہا ”یہ تو شاہ عالم ہیں مگر تم ادھر دیکھو میری طرف۔“
 میری پوزیشن سخت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے صورت حال کو سمجھانے کی پوری کوشش کی ”دیکھو۔ ہم باہر جا کے بات کریں گے۔“

وہ بولا ”سر آپ نے میرے ساتھ۔“
 میں نے سختی سے اس کی بات ٹھٹھکی ”آخر تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ہر بات کا ایک موقع مل جاتا ہے پہلے تم ڈاکٹر عائشہ کی بات سن لو۔“
 ڈاکٹر عائشہ کچھ حیران ہوئی ”تم جانتے ہو اسے شاہ عالم؟“

میں نے کہا ”ایسے تو نہیں جانتا جیسے آپ کو جانتا ہوں۔ کل رات یہ مجھے ملا تھا اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس وقت موقع نہیں تھا کہ میں اس کی سن سکتا۔ میرے ساتھ

کوئی اور تھا۔“

ڈاکٹر عائشہ نے سر ہلایا ”اسلم! میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ علاج مہنگا بھی ہے اور طویل بھی۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میرا ہسپتال چلے جاؤ یا گنگا رام۔ وہاں مریضوں کی فلاح کے لیے بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں۔ بڑے اسپتالوں میں ویلفیئر ایسوسی ایشنز ہوتی ہیں جو خیر حضرات سے عطیات وصول کرتی ہیں۔ دوائیں اکٹھی کرتی ہیں اور غریب اور مستحق مریضوں کو فراہم کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں وہاں سے اپنی ماں کے لیے دوائیں مل جائیں یا کوئی تمہاری مدد کرے۔ یہ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کا خرچ ہے۔“

اسلم کی صورت پر مجھے وہی بے بسی اور مظلومیت نظر آ رہی تھی جس کا مشاہدہ میں نے گزشتہ رات کیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے اپنی ماں کے علاج کے لیے دوائیں ہی مانگنا چاہتا تھا مگر اس نے وہ خیرات قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو میں اسے دے رہا تھا۔ اپنے گزشتہ شب کے بدسلوکی والے رویے کی غلطی کرنے کے لیے اور اسے خاموش کرنے کے لیے میں نے کہا ”دو ہزار روپے مہینے کی بات ہے۔ ڈاکٹر عائشہ! بے ذتے داری میں قبول کرنا ہوں۔“

ڈاکٹر عائشہ نے کہا ”کو۔ تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب ان کا شکریہ ادا کرو۔“

اسلم نے مجھے بے بسی کے ساتھ دیکھا۔ گزشتہ رات میں اس سے بات بھی کرنے کا روادار نہ تھا اور آج میں نے ایک احسان کر کے اسے خرید لیا تھا۔ ”شاہ عالم صاحب! میں آپ کا بیشہ احسان مند ہوں گا۔“

میں نے کہا ”کل رات تم یہی کہنا چاہتے تھے؟“
 ”نہیں سر۔ وہ دوسری بات تھی۔“

میں نے پرس نکالا اور دو ہزار روپے اس کے سامنے رکھ دیے ”یہ لو اس مہینے کی دواؤں کا خرچ۔ آئندہ تمہیں ہر مہینے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا سیکرٹری یا کوئی ملازم تمہارے گھر خود جا کے رقم دے آئے گا۔“

”میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟“
 میں نے کہا ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم باہر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی تم سے بات کرتا ہوں۔“

وہ خاموشی سے دو ہزار روپے اٹھا کے باہر چلا گیا۔
 ڈاکٹر عائشہ نے کہا ”اسلم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہا ”دراصل کل رات یہ ملا تو میں نے خود کو شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

”یعنی وہ تمہیں پہلے سے جانتا تھا؟“

”مگر میں اسے نہیں جانتا۔“ میں نے کہا ”اور اسی لیے میں کچھ گھبرایا تھا۔ میں نے کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ آج پھر اس سے ملاقات ہو گئی اور آپ کے منہ سے اس نے میرا نام سنا تو چکر میں پڑ گیا۔“

”شاہ عالم! آخر تم کب تک ایسے زندگی گزارو گے؟“
 میں نے کہا ”یہ تو مجھے بھی علم نہیں۔“

”تم اپنے خلاف مقدمات کو عدالتوں میں فیس کیوں نہیں کرتے۔ اگر تم بے قصور ہو تو رہا ہو جاؤ گے باعزت طور پر۔“

میں نے تلخی سے کہا ”جس کا اس نظام انصاف سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو وہ اسی خوش فہمی میں رہتا ہے کہ عدالتوں سے انصاف مل جاتا ہے۔ جھوٹے کا منہ کالا اور سچے کا بول بالا ہوتا ہے۔ لیکن جو میری طرح اس دلدل میں پھنس جائے اس کے لیے ہر قدم پر دلدل اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ میرے خلاف سازشوں کا جال بڑا مضبوط ہے اور جال بننے والے ہاتھ اس سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔“

”پھر تم کیا کرو گے؟ ساری عمر بھاگتے رہو گے؟“ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا ”نہیں۔ مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔“
 رہیں نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا ”اس نوجوان کی ماں کا کیا کیس ہے؟“

ڈاکٹر عائشہ نے کہا ”ایک عام سا گھریلو مسئلہ ہے جس سے غریبی میں تنہا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسلم اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہے۔ چار بہنیں ہیں جن کی شادی ہو گئی۔ یہ خود معمولی بڑھا لکھا ہے اس لیے نوکری ملتی نہیں یا ملتی ہے تو عارضی قسم کی محنت مزدوری والی۔ اس کا باپ ہاتھ کی کمائی سے گزارے لائق کمائی کر لیتا تھا۔ وہ ماتھے پیشل کے برتنوں پر نقش و نگار پٹانے اور کندہ کاری کا ماہر تھا۔ اس نے بیٹے کو کبھی یہ ہنر سکھانے کی کوشش کی تھی مگر اسلم نے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ دراصل اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ کام کرنے کی وجہ سے ہی باپ بچاس سال کی عمر میں اندھا ہو گیا تھا۔ وہ دن رات دھات کے برتنوں پر جھکا جھوڑا چھنی سے کھدائی میں مصروف رہتا تھا۔ بہت باریک اور نفیس کام ہوتا تھا مگر اس کے لیے وہ دن رات محنت کرتا تھا۔ دن میں وہ اپنی جھونپڑی کے باہر چوتھے پر بیٹھتا تھا تو سورج کی روشنی دھات کے برتن پر سے منعکس ہو کے اس کی نظروں کو خیرہ کرتی تھی اور

رات کے وقت وہ جھوپڑی کے اندر لائین کی روشنی میں کام کرتا تھا تو کافی روشنی میں آنکھوں پر بہت زور پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اس کی آنکھیں بے کار ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بے روزگار ہو گیا۔ جس شخص کے لیے وہ کام کرتا تھا اس نے آنکھوں کا علاج بھی نہیں کرایا۔ لیکن علاج سے فائدہ کوئی نہ ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیکسا کے مشن اسپتال پہنچا جہاں اس کی آنکھوں کا معائنہ غیر ملکی ڈاکٹروں نے کیا۔ اگر ممکن ہوتا تو وہاں اس کا مفت علاج ہو جاتا لیکن اس کی آنکھیں بالکل ہی جواب دے چکی تھیں۔ آخری علاج آرٹھین تھا مگر قرنیہ کی تبدیلی کے خواہش مند بہت تھے۔ اس کا نام وینٹک لسٹ میں لکھ لیا گیا اور اسے بتا دیا گیا کہ جب اس کی باری آئے گی اور قرنیہ دستیاب ہوگا تو اس کی ایک آنکھ میں لگوا جائے گا۔ اندازہ یہ ہے کہ اگر وہ انتظار کرتا تو شاید دس برس میں اس کا نمبر آجاتا مگر وہ دس سال کیسے بیٹھا رہتا اور بیٹھا رہتا تو کھانا کہاں سے۔ خیال یہ ہے کہ کچھ عرصہ فائدہ کشی اور سختی میں گزار کے وہ حوصلہ ہار گیا۔ وہ ایک دن اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ اسلم کا کہنا ہے کہ وہ اسی شخص کے پاس گیا تھا جس کے لیے وہ ساری عمر کام کرتا رہا تھا اور جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کے تیس سال اور اپنی آنکھیں گنوا دی تھیں۔ لیکن وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ اس کے لاپتا ہونے کی رپورٹ پولیس میں بھی لکھوا دی گئی مگر لا حاصل۔ لوگوں نے فرض کر لیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا یا اس نے خودکشی کر لی۔ وہ اکثر مرنے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اسلم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور اس شخص کے پاس بھی گیا جس کے پاس اس کا باب کام کرتا تھا مگر اسے کوئی مدد نہ ملی۔ اسلم مایوسی کی کیفیت میں چوری چکاری کر سنے لگا۔ اس نے گاڑیوں میں سے ریڈیو نیپ نکالنے شروع کر دی۔ لیکن ابھی یہ کام شروع ہی کیا تھا کہ پکڑا گیا اور چھ مہینے کے لیے جیل چلا گیا۔ جیل سے نکل کے اس نے چوری چکاری سے توبہ کی اور کہیں محنت مزدوری کرنے لگا مگر اس کی بد قسمتی کہ بے درپے حادثات نے ماں کا دماغ خراب کر دیا۔ اس نے ماں کا علاج سرکاری اسپتالوں سے کرائے کی کوشش کی مگر وہاں غریبوں کو پوچھتا کون ہے۔ نہ جانے کس نے اسے میرا بتا دیا اور وہ یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ بڑی مشکل ہے۔ ہم میاں بیوی مقدور بھر کوشش ضرور کرتے ہیں کہ غریبوں کا بھی علاج کریں۔ ہم ان سے فیس مشورہ نہیں لیتے اور وہاں لکھ کر دے دیتے ہیں مگر ان پیاریوں کا علاج بھی بہت مہنگا ہے۔ ہم سب کو میاں داخل بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس بہت محدود جگہ ہے۔ اس

نوجوان اسلم کی ماں کو میں نے ترس کھا کے ایک سروٹ کوارٹر میں رکھ لیا تھا جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اب علاج سے فرق پڑا ہے تو اسلم کے پاس دواؤں کے پیسے نہیں رہے۔

میں نے پوچھا "اس کی ماں ٹھیک تو ہو جائے گی؟"

"مجھے پوری امید ہے۔"

میں نے کہا "چلیں پھر آپ علاج جاری رکھیں۔ آپ کس تو میں سال بھر کا خرچ آپ کو ایڈوائس دے جاؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتی ہوں اسلم اب اپنی ماں کو گھر لے جائے۔ اس کی کنڈیشن اس حد تک STABLE ہے کہ اس کا علاج گھر پر جاری رہ سکتا ہے لیکن گھر میں اسلم کے سوا کوئی ہے نہیں۔ وہ صبح سے شام تک کام کے سلسلے میں باہر رہتا ہے۔ گھر پر مریض کی دیکھ بھال کون کرے لیکن یہ ایسے مسائل ہیں جن کا کل اسپتال والوں کے پاس نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "جبم کے علاج معالجے کے اخراجات بھی ہوں گے۔"

وہ بولی "اس کی تفصیل تمہیں اکاؤنٹنٹ سے مل جائے گی۔" ڈاکٹر عائشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں بھی اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر آ گئے۔ وہاں میں نے اکاؤنٹنٹ کے پاس پانچ ہزار روپے جمع کرادیے اور اس نے مجھے رسید بنا دی۔ مختصر سے لاؤنج نماؤنگ روم میں اس وقت بھی چار پانچ افراد بیٹھے تھے۔ ان میں اسلم بھی شامل تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ آگے آیا اور پیچھے پیچھے چلے لگا۔

میں نے کہا "اسلم تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو۔ رقم ہر مہینے تمہارے گھر پہنچتی رہے گی۔"

وہ بولا "یہ بات نہیں شاہجی!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے اپنے والد کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔" اس نے گاڑی کے پاس رک کے کہا۔

میں نے کہا "میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اگر وہ لاپتا ہو گئے ہیں تو ان کا سراغ پولیس لگا سکتی ہے۔"

وہ بولا "یہ بات نہیں سرب۔ مجھے شک ہے کہ انہیں ملک رب نواز نے قتل کر دیا ہے؟" اسلم نے سپاٹ لیجے میں کہا۔

میں چونک پڑا "یہ تمہارے لیے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وہ ملک رب نواز کے لیے کام کرتے تھے اور آخری بار

اس سے ملنے گئے تھے۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر گئے تھے لیکن اس کے بعد انہیں باہر جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "فرض کرو ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن کسی ثبوت یا دوا کے بغیر تم ملک رب نواز کے خلاف کوئی الزام کیسے عائد کر سکتے ہو۔"

اس نے سر جھکا لیا "یہ تو مجھے معلوم ہے جناب! لیکن وہ آپ کے دوست ہیں۔ آپ ان سے معلوم کر سکتے ہو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا میرے پوچھنے سے ملک رب نواز بتا دے گا کہ اس نے تمہارے والد کو کہاں اور کیسے غائب کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ رب نواز میرا دوست ہے۔"

رہیں نے پریشانی سے اوڑھ اوڑھ دیکھا "یار! ہم یہاں کھڑے رہ کر باتیں نہیں کر سکتے۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسلم سے کہا "اندر بیٹھو۔" اور پھر خود بھی اس کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا اور ان کا برنس ایک ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہلے ایسا ہی تھا مگر اب ہم الگ ہو گئے ہیں اور آج پوچھو تو آج ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا "آپ میری مدد کرنا نہیں چاہتے، کل رات بھی آپ نے مجھے نالے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "کل رات میری ایک مجبوری تھی۔ اس لیے میں نے تمہیں ٹال دیا تھا۔ لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے کہ میں تمہاری مدد نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ڈاکٹر عائشہ نے تفصیل سے تمہارے حالات کے بارے میں بتا دیا ہے۔"

اس وقت تک رہیں نے گاڑی یا ہرنکال لی تھی اور ہم اسپتال سے کچھ دور آ گئے تھے۔ باہر ابھی دھوپ تھی لیکن گاڑی کے سیاہ شیشوں سے ماحول ابراؤد دکھائی دیتا تھا۔ تجزیہ کے انٹرنلٹ شیشوں نے باہر کا سارا شور دھواں اور گردوغبار روک لیا تھا اور اندر خاموش سرسراہٹ کے ساتھ گاڑی کا اسے ہی اپنی خوشگوار ٹھنڈک پھیلا رہا تھا۔

میرا ذہن جبم کے معاملات میں الجھا ہوا تھا اور فی الحال میں دیگر مسائل کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اسلم اپنے مسئلے کے ساتھ میرے سامنے تھا اور اس سے نجات کی یہی ایک صورت تھی کہ میں اس کی بات سن لوں۔

"مجھے شک ہے جی کہ رب نواز نے میرے والد کو قتل

کر دیا ہوگا۔"

میں نے کہا "شک کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے مگر شک کی کوئی وجہ؟"

رہیں نے بھی کہا "تمہارے والد نے ملک رب نواز کا کیا بگاڑا تھا آخر؟"

"ہو سکتا ہے میرے والد نے ملک رب نواز کو ہتھی دی ہو؟" اسلم نے کہا۔

"دھمکی کیسی؟"

"دراصل وہ اپنی بیٹی جانے کے بعد حد سے زیادہ مایوسی کا شکار تھے اور گھر کرتے رہتے تھے کہ ملک رب نواز نے ان کی جوانی لے لی۔ ان کی آنکھوں کا نور چھین لیا اور اس کے بدلے میں انہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ ان کی محنت سے رب نواز نے لاکھوں کا فائدہ حاصل کیا مگر محنت کرنے والے کو روکھی سوکھی بھی بیت بھر کے نصیب نہ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ رب نواز نے میرا بہت استحصال کیا ہے اور اب میں کسی قابل نہیں رہا تو اسے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مجھے وہی روکھی سوکھی پانے کے لیے کسی کے سامنے بھگ نہ مانگی پڑے۔ وہ کئی بار ملک رب نواز سے ملے مگر اس نے میرے والد کی بات بھی سننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ پیسے کام کے ملتے تھے اور اب کام نہیں تو پیسے کیسے۔ یہ کوئی سرکاری نوکری نہیں تھی جس میں بڑھاپے کی پنشن ہو۔"

میں نے کہا "ہر آجر اور صنعت کار ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

"میرے والد نے ایک بار گھر میں ذکر کیا تھا کہ رب نواز بڑا چور اور جھٹسا ہے لیکن اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر ایک دن وہ چلانے لگا کہ اگر ملک رب نواز نے میری بات نہ مانی تو میں اس کے بارے میں سب کو بتا دوں گا کہ وہ کیا کرتا ہے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے والد نے ملک رب نواز کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہوگی؟" رہیں نے پوچھا۔

"اسے بلیک میلنگ تو نہیں کہا جاسکتا۔" اسلم نے فحقی سے کہا "انہوں نے تیس سال ملک صاحب کی خدمت کی تھی۔ کیا اس کے بدلے میں انہیں کچھ مانگنے کا حق نہیں تھا؟"

میں نے کہا "اسلم! اتنا تو تمہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ بھگ مانگنے، حق مانگنے اور دھمکی دے کر مانگنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

رہیں نے سوال کیا "آخر تمہارے والد کو ایسی کیا بات معلوم تھی جو لوگ نہیں جانتے تھے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا "اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو کچھ دکھاؤں۔"

میں نے کہا "ابھی اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم ایسے ہی بناؤ۔"

وہ بولا "میرے والد کمال کے کاریگر تھے وہ دھات پر ہر قسم کے نقش و نگار اُبھارتا جانتے تھے لیکن وہ ایک اور کام کے بھی ماہر تھے وہ پرانی چیزوں کی نقل بنالیتے تھے۔"

میں نے رہیں کی طرف دیکھا "تمہاری مراد نوادرات سے ہے؟"

"نہیں جی۔ ان کو انگریزی میں این ٹیک کہتے ہیں۔ وہ بولا۔"

میں نے کہا "میری مراد انہی چیزوں سے تھی۔"

رہیں نے گاڑی کو ایک جگہ روک لیا "وہ کیا کرتے تھے؟"

"وہ نئی دھات کو پگھلا کے ایسے برتن بناتے تھے اور بھی بہت سی چیزیں مثلاً زیورات۔ سکے، خنجر اور سکواریں جو دیکھنے میں بہت پرانی لگتی تھیں۔ اس کے لیے وہ اپنے خاص طریقے سے نئی دھات میں کچھ چیزیں شامل کرتے تھے مثلاً ریت، مٹی، کوئلہ اور چونا اور رنگ کھایا ہوا لہو، مجھے صحیح فارمولا معلوم نہیں مگر جب وہ چیزیں تیار ہوتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے کئی سو سال پرانی ہیں۔ ان پر وہ خاص طریقے سے کام کرتے تھے۔ ان پر خاص قسم کے کیمیکل لگاتے جاتے تھے اور انہیں کبھی کبھی میں پکایا جاتا تھا کبھی پانی میں ڈال کے رکھا جاتا تھا تو کبھی زمین میں دبا کے بالآخر جو چیز تیار ہو کے سامنے آتی تھی وہ این ٹیک کا نمونہ ہوتی تھی۔ ماہرین کی بات الگ ہے۔"

عام لوگ اس سے دھوکا کھاتے تھے اور ان کی قیمت اصل لاگت سے کئی ہزار گنا زیادہ مل جاتی تھی۔ مگر یہ سارا فائدہ رب نواز اٹھاتا تھا جو ان چیزوں کو غیر ملکی گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ میرے والد نے ایک بار مجھے ایک چاقو دکھایا تھا جو انہوں نے اپنے مخصوص طریقے سے تیار کیا تھا۔

ان کا کتنا تھا کہ ویسے تو یہ بے کار ہے۔ اس سے آدمی سب تک نہیں کاٹ سکتا مگر شوقین لوگ اسے دس میں ہزار میں لے جاتیں گے۔ پہلے ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر بعد میں والد کے ایک دوست نے مجھے تفصیل سے سمجھایا تو مجھے پتا چلا کہ دنیا میں این ٹیک اور تاریخی حیثیت رکھنے والی چیزوں کا کیا مول ہے۔ میں نے سنا ہے باہر کے

ملکوں میں جا کے یہ چیزیں اور مستحق فروخت ہوتی ہیں۔"

میں اس کی بات غور سے سنتا رہا تھا "تھک سنا ہے تم نے مگر ایک بات بتاؤ۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہارے والد خود ایک جہاز تھے؟"

"نہیں جہاز بنایا گیا۔ وہ خود صرف ایک ماہر کاریگر تھے اور دھاتی کام جانتے تھے۔ ان کو اس لائن پر لگانے والا ملک رب نواز تھا مگر اس نے لاکھوں کمائے اور میرے والد کو پوری مزدوری بھی نہیں دی۔ اگر آپ انہیں کھودینے کے بعد میرے والد نے اس سے کچھ مانگ لیا۔"

"کچھ؟"

"میرے والد نے صرف دو لاکھ مانگے تھے۔"

میں نے کہا "صرف دو لاکھ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کتنے غریبوں کا لہو چوس کر یہ دو لاکھ جمع ہوتے ہیں اور ملک رب نواز جیسے خون لٹی کر اپنی دولت مندی کے غرور کو پروان چڑھانے والے کسی کو دو روپے کی خیرات بھی دیتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے نامہ اعمال میں اس نیکی کا اندراج دوبار ہو جائے۔ تمہارے والد نے یہ کیا بے وقوفی کی کہ ساری عمر کمال رہنے کے بعد ملک رب نواز کے سامنے لکھ جی بننے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور انکار پر اسے دھمکی بھی دے دی۔"

"انہوں نے کوئی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ ان کا حق مار مار کے ملک رب نواز نے لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے تھے۔ کیا تھا اگر ان کا بیڑا آرام سے گزر جاتا۔ وہ کوئی عیاشی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک لاکھ میں اپنے لیے ایک کمرے کا مکان بنانا چاہتے تھے۔"

میں نے کئی سے کہا "ساری عمر جمو پڑی میں گزارنے کے بعد۔ جب ان کی آنکھوں میں روشنی تھی اور وہ دیکھ سکتے تھے کہ رب نواز انہیں مزدوری کے چند گنے دے کر ہزاروں کی چیزیں لوٹ رہا ہے تو انہوں نے اپنے حق کا سودا نہیں کیا اور جب آنکھوں کی روشنی چلی گئی تو وہ بھیک کی طرح یہ حق مانگنے چلے گئے اور پھر اتنی جرات کی کہ ملک رب نواز جیسے ما غنڈے سے دو لاکھ غنڈا نکلیں کی طرح مانگے۔"

"آپ بار بار مجھے ان کی غلطی کا احساس دلا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اس غلطی کا خمیازہ وہ بھگت چکے ہیں۔ کیا اب بھی تم حق اور انصاف کے چیمپئن کھانا چاہتے ہو۔ تمہارے دل میں یہ خواہش بیدار نہیں ہوتی کہ تم ظلم اور زیادتی کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرو؟ تم انتقام کی بات کیوں نہیں کرتے؟"

نوادرات خریدتے ہیں نہ بیچتے ہیں۔" میں بولا۔

"سر! اگر آپ مجھے کسی کا پتا بتائیں، آپ تو لوگوں کو جانتے ہیں؟"

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ میں اسے جعلی نوادرات بنانے اور بیچنے کے مذموم کاروبار کی قانونی نوعیت سے آگاہ کروں لیکن پھر مجھے اس کے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم اور اس کی ماں کی قابل رحم حالت کا خیال آگیا اور میں نے سوچا کہ دنیا کے بازار میں ملک رب نواز اور پیر سبحان جیسے نہ جانے کتنے یہ جعلی نوادرات بھرتے جا رہے ہیں اور اس کے عوض ملنے والی دولت سے اپنے خزانے بھر رہے ہیں تو اگر اس جہاز کے کاروبار میں یہ لڑکا بھی تھوڑے سے نوادرات کے ساتھ چلا گیا تو اس سے اتنا بھی فرق نہیں پڑے گا جتنا سمندر میں ایک لٹا پلائی ڈالنے سے پڑ سکتا ہے۔

میں نے کہا "کمال! میں تمہارے یہ نوادرات؟"

وہ کچھ پر امید ہوا "ہمارا گاؤں یہاں سے چالیس میل دور ہے۔ میں آپ کو لے جا سکتا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیں۔"

میں نے کہا "تم مجھے اپنا پتا دو۔ جیسے ہی مجھے کسی ڈیلر کا پتا معلوم ہوگا جو تمہارے مال کی اچھی قیمت دے سکے۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں جناب عالی کہ ان چیزوں کی کیا قیمت ہوگی۔ مجھے تو مول تول کرنا بھی نہیں آتا لیکن مجھے ان کی صحیح قیمت مل جائے تو میرے دن بھر سکتے ہیں۔ میں آپ کا بیشداہ احسان مند رہوں گا۔"

میں نے اسے سمجھایا "دیکھو اسلم! تمہارا یہ مال ایسا نہیں ہے کہ تم باریکٹ میں سپلائی کر دو۔ کیا تم نے آج تک نوادرات کی کوئی دکان دیکھی ہے؟"

"دکان تو نہیں دیکھی جناب!۔"

"دکان ہے بھی نہیں لاہور میں۔ اس کے ڈیلر ہوتے ہیں جو سودے کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ ایسی چیزوں کے گاہک بہت دولت مند لوگ ہوتے ہیں یا پھر غیر ملکی سیاح۔ یہ چیزیں ملک سے باہر لے جا کے بیچی جاتی ہیں۔ یورپ، امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں۔ تم خود وہاں نہیں جاسکتے اور تمہیں تجربہ بھی نہیں ہے۔ کوئی اس لیے تم کو اپنا مال مجبوراً یہاں کے کسی ڈیلر کو دینا پڑے گا۔ ملک رب نواز ایک ڈیلر ہے۔ ایسے ہی پیر سبحان شاہ ہے اور اس جیسے چھ سات دوسرے لوگ ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔ اگر تم ہوشیاری سے کام لو تو ایک ایک کر کے اپنی چیزیں اچھی قیمت پر ان کے حوالے کر سکتے ہو۔ تمہارا ذخیرہ دیکھنے کے بعد میں اپنے

اس کا چہرہ وقت اور کم ہمتی کے جذبات کی تصویر بن گیا۔

"ہم جیسے لوگ ملک رب نواز جیسے طاقتور کا کیا لگا کر سکتے ہیں؟"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا "پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یا ہوگا اسے نوشتہ تقدیر سمجھ کے خوش رہو۔ مہر کو اور دعا کرو کہ خدا تمہارے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا "سر۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا "یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ کوئی میرے والد کو قتل کر دیتا تو میں عدالتوں میں انصاف کے لیے خوار ہونے کے بجائے خود اسے جان سے مار دیتا۔ تم کیسے نوجوان ہو کہ اسے غیبر کے سامنے روئے بھرتے ہو؟"

اس نے اپنا سر جھکا لیا "میں آپ سے کچھ اور کسنا چاہتا تھا۔ میرے والد اب واپس نہیں آسکتے اور مجھ میں بہت نہیں ہے کہ ملک رب نواز کے خلاف انتقام کی بات بھی کروں۔ میرے پاس ان کی کچھ چیزیں پڑی ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر علامہ اقبال کا فرمودہ دہرایا۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا۔ غریب اس لیے غریب رہتا ہے کہ وہ غریبی کو اپنا مقبوض سمجھ لیتا ہے۔ مظلوم کو انصاف اس لیے نہیں ملتا کہ اس کے لب پر بد بختی کو اپنی تقدیر سمجھ کے خاموش رہتے ہیں۔ معاشرتی رویے ایک غلطی اور انتقامی سوچ کے بغیر نہیں بدلتے۔"

رہیں نے کہا "کیا چیزیں ہیں؟"

"دراصل بعد میں انہوں نے یہ کیا کہ جتنی چیزیں ملک رب نواز ان سے ہوا تھا وہ اس جیسی دو بنا لیتے تھے۔ ایک رب نواز کو دے دیتے تھے اور دوسری اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ ایسی بے شمار چیزیں ان کے پاس جمع ہو گئی تھیں جن کو آپ نوادرات کہتے ہو۔ ملک رب نواز کے ذمے وہ ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھتے تھے۔"

"پھر کیا انہوں نے کوئی گودام کرائے پر لے رکھا تھا۔"

"ایک جگہ تھی ان کے پاس" وہ بولا "اس گاؤں میں ہمارا گھر تھا جہاں سے ہجرت کر کے ہم شہر آئے تھے وہاں میرے دادا اور دادی رہے تھے۔ وہ دونوں بھی مر گئے ان کی یہ جگہ خالی پڑی تھی۔"

میں نے کہا "چھا پھر؟"

وہ بولا "میں چاہتا تھا، آپ اس ذخیرے کو دیکھ لیتے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟ ہم یہ کام نہیں کرتے۔ نہ جعلی

انداز سے ہر چیز کی ایک قیمت لگا سکتا ہوں۔ اگر تمہاری قدر نے ساتھ دیا تو ڈیڑھ سے تینس اچھے پیسے بھی مل جائیں گے۔ ڈیڑھ ایک چیز کے گاہک سے دس ہزار سے ایک لاکھ تک وصول کر سکتا ہے۔ اس کا انحصار چیز سے زیادہ گاہک پر ہے کہ وہ کتنا بے وقوف ہے۔ اور کتنا دولت مند ہے لیکن ڈیڑھ تینس اسی چیز کے ہزار دو ہزار یا زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمہارا مال جعلی ہے۔ جو وہ گاہک کو اصلی بتانے کے فروخت کرتا ہے۔ اس لیے تینس زیادہ لالچ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ایسے سر ہلاتا رہا جیسے سب سمجھ گیا ہو۔ اسے نہ دنیا داری کا کوئی تجربہ تھا نہ کاروبار کا۔ اپنے باپ کی طرح اسے زمانے کی ٹھوکرین کھانے کے بست کچھ سیکھنا تھا اور پھر بچھٹانا تھا۔

”میں آپ سے کہاں ملوں گی؟“ وہ سادگی سے بولا۔
میں نے کہا ”ہم یہاں اسپتال آتے ہیں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”لیکن ڈاکٹر عاشر کہہ رہی ہیں کہ اپنی ماں کو گھر لے جاؤ“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”چلو پھر اپنے گھر کا پتا مجھے سمجھاؤ۔“
اس نے ہم سے ایک کانڈ مانگا پھر بال بوائٹ سے اس پر کچھ لکھتا رہا اور ایک نقشہ بنا تا رہا ”یہ ہے جی میرے گھر کا پتا۔“

میں نے کانڈ لے کر دیکھے بغیر جب میں رکھ لیا ”ٹھیک ہے“ اب تم جاؤ۔ اور دیکھو کسی سے بھی اس معاملے کا ذکر مت کرنا۔ تمہارا کام غیر قانونی اور خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کام بننے سے پہلے جڑ جائے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تمہاری شاہ عالم سے ملاقات ہوئی تھی۔“

جب وہ سر ہلا کے چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔
”کل سے کیسے عجیب اتفاقات ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے شناخت کرنے والے مل رہے ہیں۔“

”نہیں بولا“ یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔
نہیں نے کہا ”کیسی عجیب بات ہے کہ جب میں شاہ عالم نہیں تھا تو کوئی مجھے شاہ عالم ماننے کے لیے تیار نہ تھا اور آج میں ناصر عظیم بنا چاہتا ہوں تو کوئی یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتا۔“

”ہنس کی چال چلنے والے کو بے کاہلی حال ہوتا ہے۔
بیتے تو نہ کو رہا نہ جس بتا۔“

”کل پہلے وہ پولیس انسپکٹر راؤ سکندر میرے پیچھے پڑ گیا تھا اور مجھے شاہ عالم ثابت کرنے پر تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ مل گیا“ اسلم آج مجھے ڈاکٹر عاشر کے سامنے تسلیم کرنا ہی پڑا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ وہ ضرور سوچے گی کہ شاہ عالم کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو بڑا بااثر سیاست دان تھا۔ اس کے پاس کارکنوں اور غنڈوں کی ایک فوج تھی اور اس کے اثر و رسوخ کا دائرہ ایوان اقتدار کو چھو تا تھا۔ پھر آج وہ ایسے چوہے کی طرح کیوں چھپتا پھر رہا ہے اور جنم کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر بھی خاموش ہے۔ میں اسے کیسے بتاؤں کہ میں اب ناصر عظیم ہوں جس کا جنم سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔“

رہیں نے کہا ”یہ مسئلہ تو آگے بھی رہے گا۔ اسی شر میں کچھ لوگ تجھے شاہ عالم سمجھیں گے تو کچھ ناصر عظیم۔“
میں نے کہا ”کاش کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے جو جنم کو انوکھا کر کے لے گئے تھے۔“

”پھر کیا کرے گا تو؟ ان کے خلاف رپورٹ لکھوائے گا؟“

”یہی تو ساری خرابی ہے۔ ثبوت باقی نہ رہے اور گواہ کوئی نہ ہو تو کوئی جرم بھی جرم نہیں رہتا۔ نفیث کر کے جرم کا سراغ لگانے کا یہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اور پھر اس کیس میں رپورٹ لکھنے والے خود ہی مجرم ہیں تو رپورٹ لکھنے سے کیا ہوگا۔ ہوتے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ ایسی ہی صورت حال مزید لا قانونیت کو جنم دیتی ہے۔ مظلوم بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود ہی مجرموں کو سزا دینے پر مل جاتا ہے۔“

”تجھے کس پر شک ہے؟“ وہ راؤ شاہ پریا راؤ سکندر پر؟
میں نے کہا ”راؤ سکندر“ اس حد تک آگے نہیں جاسکتا۔ وہ ایک معمولی انسپکٹر ہے اور کل رات اس کی خاصیوصلہ شکنی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اگر وہ کوشش کرے گا تو میرا تعاقب کر کے میری اصلیت معلوم کرے گا۔“

”اس کے ایک ساتھی نے چند اکو بچان لیا تھا۔“
میں نے کہا ”ہاں“ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ وہ دوبارہ مجھ تک پہنچنے کے لیے اس ذریعے (LINK) کو استعمال کر سکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ فوری طور پر چند اکو وہاں سے ہٹاؤں۔“

”اس سے زیادہ فرق نہیں پڑ سکتا۔ اگر کوئی پیچھے پڑ جائے تو وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھ کچھ کر سکتا ہے۔ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس اسپتال میں چندا نام کی جو ترس کام کرتی

تھی وہ اب کہاں ہے۔ وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھ سکتا ہے کہ تمہارا بچپن کا دوست ناصر عظیم کہاں ہے؟“
”یہ نفیث تو نیلم سے بھی پوچھ سکتی ہے مگر اس میں ڈر کی کوئی بات نہیں۔ میں خود کو ناصر عظیم بننے بھی ثابت کر چکا ہوں اور دوبارہ بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے اصل خطرہ ہے ولا در شاہ سے۔ وہ شاہ عالم کا سراغ لگانے کے لیے لندن تک جاسکتا ہے۔ اس کے پاس اختیارات بھی ہیں اور سجان شاہ کی وجہ سے اس کی پہچان اور تک ہے۔“ میں نے کہا۔

اس پریشانی میں سر پڑھو گئی تھی۔ میں ریش کو اسٹوڈیو میں نیلم کے پاس چھوڑنے گیا تو وہ سین چھوڑ کے میرے پاس آئی۔ ہم ایک پروڈیو سر کے آفس میں جا بیٹھے۔
”کہاں پھر رہے ہو تم لوگ؟“ نیلم نے تشریش سے پوچھا۔

میں نے کہا ”کچھ لوگ شاہ عالم کو تلاش کر رہے ہیں۔ کچھ ناصر عظیم کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں دونوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔“

”جنم کا کیا حال ہے؟“ اس نے سوال کیا۔
”خود اس نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ وہ سوری ہے۔ لیکن اس کی معاذ ڈاکٹر عاشر نے سب بتا دیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کھانا کھایا ہے تم نے؟“
میں نے نفی میں سر ہلایا ”صبح سے اب تک خیال ہی نہیں آیا۔“

”اچھا تو پھر میرے ساتھ کھاؤ۔ مجھے بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ میں ڈاکٹر سے کہہ دیتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے ٹوش روک دیں۔“ نیلم نے کہا اور ہر چلی گئی۔
شفٹ میں کام کرنے والے یونٹ کے بالی ارکان بھی مجھ سے شوٹنگ میں مصروف تھے اور وقفہ چاہتے تھے مگر ڈاکٹر کے آگے کسی کی ایک نہیں چلتی تھی۔ اب خود یونٹ نے لچ کا وقفہ لے لیا تو بالی لوگوں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

نیلم اپنا کھانا گھر سے لے کر آنے کی عادی تھی۔ اسٹوڈیو کی ایک ملازمہ نے جو نیلم کے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص تھی کھانا گرم کر کے لگا دیا اور ہم اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے نیلم کو تفصیل سے وہ سب بتا دیا جو مجھے ڈاکٹر عاشر سے معلوم ہوا تھا۔

”تمہارے خیال میں جنم کیا کرے گی؟“ نیلم نے پوچھا۔

میں نے کہا ”وہ کیا کر سکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سب کو سنانے کی تو لوگ محض لطف لیں گے۔ اس ظلم کے کسی ذمہ دار کا اسے نام تک معلوم نہیں۔ وہ سفاک لوگ بت چلا لاک تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کی شناخت ظاہر ہو گئی تو اس کی خیر نہیں۔ پاکستان کے سارے صحافی نیلم کے ہمنوا ہو گئے سخت ترین سزا کے لیے سراپا احتجاج بن جائیں گے۔“

”میں تینس مود الزام قرار نہیں دیتی“ نیلم نے کہا ”مگر تینس جنم کے لیے کچھ ضرور کرنا چاہیے۔“
”مجھے احساس ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ ہو سکتا ہے جنم ہوش میں آئے مجھے اس بد معاشی کے ذمہ داروں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس نے کچھ سنا ہوا نوٹ کیا ہو۔ جو ان کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہو۔ مجھے صرف اتنا پتا چل جائے کہ وہ کھانا کون سا تھا تو میں ایک ایک کی صورت جنم کو دکھاؤں۔ ان کی آواز سناؤں اور پھر وہ جس پر شک کا اظہار کرے اسے ایسی سزاؤں کے اس کی آنے والی سلیس یاد رکھیں۔ مگر ایسے ہوا میں تو حیر نہیں چلا جاسکتا۔“

”اس بد معاشی کا کچھ تو سدباب ہونا چاہیے ناصر!“
میں نے کہا ”میں بھی دیکھو جنم کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس سے احتجاج کرنے کی اپیل کرے۔ وہ کسی کا نام لیے بغیر تفصیل میں جائے بغیر پولیس کی غنڈا گردی کی شکایت کرے اور بتائے کہ اسے غیر قانونی طور پر انوکھا کر کے کسی نامعلوم مقام پر رات بھر تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ شاہ عالم کہاں ہے؟ شاہ عالم پولیس کی تحویل سے فرار ہوا تھا اور اب پولیس اسے دوبارہ گرفتار کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بجائے ایسے جھگڑوں پر اتر آئی ہے۔“

”لیکن جرنلسٹوں کے احتجاج سے وہ محفوظ تو نہیں ہوگی۔“
”لا قانونیت سے یہاں کس کو تحفظ ہے۔ تمہارے ساتھ سیکیورٹی گارڈ کیوں رہتے ہیں؟ اس لیے کہ تم بھی غنڈا گردی سے ڈرتی ہو۔ غنڈے کہاں نہیں ہوتے اور جہاں کی پولیس خود غنڈا گردی پر اتر آئے وہاں شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر میں بھی جنم کے ساتھ ایک یا دو سیکیورٹی گارڈ رکھنا چاہوں تو یہ میرے لیے کوئی مشکل نہیں۔ میں انور ڈر سکتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے جنم اس پر راضی نہیں ہوگی۔ دن کے چوبیس گھنٹے کون

قیدیوں کی طرح رہ سکتا ہے؟ اور پھر یہ دو چار دن کی بات نہیں وہ جہنم پر نظر رکھیں گے۔

”بعد میں کیا ہوگا؟ یہ چھوڑ دو میں بھی ساری عمر اپنے ساتھ سیکورٹی گارڈ نہیں رکھوں گی۔ لیکن جب خطرہ ہو تب تو کوئی حرج نہیں۔“

میں نے کہا ”اگر جہنم نے مخالفت نہ کی تو میں اسے پرائیویٹ سیکورٹی فراہم کر دوں گا۔“

”جس سینی کے گارڈ میں نے لیے ہیں وہ بہت قابل اعتماد ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ کہو کہ تمہارا دل اس انتظام سے مطمئن ہے۔ ورنہ اصل حفاظت کرنے والا تو خدا ہے۔“

”چلو کیسی سمجھ لو۔ خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ تم خود کچھ مت کرو کیونکہ تمہاری حفاظت کے لیے میں جو موجود ہوں“

نیلم غماہنے لگی۔

میں نے کہا ”اوکے اوکے! جہنم کے لیے سیکورٹی گارڈ ہو جائیں گے لیکن مجھے بتاؤ کہ اور کس کس کی حفاظت کے لیے سیکورٹی سینی کی خدمات حاصل کی جانی چاہئیں۔ خطرہ تمہیں بھی ہے چند اکو کمال اور قرب۔ یا رہیں۔ سب کے ساتھ وہی ہو سکتا ہے جو جہنم کے ساتھ ہوا۔“

”کیا ہم سب کو اس بات کا خیال نہیں رکھنا چاہیے؟“

میں نے کہا ”دیکھو نیلم یہ چند دن کی بات ہے۔ اس کے بعد شاہ عالم ایک ماضی کی داستان ہو جائے گا۔ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اس کے دوست اور دشمن سب کے لیے اسے یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔“

”اگر چند دن کی بات کرتے ہو تو پھر چند دن کے لیے تم گھر سے باہر نکلتا ہی چھوڑ دو۔“

میں نے کہا ”نہیں نیلم! میں دنیا سے منہ چھپا کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے یعنی ناصر عظیم کو اپنی شناخت پھر سے قائم کرنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ناصر عظیم کو شاہ عالم سمجھے جائے کہ اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔ وہ شاہ عالم کے خوف سے بے نیاز ہو کے آزادانہ اس شہر میں رہنے کا حق حاصل کر سکے۔“

ہم ابھی کھانا کھا کے فارغ ہوئے تھے کہ باہر ایک شور مچ گیا۔ اسٹوڈیو کے ملازمین میں سے ایک نے آفس میں جھانک کے دیکھا اور پھر اندر آگیا۔

”میڈم۔ وہ پھر آگیا ہے۔“

”کون؟“ اور تم اتنے بدحواس کیوں ہو؟“ نیلم نے کہا۔

”میڈم جی! اس کا گیت پر بھی بڑا جھگڑا ہوا ہے“ دہلے

پتلے مدقوق سے ملازم نے خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

”بے وقوف۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ جی۔ استاد موج دین قصور والا۔ اپنے ہدایت کار ہراز صاحب نے کہا کہ میں آپ کو بتا دوں۔“

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا ”ٹھیک ہے تم نے بتاؤ۔ اب جا کے ہراز صاحب کو بتاؤ کہ میں سیٹ پر کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“

حواس باختہ ملازم نے کچھ اور کہنے کی خواہش پر قابو پایا اور کچھ پریشان سا باہر نکل گیا۔

استاد موج دین قصور والا کا نام میں نے بھی سن رکھا تھا۔ وہ آج کل لاہور کا بد معاش نمبروں بنا ہوا تھا کیونکہ اسے ایک سابق وزیر اعلیٰ کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی اور اس نے اپنے چیلوں چانوں کے ساتھ لاہور میں غنڈ گردی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اس کے جوئے اور سٹے کے کئی اڑے چل رہے تھے اور اس کی بسوں کو لاہور سے مضافات تک جانے والے ہر روٹ پر اجارہ داری حاصل تھی۔ اس کے ٹرک لاہور سے کراچی تک ہر قسم کا مال لاتے لے جاتے تھے۔ پہلے اس کے خلاف ہر تھانے میں چوری ڈکیتی اور مارپیٹ کے درخون مقدمات درج تھے مگر اب وہ سب قصہ پارینہ ہو گئے تھے۔ موج دین قصوری آنے والے انتخابات میں زیادہ اونچی پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ ابھی وہ لاہور کا روپریش کا ممبر تھا مگر اب اسے اپنے مرنے اور حفاظت سابق وزیر اعلیٰ کی پشت پناہی سے صوبائی اسمبلی کے لیے آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ جی ٹی روڈ پر اس کے دو پٹرول پمپ تھے جہاں سے سرکاری گاڑیوں اور روڈ ٹرانسپورٹ والوں کے لیے ڈیزل پٹرول لینا گویا لازمی تھا۔ دولت مندی کے اعتبار سے طبقہ اشراف میں شامل ہونے کے باوجود وہ ابھی تک استاد کمالا پند کرتا تھا اور بد معاشوں کے حلقے میں ابھی تک اس کی شہرت موجود بد معاش کی حیثیت سے قائم تھی۔

نیلم کی پریشانی اور رہیں کے چرچے پر ناگواری کے آثار دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ موج کا مقصد صرف نیلم سے شرف ملاقات حاصل کرنا ہی نہیں ہوگا ورنہ سب سے ملنے والی نیلم اسے کیوں انکار کرتی۔

میں نے کہا ”استاد موج دین قصور والے کو کیا پریشانی ہے؟“

”رہیں نے برہمی سے کہا“ میں بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں۔“

نیلم نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی ”تمہیں ایسے

مذاہب کو ڈیپوٹیشن سے حل کرنے کی عادت ہوئی چاہیے۔“

”اس لیے کہ میں تمہارا سیکریٹری ہوں؟“ رہیں کا غصہ کم نہیں ہوا۔

”ہاں۔ اس لیے کہ تم میرے سیکریٹری ہو“ نیلم نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔

ایک شخص اندر آیا جس کا سرانڈے کی طرح صاف تھا اور اس پر پینٹ چمک رہا تھا۔ اس نے ڈھیلی اور نیکی پتلون پر رنگین بشرٹ پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک فیلٹ بیٹ تھام رکھا تھا۔ اپنے طے اور تیر سے وہ خود اپنے ہدایت کار ہونے کا اشتہار نظر آتا تھا۔

”میڈم! ابھی یہ مسئلہ حل کریں۔“ اس نے بیٹ کو میز پر رکھا اور جیب سے رومال نکال کے سر کا پینٹ صاف کرنے لگا۔

”سیٹ پر اور اسٹوڈیو میں ایسے مسئلے حل کرنا میرا کام نہیں ہے ہراز صاحب!“ نیلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”آپ خود ہی اسے سمجھا دیں کہ گڑبڑ نہ کرے۔“

”رہیں بولا۔“

ڈائریکٹر صاحب ایک اسٹول پر ٹک گئے۔ ”ایسے سمجھنے والے لوگ ہوتے تو یہ نوٹ ہی کیوں آتی۔ ابھی تو میں نے اسے باعزت طور پر دوسری جگہ بٹھایا ہے اور کہہ دیا ہے کہ میڈم کھانا کھا رہی ہیں۔ لیکن وہ ایسے ٹٹنے والا نہیں ہے۔ وہ آپ سے مل کے ہی جائے گا۔“

”میں اس سے نہیں ملوں گی“ نیلم نے قطعی لہجے میں کہا۔

”بس۔ اسے ایک بار نہیں دس بار جو بات سمجھا دی گئی ہے وہ اسے شرافت سے سمجھ لیتی چاہیے۔“ رہیں نے کہا۔

”شرافت سے“ ہراز صاحب نے ٹھنڈی سانس لی۔

”آپ بھی لطیفہ پیدا کرتے ہیں رہیں صاحب۔ ایسے بد معاشوں کا شرافت سے اتنا بھی رشتہ نہیں ہوتا جتنا طوائف باپا کیڑی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس سے مل لیں اور اسے سمجھا بھجائے قائل کریں۔“

”آخر کیسے قائل ہوگا وہ۔ میں نے اسے بتا دیا“ سمجھا دیا۔ وہ اخبارات دکھا دیے جن میں میرے قلموں سے رونا روٹنے کی خبر شائع ہوئی تھی۔

”میڈم! اب اس معصیت کو کسی طرح ٹالنا تو ہوگا“ ڈائریکٹر صاحب نے لجاجت سے کہا۔

”میں خان خود ایک زمانے میں ہر قسم کی بد معاشی کر چکے تھے اور کسی بد معاش کے رعب میں آنے والے

نہیں تھے۔ وہ استاد موج دین سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا تھا جب کہ ہدایت کار کی خواہش تھی کہ مسئلہ اقامت و تنقیم سے حل ہو جائے اور دونوں بڑی طاقتوں کے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

نیلم کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا اور آثار یہ تھے کہ صورت حال بہتر ہونے کے بجائے زیادہ خراب ہو جائے گی۔ میں وہاں سے مل جانے کا سوچ رہا تھا کہ استاد موج دین خود وہاں آگیا۔

باہر کسی نے کہا۔ ”جناب عالی! میڈم کے پاس مہمان ہیں۔“

”اوپر! ہم بھی مہمان ہیں“ موج دین نے ہماری بھرپور آواز میں کہا ”اور ان کے مہمان تو ہمارے مہمان!“ پھر وہ اندر آگیا۔

استاد موج دین قصور والا کو میں نے پہلے کہیں دیکھا نہیں تھا لیکن اس کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ وہ چھوٹے سے نکلنے قد کا اور شاید پینتیس چالیس سال کے درمیان کی عمر کا صحت مند آدمی تھا مگر اس کی صحت مندی نمائشی چیز زیادہ تھی۔ عام پسوانوں کی طرح اس کا بدن بھاری تھا اور اس پر گوشت اور چربی کی تھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے ذیل ڈول کی طرح اس کی موتھیں بھی دوسروں کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لیے تھیں۔ اس کا چہرہ سختی حالات کی تصویر تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں پُر آسائش اور مذہب زندگی کی نرمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غصیلی نظر آتی تھیں اور ان میں نفی کی لالی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چارخانے والے رسمی کپڑے کی شلوار تھیں پن رگھی تھی جس کی ایک جیب بہت بوجھل نظر آتی تھی۔ غالباً اس میں ریوالور جیسا اسلحہ تھا۔ اپنی عمر گزشتہ کے کارناموں کا عکس ان نشانات کی صورت میں بھی نظر آتا تھا جو اس کے چہرے پر میڈلوں کی طرح بچے ہوئے تھے۔ کسی کھڑائی جیسے ہتھیار کا ایک ذمہ عین دائیں آنکھ کے اوپر تھا۔ اس کے مقابل بائیں آنکھ کے نیچے گھاؤ کا دوسرا نشان تھا۔

موج دین آگیا نہیں تھا۔ استاد ہونے کی وجہ سے شاگرد اس کے ہر کاب ہوتے تھے اور وہ ان کے جلو میں بد معاشی کی پوری شان کے ساتھ چلتا تھا۔ اس کے شاگرد بھی چلنے اور انداز سے بد معاش نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ استاد محترم کی آن بان اور شان کی حفاظت پر وہ اپنی جان قربان کرنا عین سعادت سمجھتے ہیں۔

”اوی خیر ہوے سب کی۔ سلاماں نیگم جناب!“ موج دین نے اندر آکے اپنی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری کا مظاہرہ کیا۔

اس کے سلام کا جواب صرف میں نے سر کے اشارے سے دیا۔ رئیس کے تیرہ تاتے تھے کہ وہ ضبط سے کام لے رہا ہے ورنہ اس سلام کے جواب میں وہ کتنا کہ لعت ہو نہاری صورت پر۔ نیلم کے چہرے پر خفگی آمیز حسرت بھی بہت واضح تھی لیکن موج دین ذہیت اور ضدی آدمی تھا۔ وہ اندر آکے ایک صوفے میں بیٹھا۔

”چلو بھی تم لوگ ذرا باہر بیٹھو“ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”دھر تو آتی جگہ نہیں ہے کہ ہم سب کی تشریف کا ٹوکرا رکھا جائے“ وہ اپنے مذاق پر خود ہی ہنسنا۔ اس کے ساتھی سب کو گھورتے ہوئے یوں باہر چلے گئے جیسے کمرے میں جگہ کا نہ ہونا ہمارا تصور تھا۔ کمرہ خاصا بڑا تھا مگر اس میں بہت وسیع آفس ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر زمانے بھر کا علم ڈھیر تھا۔ کمرے کے مختلف گوشوں میں بھی پروڈکشن میں کام آنے والا سامان رکھا ہوا تھا۔ صرف ایک گوشہ محفوظ تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ کے ساتھ ایک سینئر ٹیبل لگادی گئی تھی جہاں پروڈیوسر کے دو چار مسلمان بیٹھ سکتے تھے۔

”کتنے موج دین صاحب! دوبارہ کیسے زحمت کی؟“ نیلم نے کہا۔ ”زحمت!“ وہ منہ کھول کے ہنسا ”اوی بادشاہو آپ سے ملنا تو دل کے لیے بڑی رحمت ہے۔“

”میرا مطلب تھا اب کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟“ ”دیکھو جناب عالی! اپنا تو ایک ہی کام ہے“ آپ جانتے ہو۔“

”اور وہ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجبور ہوں۔ میں نے فلمیں لینا بند کردی ہیں اور میرا آخری فیصلہ ہے۔“ وہ مسکراتے لگا ”ایسا مت کہو میڈم! کوئی فیصلہ آخری فیصلہ نہیں ہوتا بندے کا۔ یہ کوئی رب کا فیصلہ نہیں ہے کہ بدلانا نہ سکے۔“

”بھی تک میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ بہت پروڈیوسر آتے ہیں میرے پاس، میرا سب کے لیے ایک ہی جواب ہے۔“

”اوی! ایسا ظلم مت کرو۔ ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے۔ ہمارا کام کرو آپ“ تو آپ کی بڑی سہیلی۔ اب ہم نے فیصلہ کرلی لیا ہے فلم بنانے کا اور آپ کو بیرون لینے کا تو آپ انکار مت کرو۔“

”استادجی! آپ پتہ نہ لیں۔“

بھی نئی فلم سائن کی ہو تو میں مجرم۔ میں نے بہت پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو فلمیں زیر تکمیل ہیں انہیں مکمل کرانے کے بعد فلم لائن چھوڑوں گی اور اب میری آخری چھ فلمیں سیٹ پر ہیں۔ اس وقت میں کوئی بھی نئی فلم کیسے لے لوں۔ میرے سارے پلان ادھر سے رہ جائیں گے، انکی ایم سوئی!“

موج دین ساٹ چہرے سے کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر مسکراتا رہا اور نیلم کو ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ فارسی بول رہی ہے ”دیکھو جناب، ہم تو ایک بات جانتے ہیں۔ ہماری فلم مکمل ہو جائے گی تین چار مہینے میں۔ آپ اس کے بعد ریٹائر ہو جائے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ اور سچ مانو ہماری بات تو ہم عرض کریں کہ آخر آپ کو ضرورت کیا ہے فلمی دنیا چھوڑنے کی؟“

”یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے موج دین صاحب!“ نیلم نے سخت لہجے میں کہا۔

رئیس اب خاموش نہ رہ سکا ”اور تم کون ہوتے ہو نیلم کو مجبور کرنے والے؟“

موج دین کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی ”دیکھ یار۔ کیا نام ہے تیرا۔“ رئیس ”ہم جانتے ہیں تجھے بھی اچھی طرح۔ توچ میں مت بول۔“

نیلم نے اچانک مضبوط لہجے میں کہہ دیا ”رئیس کو آپ صرف میرا سیکریٹری مت سمجھیں۔ میں رئیس سے شادی کر رہی ہوں۔“

نیلم اگر اپنے چھوٹے سے پنڈیک سے کھا شکوف نکال لیتی تو کسی کا بے یقینی اور صدمے سے وہ حال نہ ہوتا جو اس اعلان سے ہوا۔ چند لمحوں کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا۔ استاد موج دین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ رئیس کی حیثیت یکھت بدل کے بہت برتر و افضل ہو گئی اور میں اس ”انکشاف“ پر خاموشی سے مسکراتا رہا۔

بالآخر رئیس نے کہا ”اب بات تمہاری سمجھ میں آجانی چاہیے۔ نیلم کے پاس ٹائم نہیں ہے ایک بھی فلم کے لیے۔“ موج دین اسے گھورتا رہا ”ٹائم تو خیر“ سے نکالنا پڑے گا۔ اس کی مرضی ہے جس ایرے خیرے سے چاہے شادی کر لے مگر استاد موج دین کی فلم تو بے گئی اور اس میں ہیروئن بھی نیلم ہی ہوگی۔“

”میرا خیال ہے تم اب جاؤ“ رئیس نے جتنی بجا ہی۔ موج دین کی آنکھوں میں خفا و غضب کے آثار نمودار ہوئے ”کسی کی مجال ہے کہ ہمیں ایسے کتے کی طرح دھکا دے۔“

نیلم نے پھر معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی ”استادجی۔ ایک میرے نہ ہونے سے فلمی دنیا کو کیا فرق پڑتا ہے ایک سے بڑھ کر ایک ہیروئن موجود ہے اور میں تو جانتی ہوں کہ یہ جو نئی لڑکیاں آتی ہیں یہ بہت اچھی ہیں۔ اب رہا کوئلے لیں، میرا ہے اور رہیم ہے۔“

”تم اپنا بیچ کر رہے دو۔ سیدھی طرح شرافت سے بتاؤ کہ میری فلم سائن کو کی یا نہیں؟“ موج دین دھڑلے لگا۔ رئیس نے آگ بگولا ہو کے کہا ”دھمکی دیتا ہے نیلم کو میرے سامنے۔ چل اٹھ“ اٹھ تیری تو۔“

استاد اچھل کے کھڑا ہو گیا اور چیخ کے بولا ”میرے سامنے بھونکتا ہے کتے!“

اب میرے لیے دخل اندازی ناگزیر ہو گئی۔ میں فوراً ان کے پیچ میں آ گیا ورنہ استاد کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھ چکا تھا اور رئیس کا پانی جیب کی طرف۔

موج دین اعلانہ ایک دوسرے کے مقابل آچکے تھے۔ میں نے کہا ”خدا کے لیے آپ دونوں عقل سے کام لیں۔“

موج دین نے مجھے دھکا دیا ”توہٹ جانچ میں ہے۔“ رئیس نے بھی مجھے ایک طرف کرنے کی کوشش کی۔ ”میں ابھی اس کی ساری بد معاشی نکال دیتا ہوں۔“

ہنگامہ سن کے موج دین کے سامنے اندر گھس آئے اور کتے کے ساتھ بھونکنے والے پلوں کی طرح بولنے لگے ”اوئے میں تیری زبان سمجھنے کے ہاتھ پر رکھ دوں گا“ ایک نے رئیس کو گالی دے کر کہا۔

دوسرے نے کہا ”تو ہے کون۔“ ”استاد موج میں نے بھائی امن کی کوشش جاری رکھی“ استاد موج دین۔ آپ اپنے ساتھیوں سے کہیں باہر جائیں۔ میں ابھی معاملہ سلجھا دیتا ہوں۔“

اچانک موج دین نے کہا ”اوئے شاہ عالم تو اپنی سیاست کر، ہمارے معاملات میں ناگم مت اڑا۔“

میں نے کہا ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔“ اس نے مجھے بھی ایک گالی دی ”نا نام ہی نہیں ولدیت بھی بدل لے تو مگر کیا جانتے نہیں تجھے۔ تو مفروضہ ہے۔ یہ یا نہیں؟“

موج دین کے ایک ساتھی نے سہلایا ”یہ تو پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔“

دوسرے نے کہا ”بلا تو پولیس کو۔“

اب موقع نہ تھا کہ میں اپنے شاہ عالم ہونے یا نہ ہونے

کے معاملے کو زیر بحث لاؤں۔ اصل مسئلہ اس جھگڑے کو ختم کرنے کا تھا جو سنگین صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں ساری بے عزتی کو برداشت کر گیا۔

میں نے کہا ”استادجی۔ ایگری منٹ ہے آپ کے پاس؟“ ”ایگری منٹ؟“ استاد کے غصے کی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا۔ ”ایگری منٹ؟“ ”ہاں“ ایگری منٹ تیار ہے تو نکالیں میں سائن کر دیتا ہوں۔“

”تو کیسے سائن کرادے گا؟“ ”میں نے کہا“ یہ آپ مجھ پر چھوڑیں“

نیلم نے پھر کہا ”میں ہرگز یہ ایگری منٹ سائن نہیں کروں گی۔“

استاد نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا ”اوئے ایگری منٹ لایا ہے اپنے ساتھ؟“

”لایا ہوں استادجی!“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے ایگری منٹ لے لیا ”بیٹھ جائیں آپ استادجی۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہیں کہ باہر جائیں۔“

رئیس نے کہا ”یار یہ کیا کر رہا ہے تو؟“ استاد موج دین نے اپنے ساتھیوں کو باہر بھیج دیا ”چلو“

تم لوگ باہر انتظار کرو۔“

وہ رئیس کو گھورتے ہوئے چلے گئے استاد موج دین اور رئیس بھی بیٹھ گئے تو میں نے کہا ”استادجی۔ ایک بات بتاؤ“ یہاں تم نے نیلم سے زبردستی ایگری منٹ سائن کرایا تو

اس کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟“ ”میں اس کا مطلب؟“ وہ ہنسنے لگا۔

میں نے کہا ”مطلب یہ کہ گمن پوائنٹ پر سائن کرائے ہوئے کسی ایگری منٹ کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ دستخط تو میں ابھی کرانے ہوں۔“

موج دین بد معاشی سے مسکرایا ”شاہ عالم ہمارے ساتھ سیاست مت کھیل، تو سائن کرا، آگے ہم منٹ لیں گے۔“ اس وقت اچانک ہدایت کار ہراز صاحب اندر آ گئے۔

موج دین کی آخری بات سن لی تھی۔ ”بھی بہت خوب۔ آپ شاہ عالم ہیں۔ ہم بھی سوچ رہے تھے کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ آپ نے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔“

موج دین معنی خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ایک سوال بہت واضح نظر آیا۔

استاد مومن جوین کی آنکھوں کا سوال واضح تھا لیکن مجھے اس وقت ہراز صاحب کی فکر ہو گئی تھی۔ اس نے جس طرح نازک موقع پر مجھے شناخت کرنے اور نیلم کے ساتھ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اگر یہ بات لیک آؤٹ ہو جاتی تو پینڈورا کس کھل جاتا۔ نیلم کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ اطمینان سے کہہ سکتی تھی۔ شاہ عالم میرا رفیق ہے۔ یہ کوئی اتو کھی بات نہیں ہے اکثر فلمی اداکاراؤں کے ساتھ کسی نہ کسی ملاقات اور سیاست دان کا نام بھی ہوتا رہا ہے۔ البتہ نیلم ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی کہ شاہ عالم کے ہم شکل سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ناصر عظیم کون ہے۔ اسے کب سے جانتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ شاہ عالم کا ہم شکل ہے۔ سوال سے سوال نکلتے چلے جاتے اور میں ان سوالوں میں اس طرح پھنس جاتا ہوں جیسے کوئی بد نصیب دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ جتنا ہاتھ پاؤں مارا ہے اس میں اور دھنسا چلا جاتا ہے۔ استاد مومن دین جیسے بد معاش سے زیادہ بے ضرر نظر آنے والا یہ بدایت کار میرے لیے خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہ شو برنس سے تعلق رکھتا تھا اور یہاں خبریں جنگل کی آگ سے زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ اگر میں تسلیم کر لیتا کہ میں شاہ عالم ہوں تو نیلم مصیبت میں پڑ جاتی۔ وہ کتنی ہی بڑی اداکارہ سہی لیکن میرے بلکہ شاہ عالم کے مخالفین بھی کمزور نہیں تھے۔ پولیس ضرور آتی اور یہ سوال بھی کرتی کہ نیلم ایک مفور لٹرم شاہ عالم کے ساتھ کیا کر رہی تھی۔ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑتا۔ میرے ذہن میں جو تھا وہی نیلم بھی سوچ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پہلے کہا۔

”ہراز صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ شاہ عالم نہیں۔ ناصر عظیم ہے۔“

ہراز صاحب مہربانہ انداز میں مسکرائے ”لوہی غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سو فیصد شاہ عالم ہے۔ میرا ذہن کبیرا ہے ایک بار جو صورت دیکھی سمجھو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔“

پہلے استاد مومن دین نے تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا لیکن اب نیلم نے بھی تردید کر دی تھی۔ وہ صورت حال میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا ”میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں شاہ عالم نہیں بلکہ ناصر عظیم ہوں۔ اس شہر کا ایک برائے نام پولیس میں۔ میرا کنسرکشن کاربنس تھا اور میں اسے دوبارہ اسٹیبلش کر رہا ہوں۔ میرے بچپن کے حوالے ہیں۔“

ہراز صاحب کھی کھی کر کے ہنسے ان کی بقیہ فہمی کہیں

گلے میں ہی رہ گئی ”خوب گویا یہ تو فلمی کمائی ہو گئی۔ بائے وا دے ناصر صاحب آپ اب تک کہاں تھے؟“

”اسی شہر میں۔“ میں نے بے خوفی سے کہا ”میرے رائے کا رو باری ساسھی دوست احباب اور جاننے والے ہوا ہی دیں گے۔ رشتے دار کوئی ہے نہیں۔ کیونکہ میں نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی ہے۔“

مومن دین عمارت سے مسکرایا ”یعنی تیرے باپ کا بچا ہے نہ ماں کا۔“

میں نے تھل سے جواب دیا ”دنیا والے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ استاد مومن دین صاحب بھونکنے والے تو یہ بھی بھونکتے ہیں کہ آپ کی ولدیت میں اصل نام اس سابق وزیر اعلیٰ کا لکھنا چاہیے جو آج کل آپ کا سرپرست ہے لیکن اس سے آپ کی ولدیت پر کوئی خوف نہیں آتا۔“

استاد مومن دین کی آنکھ میں شعلہ سا لپکا لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ پہل اس نے کی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے میں نے ہراز صاحب کے ملاحظے کے لیے اپنا شناختی کارڈ چیک بک اور کچھ دیگر کاغذات پیش کیے ”یہ کاغذات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ آپ چاہیں تو کسی بھی جگہ سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں۔ بینک میجر میرا رانا جاننے والا ہے۔ میں سال پہلے اس نے میرا اکاؤنٹ کھولا تھا جب میں میٹرک کر رہا تھا۔ یہ اکاؤنٹ شاید نے کھلوا یا تھا۔ وہی میری زندگی کو اس راہ پر لے کر آئی تھی جس پر چل کر میں ناصر عظیم بنا اور خود میری راہ سے خاموشی سے ہٹ گئی تھی۔ کتنی بے غرض اور بے لوث محبت تھی۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک بھی خونی رشتہ نہ رکھنے کے باوجود مجھے اتنے بے لوث اور پر غلوں چاہنے والے ملے تھے۔“

ہراز صاحب کے چہرے پر متذہب کے آثار نظر آنے لگے تھے اور ان کا اپنے گہرا صفت دماغ پر اعتماد متزلزل ہو گیا تھا۔

”یہ سکتے ہی شناختی کارڈ اور کاغذات مومن دین کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔“

”استاد مومن دین تمہارے حوالے اور پس منظر بھی کیا جب میں پڑے رہتے ہیں۔ سچ ایک ہی ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ تم جس طرح چاہے تصدیق کرلو۔ شاہ عالم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور سوائے تصویروں کے میں نے بھی اسے آئے سامنے سے نہیں دیکھا ہے۔“

”لیکن لندن میں۔“ ہراز صاحب نے کہنا چاہا۔

نیلم نے اس کی بات کالی ”وہ شاہ عالم ہی تھا۔ وہ میرے

فن کے پرستاروں میں تھا اور اتفاق سے لندن میں ملاقات ہو گئی۔ اس نے وہاں مدد کی درخواست کی تو میں مسترد نہ کر سکی تھی۔“

”فن کا یا تمہارا پرستار۔“ مومن دین معنی خیز انداز میں ہونا ”شاہ عالم کی عیش پرستی سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔“

رہیں کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی نیلم نے جواب دیا ”جب وہ لندن میں ملا تو بالکل بدل گیا تھا اور مشکل میں بھی تھا۔ اب میں سیاست دان تو ہوں نہیں کہ کسی پر برا وقت آئے تو نظریں پھیر لوں۔ استاد مومن دین صاحب!“

”چلو جی ہمیں کیا کہ یہ ناصر عظیم ہیں یا شاہ عالم۔ آپ ایمری منٹ پر دستخط کرو۔“

”نیلم کوئی سامان نہیں کرے گی۔“ رہیں نے تیز لہجے میں کہا۔

”یار“ اتنا پریشان مت ہو۔“ میں نے رہیں کو آنکھ ماری ”جہاں نیلم چھ فلموں میں کام کر رہی ہے وہاں ساتویں بھی سہی۔ بلکہ یہ ساتویں فلم بھی اسی مدت میں بن جائے گی۔ باقی فلموں میں نیلم کا اکثر کام مکمل ہو چکا ہے۔“

ہراز صاحب نے سکون کا سانس لیٹے ہوئے اعلان کیا ”میری قلم تو عمل ہی سمجھو آپ لوگ!“

رہیں نے اشارہ سمجھ لیا تھا لیکن دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت مزاحمت کی۔ نیلم نے ایمری منٹ لے کر اس پر سائن کر دیے لیکن چالاک مومن دین بھی گولیاں پھیل کر استاد کی درجے تک نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنے خاص گڑے کو آواز دی۔ وہ شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ فوراً اندر آگیا ”موجب گڈی اور رسید نکال۔“

موجب نے اپنی جیب سے توٹوں کی ایک گڈی اور ایک کی رسید نکال کر نیلم کے سامنے رکھ دی ”لیس جی، بسم اللہ کریں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے مومن دین صاحب۔“ نیلم نے کہا۔

”نہ جی انکار نہ کریں۔ یہ تو ایڈسٹری کی ریت ہے۔“ مومن دین کا لہجہ معنی خیز تھا ”ادا کارا میں تو کوشش کرتی ہیں کہ سارا معاوضہ ایڈوائس لے لیں۔ رقم اٹھالیں اور مجھے ڈیس دے دیں۔“

باہل ناخواستہ نیلم نے نوٹ اٹھا لیے اور رسید پر دستخط کر دیے ”تاریخیں میں آپ کو اپنا شیڈول چیک کرنے کے بعد دوں گی۔“

”چنگائی۔“ استاد مومن دین اٹھ کھڑا ہوا ”ہر ایک خیال رکھے گا میری قلم کے سیٹ پر آپ اکیلی آئیں گی۔ کسی ایسے غیرے کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا اشارہ واضح طور پر رہیں کی طرف تھا۔

رہیں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نیلم نے ایک بار پھر سکون انداز میں جواب دیا ”مومن دین صاحب میں دیکھے گی سیٹ پر فالو لوگ لانے کی قائل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرا سیکرٹری ہوتا ہے جو میرے تمام معاملات دیکھتا ہے اور کبھی بھی ایک ملازمہ ہوتی ہے۔ جو چائے اور کھانا وغیرہ سرور کرتی ہے۔“

”میری قلم میں آپ کو ان لوگوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ مومن دین نے پیچھے ہاتھ رکھ کر کہا ”آپ کے آبدار کا ایک اشارہ کالی ہوگا۔ ہر شے حاضر ہو جائے گی۔“

نیلم نے ناگاری سے اسے دیکھا ”مومن دین صاحب اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ آپ نے ابھی سے شریں لگانا شروع کر دی ہیں۔ آپ کا ایڈوائس واپس بھی ہو سکتا ہے۔ میں شرائط کے ساتھ کام نہیں کرتی۔“

مومن دین نے فوراً پیٹیرا بدلا ”اوجی آپ تو ناراض ہو گئیں۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ چاہو تو بے شک پوری رات لے آؤ۔“

جب تک مومن دین موجود رہا رہیں غصے سے مل کھاتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مومن دین کی تحریک گردن دباوے یا اس کی گالوں میں دھنسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال لے۔ جن میں نیلم کے لیے ہوس بھری ہوئی تھی مگر وہ میری وجہ سے مجبور تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ اس نے نیلم اور ہراز صاحب کی پروا کیے بغیر مومن دین کو ایک سے ایک گالی دی اور اس کی ایسی کم تھپی کرنے کا اعلان کیا۔ نیلم نے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ ہراز صاحب اب تک مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ماحول کی گرمی سے ان کی صاف شدہ چاند پر پیسہ آ رہا تھا۔ انہوں نے ایک گلاس پانی پیا۔

”اتنی مشاہرت میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔“ ان کے لیے میں شک تھا۔

”حالانکہ فلموں میں آئے دن ڈبل کرڈا پیش کیے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا ”ملتی جلتی شکایں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جب ناقابل یقین حد تک مشابہ لوگ سامنے آتے۔ جن کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ ہٹلر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے کئی ہم شکل تھے جنہیں وہ استعمال کرتا تھا۔ امریکا کے صدر لنڈن بی

جانسن اور چرچل کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ نیولین بھی اپنا ڈیڑھ رکھتا تھا۔ بے شمار معروف فنکار "اداکار اور کھلاڑی ایسے گزرے جن سے ناقابل یقین مشابہت رکھنے والے افراد سامنے آئے۔ اب اگر میں شاہ عالم کا ہم شکل ہوں تو اسے سوائے اتفاق کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"ہمراہ صاحب آپ یہ بھی سوچیں کہ کیا شاہ عالم اتنا ہی احمق ہوگا کہ پولیس کی قید سے فرار ہونے کے بعد یہاں اسٹوڈیو میں آئے گا۔ ایسا تو احمق ترین مجرم بھی نہیں کرتا۔ وہ تو پھر بھی شاہ عالم ہے۔" نیلم نے دلیل دی۔

"اور شاہ عالم کو پولیس نے مار دیا ہے۔ اس کی لاش غائب کر کے مفور و مشہور کر دیا ہے۔ شامت بے چارے ناصر کی آ رہی ہے۔" رئیس نے کہا تو ہمراہ صاحب قائل نظر آنے لگے غیبت رہا کہ انہوں نے شاہ عالم والی بات خود تک محدود رکھی۔ پورے اسٹوڈیو میں اس کا ڈھنڈورا نہیں بیت دیا۔ موج دین کی آمد سے پہلے ہم کھانا تقریباً ختم کر چکے تھے اس کے بعد موج دین نے آکر بد مزگی کر دی۔ اب ہم میں سے کسی کا کھانا ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لہذا نیلم نے خادمہ کو برتن سینے کا کہا۔

"کیا خیال ہے میڈم شوٹنگ شروع کی جائے۔" ہمراہ صاحب بے چین لگ رہے تھے۔

"آپ سیٹ پر چلے میں آتی ہوں۔" نیلم نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ نیلم نے فحش سے کہا "یہ کیا محانت کی مجھ سے ایگری منٹ سائن کروا دیجئے۔ اس سینے سے ایڈوائس بھی لیتا رہا۔ قلم کا تو بھانہ ہے ورنہ اس کی نظریہ" نیلم بات مکمل نہ کر سکی تھی لیکن میں نے اور رئیس نے اس کا مقصود سمجھ لیا تھا۔ رئیس نے ایک بار پھر موج دین کی ایسی کم تہی کرنے کا اعلان کیا۔ میں نے نیلم سے کہا "تم اس قلم میں کام نہیں کر سکتی۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے تم سے سائن کرائے ہیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہمراہ صاحب نے آکر کام خراب کر دیا۔ ورنہ اسے صاف انکار بھی کیا جاسکتا تھا۔"

"نکواس نہ کر۔" رئیس بھڑک اٹھا "تو نے پہلے ہی سائن کرنے کی بات کر دی تھی۔ میں اس حرای کی ٹانگیں چیر کر۔"

رئیس نے جو کہا اسے سن کر نیلم کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"میں کسی طرح اسے ٹالنا چاہتا تھا۔ اس وقت موج دین جیسے آدمی سے بھگڑا ہوا ہے خدا میں نہیں ہے۔"

"ناصر صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔" نیلم نے میری تائید کی۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔" رئیس فیصلہ کن انداز میں بولا "تم لوگ جو چاہے کرو لیکن تم اس کی قلم میں کام نہیں کر سکتے۔"

"مجھے بھی کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔" نیلم رسائیت سے بولی "مگر ہمیں حالات دیکھ کر چلنا ہوگا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں چار گھنٹے کی شوٹنگ اور ہے۔ تم ناصر کو چھوڑ کر شام سات بجے تک مجھے لینے آ جانا۔"

میں اور رئیس باہر نکلے تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ نیلم کے سامنے تو وہ مجبور تھا لیکن میرے سامنے اسی نے موج دین کے شہرہ نسب کو خاصا زیرو زبر کیا تھا۔ نیلم کی بچاؤ اسٹوڈیو کی پارکنگ میں گھڑی تھی۔ گیت سے باہر نکل کر رئیس نے گاڑی روکی "میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

وہ سڑک پار کر کے اسٹوڈیو کے سامنے موجود بان فروش کی طرف گیا تھا۔ موج دین ایک معمولی دیر سے کا بد معاش تھا۔ اس کی ماں شامی محلے میں دھندلا کرتی تھی مگر موج دین نے بھائی گیت کے ایک استاد کے ذریعے پرورش پائی تھی۔ نو عمری سے وہ جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ جب اڑے کا استاد ایک محل کے الزام میں عرقید کی سزا پارک جیل چلا گیا تو موج دین نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے اڑے پر قبضہ کر لیا۔ اسے اپنی ماں سے باپ کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے باپ سے رابطہ کیا جو ایک بوڑھے جاگیردار گھرانے کا سیاست دان تھا۔ انہی دنوں حکومت ختم ہونے سے اس کی وزارت اعلیٰ ختم ہوئی تھی اور اس نے حکومت میں جن لوگوں کا جینا حرام کیا تھا وہ اس سے بدلہ لینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے میں موج دین اس کی ڈھال بن گیا اور اس نے اپنے ناجائز باپ کے دشمنوں کو چن چن کر نشانہ بنایا اور اب وہ اس کے لیے اس کے شکے بیٹوں سے زیادہ ٹانگری ہو گیا تھا۔ اس کی سرپرستی میں موج دین نے تیزی سے ترقی کی تھی۔ اب وہ بد معاش ہی نہیں بلکہ صنعت کار "ٹرانسپورٹرز اور تاجر بھی تھا۔ قصور کی طرف بارڈر کے ساتھ اس کی وسیع و عریض زمینیں بھی تھیں۔ جن پر اگنے والا اناج بھارت اسمگل کر دیا جاتا تھا۔ خیرے موج دین صاحب اسمگلر بھی تھے۔

"اللہ کے نام پر بابا۔" اچانک ایک بے کئے فحش نے گھڑی کا شیشہ ٹھٹھکیا۔ میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا لیکن وہ مستقل مزاجی سے ڈٹ رہا۔ میں نے اسے ڈانٹنے کے لیے شیشہ نیچے کیا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے عین

میرے چہرے پر کوئی شے اسپرے کی۔ اس کی بوتلی تیز اور زود اثر تھی کہ میں فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ دشمن اتنے مستعد ہوں گے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لیکن شاید میں غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔ رب نواز اور پیر سبحان کے علاوہ اب موج دین جیسے لوگ میرے دشمنوں میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ سب دست دراز اور سفاک لوگ تھے۔ بے شک میں تصدیق شدہ طور پر ناصر عظیم تھا لیکن میرے دشمن بشمول پولیس کے صرف میری بات پر یقین کر کے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

انہوں نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ موقع کی ہاک میں تھے۔ رئیس کی سگریٹ نوشی کی عادت نے انہیں موقع دیا اور وہ مجھے بے ہوش کر کے لے اڑے تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک سنگی دیواروں والے کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ دیواروں پر پلاسٹر تھا لیکن رنگ نہیں ہوا تھا۔ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا سوائے ایک دروازے کے جو غائب ہے کہ بند تھا۔ بے ہوشی کی دوا جتنی زود اثر تھی اتنی ہی مضر اثرات سے پاک تھی کیونکہ ہوش میں آتے ہوئے نہ میرا سر پکرایا تھا اور نہ ہی محلی کی کیفیت محسوس کی تھی۔ بلکہ یوں لگا جیسے میں طویل اور پرسکون نیند کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ صرف سنگی فرش نے میری کمر کو اکڑا دیا تھا۔ بمشکل میں اٹھا اور ہاتھ پیر چلا کر جسم کھولا۔ کمرہ کسی قسم کے فرنیچر یا سامان سے بالکل خالی تھا۔ یہ غالباً کسی زیر تعمیر مکان کا حصہ تھا۔ میں نے دروازہ کھولنے کی بے سود کوشش کی۔ حسب توقع وہ باہر سے بند تھا۔ ٹھوس گھڑی کے اس دروازے کو رستم زمان بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔

دروازے سے باہر ہو کر میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہو سکتا ہوں۔ اور گرد مکمل خاموشی تھی نہ تو ٹریفک کی آواز تھی۔ نہ کوئی انسانی آہٹ اور نہ ہی کوئی اور آواز۔ جس سے میں اندازہ لگا سکتا۔ عین ممکن تھا کہ آوازیں تو ہوں لیکن کمرہ ایساؤنڈ پروف ہو یا گھر میں ایسی جگہ ہو جہاں باہر کی آوازیں آنا ناممکن ہو۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا اور بند کمرے کے جس میں ذرا سی دیر میں بیہوشی سے پاؤں تک بیٹھ لگا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ رات کا کوئی پہر تھا۔ کیونکہ میرے جسم سے سوائے لباس کے سب کچھ اتار لیا گیا تھا۔ اس میں گھڑی بھی شامل تھی۔ جب سے بنوا اور ناصر عظیم کے تمام کاغذات بھی غائب تھے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے تھے یا تو دشمن نے روایت کے مطابق مجھے ہر شے سے محروم کر دیا تھا یا

وہ ان کاغذات کی جانچ کرنا چاہتے تھے۔ دوسری صورت ہتر تھی کیونکہ ریکارڈ میں ہر جگہ ناصر عظیم کا نام موجود تھا اور اس کی تصدیق۔ آسانی کرانی جاسکتی ہے۔

انوار کرنے والوں پر سر کھانے کے بجائے میں نے اس کمانی پر غور کرنا شروع کر دیا جو انہیں سنائی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھے ناصر عظیم ہونے پر اصرار کرنا تھا۔ بس ایک ہی خطہ تھا۔ اگر میں رب نواز کے جتنے چڑھا تھا تو میری کمر اور سینے پر موجود ہتھکڑی خربوں کے نشان دیکھ سکتے تھے۔ قید کے دوران دنواڑنے بے رحمی سے مجھے مارا تھا۔ وہ فوراً سمجھ جاتے کہ میں شاہ عالم ہوں اور پھر کسی صورت مجھے ناصر عظیم تسلیم نہ کرتے۔ امکان یہی تھا کہ میں رب نواز کے بجائے کسی دوسری بارانی کے ہاتھ لگا تھا۔ ورنہ مجھے شاید کسی عقوبت خانے میں ہوش آتا۔ میں اٹکا ہوا ہوں اور اب تک رب نواز کے کتے میری یونیاں نوچ چکے ہوتے۔ دنواڑ کی بیوی فریال کو پر غمال بنا کر فرار ہو کے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا کہ میں اگر ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور اپنے ٹکڑوں کو کھلا کر بھی مطمئن نہ ہوتے۔

مجھے رئیس کا خیال آیا۔ سگریٹ لے کر واپس آنے پر اس نے مجھے غائب پایا ہوگا تو توثیق سے اس کا برا حال ہو گیا ہوگا۔ ابھی مجھے رب نواز کی قید سے نکلے چند ہی دن تو گزرے تھے اور میں دوبارہ کسی کی قید میں پہنچ گیا تھا۔ نیلم چندا اور قمر سب رو کر برا حال کر لیں گی۔ کمال میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے گا لیکن پریشان تو وہ بھی ہوگا۔ صرف رئیس سے ہی امید کی جاسکتی ہے وہ میری رہائی کے لیے عملاً کچھ کر سکے گا۔ شہنشاہ اپنے اخبار کے ساتھ میرا بہت بڑا سارا ہے لیکن وہ خود چند درندہ نما انسانوں کی بربریت کا شکار ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ڈاکٹر عاتش کے کلینک میں پڑی تھی۔ وہ میری کیا مدد کر سکتی تھی۔

وقت رنگ رنگ کر گزر رہا تھا۔ جب میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر بنجرے میں بند جنگل سے تازہ دہر آند شدہ شیر کی طرح نکلنے لگا اور جب نکلنے نکلنے تھک گیا تو دوبارہ بیٹھ گیا۔ گرمی کی شدت سے پسینہ دھاروں کی صورت میں برس رہا تھا۔ میزائل جاپاکہ قیس اتار دیں لیکن زخم نظر آنے کے خوف سے میں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ اگر میں بد قسمتی سے رب نواز کی قید میں آئی بیٹھا تھا تو یہ زخم مجھے مروا دیتے۔ یہ وقت میں نے کس اذیت سے گزرا میں بھی جانتا ہوں۔ معاذ بھی کی آواز آئی۔ میں نے کان لگا کر سننا دور نہیں موزن اللہ کے بڑے ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔ جب کہ بہت

سارے لوگ اپنی خدائی کے نشے میں چور تھے۔ ان کے بے حس کانوں کے لیے خدا کی کبریائی کے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ بے اختیار میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”میرے رب تو جانتا ہے۔ میں۔ بے گناہ ہوں۔ بے قصور ہوں۔ اے اللہ مجھے ان ظالموں سے بچا۔“
دعا مانگ کر میں نے دل کا بوجھ ہلکا ہوا محسوس کیا تھا۔ میں نے پہلی بار دروازہ کھٹکٹایا پھر زور سے دھڑ دھڑایا۔ چند لمحوں بعد دوسری طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی ”کیا بات ہے۔ کیوں شور مچا رہا ہے؟“ کسی نے کڑخت لہجے میں کہا۔

”مجھے کیوں بند کر رکھا ہے۔“ میں نے چلا کر کہا ”اب تک ایک گلاس پانی بھی نہیں دیا ہے۔ کیا تم لوگ مسلمان نہیں ہو۔“
”ہم کو کمر کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔ انتظار کرو ابھی ہمارا صاب آئے گا تو تمہیں پانی کھانا سب مل جائے گا۔“
”تمہارا صاحب کون ہے؟“

لیکن جواب میں جاتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ واپس چلا گیا تھا۔ ایک انسان کی آواز سن کر میں نے اپنے اندر تازہ حوصلہ امنڈتے محسوس کیا۔ بے شک وہ دشمن سنی لیکن میں یہاں اکیلا نہیں تھا۔ دشمن مجھے بند کر کے بھول ہی گیا تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ میں صبر اور سکون سے دوبارہ انتظار کرنے لگا۔ شاید دو گھنٹے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے تالا کھولنے کی آواز سنی۔ دروازہ کھلا اور سامنے ایک پست قد چھان گمن تانے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑا تھا جس کا سایہ مجھ تک آ رہا تھا لیکن صورت نظر میں آ رہی تھی۔

”شاہ عالم کھڑے ہو جاؤ اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔“
آواز آئی تو میں نے بمشکل خود کو اچھلتے سے روکا۔ آواز دلاور شاہ کی تھی۔ سبجان شاہ کا سالا۔ میں نے جواب دیا۔
”یہاں کوئی شاہ عالم نہیں ہے۔ اگر یہ حکم میرے لیے ہے تو میں سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“

دلاور اندر آیا تو اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی ”تم دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہو مجھے نہیں۔“
دلاور کو دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ یعنی میرے اغوا سے رب نواز اینڈ سبکی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساتھ ہی میں نے خود کو زیادہ با اعتماد محسوس کیا ”آخر تم لوگ شاہ عالم سے میرا تعلق جوڑنے پر کیوں مصر ہو۔ پولیس کو دیکھو۔ لوگوں کو دیکھو سب مجھے شاہ عالم سمجھتے پر مصر ہیں۔ میرا

لیکن کچھ دنوں پہلے جب شاہ عالم تھانے میں تھا تو رئیس اس کے پاس مسلسل آ جا رہا تھا۔ اگر دلاور شاہ کے عالم میں یہ بات آچکی تھی تو میری خیریت مشکوک تھی۔ میں نے جواب دیا۔

”رئیس میرا بچپن کا دوست ہے ہم دونوں نے ایک ہی یتیم خانے میں پرورش پائی ہے۔ بڑے ہونے کے بعد ہم نے مختلف شعبے اپنائے لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں آج بھی رئیس کو اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتا ہوں۔“

”یہ رئیس بچپلے دنوں اس تھانے میں کیا کرنے جاتا رہا تھا۔ جس میں گرفتاری کے بعد شاہ عالم کو رکھا گیا تھا۔“ آخر میرے دل کا اندیشہ اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

میں ہنسا ”رئیس تو اکثر تھانے جاتا ہی رہتا ہے۔ اس کے کروت ہی ایسے ہیں۔“
”میری اطاعت کے مطابق وہ اسی دوران میں شاہ عالم سے ملتا رہا تھا۔ آخر کیوں؟“

”تمہاری معلومات درست نہیں ہیں۔ اگر رئیس شاہ عالم سے ملتا تو مجھے ضرورتاً بتا۔“

اس نے میری بات نظر انداز کی ”شاہ عالم سے کچھ عورتیں بھی ملنے آتی تھیں جبکہ میری معلومات کے مطابق شاہ عالم کی دنیا میں ایسی کوئی رشتہ دار عورت نہیں ہے جو اس سے تھانے میں ملنے آئے۔ اس کی ایک سابقہ بیوی ہے جو اس کی اب صورت دیکھنا پسند نہیں کرتی لیکن کتنی عجیب بات ہے۔ اس کا دوسرا ختم فرید عباسی شاہ عالم کا وکیل تھا بلکہ اب بھی ہے۔ اس نے ایک شور مچا رکھا ہے کہ پولیس نے شاہ عالم کو قتل کر دیا ہے۔“

دلاور شاہ کا نہیں بلکہ حالات کا پھندا میرے گرد سخت ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے مسلسل غلطیاں کی تھیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہا تھا کہ ان پر پردہ پڑا رہے گا۔ دشمن اسحق نہیں تھا۔ واقعات کی کڑیوں کو ملا کر وہ اس طرح نتیجہ نکال رہا تھا جیسے طالب علم مساوات کی مدد سے ریاضی کا سوال حل کرتا ہے۔

”اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے شائے اچکائے ”یہ بات شاہ عالم یا اس کا وکیل ہی بتا سکتا ہے ویسے یہ کوئی اتنی عجیب خیر بات نہیں ہے۔ رقابت اپنی جگہ اور رئیس اپنی جگہ۔ شاہ عالم دولت مند شخص تھا اور وہ اپنے وکیل کو کیا نام بتایا تم نے۔ ہاں فرید عباسی کو اچھا معاوضہ دیتا ہو گا۔“

دلاور شاہ ٹوٹنے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں قاتل خان ایک نرسے میں پانی کا جگ گھاس پلٹ میں آلو گوشت کا سالن اور تندوری روٹی لے آیا۔ اس نے دلاور شاہ کے اشارے پر نرسے ایک کونے میں رکھ دی اور دوبارہ اپنی گمن سنبھال کر مستعد ہو گیا۔ میں اس کی طرف توجہ دینے بغیر کھانے پر ٹوٹ رہا تھا۔

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ناصر عظیم ہو؟“
دلاور شاہ نے اچانک کہا۔

میں ہنسا ”ثبوت تو تمہیں دینا چاہیے کہ میں شاہ عالم ہوں لیکن تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ البتہ میرے سارے حوالے موجود ہیں۔ تم یتیم خانے سے معلوم کر سکتے ہو۔ جہاں میں نے پرورش پائی پھر میں ڈاکٹر مشہود کے گھر رہا۔ اس کے بعد مجھے کرنل خان نے اپنے ساریہ عاطفت میں لے لیا تھا۔ آج جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔“

”چھان“
”معلوم کر سکتے ہو۔ کرنل خان کی بیٹی مجھے جانتی ہے۔ ڈاکٹر کمال کمال ہسپتال والا میرے بچپن کا دوست ہے۔ میری منہ بولی بہن قمر جس کی میں نے ایک طرح سے پرورش بھی کی ہے کمال کی بیوی ہے۔ رئیس کا نام میں اس لیے نہیں لوں گا کہ وہ ہسٹری شیٹر تھا۔ اب وہ شریف ہو چکا ہے لیکن پولیس اسے شریف ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آئے دن اسے تھانے میں حاضری دینا پڑتی ہے۔ تم اداکارہ نیلم سے پوچھ سکتے ہو۔ وہ دس سال سے مجھے جانتی ہے۔ ان ساری راہوں سے شاہ عالم کا بھی گزر نہیں ہوا۔ وہ ایک اکیلا اور خود غرض شخص تھا جس کا دنیا میں ایک بھی خلوص کا رشتہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سنا ہے کہ سیاست کے ساتھ اس نے مافیہ نوعیت کے جرائم میں بھی ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اس کی بیوی اسی وجہ سے اس سے ٹالان تھی اور بالآخر اس نے شاہ عالم سے چھٹکارا پایا۔ شاہ عالم برباد زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے لیے پر خلوص دوست ملنا محال تھا۔ میں نے جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے ہر ایک ضرورت پڑنے پر میرے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

”تمہارے خیال میں؟“
”ختم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”نکون ختم؟“ میں بولا ”اچھا تم اس صحافی کی بات کر رہے ہو جو ایک زمانے میں شاہ عالم کے لیے دیوبلی بچرا

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا ”جی۔ آپ کو نہیں معلوم؟“

”جی تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ کسی قدر تذبذب کے ساتھ اس نے اقرار کیا کہ اس وقت میں پیر سجان کی حویلی میں ہوں جولاہور سے باک چین جانے والی سڑک پر ہے۔ لاہور میاں سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔

”پیر سجان کہاں ہے؟“ ”وہ جی خاص کرے میں ہیں۔“ اس نے سسے ہوئے انداز میں جواب دیا بھر پلنے لگی ”چھوڑ مجھے۔“ میں نے اسے آزاد کیا تو وہ حیران رہ گئی پھر نکلی سے بولی۔ ”یہ کیا حرکت تھی جی۔ حویلی میں آنے والے کسی مسلمان نے میرے ساتھ ایسا نہیں کیا۔“

”پہل اس بہانے تجھے چھو لیا۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”پوری ہمہ تنی ہوئی ہے۔“ وہ بھونڈے پن سے شرابی ”جی“ تو کہتا تھا اس طرح جھٹلانا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

اس کی بات سے واضح تھا کہ وہ اس حویلی میں آنے والے مسلمانوں کی ”خاطر بردارات“ پر بھی مامور تھی ”آپ نہالو جی۔ میں کپڑے لا دیتی ہوں۔“ اس نے الماری کھول کر اس میں نئے جوڑوں میں سے ایک شلوار قمیض نکالی اور تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا ”یہ جوڑا ٹھیک رہے گا جی۔“

”بالکل جی۔“ میں اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ کمرے کے برعکس غسل خانہ عام سا ثابت ہوا تھا لیکن نہال کر میری طبیعت کی رہی سہی کسل مندی بھی دور ہو گئی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے میں نے کپڑے لے کر پینٹ باہر آکر میں نے بال ہائے اور شادوں کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ مجھ سے آگے اپنے بے حجاب بدن کو چٹائی چل رہی تھی۔ پیر سجان ایک دربار نما کمرے میں میرا منتظر تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھا تھا جس پر قائلین تھا اور اس نے گاؤں کیے سے ٹپک لگا رکھی تھی۔ خوشبودار ہتھکے کی نے اس کے ہاتھ میں تھی اور کمرے میں تباہ کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے پیر سجان کو یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شاید آپ ہی پیر سجان ہیں۔ مجھے ناصر عظیم کہتے ہیں۔“ ”پیر سجان نے ہاتھ ضرور بلایا لیکن مجھ سے ملانے کے

معتدلت سے سنے گا۔“ ”تم دیکھ لو۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا ”بہتر ہوگا اب تم آرام کرو۔“

اس کی بات کا مفہوم اس وقت واضح ہوا جب اچانک پیرا سر پکڑنے لگا تھا۔ کھانے میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملی تھی۔ وہ لوگ جا چکے تھے اور میرے پاس سوائے بے ہوش ہو جانے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں چپٹ لیٹ گیا اور کمرے گھومتے گھومتے اچانک تارک ہو گیا۔ دوسری بار ہوش میں آنے پر میں نے خود کو ایک صاف ستھری اور نجی ہوئی خواب گاہ میں پایا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی خاصی دیر تک میرا سر گھومتا رہا تھا جب طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ سامنے دیوار پر وال کلاک تین بج رہا تھا۔ بند کمرے میں میرا اندازہ تھا کہ اس وقت دوسرے کے تین بج رہے تھے۔ رات کے تین بجے تک میرا بے ہوش رہنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک طرح دار دیہاتی جینے اندر داخل ہوئی وہ محبت اور دلکشی کا دیہاتی شاہکار تھی جس کی دیوانی اس کے تنگ کپڑوں سے الٹی پڑ رہی تھی۔

”آپ اٹھ گئے جی۔“ اس نے خوشی سے کہا ”بڑی مہربانی ہوئی ہے آپ کی۔“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔ گویا اسے یہ معلوم تھا کہ میں سو رہا تھا ”کون ہو تم؟“

”میں۔ شاداں ہوں۔ پیر کی کی خادمہ۔“ پیر جی سے مراد یقیناً پیر سجان تھا۔ اس نے جس انداز سے خادمہ کہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ پیر سجان کے لیے کس قسم کی خدمات انجام دیتی ہوگی۔ اس عمر میں پیر سجان کا ذوق اچھا تھا۔ شاداں نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”آپ تیار ہو جاؤ جناب۔ پیر جی آپ سے ملیں گے۔“ وہ مجھے بے ضرر سمجھ رہی تھی۔ لہذا جب میں نے اسے اچانک دوپچا تو اس کی آواز بھی نہ نکل سکی تھی اور جب تک وہ صبح مارنے کے لیے منہ کھولتی ”میں اس کا منہ داجکا تھا۔ اس کا محبت مند جسم میری گرفت میں پھنسا کر رہ گیا تھا۔ اس نے کوئی سستا قم کا تیر عطر لگا رکھا تھا جس کی بو اس کے بدن کی بو میں مل کر میری ناک تک آ رہی تھی۔

”آواز نکالی تو گھبرا دوں گا۔“ میں نے اب کے اس کا کلا پکڑ لیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے ہشکل سر ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ کوئی آواز نہیں نکالے گی۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“ میں نے گرفت ذرا نرم کرتے ہوئے کہا۔

رہا کہ پولیس والوں نے جینم کے ساتھ کتنا شرناک سلوک کیا تھا۔ میں ایسے سنتا رہا جیسے میں ایک غیر متعلق فرد ہوں۔ البتہ ملا متی انداز میں اس سے اتنا ضرور کہا۔

”کیا ایک عورت سے یہ سلوک کرنے والوں کی ماں ہمیں نہیں تھیں یا وہ اپنی ماں بہنوں سے بھی ایسا سلوک کرتے ہیں۔“

ایک لمحے کو دلاور شاہ کا رنگ خفیہ ہوا لیکن وہ ڈھٹائی سے بولا ”جینم کون سی بار سا ہے۔ وہ خود سب کے سامنے کھل کر اعتراف کرتی ہے کہ وہ شاہ عالم کی رکھیل ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں سے اس کے تعلقات رہے ہوں گے پولیس بھی بندہ دیکھ کر سلوک کرتی ہے۔“

میں نے پر ناسف لہجے میں کہا ”اگر وہ شاہ عالم سے محبت کرتی ہے تو اسے اتنا بڑا جرم نہیں سمجھتا چاہیے۔ تم لوگوں کے تشدد سے وہ پیشہ کے لیے باطل بھی ہو سکتی ہے۔“ ”تم اپنی فکر کو شاہ عالم۔“ اس نے اچانک لہجہ بدل کر کہا ”میاں تمہیں مذاکرات کرنے کے لیے نہیں بلایا گیا ہے۔“

”مگر تم مجھے شاہ عالم سمجھتے پر مصر ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ میں نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ یہ سالن اور دیوانی یقیناً کسی ہوش سے آئی تھی گویا یہ مکان بالکل غیر آباد تھا۔ شاید میاں قابل خان کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں ممکن تھا۔ دلاور شاہ نے یہ مکان اپنی غیر قانونی تفتیش کے لیے لے رکھا ہو۔ میاں ان لوگوں کو لایا جاتا ہوگا۔ جنہیں تھانے میں نہیں رکھا جاسکتا ہوگا۔ سیاہی لیڈر اخباری کارکن اور حکومت کے مخالفین ایسے لوگ تھے جنہیں اختیارات سے ماوراء سر اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ ان کی گرفتاری کہیں نہیں دکھائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو ایسے ہی ٹھکانوں پر رکھا جاتا ہے اور میاں ان کے ساتھ سب کچھ دے دیتا تھا۔ کیونکہ اس ظلم کی فراہم کہیں نہیں کر سکتے تھے۔

”دیکھو تمہارے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو۔ اگر میں تمہیں مار کر کہیں گا زوروں کو قیامت سے پہلے تمہارا سراغ نہیں ملے گا۔“ ”میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔“

”تمہارے پاس چند گھنٹے کی مہلت ہے۔ اگر پیر سجان آجے تو میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے یہ پیر سجان جو بھی ہے میری بات زیادہ

کرتی تھی۔ میرا خیال ہے اب اسے عقل آگئی ہوگی۔“ ”اس کے برعکس وہ پہلے سے زیادہ اس کی دیوانی ہو گئی ہے۔ اس نے شاہ عالم کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔“

میں چونکا ”کیا مطلب کیا تم نے اس سے بھی پوچھ کچھ کی ہے۔“

وہ خبیثانہ انداز میں مسکرایا ”میں نے تو نہیں لیکن کچھ اور لوگ ہیں۔ وہ انسپکٹر سلامت کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کا حشر نشر کر دیا۔“ میں نے اشتعال کی شدید لہر کو بمشکل اپنے چہرے پر آنے سے روکا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جینم کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور عین ممکن تھا اسے موقع ملتا تو جینم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا۔

مگر ناصر عظیم سے جینم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہذا اس کی صورت پر اس کے لیے کوئی تاثرات بھی نہیں آنے چاہیے تھے۔ میں نے کہا ”پولیس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ بد معاش اور غنڈے ایک طرف رہے اب یہ بڑس میں اور صحتی جیسے لوگوں کو اٹھلاتے ہیں۔“

دلاور فاتحانہ غور کے ساتھ مسکرایا تھا۔ اس نے میری بات کی تردید نہیں کی تھی۔ اس نے جینم کو ایک مندی سی گالی دی ”اس سبجری نے کچھ نہیں بتایا۔ شاہ عالم کے لیے سب برداشت کر لیا۔“

”ممکن ہے اسے شاہ عالم کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ ہو۔“ میں نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا ”شاہ عالم اگر پولیس کی حراست سے فرار ہوا بھی ہو تو اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ ایک کمزور عورت کو اپنا ٹھکانا بنائے۔“

”وہ کمزور عورت نہیں ہے۔“ دلاور شاہ کے لہجے میں اشتعال تھا ”اس نے شاہ عالم کے لیے جو برداشت کیا ہے وہ کوئی اور برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے منہ سختی سے بند کر رکھا سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن ایک لفظ نہیں نکالا۔ مجھے یقین ہے وہ شاہ عالم کے ٹھکانے سے ضرور واقف ہوگی۔ اس سے تفتیش کرنے والوں میں میرا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ اگر وہ بتائی تو سب سے پہلے مجھے پتا چل جاتا۔“

میرا خون کھول رہا تھا لیکن میں اوپر سے سمندر کی طرح پرسکون رہنے پر مجبور تھا۔ اگر مجھے موقع ملتا جب بھی میں دلاور شاہ کی گردن نہیں توڑ سکتا تھا کیونکہ ایسا صرف شاہ عالم کر سکتا تھا۔ ناصر عظیم کا جینم سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ جذباتی ہوتا۔ مجھے اشتعال دلانے کے لیے دلاور شاہ تفصیل سے بتاتا

لے نہیں بلکہ شاداں کو وہاں سے رخصت ہو جانے کا اشارہ کرنے کے لیے شاداں کے جاتے ہی اس نے منہ سے حقے کی نالی "میرے سامنے ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ عالم بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کی چوکی کے سامنے نیچے قالین پر بیٹھ گیا "چلے شاہ عالم ہی سہی لیکن آپ میرا قصور بتائیں گے مجھے اس طرح کیوں اغوا کیا گیا ہے جیسے ڈاکو نادان کے لیے لوگ اٹھائے جاتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر غیظ کی جلیاں سی کوندی تھیں لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز پر سکون تھی "ہم نے تمہیں تادوان کے لیے نہیں اغوا کیا ہے بلکہ ہمارا تم سے کچھ حساب کتاب نکالنا ہے۔"

"جب میں شاہ عالم نہیں ہوں تو مجھے حساب کتاب کا کیا معلوم؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "آپ جس طرح چاہیں تصدیق کرائیں۔ سوائے شکل کے میں کہیں سے بھی شاہ عالم ثابت ہو جاؤں تو آپ میرے ساتھ ہر سلوک کرنے کے لیے آزاد ہیں۔"

"تمہارا دعویٰ بوجہ ہے ناصر عظیم کو کوئی نہیں جانتا اور شاہ عالم کو سب جانتے ہیں۔"

"ناصر عظیم کے حوالے موجود ہیں جو شاہ عالم سے یکسر مختلف ہیں۔" میں نے اصرار کیا۔

"شاہ عالم جیسے شاطر سے کچھ بعید نہیں ہے۔ وہ اپنے لیے ایک اور شناخت تیار کر سکتا ہے۔" سہجان شاہ نے حقہ گڑا۔

"جس وقت شاہ عالم لندن میں پھنسا ہوا تھا اس وقت میں یہیں تھا۔ اس کی گواہی بہت سارے لوگ دیں گے۔ یہ وہ سب لوگ ہیں جو مجھے بچپن سے جانتے ہیں اور معاف کیجئے گا۔ یہ اتھقانہ بات ہے۔ شاہ عالم بیک وقت دو زندگیاں نہیں گزار سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ بیک وقت دو مختلف ناموں سے مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف حوالوں سے زندگی گزار سکے۔ ہمارے سیاست دان عام طور سے بڑے وقت کے لیے بیرون ملک انتظام کر کے رکھتے ہیں۔ شاہ عالم کا اکثر وقت ملک سے باہر ہی گزرتا تھا۔ ملک میں وہ کم رہتا تھا۔ لازمی بات ہے اس نے اپنی محفوظ پناہ گاہ بھی کسی دوسرے ملک میں تیار کی ہوگی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسے اتنے احقانہ انداز میں اس شہر میں اپنی دوسری شناخت بنانے کی کیوں سوجھی۔"

پیر سہجان شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچتے ہوئے

حقہ گڑا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے وہیل کے ساتھ بات کی اور اپنے سامنے کی نسبت سہجان شاہ معقول آدی تھا۔ اس کی پچھلی مریدی کے دھندے اس کی مجبوری تھے جن کے بغیر وہ اپنی روحانی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ جبکہ دلاور شاہ ایک سفاک شخص تھا۔ پولیس نے اس کی سفاکی کو حیل کیا تھا۔ اگر سہجان شاہ مجھے اس کے حوالے کر دیتا تو وہ بلا تکلف مجھے اوجڑ کر رکھ دیتا۔ اسے قطعی غرض نہیں ہوتی کہ میں شاہ عالم ہوں یا نہیں۔ اگر میں اس کی تفتیش کے دوران میں ہلاک ہو جاتا تو اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ میری کوشش تھی کہ سہجان شاہ مجھ پر تشدد کا حربہ آزمانے کا فیصلہ نہ کرے۔

"یہ تو بڑا طویل چکر ہو جائے گا بابا۔" بالآخر اس نے حقہ منہ سے ہٹا کر کہا "اگر ہم نے ناصر عظیم کے ماضی کی کھوج شروع کر دی۔"

"لے شک یہ ایک طویل عمل ہو گا لیکن اس سے آپ حقائق تک پہنچ سکیں گے۔"

اس نے سر ہلایا "چلو ایسا بھی کر کے دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک تم ہمارے پاس رہو گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "بلکہ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ کی وجہ سے اس منحوس شاہ عالم کے لیبل سے میری جان بچھوٹ جائے۔"

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" پشت کی طرف سے دلاور شاہ کی آواز آئی۔ وہ نہ

جائے کب سے پیچھے کھڑا تھا "جب تفتیش ہوگی تو بہت ساری باتیں سامنے آجائیں گی۔ جو تم نے اب تک چھپائی ہیں۔ شاہ عالم کے قتل سے لے کر اب تک۔" آئے والے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ تمہیں وضاحت کرنا ہوگی کہ اب تک تم کیا کرتے رہے تھے۔ تمہیں اپنے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہو گا۔"

"میں تیار ہوں۔" میں نے پوری بے خوفی سے کہا لیکن دلاور شاہ کی بات نے مجھے اندر سے شکر کر دیا۔ اگر انہوں نے بچ بچ گمراہی میں جا کر تفتیش کی تو میرے بہت سارے کمزور پہلو سامنے آ سکتے تھے جو شاہ عالم سے میرے تعلق کی نشان دہی کر سکتے تھے۔ اگر ایک بار ان کا شک مخصوص درجے تک پہنچ جاتا تو انہیں مجھ پر تشدد سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ اچانک دروازے سے دو ملازم ایک فی دی ٹرائی کھینچتے ہوئے اندر لائے۔ اس کے نچلے حصے میں دی سی آر

بھی رکھا تھا۔ دلاور شاہ کی مسکراہٹ نے احساس دلایا کہ مجھے کسی خاص آزمائش سے گزارا جانے والا ہے۔

"ابھی تمہیں دکھاتا ہوں کہ اپنے مخالفین کے ساتھ میں کس قسم کا سلوک کرتا ہوں۔"

دلاور شاہ نے ایک ویڈیو کیسٹ وی سی آر میں ڈالی ٹی وی پر دکھایا۔ یہ چھتیس انچ کا ٹی وی تھا۔ جس کی اسکرین منی سینما کی طرح کی تھی۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا اگلے ہی لمحے اسکرین پر جو منظر نمودار ہوا اسے دیکھ کر میرا دل رکنے سا لگا تھا۔ جنیم درندہ نما انسانوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ فحش پائی کرتے ہوئے اسے فوج کھسٹ رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کے کپڑے آتار کر دیے تھے۔ جنیم جیتی چلاتی رہی۔ انہیں گالیاں دیتی رہی لیکن وہ کمزور سی عورت ان چھ بٹے کئے مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ جو اس وقت شیطان کو مات کر رہے تھے۔ اس ویڈیو میں وی سی آر کے کچھ تھاموں نے ڈاکٹر عائشہ کی زبانی سنا تھا۔ بس فرق وی تھا جو سننے اور خود دیکھنے میں تھا۔ وہ درندے جنیم سے ٹھیکے ہوئے بار بار ایک ہی سوال دہرا رہے تھے کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ انہوں نے بے شرمی کی انتہا کر دی تھی۔ میں بے اختیار چیخ اٹھا "بند کرو اسے۔ بند کرو اسے۔"

دلاور شاہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "تم برداشت نہیں کر سکتے شاہ عالم۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ یہ سلوک۔"

"لعنت ہو شاہ عالم پر۔" میں چلایا "کاش کہ میں شاہ عالم ہوتا تو یہ منظر میرے لیے اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا مگر میں ناصر عظیم ہوں۔ اس ملک کا ایک عام شہری میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں بے حس ہوں۔ میری بد قسمتی کہ میرا تعلق انسانوں سے ہے درندوں سے نہیں۔ ورنہ اتنی درندگی تو جنگل کے درندے بھی نہیں دکھاتے۔ کیا تم پولیس دانوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔"

میرے لہجے اور الفاظ نے ایک لمحے کو دلاور شاہ کو شرمندہ کر دیا تھا لیکن فوراً ہی وہ سنبھل کر بولا "بھرموں کے لیے ہمیں اپنا دل سخت کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"اور مجرم بھی وہی ہوتا ہے جسے تم لوگ مجرم قرار دیتے ہو۔" میں نے غصے سے کہا "یہ نظام انصاف اور عدالتیں تو بنائے ہیں۔ انصاف کا سارا کام پولیس پر چھوڑ دینا چاہیے جو خود ہی منصف بلکہ گواہ اور جلا د کا کردار بھی ادا کر لیتی ہے۔"

"میں تم سے پولیس سسٹم کے بارے میں بحث نہیں کرتا۔"

"پھر تم یہ ویڈیو دکھا کر مجھ سے پولیس کے لیے کھاتے

ہائے تحسین کھلوانا چاہتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔

پیر سہجان بے اثر نظروں سے فی دی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس منظر میں اس کے لیے کچھ کاکوئی سامان نہ ہو اور نہ ہی وہ اسے انسانیت سے گرا ہوا محسوس کر رہا ہو۔ وقفے وقفے سے وہ حقہ بھی لپی رہا تھا۔ ابتدائی جذباتیت کے بعد میں نے خود پر قابو پالیا تھا اور اب ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ ایک عام انسان ہونے کے ناتے مجھ سے انسانیت کی تدریل کا یہ تماشا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے پیر سہجان سے کہا "پیر صاحب آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں عورت کا کیا مقام ہے۔ وہ پیر پیغمبروں کی ماں ہے۔ اس کی اس حد تک تدریل۔"

"اس کجبری کو ان سے نہ ملاؤ۔" پیر سہجان نے ناگواری سے کہا لیکن اس کے اشارے پر دلاور شاہ نے وی سی آر آف کر دیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر جنیم سے میرا جذباتی تعلق نہ ہوتا اور اس ویڈیو میں کوئی اجنبی عورت ہوتی تب بھی یہ میری برداشت سے باہر ہی ہوتا۔ اچانک پیر سہجان کے پاس چوکی پر رکھا وائریس واکر ٹی سیٹ بول اٹھا۔ اس نے سیٹ اٹھایا "ہاں بابا۔ کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے جو کہا کیا "اس نے تم کو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے کہا "ایس ایس پی سے بات کرو۔"

ایس ایس پی کا سن کر دلاور شاہ چونکا تھا۔ پیر سہجان کہہ رہا تھا "اور سنناؤ ایس ایس پی کیسے زحمت کی؟" ایک بار پھر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا "کون حراسی کتا ہے۔" اس نے دھاڑ کر کہا "تھوٹ ہے بابا! کو اس ہے جس نے بھی اطلاع دی ہے اس نے اپنی عاقبت کے ساتھ دنیا بھی خراب کر لی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے سیٹ اٹھایا اور دلاور شاہ سے بولا "اسے اندر لے جاؤ بلکہ نیچے لے جاؤ۔ خاص۔ خانے میں۔"

دلاور شاہ نے دو مسلح افراد بلا کر مجھے ان کے سپرد کر دیا۔ وہ مجھے حویلی کے نچلے حصے میں واقع ایک خانے میں لے گئے۔ یہ خانے میں ایک راہداری کے دونوں اطراف کمرے بنے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائے۔ اپنی سجاوٹ سے یہ کمرہ انشت گاہ لگ رہا تھا۔ درمیان میں گردے کی شکل کے دو صوفے آئے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان گول میز تھی۔ نہ جانے انہوں نے کیا کیا کہ ایک صوفہ فرش سمیت سرک کر ایک طرف ہو گیا۔ اس کے نیچے فلا نمودار

ہوا تھا "نیچے اتر جاؤ۔" ایک نے مجھے حکم دیا اور میں بیڑھیاں اتر گیا۔ فوراً ہی اوپر کا خانہ بند ہو گیا۔
 بظاہر اندر سے خانے کا دروازہ کھولنے کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں بیڑھیوں سے نیچے اترتا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ بشکل بارہ بائی بارہ فٹ کا۔ اس کی چھت البت اونچی تھی۔ نیچے سوائے ایک سادہ سے بستے کے کچھ نہیں تھا۔ کمرے چاروں طرف سے بند تھا لیکن اس میں کھنک نہیں تھی۔ شاید کہیں سے تازہ ہوا کی آمدورفت جاری تھی۔ یہ خانہ ٹھنڈا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ زمین دوز تھا۔ ورنہ اوپر اس وقت بے پناہ گرمی تھی۔ میں چار بائی پر بچھے بستر گر پڑا۔ چند منٹ پہلے جو مجھ پر سخت وقت گزرا تھا، اس نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ دلاور شاہ نے کینٹینی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا بلکہ مجھے شبہ تھا کہ شبنم پر ہونے والے تشدد میں اس کا ہی ہاتھ تھا۔ ورنہ اس کے پاس یہ ویڈیو کیسٹ کہاں سے آئی۔

میرا ذہن ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو میں سہان شاہ کے بارے میں غور کرنے لگا، ایس ایس بی کی آمد پر اس نے جو رد عمل ظاہر کیا تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ ایس ایس بی کی آمد خوشگوار نہیں تھی پھر اس نے مجھے جس طرح اس خفیہ خانے میں پہنچانے کی ہدایت کی تھی، اس سے بھی دال میں کالا ظاہر تھا۔ کیا اسے خدشہ تھا کہ پولیس حویلی کی تلاشی لے گی مگر پولیس پیر سہان جیسے با اثر شخص کی حویلی کی تلاشی لینے کی جرات کیونکر کر سکتی تھی۔ یہ کسی غریب کی ہو بیٹی یا سودگی کا معاملہ نہیں تھا۔ جسے پیر سہان کے ہر کارے اٹھالائے ہوں۔ اول تو پولیس ایسی کسی شکایت پر پیر سہان کی حویلی کا رخ ہی نہ کرتی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے آتی بھی تو ایس ایس بی صاحب بذات خود آنے کے بجائے خانہ پری کے لیے کسی معمولی افسر کو بھیجتا۔ اچانک میرے ذہن میں الہام کی طرح خیال آیا۔ پولیس صرف شاہ عالم کے لیے آ سکتی تھی۔ کسی ذریعے سے پولیس کو معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ عالم پیر سہان کی حویلی میں تھا۔ بے شک پیر سہان اہم تھا لیکن شاہ عالم کے فرار کی وجہ سے پولیس کی جان پر بی ہوتی تھی۔ پولیس نے الزامات کی دو بارہ گرفتاری کے لیے اگلے ہو رہے تھے تاکہ ایک بار اسے عدالت کے دوہرے پیش کر کے سرخرو ہو سکیں۔ معاملہ اتنی اونچی سطح کا تھا کہ ایس ایس بی نے خود آنا ضروری سمجھا۔ پیر سہان کی حویلی کی تلاشی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے اس کے مریدوں اور ارادت مندوں میں اشتعال

پھیل سکتا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ صرف ایک غلط فہمی ہو۔ میں نے خود سے کہا۔ زمین سے کوئی شے فٹ نیچے اس تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر میں سوائے خیالی گھوڑے دوڑانے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند بھی نہیں آئی تھی۔ شاید بھوک کی وجہ سے۔ آخری بار میں نے دلاور شاہ کے سامنے اس ویران مکان میں کھانا کھایا تھا۔ اس بات کو بھی غالباً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں بستر لیٹا رہا۔ وقت سستی سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اوپر سے سربراہ کی آواز آئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ دلاور شاہ بیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

"پولیس شاہ عالم کی تلاش میں آئی تھی۔" میں نے کہا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
 "تمہیں کیسے پتا۔" پھر بات ادھوری چھوڑ کر اس نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا "ہاں وہ حرامی ایس ایس بی شیر حسین آیا تھا۔ اس کے پاس حویلی کی تلاش کا وارنٹ بھی تھا۔"

"پتہ ہم جنسوں کو خوب پہچانتے ہو۔ کیا اس نے حویلی کی تلاشی لی؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کوئی پیر سہان کی حویلی کی تلاشی لینے کی جرات کرے۔ پولیس ناکام واپس گئی ہے۔" اس نے تکبر سے کہا پھر گالی دے کر بولا "میں اس شخص کو دیکھ لوں گا جس کی یہ ایس ایس بی ججہ گیری کر رہا ہے۔"
 میں نے قہقہہ لگایا "تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ سہان شاہ کی حویلی پر پولیس پہنچنے والے معمولی لوگ نہیں ہو سکتے۔" "بھونکنا بند کرو۔" اس نے دباؤ کر کہا "جانو ادھر آ۔" اوپر سے وہی شخص اترتا جو مجھے اس خانے تک لایا تھا اس کا جوڑی دار ابھی نظر نہیں آ رہا تھا "حکم سرکار۔"

"اسے بھٹکڑی لگاؤ۔" دلاور شاہ نے حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جانو سے اس کی کلا شکوف لے لی تھی "شاہ عالم شرافت سے بھٹکڑی لگو لو۔" اس کے لیے میں سفای محسوس کر کے میں نے خود ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ مجھے بھٹکڑی لگانے کے لیے جانو آگے آیا تو وہ ایک لمحے کو میرے اور دلاور شاہ کے درمیان آگیا۔ اگر میں چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس شخص کو دلاور شاہ پر دے مارا لیکن اول تو مجھے یقین تھا کہ میری کسی غلط حرکت پر دلاور شاہ اپنے آدمی کی پروا کیے بغیر بے دریغ فائر کر دے گا۔ دوسرے میں اس پر قابو پالیتا تب بھی اس جگہ سے میرا ٹکنا حال تھا۔ مجھے حویلی کے بارے

میں علم نہیں تھا اور سہان شاہ کے محافظین اس کے چپے چپے پر موجود ہوتے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس فرار سے میرا شاہ عالم ہونا ثابت ہو جائے اور میرے ساتھ وہ تمام لوگ قریب میں آجائے جن سے ناصر عظیم کا تعلق تھا۔ لہذا میں نے ضبط کر کے بھٹکڑی لگوائی۔

"اور چلو۔" دلاور شاہ نے کلا شکوف سے اشارہ کیا۔ "بھٹکڑی کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو ویسے ہی قید میں ہوں۔" میں نے احتجاجی انداز میں مارچ شروع کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح بھٹکڑی لگانے کا مقصد مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کرنا تھا۔ ایس ایس بی ناکام واپس گیا تھا اور وہ دوبارہ آ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس بار وہ تلاشی پر اصرار کرے اور سہان شاہ مجبور ہو جائے۔ لہذا مجھے کسی اور مقام پر منتقل کرنا ضروری تھا۔ حویلی کی ویران راہداریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک پورچ تک پہنچے۔ وہاں سیاہ شیٹوں والی ایک پجاری کھڑی تھی۔ بالکل دکنی گاڑی جس سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی پجاری نہ ہو لیکن جب میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی تو وہ بالکل مختلف تھی۔ یہ مٹان کی رجسٹرڈ گاڑی تھی۔ اس کی اندر کی آرائش بھی مختلف تھی۔ دلاور شاہ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں کچیس سیٹ پر اس کلا شکوف بردار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے دلاور شاہ کے اشارے پر ایک سونے سیاہ کپڑے کا غلاف میرے سر پر چڑھا دیا تھا۔ جیسے سزائے موت کے مجرموں کے سر پر چڑھایا جاتا ہے۔

پجاریو سبک خرابی سے آگے بڑھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا لیکن گرمی ابھی تک برقرار تھی۔ اور بات تھی کہ اس انرکنڈیشنڈ گاڑی کے اندر اس کا اثر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میری درخواست پر دلاور شاہ نے مجھے پانی تو پلوا دیا تھا لیکن کھانے کو کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ جلد از جلد مجھے حویلی سے نکال لے جانے کی فکر میں تھا۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ ہم کس طرف جارہے تھے مجھے سبوتوں کا بھی پتا نہیں تھا۔ یہ سنا ناممکن تھا کہ ہم لاہور کی طرف جارہے تھے یا اس سے مختلف سمت میں کسی طرف۔ سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ایس روانہ ہوئے آدھ یا پون گھنٹا ہو گیا تھا۔ اچانک دلاور نے چلا کر کہا۔

"جانو بوشیار ہمارا چچھا کیا جا رہا ہے۔" کوئی گاڑی زن سے برابر سے گزری تھی اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے برست چلنے اور شیشے بھرنے کی آواز سنی۔ گاڑی میں کسی نے بھیاک آواز نکالی۔ اس کے ساتھ

ہی گاڑی ڈولنے لگی اور پھر پھر الٹ پلٹ ہونے لگی۔ میں اندر ہی اندر زبردست ہرگیا۔ میرا سر کسی سخت شے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہوتے ذہن سے میں نے ایک زوردار دھماکا سنا۔ شاید پجاریو کا پٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا اور اب مجھے جل کر مرنے سے سوائے خدا کے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ آخری سوچ تھی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔

○☆☆○

یہ بے ہوشی نہیں تھی بلکہ اتنے پلٹنے اور پھر سر کسی شے سے ٹکرانے کی وجہ سے مجھے ذرا زیادہ ہی چکر آ گیا تھا۔ میں شاید دس پندرہ منٹ سے زیادہ بے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں خاصی مضحکہ خیز حالت میں ہوں۔ میری انگلیں اوپر کی طرف تھیں اور گردن کسی شے میں پھنسی ہوئی تھی میرے اوپر کسی جسم کا بوجھ بھی تھا۔ میں نے بمشکل سب سے پہلے اپنا نقاب اتارا۔ جانو میرے اوپر سوار تھا۔ پجاریو بائیں کوٹ پر بیٹھی تھی۔ جانو دائیں طرف تھا اس لیے وہ مجھ پر سوار تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کی لاش مجھ پر سوار تھی۔ گولیوں نے اس کا سر تقریباً غائب کر دیا تھا اور اس کا خون مجھے ترہڑ کر رہا تھا۔ میں نے دشت کے عالم میں اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا لیکن وہاں جگہ کہاں تھی۔ مجبوراً میں اس کی لاش پر سوار ہو گیا۔ ہاتھوں میں لگی بھٹکڑی کی وجہ سے رکاوٹ ہو رہی تھی۔ میں نے شیشہ کھولنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ شیشہ غائب ہے غالباً جانو جن گولیوں سے مارا گیا تھا انہوں نے اسی شیشے سے راہ گزریاتی تھی۔ اتنے پلٹنے سے مجھے خاص نقصان نہیں ہوا تھا کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ بلکہ پھٹکی چوٹیں آئی تھیں۔ بمشکل میں نے خود کو پجاریو سے باہر نکالا۔

سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ پجاریو سڑک سے اتر کر کچے میں انٹی پڑی تھی اور سامنے سڑک پر ایک پرانے ماڈل کی جاسی سائز بیکو دھڑا دھڑا جل رہی تھی۔ میں نے جو دھاکا سنا تھا وہ پجاریو نہیں بلکہ بیکو کے پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا تھا۔ شاید جانو اور دلاور شاہ نے بیکو پر فائرنگ کی تھی جو پجاریو کا راستہ روکنے کے لیے کھڑی تھی۔ مجھے دلاور شاہ کا خیال آیا۔ میں محسوس کر سامنے کی طرف آیا۔ پجاریو کی دھڑا شیلڈ ٹوٹ گئی تھی اور دلاور شاہ کچھ عجیب سے انداز میں پڑا تھا۔ اس کی شاید ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ مردکا تھا۔ ڈرائیور سیٹ بیٹھ سے بندھا ہونے کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی نشست پر رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے ذرا آگے جھک کر

دلاور شاہ کو دیکھا۔ معامیری نظر ڈالیں بورڈ کے ساتھ پڑی ویڈیو کیسٹ پر بڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ شاید وہی کیسٹ تھی۔ جس میں ختم ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی ریکارڈنگ تھی۔ اچانک دلاور شاہ کراہا۔ اس نے کدوٹ لینے کی کوشش کی اور اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے اسے پیچھے کر بچا رو سے باہر نکالا۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ گولیوں نے اس کے درمیانی دھڑ میں نئی سوراخ کر دیے تھے۔ وہ چند لمحوں کا مسمان نظر آ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کراہا ”شاہ عالم“

”ہاں۔“ میں نے سیٹ لیجے میں کہا ”میں شاہ عالم ہی ہوں۔ جس کا پتا معلوم کرنے کے لیے تم نے ایک کمزور سی عورت پر ظلم کے سہارے ڈالے تھے۔“

”سنو۔ مجھے کسی طرح اسپتال تک لے چلو۔ میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔“

”سو تو سامنے دیکھ کر بھی تمہاری مکاری نہیں گئی۔ معافی مانگنے سے کیا ختم کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تلافی ہو جائے گی۔“ میں نے طنز کیا۔

”پلیز مجھے طبی امداد دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری مدد کروں گا۔“

”تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“ میں نے اس کے زرد ہوتے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔ رب نواز۔ تمہارا۔ دشمن ہو رہا ہے۔ میرے پاس ایسے ثبوت ہیں جن سے اس پر ملک سے نوادرات اسمگل کرنے کا جرم ثابت ہو جائے گا۔“

”وہ ثبوت کہاں ہیں؟“

”میں دس دوں گا لیکن۔ پہلے مجھے اسپتال لے چلو۔“

میں نے چاروں طرف دیکھا اور مایوسی سے بولا ”یہاں تو دور دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم ہیں کہاں؟“

دلاور شاہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز کے بجائے خون ابل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور خون کا ایک بلبلہ سا آکر اس کے ہونٹ سے گوشت پر ٹپک گیا تھا۔ وہ چمکا تھا۔ میرا لباس جانو کے خون میں تر تھا۔ اس لیے میں نے دلاور شاہ کے خون میں لت پت ہونے کا خیال کیے بغیر اس کے لباس کی تلاشی لی اور سب چیزیں نکال لیں۔ ان کا معائنہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سڑک آکر چہرے سنسنی تھی لیکن کسی وقت بھی کوئی آسٹن تھا اور اگر

پولیس آجاتی تو یہ میرے لیے آسمان سے گر کر سمجھو میں اٹھنے والی بات ہوتی۔ میں نے ایک نظریہ پوک والوں پر ڈالی۔ اس میں تین افراد سوار تھے اور تینوں ہی اندر چل مرے تھے۔ ان کے چلنے کوشت سے اٹھنے والی چاندنا قاتل برداشت تھی۔ میں بے اختیار اٹکیاں لیتا بھاگا۔ ذرا دور صاف ہوا میں سانس لے کر میری طبیعت بحال ہوئی تھی۔ سورج سے میں نے مغرب کی سمت کا اندازہ لگایا اور اس کے مخالف سمت میں چلتا شروع کر دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں واپس آیا۔ میں نے دلاور شاہ کی لاش کے پاس بڑا اس کا ربوہ لور اٹھایا۔ یہ بھرا ہوا تھا مگر تلاش کرنے پر بھی مجھے اضافی گولیاں نہیں ملی تھیں۔ بچا رو میں جانور کی کلا شکوف پڑی تھی۔ اس کا میگزین بھی مل جاتا لیکن میں نے اسے نہیں اٹھایا۔ بڑا ہتھیار اٹھا کر چلنا خود کو مشکوک بنانا تھا۔ پستول میں آسانی سے لباس میں چھپا سکتا تھا۔ لباس پر لگا خون مجھے پریشان کر رہا تھا۔ اس سے لوگ شکوک میں مبتلا ہو جاتے مگر خوش قسمتی سے لباس مگرے نیلے رنگ کا تھا اور سورج خوب ہونے کے بعد اس پر خون کے دھبے نہیں دیکھے جاسکتے تھے۔ میں سڑک سے ذرا ہٹ کر درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چل رہا تھا۔

صبح سے کچھ نہ کھانے کی وجہ سے مارے بھوک کے آنتوں میں بلی پڑ رہے تھے۔ اب پیاس بھی شدت کی لگ رہی تھی۔ خاصی دور نکلنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے بچا رو کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ ممکن تھا کہ وہاں سے کھانے پینے کی کوئی شے نکل آئی لیکن اب میں خاصی دور نکل آیا تھا اور جائے حادثہ پر دوبارہ جانے کا مطلب خود کو گرفتار کرنا تھا وہاں اب تک پولیس آچکی ہوگی اور وہاں جمع ہونے والے تماشا بینوں کو سمیٹ رہی ہوگی۔

دلاور شاہ کی کلائی سے اناری گھڑی میں رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ یہ خاصی سنسنی کی سڑک تھی اتنی دیر میں صرف چند ایک گاڑیاں ہی گزری تھیں۔ ایک ٹریکٹر زراعی پر بھوسا جا رہا تھا اس کے عقبی حصے میں دو کم عمر بچے خطرناک انداز میں کھیل رہے تھے پھر ایک پک اپ گزری۔ جس پر کوئی برات لدی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک نوجوان ڈانس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کی بے فکری دیکھ کر اور قہقہے سن کر مجھے نالاش سی ہوئی تھی کہ کاش میں بھی ایک عام دیوانی ہوتا۔

اچانک بستے پانی کی جاں فزا آواز نے مجھے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف ایک رستہ تھا جسے دو تیل چلا رہے تھے۔ کوئیں سے نکلنے والا پانی ایک ٹال سے

ہوتا ہوا دور کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر سب سے پہلے پیاس بجھائی۔ شدید پیاس کے عالم میں کوئیں سے نکلنے والا پانی جیسے آب حیات ثابت ہوا تھا۔ پیاس بھا کر میں نے کپڑوں پر لگے خون کے داغ صاف کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر انہیں اتار کر دھویا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے سامان ایک طرف رکھا اور کپڑے اتار کر اس مختصر سے حوض میں گھس گیا۔ جس میں رہت کا پانی گر رہا تھا۔ گرمی خاصی تھی اور سرد پانی نے مجھے تڑ تازہ کر دیا تھا۔ نہ صرف جسمانی کلفت دھو ڈالی تھی بلکہ میں ذہنی طور پر بھی خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔

”اے کیا کر رہے ہو؟“ اچانک آواز آئی تو میں اچھل پڑا تھا۔ یہ ایک سولہ سترہ سالہ صحت مند دیوانی لڑکا تھا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی کیونکہ سوائے اندر دیر کے میرے جسم پر کچھ نہیں تھا ”باہر نکلو۔“

”معاف کرنا بھائی۔“ میں نے باہر آ کے کہا ”ایک کتا پیچھے لگ گیا تھا اس سے پیچھے ہوئے ایک جوہڑ میں جا کر تھا۔ سارے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔“

لڑکا میری وضاحت سے کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا تھا لیکن ربوہ لور پر نظر پڑتے ہی وہ پھر مشکوک ہو گیا۔

”تم چور۔ ڈاکو ہو؟“

”میں شکل سے تمہیں چور یا ڈاکو نظر آتا ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا ”میں ایک شریف آدمی ہوں۔ ٹھکے انمار میں افسر ہوں۔ پیچھے سڑک پر میری گاڑی کھڑی ہے پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔ آگے کسی پیٹرول پمپ کی تلاش میں تھا کہ کتا پیچھے لگ گیا۔ یہ ربوہ لور میں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے اس کا لائنس بھی ہے میرے پاس۔“

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب لڑکا مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ اس نے لائنس بھی نہیں مانگا تھا ”میرا نام رحیم داد ہے پل طرف گاؤں میں گھر ہے۔“

”یار رحیم داد خت بھوک لگی ہے۔ صبح ناشتا کیا تھا۔ اگر یہاں کھانے کو مل جائے تو میں معاوضہ بھی دوں گا۔“

”تو جی جی کھانے کا معاوضہ۔“ اس نے کہا ”ہمارے ہاں مسلمانوں سے کھانے کے پیسے نہیں لیے جاتے۔“

میں نے خت شرمندگی محسوس کی تھی۔ کھیتوں کے پار رحیم داد کا گاؤں تھا۔ میں ٹیلے کپڑے پن کر اس کے ساتھ چل دیا تھا۔ وہ جتنا سیدھا تھا اس کا پاپ اتنا ہی نیڑھا ثابت ہوا۔ اس نے مجھے گھر میں بٹھا کر کھانا کھلایا مگر ساتھ ہی اس نے سوالات شروع کر دیے اور ہر سوال سے ذیلی سوال پیدا

کرنا اس کی پیدائشی عادت تھی۔ رحیم نے اسے روکنے کی کوشش کی ”ابا اسے سکون سے کھانا تو کھالینے دے۔“

”کیوں نہ کر حرامی۔ جا کر دیکھ وہ تمہارے باپ نہ کوئی لے جائے گاؤں میں موسیٰ چوری بڑھتی جا رہی ہے۔“

والد ماجد کا اشارہ بیلوں کی طرف تھا۔ بڑھے کے سوالوں سے تنگ آکر میں نے اٹے جواب دینا شروع کر دیا۔

”آپ کہاں سے آئے ہو؟“

”لاہور سے۔ دو سال ہوئے اس سے پہلے میں ایک پاگل خانے میں تھا۔“

”پاگل خانے میں۔“ وہ حیران ہوا ”مگر آپ تو باا“

ٹھیک نظر آتے ہو۔“

”نظر آتا ہوں۔“ میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا ”پاگل تو وہ ڈاکٹر تھے جو مجھ سے روز پچھتے تھے کہ میں نے اس بندے کو کیوں مارا۔“

”بندے کو۔“ اس کی جان نکل گئی تھی ”قتل کر دیا۔“

”بچ مار دیا۔“

”نہیں کیا جھوٹ موٹ مارا۔“

”لیکن کیوں جناب؟“

”اب یہ تو یاد نہیں ہے۔ اس وقت میں پاگل تھا۔ ممکن ہے مجھے اس کی کوئی بات پسند نہ آئی ہو اور میں نے اسے کوئی مار دی۔“

”ٹھگ۔ گولی مار دی؟“ آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔ اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا ”مم۔ آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“

بڑھے کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی لیکن یہ زیادہ ہی مذاق ہو گیا تھا۔ ممکن تھا وہ خوف زدہ ہو کر گاؤں والوں کو بلا لانا اور میں کسی نئی مصیبت میں پڑ جاتا۔ میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ بڑھے کو آواز دی کہ برتن واپس لے جائے ”وہ پانی لینے گیا تھا تو واپس ہی نہیں آیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آیا تو میں نے اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ وہ دعا میں دینے لگا تھا ”اب میں چلتا ہوں تمہارا شکر یہ۔“

”اتنی رات گئے آپ کہاں جاؤ گے؟“ اس نے جلدی سے کہا ”رات یہاں ٹھہر جاؤ۔ صبح چلے جانا۔ اس وقت تو گاڑیاں بھی بند ہو گئی ہوں گی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی اتنی رات گئے میں یہاں سے نکلا تو کہاں جاتا۔ ممکن ہے چور میرا جسم اب آرام طلب

کر رہا تھا۔ رحیم داد کا باب لالچ میں آگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں رات بھر غصے کا معاوضہ الگ سے دوں گا اور ناشے کا الگ سے۔ میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ رقم بھی دلاور شاہ کی جاری تھی۔ اس کے ہونے میں پچیس ہزار سے اوپر ہی رقم تھی۔ ایک ڈی ایس پی کی جیب میں اتالیق تو ہوتا ہی چاہیے۔ میں رکنے پر تیار ہوا تو وہ خوش ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس چارپائی پر ایک کمیس لاکر بچھادیا اور چھروں سے بچنے کے لیے ایک چادر بھی لا دی۔ اتنی دیر میں میرے کپڑے تقریباً خشک ہو چکے تھے لہذا میں نے اس سے کوئی خشک جوڑا مانگنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ مگر چادر کا سوراخ بھی چھروں کی بلخار کے آگے بے بس ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے کانٹا اور گانا سنانا شروع کر دیا۔

تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں ان کی پروا کیے بغیر ہی سو گیا۔ رات کے نہ جانے کس پر میری چھٹی حس نے چونکا دیا۔ جیسے پاس ہی کوئی خطرہ ہو۔ میں چونک کر اٹھا تو ایک ساہی بھڑک کر بھاگا۔ میں نے اسے لاکار "خبردار رک جاؤ۔ ورنہ گولی باروں" حالانکہ میرے ہاتھ میں ریوالتور نہیں تھا۔ وہ رک گیا۔ "خدا کے لیے گولی نہ چلائو" تو از رحیم داد کے باپ کی تھی۔ محسن میں گلی لائیں بھئی گئی تھی۔

چراغاں چاہتے تھے۔ "مجھے معاف کرو" اس نے کہا اور ایک دم دباؤں مار کر دوسنے لگا "میں اور کیا کروں۔ جی کا گھر بنانے کے لیے چوری نہ کروں تو کیا کروں۔ مگر اوز زمین پہلے ہی رہن رکھ چکا ہوں۔"

"بے وقوف بتاتے ہو مجھے، تمہارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے" میں نے اسے شانے سے پکڑ کر جھٹوڑا۔ "بہن! اپنے گھر میں ہے لیکن اس کا کینہ شوہر دھکی دے رہا ہے اگر میں نے موٹر سائیکل نہ دلائی تو وہ اسے اور اس کے چار بچوں کو گھر سے نکال دے گا۔"

"اور تم اس کی بلیک میلنگ میں آگئے" میں نے سختی سے کہا "شاید پہلے ہی وہ تمہیں اس طرح دھمکیاں دے کر اپنے مطالبات منوانا رہا ہے۔ یہ بتاؤ زمین اور گھر کیوں رہن رکھی ہے؟"

"اس کہنے کو بیلوں کی جوڑی دینے کے لیے" اس نے نفرت بھرے انداز میں کہا "پڑاری نے دونوں کے صرف بارہ ہزار روپے دیے تھے۔"

کے لیے ڈاکا روگے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ تم جا کر اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو لے آؤ اور اپنے کہنے داماد سے وہ سب کچھ چھین لو جو تم نے اسے دیا تھا۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا۔"

"شاہ اب ایسا ہی کرتا پڑے" اس نے کیا پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔ پولیس میں رپورٹ نہ کرنا ورنہ میں بالکل ہی برباد ہو جاؤں گا۔"

مجھے بے اختیار اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اس ملک کی کچلی ہوئی بے بس عوام کا ایک نمونہ تھا جو خدا سے زیادہ اس کی زمین پر فراعون بن جانے والوں سے ڈرتا تھا۔ وہ برطانت ور سے دتا تھا۔ اپنا حق احسان سمجھ کر لیتا تھا۔ حق غصب کرنے پر مہر کا سارا لیتا تھا۔ "اگر تمہارا گھر اور زمین تمہیں واپس مل جائے تو؟"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "تو مجھے پڑاری کو آدمی پیداوار نہیں دینا ہوگا۔"

میں نے اسے ہونے سے چندہ ہزار نکال کر دیے "یہ رکھو۔ اپنی زمین اور مکان چھڑاؤ اور میرا مشورہ ہے کہ داماد پر لعنت بھیج کر بیٹی کو گھر لے آؤ۔ اس طرح تو تم اسے تباہ کر رہے ہو۔ تمہارا لالچی داماد ایک دن اسے بھی بچ کر کھا جائے گا۔"

اس پر شاہی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی ذلیل حرکت کے بدلے میں سزا کے بجائے اسے رقم بطور انعام تمہادوں گا۔ اس نے ہتھکڑیاں کرکھا "نہیں صاحب! میں یہ رقم نہیں لوں گا۔"

"کیوں نہیں لوگے" میں نے ڈانٹ کر کہا "چوری کرنے کو تیار ہو گئے تھے اور اب میں دے رہا ہوں تو انکار کر رہے ہو" میں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں زبردستی تمہادے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ اس نے اتنی بار میرا شکر یہ ادا کیا کہ میں شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔ رات خانے کے قریب تھی۔ میں تقریباً چھ گھنٹے سویا تھا اور تازہ دم ہو گیا تھا۔

لہذا میں نے مناسب سمجھا کہ اب روانہ ہو جاؤں مگر رحیم داد کا باپ مجھے چٹ گیا۔ اس نے ناشتے کی بغیر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے خود میرے لیے دسی تھی میں براٹھے بنائے "اندھے تلے اور چائے پانی۔ اسی وقت رحیم داد آگیا تھا۔ وہ ساری رات زمینوں کو پانی دیتا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن وہ تھا ہوا تھا اس لیے ناشتا کرتے ہی سوئے چلا گیا۔ رحیم داد کا باپ مجھے سڑک تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے جذبات سے قائلہ اٹھا کر میں

نے اس سے ایک کمرہ اور نقلی حاصل کر لی تھی۔ لباس پرانا اور بوسیدہ لیکن صاف ستھرا تھا۔ مجھے شلوار قمیص سے دھل جانے کے باوجود کراہیت ہو رہی تھی۔ اس نے میری درخواست پر اپنی چارخانے کی سر پر باندھنے والی چادر بھی میرے حوالے کر دی تھی اس طرح میرا حلیہ خاصی جد تک بدل گیا تھا۔ چہرے پر چاروں کی برہمی ہوئی شیو تھی۔

لاہور جانے والی بس خلاف توقع خالی تھی۔ صبح صبح کم لوگ سفر کرتے ہیں۔ لاہور قریب آیا تو ایک جگہ پیٹاب کے بہانے بس روکا کر میں نے ریوالتور سے چھکارا حاصل کر لیا۔ اگر کسی چیک پوسٹ پر تلاشی کی جارہی ہوئی تو یہ ریوالتور مجھے کھلا دیتا اور پھر پولیس کو شاہ عالم کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ اتار کھلی سے کچھ دور بس اڑے پر اتر کر میں نے سب سے پہلے ایک ہوٹل میں چائے پی اور تازہ اخبار دیکھا جسے دسیوں لوگوں نے ہاسی کر دیا تھا۔ شاہ عالم کی مفروزی کی خبر ابھی تک گرم تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ شاہ عالم کی تلاش میں مصروف پولیس نے ختم کو گرفتار کر کے اور پھر انسانیت سوز تشدد کر کے پورے پریس کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔ دو اخباروں نے پولیس کی اس لاقانونیت کے خلاف زوردار ادارے لکھے تھے جبکہ پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل نے اس الزام کی تردید کی تھی۔

ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کی طرف سے عدالت میں بیان دیا تھا کہ پولیس یا کسی صوبائی ایجنسی نے ختم کو گرفتار نہیں کیا "اس لیے یہاں سلوک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس سفید جھوٹ پر سختی سے مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس ویڈیو کیسٹ کا خیال آیا جس میں ان لوگوں کے مکروہ چہرے محفوظ تھے جو ختم پر ظلم میں پیش پیش تھے اور اس ظلم کا ایک کردار کیئر کرار تک پہنچ چکا تھا یعنی دلاور شاہ۔ اگرچہ اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے جو عبرت ناک موت دی تھی اس سے میں نے اندر سے اطمینان محسوس کیا تھا۔ اب میرے پاس ایسا ثبوت بھی آگیا تھا کہ ختم کے ساتھ دہندگی کرنے والوں کو قانون کے ذریعے سزا دلا سکتا لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ اس وقت سب سے پہلے مجھے کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچنا تھا۔ پولیس کے ساتھ دشمن بھی کتنی ہی طرح شاہ عالم کی بوسوختی پھر رہے تھے۔

ہوٹل سے میں ایک بی بی سی آؤٹک گیا۔ میں نے نیلم کے گھر کا نمبر لایا۔ فون خالد بانو نے اٹھایا "میاں جی کون ہو؟"

"ایک بھوت!" میں نے قہقہہ لگا کر کہا "اب میں

تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

"نامہرمیاں!" خالد نے چیخ ماری "کہاں تیرا میاں سب کو پریشان کر رہا ہے۔"

"نامہرم! عقب میں نیلم کی چیخ سنائی دی اور وہ ریسیور لینے بھاگی۔ پس منظر میں کسی شے کے ٹوٹنے کی آواز آئی پھر اس نے خالد سے ریسیور چھین لیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی "نامہرم! کہاں ہو تم؟"

"اسی دنیا میں" میں نے فلسفیانہ انداز میں حقیقت کا اظہار کیا "ظاہر ہے دو سری دنیا سے ابھی بھی تک کسی مواصلاتی رابطے کا سلسلہ نہیں چلا ہے۔"

"نکومت" تمہیں احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان رہے ہیں کہاں چلے گئے تھے تم؟" اس نے برہمی سے کہا۔

"خادم کہیں نہیں گیا تھا بلکہ لے جایا گیا تھا اور بڑی مشکل سے جھوٹ کر واپس آیا ہے۔ خیر بانی باتیں ملاقات پر ہوں گی یہ بتاؤ کہ یہ کہیں کہاں ہے؟"

"رہیں یہ دہا لیکن تم۔" اس سے ریسیور رہیں نے چھین لیا اور گالیوں سے آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"قسم اللہ کی پیارے" آج تو میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔ وہ بہت کچھ کہتا رہا اور عقب میں نیلم اسے ڈانٹتی رہی تھی "میں نے جتنے ہوئے کہا۔"

"تو اس نہ کہ باتیں گالیاں منہ پر دے لیتا۔ ابھی تو مال روڈ پر میگزین دکان کے سامنے والے بی بی سی اور آجا۔"

دو سری کال میں نے دن سیموں کی ملائی اور اس سے پیر سبحان شاہ کا لاہور کا نمبر مانگا۔ پیر سبحان صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی تھا لہذا اس کا نمبر تلے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے وہاں فون کر کے پیر سبحان کی لاہور پاک فون روڈ والی کو بھی کا نمبر حاصل کیا۔ آخری فون میں نے اسے ہی کیا تھا۔ میری آواز سننے ہی وہ گالیاں بکتنے لگا تھا۔

"میں تجھ سے متعلق ہر فرد کو مٹا دوں گا" اس نے دھمکی دی۔

"آپ ایسا کر سکتے ہیں لیکن میں نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ اس حادثے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھے ان کا مقصد مجھے قتل کرنا تھا۔ انہوں نے اسٹریٹ فائرنگ کی تھی لیکن قضا دلاور شاہ اور دوسرے لوگوں کو آگئی۔ جانو کے مرنے کے بعد میں نے اس کی کاشمکوف سے سفید ہوک والوں پر فائر کیے تھے۔ اس سے کار کے بیٹروں ٹینک میں آگ لگ جانے سے وہ سب جل مرے۔ اگر

کر رہا تھا۔ رست یا حاجی ہوتے تو میں ان پر قازکیوں کرتا۔ کہ میں رپورٹ آپ کو بتائے گی کہ جانو اور ڈرائیور فوراً ناشتے پکائے تھے۔ دلاور شاہ نے میرے سامنے دم توڑا تھا لیکن جس کے پاس صرف ریوالور تھا اور وہ یوک پر فائرنگ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے میری بے گناہی ثابت ہوتی ہے۔

”تم دلاور شاہ کا ریوالور اور اس کے پاس موجود دوسری اشیاء بھی لے گئے تھے۔“

”جی نہیں“ میں نے جلدی سے کہا ”میں نے اس کے پاس سے کوئی شے نہیں اٹھائی تھی۔ دیے بھی مجھے پولیس کے آنے سے پہلے وہاں سے بھاگ جانے کی جلدی تھی۔“

”اس کی ساری اشیاء غائب ہیں۔ ان میں پرس اور ریوالور کے ساتھ دوسری اہم چیزیں بھی تھیں۔“ بھان شاہ نے ویڈیو کیسٹ کا نام لینے سے گریز کیا۔

”ممکن ہے“ یہ کسی اچکے کا کام ہو۔ پولیس کی آمد سے پہلے کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھادی ہو۔ حادثات کے بعد عام طور سے اس قسم کے کام ہو جاتے ہیں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ وہ عیاری سے بولا۔

”محاف کیجئے گا پیر صاحب! ابھی میں خود کو خطرے میں محسوس کر رہا ہوں۔ کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن آپ کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ آپ ہی نہیں سارا زمانہ تسلیم کرے گا کہ شاہ عالم اور ناصر عظیم دو الگ اور مغضوب انسان ہیں۔ مجھے خطرہ شاہ عالم کے خون کے بارے میں دشمنوں سے ہے جو مجھے دیکھتے ہی مار دیں گے۔ ان سے بچنے کے لیے میرا روپوش ہونا ضروری ہے۔“

”اس کے لیے تم ہماری پناہ میں آ سکتے ہو۔ یہاں کوئی تمہارا پال بھی بیک نہیں کر سکتا۔“

میں نے اس کی مفکاری پر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے اسے اتنی ہی منافقت سے پر جواب دیا۔ ”آپ کی پیش کش کا شکریہ پیر صاحب! لیکن میرے اپنے بھی کچھ وسائل ہیں۔ اگر میں نے کبھی ضرورت محسوس کی تو آپ کی پیش کش سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!“ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا ”میں فون رکھ چکا تھا۔ بی بی اودالے تو جوان کو کالوں کی ادائیگی کر کے میں باہر گیا۔ ابھی صبح کے سوانو بجے تھے اور مال روڈ سوئی ہوئی تھی۔ ٹریفک جاری تھا لیکن دکانیں اور شاپنگ سینٹر ابھی نہیں کھلے تھے۔ رہیں ایک چھوٹی سوزوکی سو فٹ دوڑا تا نمودار ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میں

فوراً اندر بیٹھ گیا۔ میں نے سر سے بندھی چادر اتار دی تھی۔

”کسی نے تیرا پیچھا تو نہیں کیا۔“

”ہاں، موت کا فرشتہ آ رہا ہے، تیرا پتا پوچھ رہا تھا“ اس نے ہنسا کر کہا۔

میں ہنس دیا ”کیا بات ہے پیارے بڑے تپے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”اٹو کے پیچھے، تجھے کیا ضرورت تھی گاڑی سے باہر جانے کی۔“

”میں باہر نہیں گیا تھا بلکہ مجھے پچھو سے ہی اغوا کر لیا گیا تھا۔“ میں نے کہا پھر اسے اپنے اغوا کی روداد سنائی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ میں کس کی قید میں تھا اور وہاں سے میری رہائی کیوں کر ہوئی لیکن میں نے کہہ دیا کہ ایک ہی بار سب کے سامنے بیان جاری کروں گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ باری باری سب کو سناؤں۔ رہیں نے بتایا کہ میرے غائب ہونے کے بارے میں اسے اور نیلم کے علاوہ صرف کمال، عباسی اور رخصتی کو علم تھا۔ چندا اور عمر کو نہیں بتایا تھا اور خیریت دستور ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں تھی اس کی حالت ابھی مستحکم نہیں تھی۔

”جب تک مسلسل ہسپتال کے دورے بڑھ رہے ہیں“ رہیں نے کہا ”ڈاکٹر عائشہ کو خطرہ ہے کہ اس کا ماراغ زیادہ ہی متاثر نہ ہو جائے۔“

”اس پر ہونے والے ظلم کا مداوا تو نہیں ہو سکتا لیکن اس کے ذمے داروں کو ضرور کیفر کردار تک پہنچایا جاسکتا ہے“ میں نے کرتے کی جیب میں رکھی ویڈیو محسوس کی۔

”زے دار!“ رہیں تنگی سے بولا ”پولیس والوں کے خلاف آج تک کوئی کارروائی ہوئی ہے“ پولیس پہلے ہی ختم کی گرفتاری اور اس پر ہونے والے تشدد سے انکار کر چکی ہے۔“

”اب نہیں کر سکے گی۔“ میں نے اعتماد سے کہا اور اسے ویڈیو کیسٹ کے بارے میں بتایا جس میں ختم پر ہونے والے تشدد کے ذمے دار شیطانوں کے چہرے واضح تھے۔ رہیں اچھل پڑا۔

”یہ کیسٹ تمہارے ہاتھ کہاں سے لگی؟“

”میرا راپس گھر پہنچنے والے ہیں پھر ایک ساتھ ہی بتاؤں گا۔ یہ بتا کہ جب تو نے مجھے دابھی پر غائب پایا تو کیا کیا؟“

”پچھو کا دروازہ کھلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھکا تھا۔ تو اس طرح غیر ذمے داری سے نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اور گرد

والوں سے پوچھا لیکن کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔“

”دیکھا بھی ہو گا تو انجان بن گئے ہوں گے“ میں نے تنگی سے کہا ”ہمارے معاشرے میں بے حس کی بیماری زیادہ ہی رائج کر گئی ہے۔“

”تو نے ٹھیک کہا۔ پچھو جس دکان کے سامنے کھڑی تھی اس کے مالک نے بھی انکار کیا تھا لیکن جب میں نے اپنے انداز میں پوچھا تو اس نے اقرار کر لیا۔ دو افراد مجھے ایک سوزوکی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ یہ بانی روف تھی۔ انہوں نے گاڑی بالکل پچھو کے ساتھ روکی تھی۔ سر نیڈنگ دور سے مجھے بانی روف میں منتقل کیا اور لے گئے لیکن اس نے پولیس کے سامنے بیان دینے سے انکار کر دیا۔“

”ظاہر ہے پولیس مجھے خاک تلاش کرتی۔ اسے ضرور اٹھ کر لے جاتی“ میں نے افسوس سے کہا۔

نیلم باؤس کے متعدد گاڑیوں اور رہیں کی صورت دیکھ کر گھٹ کا الیکٹرک لاک کھولا تھا۔ نیلم نے مجھے کچھ عرصے سے گھر کی سیکورٹی میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ چار دیواری بلند کرا کے اس پر خادار تاریں بھی لگوائی تھیں ایک زمانے میں ماڈل ٹاؤن خوب صورت اور مکمل مکانوں کا مسکن تھا جس کی چار دیواری پانچ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہوا کرتی تھی لیکن حالات نے اب اسے تنگی قلعوں کا علاقہ بنا دیا تھا۔ خادار تاروں میں سے مکانات جتنی سوہجوں کا سا منظر پیش کرنے لگے تھے۔

بے تاب نیلم لان میں ہی ٹھل رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو تھام کر بولی ”کہاں تھے تم؟“

”میں اتنا ستانے لگے ہو ہم سب کو؟“

”میرا مقدر ہی خراب ہے“ میں نے تنگی سے کہا ”اب میں اس سے توڑنے سے رہا۔“

”اے اندر تو آئے دو۔ نہ جانے کن حالات سے گزر کر تو ہے“ رہیں نے نرمی سے کہا۔

ہم اندر چھوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے جو مشرقی انداز میں بنایا تھا۔ دیوار قلعوں کے ساتھ گاؤں کی تھیں۔ میں نے جوتے اتار کر چھکے اور قلعوں پر دراز ہو گیا۔ نیلم نے خالد بانو سے ناشتا لانے کو کہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ”نہیں“ صرف کئی منگوا لیا اور پھر جگر تھام کر میری داستان سنو۔“

”تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ۔ میں نے فرید عباسی اور کنن کو فون کر دیا ہے۔ وہ آنے والے ہوں گے ان کے سامنے یہ داستان جگر سناؤ۔“

”کہاں ہے وہ آٹو کا بچھا“ کمال نے اندر داخل ہوتے

ہوئے کہا ”ہمت ڈھٹ آدمی ہے دشمن بھی نہیں مارتے تھی۔“

”یہ ذرا سکون سے رہ سکیں۔“

”یہ کیا طریقہ ہے سلام نہ دعا۔ آتے ہی الٹی سیدھی شروع ہو گئے“ نیلم نے تنگی سے کہا۔

”میڈم! آپ نہیں جانتیں“ یہ شخص اسی قابل ہے اس بار فرید اندر آیا ”یہ شخص یہاں زندہ بیٹھا ہے اور میں عدالت میں اس کی مرگ ناگہانی کا وادیلا چار رہا ہوں۔“

نیلم اتنی فضا ہوئی کہ کافی لانے کے ہمارے پانکٹ کر گئی۔ کمال اور فرید نے کافی پینے سے انکار کر کے ہونے ناشتے کا مطالبہ کیا۔ ”اس آٹو کے پیچھے کی وجہ سے ناراض تمہاری طرف دوڑا ہوا۔“

”یہ دوست ہیں تمہارے؟“ نیلم نے جاتے جاتے کہا ”مجھے تو بچپن کے دشمن لگتے ہیں۔“

”متم اللہ کی“ اپنے پیٹ میں بھی کچھ نہیں گیا ہے“ رہیں نے سر آہ بھری ”صبح ناشتے کے بغیر تیرا منوس چرو دیکھنا پڑا۔ یا ر! یہ نیلم مستقبل میں بھی اسی طرح تیرے پیچھے خالی پیٹ دوڑائے گی؟“

”تو شو بہن کر زیادہ مجبور ہو گا میرے یا ر!“

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں اپنے اغوا اور قید کی داستان سنائی۔ درمیان میں یوں بار بار اغوا ہونے پر مجھے ان کی طرف سے لعنت ملا کہ سامنا کرنا پڑا تھا لیکن بالآخر انہوں نے مجھے خراج تحسین پیش کیا کہ میں نے اپنی ذاتی عقل سے کام لے کر معاملے کو مزید بگڑنے سے بچالیا۔ خاص طور سے ویڈیو کیسٹ کے بارے میں سن کر وہ اچھل ہی پڑے تھے۔ عباسی نے جوش سے کہا ”اب میں دیکھتا ہوں وہ حرام زادے کس طرح بچتے ہیں۔“

”زیادہ خوش فہمی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے“ میں نے اسے خبردار کیا ”اول تو یہ شرمناک ویڈیو دیکھنا ہی ایک مشکل مرحلہ ہو گا پھر اسے دوسروں کو دکھانا اور میڈیا میں اس کی پبلیٹی۔ یہ سب باتیں ختم کے لیے آئندہ ایک آزار بن جائیں گی۔“

”قانون کا راستہ اختیار کرنا مشکل اور صبر آزما ہو گا“ کمال نے میری تائید کی ”تصاف ملنے کی امید پھر بھی نہیں ہوگی۔ پولیس کا پورا حکم اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے متھ ہو جائے گا۔ ماضی میں ایسی مثالیں عام رہی ہیں جب سنگین ترین جرائم میں لوٹ پولیس والوں کو ثبوت اور گواہ ہونے کے باوجود عدالت سے کوئی سزا نہیں ہوئی۔“

”اس کا ایک راستہ اور بھی ہے“ عباسی نے تنگی سے

کرد باغیہ رشل آرٹ اور لڑائی کے ماہر اپنے ناصر صاحب کہتے خود ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔
 ”تم لوگ اتنے مایوس کیوں ہو؟“ نیکم نے ہمیں ڈانٹا
 ”جہنم مشہور صحافی ہے۔ اگر ہم پولیس کی مدد حاصل کریں تو حکومت بھی ان مجرموں کو نہیں بچا سکے گی۔“
 ”اس صورت میں وہ غائب ہو جائیں گے۔“ فرید نے
 تلخی سے کہا ”انہیں یوں بچوں سمیت دوسرے علاقوں میں یا
 باہر بھیج دیا جائے گا۔ پولیس کو ہر اعتبار سے محفوظ رکھنا
 پوری دیکھی کی ضرورت ہے تاکہ پولیس ان کے ہر جاوے جا
 حکم کی بلا چون درجہ اعلیٰ کر سکے۔ احتساب کے خوف سے
 آزادی پولیس کو ایک بے لگام فورس بناتی ہے جیسی کہ
 پاکستانی پولیس ہے۔ یہاں آج تک پولیس کا احتساب نہیں
 ہوا۔ جو وزیر اعظم کے بھائی کو بھی نہیں بخشا۔“
 میں نے مایوسی سے ویڈیو کیسٹ کی طرف دیکھا ”یعنی یہ
 بالکل بے کار ہے؟“
 ”نہیں“ ایسا نہیں ہے۔ اس کی مدد سے ہم کم از کم ظلم
 کے خلاف آواز تو اٹھا سکتے ہیں۔ انصاف کا آواز طلب کرنے
 سے ہوتا ہے۔ جب کوئی مانگے گا ہی نہیں تو انصاف ملے گا
 کیسے؟“ کمال نے کہا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ عام طور سے
 ہمارے مسئلوں میں بولنے سے گریز کرتا تھا۔ ہاں وہ ہر قسم کی
 مدد کے لیے ضرورت پڑھتا رہتا تھا لیکن اس وقت اس نے یہ بات
 کہہ کر ہمارے حوصلوں کو بالکل ہی ختم ہونے سے بچالیا تھا۔
 میں نے کہا۔
 ”دوسرے یہ کہ میں ان چھ شیطانوں کو سزا دے سکتا
 ہوں لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف میرے ہیں
 جن کو چلانے والے لوگ کوئی اور ہیں۔ ان کے پٹ جانے
 سے انہیں کوئی فرق نہیں ہوگا۔“
 نیکم نے گہری سانس لی ”رب نواز جیسے لوگوں سے
 کراتا آسان کام نہیں ہے۔ ہمیں ہر قدم سوچ بچ کر اٹھانا
 پڑے گا۔ ناصر کی پوزیشن سب سے نازک ہے۔ اس پر شاہ
 عالم کا ٹھہرا ہوا ہے۔ اسے اترنے میں وقت لگے گا۔ خوش
 قسمتی سے رب نواز اب تک شاہ عالم اور ہمارے تعلق کے
 بارے میں نہیں جان سکا ہے۔ ورنہ وہ ہمیں بھی تنگ کر سکتا
 ہے۔ بہتر ہوگا کہ ابھی تم روپوش رہو۔ عوامی جھگڑا پر جانے
 سے گریز کرو۔ میں تمہارے لیے بندوبست کرتی ہوں۔ تم کچھ
 اہم تقریبات اور پارٹیوں میں جاؤ گے اور وہاں ناصر عظیم کے
 نام سے اپنا تعارف کراؤ گے۔ اسی طرح ایک خاص حلقے سے
 ہٹ کر بھی لوگ تمہیں جاننے لگیں گے۔ ضرورت پڑنے پر یہ

لوگ گواہی دیں گے جس وقت پولیس شاہ عالم کی تلاش میں
 سرگرداں تھی۔ تم ان کے ساتھ موجود تھے۔“
 ”رائٹ! دوسرے ناصر کا یہاں رہنا بھی درست نہیں
 ہے۔“ فرید عباسی نے کہا ”اسے کہیں اور رہنا چاہیے۔“
 ”نہیں“ ناصر ہمیں رہے گا“ نیکم نے اصرار کیا۔
 ”میزم“ اگر پولیس شاہ عالم کے وارنٹ گرفتاری لے کر
 یہاں آئی تو آپ اسے ناصر عظیم کہہ کر نہیں بچا سکیں گی۔“
 ”اس پر یاد آیا“ میرے شہنشاہی کاغذات دلاور شاہ کے
 قبضے میں تھے۔ اب میرے پاس ناصر عظیم کے پاسپورٹ کے
 سوا اپنی شناخت پیش کرنے کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں
 ہے۔“
 ”تم نے اس کا پرس چیک کیا؟“ نیکم نے اچانک ہی
 پوچھا۔
 ”نہیں“ موقع نہیں ملا۔ میں نے سوچا تھا کہ فرصت سے
 بیٹھ کر دیکھوں گا۔“ میں نے جب سے ڈی ایس لی دلاور شاہ کا
 بھاری بھر کم پرس نکالا۔ اس میں رقم تو کم ہی رہ گئی تھی لیکن
 پرس کی اندرونی تھوں میں خاصے کاغذات بھرے ہوئے تھے۔
 میں نے پرس خالی کر دیا۔ اس کی ایک ایک تھیل لی۔ وہ
 لوگ کاغذات چھاننے میں لگ گئے۔ مجھے پرس کی بجلی سے
 کسی ٹھوس شے کا احساس ہوا۔ خاصی کوشش کے بعد میں
 اسے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ یہ ایک چابی تھی لیکن محض
 چابی۔ اس کے ساتھ اور کچھ نہیں تھا۔ کمال نے چابی
 دیکھی۔
 ”ارے یہ تو لا کر کی چابی ہے۔“
 ”تمہیں کیسے پتا؟“ میں نے اعتراض کیا۔
 ”خود میرے پاس بھی ایسی ہی چابی ہے۔ اسی بینک کا لا کر
 ہے۔ اسپتال اور ٹرسٹ کے سارے کاغذات میں دیں رکھا
 ہوں۔ دیکھو اس پر نمبر ہوگا۔“ اس نے چابی مجھ سے لے لی
 ”اس پر دو سواہ نمبر کندہ ہے۔“
 ”یہ کیسے معلوم ہوگا کہ بینک لا کر کس شاخ میں ہے؟“
 میں نے پوچھا۔
 ”اس بینک کی لاہور میں دو ہی شاخیں ہیں۔ اور لاہور
 صرف اس شاخ میں ہے جو ملتان روڈ پر ہے۔ لاہور وہیں
 ہوگا۔“
 ”اسے بعد میں دیکھیں گے۔“ میں نے چابی ایک طرف
 رکھ دی۔ ”کاغذات میں کوئی کام کی شے ملی؟“
 ”ایک تو خیرے کاغذات مل گئے ہیں۔ یہ رہا شہنشاہی کارڈ
 اور یہ رہا تھراڈ رائیوگ لائسنس“ میں نے دونوں چیزیں

میری طرف پھینکیں۔
 ”اور یہ رہا اس لاہور کو استعمال کرنے کا اجازت نامہ۔“
 کمال نے ایک کاغذ میری طرف بڑھادیا۔ اس پر دلاور شاہ
 نے بینک نمبر کو لکھا تھا کہ یہ کاغذ لائسنس والے کو اس کا بینک
 استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔
 ”یہ قطعی غیر قانونی ہے۔ اسے بینک نمبر کو ایسا حکم دینے
 کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاہور صرف وہی افراد کھول سکتے ہیں
 جنہیں لاہور حاصل کرتے وقت مجاز قرار دیا ہوا لاہور ہولڈر نے
 بذات خود جا کر اس فرد کو بینک والوں سے متعارف کرایا ہو۔
 اس طرح کاغذ دکھا کر کوئی لاہور نہیں کھولا سکتا۔“ فرید عباسی نے
 متراض کیا۔
 ”بھائی“ تم ایک بات بھول رہے ہو“ میں نے اسے یاد
 دلایا۔ ”یہ لاہور ایک ڈی ایس لی کا ہے جو مشاء اللہ فرعون
 صفت بھی تھا۔ اس کے لیے قانون تو رٹا ایسے ہی ہے جیسے بچے
 کے لیے کھلونا تو رٹا۔ بینک نمبر کا باپ بھی اس کا حکم ماننے
 لگا۔“
 ”ناصر صحیح کہہ رہا ہے۔“ میں نے تائید کی۔
 ”آؤں گے ناں“ عباسی نے سر آؤ بھری ”شوہر ہوتا تو
 اس کی بات سچ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ رشتی کو اسی شرط پر گھر
 چھوڑ کر آیا تھا کہ وہاں پر ناصر کو لے کر آؤں گا۔ اب تو چل
 رہا ہے یاں گھر کے بجائے سیدھا کورٹ چلا جاؤں؟“
 ”آپ فوری طور پر کورٹ کا رخ کریں۔ رشتی سے میں
 ذرا بات کر لیتا ہوں۔“
 ”تم تو کورٹ چلے جاؤ گے“ مجھے ابھی گھر جانا ہے اور قمر
 کے سامنے وضاحت کرنی ہے کہ صبح صبح کس قانون اٹھیا تھا جو
 میں بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ ناشتا میز پر چھوڑ کر کمال نے
 فریاد کی۔
 ”عباسی اور کمال کے جانے کے بعد میں نے رشتی کے گھر
 کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع اس نے ملامت کرنے کے بجائے مجھے
 بچ کر واپس آنے پر مبارک باد دی۔“ ناصر، بہتر ہوگا اب تم
 کچھ دن باہر نکلنے سے گریز کرو اور اپنے گھر میں بھی
 تبدیلی لاؤ۔ جس میں تم شاہ عالم سے بالکل الگ لگو۔ اس سے
 تمہاری غیر معمولی شہادت لوگوں کو بوجھ نہ لگاتی ہے۔“
 ”شوہرے کا شکریہ۔ میں سو کر اٹھنے کے بعد اس پر عمل
 کروں گا۔“ میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ نیکم نے سونے سے
 پہلے غسل کر کے مجھے کپڑے بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری
 زندگی میں ماں اور بہن جیسے رشتوں کی کمی رہی تھی مگر اب
 نیکم بیک وقت ان رشتوں کی کمی پوری کر رہی تھی۔ اس کی

محبت میں بیک وقت ماں کی ممتا اور بہن کی چاہت تھی۔
 میرے آنے کی خوشی میں وہ شوٹنگ کینسل کرنا چاہ رہی تھی
 لیکن میں نے اسے جانے پر مجبور کر دیا۔
 ”تمہارا معمول کے مطابق شوٹنگ پر جانا ضروری ہے
 ورنہ یہ تبدیلی دشمنوں کو بوجھ نہ لگائے گی بلکہ اب مجھے شبہ ہے کہ
 رب نواز کی پابندی بھی میرے اور تمہارے تعلق کے بارے
 میں جان گئی ہے۔ تمہیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی
 ضرورت ہے۔ اپنے گارڈز کو وارنٹ رکھا کرو۔“
 ”میرا محتاط تو خدا ہے اور پھر نہیں!“ وہ ہنسی ”مجھے
 کسی اور محتاط کی ضرورت نہیں ہے۔“
 میں گیارہ بجے کے قریب سویا تھا۔ پھر آنکھ کھلی تو سورج
 غروب ہو رہا تھا۔ سوا سات بج رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کی گھڑی
 نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ نیکم اور رئیس ابھی تک نہیں
 آئے تھے۔ خالد بانو نے بتایا کہ میرا ابھی تک کوئی فون بھی
 نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کے فوننگ کا نمبر ملایا۔ وہ
 موجود نہیں تھی لیکن ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے مجھے جہنم کے
 بارے میں بتایا کہ اب اس کی حالت بہتر تھی۔ چار گھنٹے تک
 جانگنے کے باوجود اسے مزید کوئی دورہ نہیں پڑا تھا۔ اس وقت
 وہ سو رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے شاہ عالم کے
 بارے میں پوچھا تھا اور ڈاکٹر عائشہ نے اسے بتایا تھا کہ میں
 زندہ اور خیریت سے ہوں۔ یہ سن کر میں نے سکون کا سانس
 لیا کہ اس نے ناصر عظیم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے ذہن پر شاہ
 عالم حاوی تھا۔ لہذا اشوری طور پر مجھے ناصر عظیم مان لینے کے
 باوجود وہ مجھے شاہ عالم ہی سمجھتی تھی اور دیوانگی کے عالم سے
 باہر آنے کے بعد اس نے شاہ عالم کا نام لیا تھا۔ خالد بانو کا
 اندازہ تھا کہ میں بھوکا ہوں لہذا اس نے میرے جاتے ہی میز
 پر کھانا لگا دیا تھا۔ میں نے خالد بانو سے کہا۔
 ”کسی ملازم سے کہہ کر باربر کو بلوالیں اور ہاں یہاں کیا
 میرے کپڑے پڑے ہیں؟“
 ”پورا سوٹ کیس بھرا ہے۔ کتے شوق سے لائے تھے
 اب تک ایک بھی نہیں پڑا۔“
 ”یہ تو اچھا ہوا ورنہ مجھے جاکر خریدنا پڑتے اور ہاں باربر
 کو سارے سامان کے ساتھ بلوائے“ صرف قبضی اسٹرا لپے نہ
 چلا آئے“ مجھے ہینر اسٹاکس بھی بڑا ہے اور بال رٹوانے
 ہیں۔“
 میرے کھانے سے فارغ ہوتے ہی باربر آگیا تھا۔ میں
 نے اسے بتایا کہ میں اپنے بالوں میں کیا تبدیلی چاہتا ہوں۔
 اس نے سر ہلایا ”کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن مشورہ ہے کہ بال

بھروسے کے بجائے جگے سنری رنگ میں اگساؤ کرائیں یہ زیادہ اچھے لگیں گے۔

لیکن میں نے اس کا مشورہ مسترد کر دیا۔ ہمارے ہاں سنری بال نہیں پائے جاتے اور یہ اپنی مصنوعی چمک سے فوراً متوجہ کرتے ہیں۔ میں اپنے حلقے میں تبدیلی کے ساتھ یہ بھی چاہتا تھا کہ کم سے کم لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ اس نے پہلے میرے بال تراٹے میں بائیں طرف سے مانگ نکالنا تھا۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال دی۔ میں مناسب ساز کی قلمیں رکھتا تھا مگر قلمیں بھی مختصر کرائیں اور گودی سے بال بھی چھوٹے کرالے۔ میری بڑھی ہوئی شیو اس نے مہارت سے بناتے ہوئے فریج داڑھی چھوڑ دی۔ ایک گھنٹے میں میں اتنا بدل چکا تھا کہ جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک لمحے کو خود سے نامانوس محسوس کیا۔ بارہ کمال کا آدمی تھا اس نے محض سر کے بالوں اور فریج ٹیڈی کے بد سے میرے حلقے میں اتنی تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ سرسری نظر سے دیکھنے والا مجھے شاہ عالم یا ناصر عظیم سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ غسل کر کے میں نے چٹون کے ساتھ ٹی شرٹ لی تھی۔ نیلم اور ریش آچکے تھے نشست گاہ سے ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”ہیلو!“ میں نے اچانک جاکر کہا تو وہ سب اچھل پڑے پھر مجھے دیکھ کر گھمبیر ہو گئے۔

”اے تو ناصر ہے یا اس کا بھوت!“ ریش نے چلا کر کہا۔ ہنسنے ہنسنے اس کا برا حال ہو گیا۔ نیلم بھی ہنس رہی تھی۔

”بھوت“ میں نے متانت سے کہا اور ایک دم ریش کو اٹھا کر بیٹھ دیا۔

”ارے بچاؤ۔ نیلم تمہارے ہونے والے ساگ پر قاتلانہ حملہ اسے روک۔“

خالد بانو نے آکر یہ طوفان بدتمیزی روکا۔ وہ چائے لے آئی تھیں۔ کھانے کا کسی کاموڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے توخیر ابھی کھانا کھایا تھا۔ نیلم اور ریش بھی مرتکب چوک سے فرار کی مچھلی کھا کر آرہے تھے۔

”میں کیسا لگ رہا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بتاؤں؟“ ریش ہنسا ”تو اس وقت کسی فرنگی سے ملتا ہوا لگ رہا ہے۔“

”لیکن شاہ عالم یا ناصر سے کتنا مختلف لگ رہا ہے“ نیلم نے ریش کو گھورا۔

”بس“ اب میں نے مستقل طور پر یہی طہر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

”ایکس لٹ“ ریش نے کہا تو میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ انگریزی تو ایک طرف رہی اسے درست اردو بھی بولنا نہیں آتی تھی لیکن اب وہ انگریزی کے بعض بڑے پیچیدہ الفاظ بھی روانی سے بول جا رہا تھا۔ نیلم کی اس برحمت رنگ لاری تھی۔

”اے ایسے کیا دکھ رہا ہے؟“ ریش جھنجھپ گیا۔

میں ہنس دیا ”میں دیکھ رہا ہوں نیلم نے مجھے سدھالیا اور محاورے کو غلط کرتے ہوئے کتے کی دم کو سیدھا کر دیا ہے۔“

”اب تم بھی اس سے اپنا انداز گفتگو بدلو“ نیلم نے مجھے ٹوک دیا۔ ”ورنہ اس پر مٹی ساری سخت پرانی پھر جائے گا۔ اس سے ایسے بات کو جیسے کمال یا عباسی سے کرتے ہو۔“

”یہ عباسی اور کمال سے مختلف ہے۔“

ریش کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”ہاں یار“ میں ان جیسا دھما لکھا کہاں۔ ایک ڈاکٹر ہے دو سرائیکل۔ میں نے تو میٹرنگ بھی پاس نہیں کیا۔

”اے مجھے کیا ہو گیا“ میرا مطلب تھا کہ دوستی میں وہ ریش سے مختلف ہیں۔ ان سے میری دوستی میں وہ گرائی اور معنویت نہیں ہے جو ریش سے ہے۔ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ سخت حالات ایک ساتھ برداشت کیے ایک دوسرے کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے بدن کو جانتے ہیں۔ میں ریش سے مصنوعی انداز میں بات نہیں کر سکتا۔

ریش کا چہرہ دوبارہ روشن ہو گیا۔ ”اے ہاں“ اسے کہتے ہیں دوستی قسم اللہ کی۔“

میں نے نیلم سے سنجیدگی سے کہا ”نیلم“ ریش صرف میرا دوست ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ کم پرہا لکھا ہے صورت شکل کا اچھا نہیں ہے بد معاشوں میں اٹھتا بیٹھتا رہا ہے اور کچھ عرصے پہلے تک خود بھی سکے بد بد معاش تھا۔ میری اور ریش کی دوستی ہر غرض اور ہر مفاد سے بلند ہے۔“

”لیکن تم دوسروں کے سامنے اس سے پرانے انداز میں نہیں پیش آؤ گے؟“ نیلم نے اصرار کیا۔ ”ورنہ یہ بھی پڑی سے اترنے لگے گا تم نہیں جانتے اگر میں اسے ڈرلا۔ دھمکا کر نہ رکھوں تو یہ نیل کی طرح رسی ترا کر بھاگ جائے۔“

”اے ہاں“ اپن کی طبیعت بیزار ہو جاتی ہے بعض اوقات اس مصنوعی زندگی سے ”ریش بولا“ ”اب بندہ ہر وقت تو ایکٹنگ نہیں کر سکتا۔“

”کر سکتا ہے۔“ میں نے شرارت سے کہا۔ ”ہمارے

ہاں بعض اداکار جو میں گھنٹے اداکاری کرتے ہیں۔ تین شغلوں میں کام کرتے ہیں۔“

”ان کی اداکاری بھی بدترین ہو جاتی ہے“ نیلم مسکراتی ”لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ایک فلم اور ایک ہی شغف میں کام کرتے ہیں جیسے ندیم۔“

”کل رات جینی اور عاقل کا فون آیا تھا“ ریش بولا ”میں نے بتایا نہیں جینی کو فون پر ہی روئے لگ جاتی محروہ جو تیرا داماد ہے عاقل“ وہ تاڑ گیا۔ بعد میں اس نے کہیں باہر سے فون کیا تھا۔ مجھے تیرے بارے میں بتانا پڑا۔“

”اچھا یاد دلایا“ یہ بتا کہ تم لوگوں کا لندن جانے کا پروگرام کم تک کا ہے؟“

”تو بھول رہا ہے“ تو نے اس سوچ کے بجائے سے نیلم کا انگریزی منٹ سائن کرایا تھا۔ اب وہ نیلم کے پیچھے پڑا ہے۔

”یہ مانگ رہا ہے نیلم اسے ٹال رہی ہے۔“

”ہائیتی رہو“ جب تک ممکن ہے بلکہ کوئی بہانہ کر کے انڈونائس واپس کر دو۔ جب وہ اپنی کرے گا تو دیکھی جائے گی۔“

”یہ کتنا آسان ہے۔ وہ براہ خدی اور کینہ پرور آدمی ہے۔ اس نے آکر فلم انڈسٹری کے ماحول کو خراب کر دیا ہے۔“ نیلم شکر لگ رہی تھی۔

”فلم انڈسٹری کا حال اچھا ک رہا ہے۔ جب یہاں بڑھے لکھے اور باصلاحیت لوگوں کی اکثریت تھی تب بھی لوگوں کی اکثریت فلم کی شوٹنگ کو طوائف کے گھر سے کم نہیں سمجھتی تھی۔“

”ماحول پھر بھی بہتر تھا بلکہ ابھی چند سال پہلے تک غنیمت تھا۔ لیکن اب یہاں موج دین جیسے لوگوں کی بھرمار ہو چکی ہے جو فلم اسٹوڈیو کو بھی بد معاشی کے اڑے کی طرح چلاتا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بچے کچھ لوگ بھی رخصت ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے کچھ عرصے بعد فلم اسٹوڈیو کی جگہ بھی شاہنگ سینفرز بننے لگیں گے۔“ نیلم نے سر دھجھکی۔

”اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ابتری تو ملک کے ہر شعبے میں آرہی ہے۔ جب تک معاشرہ نہیں سدھرے گا یہ ابتری قائم رہے گی۔“

”تو اب شاہ عالم نہیں رہا“ ریش نے یاد دلایا ”سیاسی باتیں مت کہ۔“

”ہم سب ہنس دیے“ تو نے اچھا یاد دلایا۔ ویسے میں شاہ عالم بھی رہا بھی نہیں تھا۔

”امیں باتوں میں لگا چھوڑ کر میں نے فون اٹھایا اور لندن

عاقل کے گھر کا نمبر ملا۔ اس وقت لندن میں شام ہو رہی تھی اور امید تھی کہ عاقل گھر آچکا ہوگا۔ میری توقع درست ثابت ہوئی تھی۔ ”آخاب۔ سر محترم! ایک بار پھر مجھ کو ابس آگئے۔ میں خاصا بد قسمت داماد ہوں۔“

”کیا تو میری زندہ واپسی کو اپنی بد قسمتی سے تعبیر کر رہا ہے؟“ میں نے غور کیا۔

”ہاں“ اگر تمہارا ترکہ مل جاتا تو میں نیو یارک یا ممبیا واشنگٹن پوسٹ جیسا اخبار بھی نکال سکتا ہوں۔ جو ملت اسلامیہ کا ترجمان ہوتا“ افسوس کہ تم نے مرکز ملت پر احسان نہیں کیا۔“

”تو اس مت کر“ یہ بتا کہ نوادرات والے معاملے کا کیا پتا؟“

”یار“ اتفاق سے یہاں پر محکمہ آثار قدیمہ کا ایک اعلیٰ افسر آیا ہوا ہے پاکستان سے۔ تو نے شاید نام سنا ہو۔ احمد الدین قدوائی۔ پچھلے دنوں اس نے بیرون ملک اسمگل کی جانے والی نوادرات کی بڑی کھپ پکڑوائی تھی۔

”نہیں“ میں نے نہیں سنا۔ عام لوگوں کو تو چھوڑو تم میڈیا والے بھی ایسے ثایاب افسران کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔“

”میں نے اس سے بات کی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے چلا کر کہا ”تو نے اسے نوادرات کے بارے میں بتا دیا؟“

اس نے برا مانیا ”بندہ شوہر ہے لیکن احق نہیں ہے۔ میں نے ذرا گھما کر پوچھا تھا کہ اگر پاکستان سے کوئی ٹاورشے اسمگل ہو کر یہاں آئے تو اسے واپس کیسے لے جایا جاسکتا ہے۔ اس نے خاصا لبا چوڑا پروبچر بتایا ہے۔ لیکن یہ کام آسان ہے۔ بہ نسبت ان نوادرات کو اسمگل منکوس کرنے کے یہ ظہر بھی کم ہوگا کہ یہ خورد برد ہو جائیں گے۔“

”وہ تو ہو جائیں گے“ میں نے سر دھجھکی ”ایک احمد الدین قدوائی کے مقابلے میں سو فیصد تو ہوں گے خیر اللہ ہماری نیت دیکھ رہا ہے۔ تو یہ بتا کہ جینی کہاں ہے؟“

”وہ اپنی قائم مقام اور منہ بولی والدہ سے ذرا تربیت لے رہی ہے۔“

”امور خانہ داری کی وہ تو اس بڑھیا کو بھی نہیں آتی ہوگی“ میں نے کہا۔

”ارے نہیں قائم مقام سر صاحب!“ عاقل نے شرماتے ہوئے کہا ”دراصل جینی ان مسائل سے نمٹنے کی تربیت لے رہی ہے جو عام طور سے شادی کے بعد خواتین کو

یہ آتے ہیں۔
”کیا؟“ میں پھر چلا یا ”کیا تو مجھے قائم مقام سر سے اعزازی نانا کے عہدے پر ترقی دے رہا ہے؟“
”دیکھا، ابھی سر رہے ہو تو عقل اٹھنی۔ نانا بن کر نہ جانے کیا کرو گے۔“

”تو اس مت کہ میں ابھی اس عہدے سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ میں نے بھنا کر کہا۔ تو رئیس کو نانا بنا لے۔ ویسے بھی یہ شوہر بننے والا ہے، میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔“
”اور ہوگی بھی نہیں۔ ساری عمر فیصلہ کرتے گزر جائے گی۔ خیر یہ بتاؤ کہ ختم کی حالت کیسی ہے؟“

نانا کا لفظ سن کر نیکم کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے میں عاقل کو جواب دیتا ”اس نے لپک کر ریور چھین لیا اور عاقل پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ خوشخبری کب ملی اور ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ یعنی کیسی ہے؟ وہ غیروہ غیروہ۔ پھر اس نے ہدایات جاری کرنا شروع کر دیں ”اس پر عاقل نے جھلا کر پوچھ لیا کہ اسے کتنے بچوں کا تجربہ ہے۔ نیکم فطرتی سے بولی ”تجربہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ دنیا تو دیکھی ہے۔ یعنی سے کہو کہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اپنا یہ فلیٹ چھوڑ کر کوئی مناسب سا مکان لے لو۔“

یہ مشکل میں نے اس سے ریور واپس لیا۔ عاقل سخت گھبرایا ہوا تھا ”خدا کے لیے قائم مقام سر صاحب! مجھے اس ساس سے بچاؤ۔ یہ تو اس بڑھیا لینڈ لینڈی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔“

”خبردار جو تم نے نیکم کی شان میں گستاخی کی۔ اور جہاں تک ساس ہونے کا تعلق ہے تو یہ ساس ہے یا وہ ہے کہ یعنی نے نیکم کو بڑی بہن بنایا ہے اور اس سے ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔“

عاقل نے سرو آہ بھری ”ایک نوجوان سرسری کم نہیں تھا کہ ایک کس ساس بھی مل گئی۔ ان دونوں سے پہلے میں ہی اللہ کو یاد رہا ہو جاؤں گا۔“

”نیکم ایک بک کرتے رہتے ہو“ عقب سے یعنی کے ڈانٹنے کی آواز آئی۔ اس نے ریور چھین لیا ”بھیا! آپ کیسے ہیں؟ اور نیکم باقی کہاں ہیں؟“

”ہمیں ہیں اگر تو اس کے ذریعے خوشخبری سنانا چاہتی ہے تو وہ میں پہلے ہی تحریے میاں کی زبانی سن چکا ہوں۔“

”سمجھانی ہے نا“ وہ شرما کر نہی ”ہر تازہ خبر فوراً نشر کر دیتا ہے۔“

یعنی کی آمد کا سن کر نیکم نے ایک بار پھر ریور لے لیا

اور ایک بار پھر جوش و خروش سے باتوں ہدایتوں اور نصیحتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ اتنی بر جوش ہو رہی تھی جیسے اس کی سگی بہن ماں بنے جاری ہو۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ نیکم کا وجود ہم سب کے لیے ماں جیسا یا خاندان کے بزرگ جیسا تھا۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود اس نے یوں ہمیں اپنا لیا تھا جیسے سگے ہوں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک بات کر کے نیکم نے فون بند کیا اور اعلان کیا کہ کل سے آنے والے مسماں کے لیے تیاری شروع کی جائے۔
”کیا مطلب؟“ ابھی تو اسے آنے میں آٹھ نو مینے ہیں“ میں نے اعتراض کیا۔

”تو کیا ہو۔ میں پاکستان سے اس کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے جانا چاہتی ہوں“ نیکم زیادہ ہی ایکساٹیف ہو رہی تھی۔

”جو تمہاری مرضی“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”اب مجھے اجازت دو۔“
”کہاں چلے؟“ نیکم نے مجھے گھورا۔

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا میاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے شاہ عالم والے پرائیویٹ آفس میں جا کر رہوں۔ ختم نے وہ میرے لیے ایک محفوظ ٹھکانا تلاش کیا تھا۔ اس کی چابی تمہارے پاس ہے نا؟“

”لیکن میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ورنہ تم پھر کسی چکر میں پڑ جاؤ گے۔“

”میں خود تو پیکروں کو دعوت نہیں دیتا۔ اب پولیس میاں چھاپا مارے تو تم کیا کرو گی؟ بلکہ مجھے شک ہے کہ نیکم ہاؤس کی گمرانی کی جا رہی ہو گی۔“

”تو اب تک چھاپا کیوں نہیں پڑا؟“ نیکم نے اعتراض کیا۔

”تم کوئی معمولی ہستی نہیں ہو جس کے گھر پولیس دندا ٹاٹی ہوئی گھس جائے بلکہ تمہارے گھر کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنے کے لیے بھی اسے خاصی معقول وجہ بتانی ہو گی لیکن خلاف بھی کم با اثر نہیں ہیں۔ وہ کسی نہ کبھی طرح وارنٹ حاصل کر لیں گے اور مجھے گرفتار کر کے لے جائیں گے تب تم کیا کرو گی۔ نیکم میرا تمام جانی بچائی جگہوں سے غائب ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے میں میاں سے جا رہا ہوں۔“

”ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے“ رئیس نے سوچ کر کہا ”اس کا کسی نامعلوم جگہ رہنا ضروری ہے۔“

”لیکن تم باہر نکلو گے اور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“
”میں قطعی باہر نہیں نکلوں گا میری ماں“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

وہ ہنس دی ”اوکے“ لیکن میں ہر گھنٹے بعد فون کر کے چیک کروں گی۔“
”یہ کیا کہو کہ تم جی وہیں چلو۔ براہ راست گمرانی کرتی رہنا“ میں نے بھنا کر کہا ”رئیس میرے ساتھ چل ایک کام ہے۔“

”کیا؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
”مجھے اس صورت کے ساتھ پاسپورٹ بنانا ہے۔ نیکم میرا پاسپورٹ بھی لا دو نا صر عظیم والا۔“

اس نے مجھے پاسپورٹ اور دفتر کی چابی کے ساتھ فونوں کی ایک گڈی بھی تمہادی ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“
”ضرورت ہے“ اس نے ڈانٹ کر کہا ”بعض اوقات تھوڑے سے نوٹ آؤں گی کہ بہت بڑی پریشانی سے بچا لیتے ہیں۔“

”ہم پیدل نکلیں گے باہر جا کر ٹیکسی کر لیں گے“ میں نے رئیس سے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے“ نیکم نے کہا ”یہ سونو کی سے جاؤ۔ میں نے ایک ہفتے پہلے ہی اوپن لیٹر خریدی ہے گاڑی اب تک مالک کے نام پر ہے۔“

میں کار کی پچھلی نشست پر دراز ہو گیا۔ رئیس نے ذرا نیونگ سیٹ سے مڑ کر دیکھا ”یہ کیا کر رہا ہے؟“
”میں گمرانی کرنے والوں کی آنکھ سے بچنا چاہتا ہوں۔ تو بھی ذرا آگے پیچھے نظر رکھ۔“

رئیس نے گاڑی نیکم ہاؤس سے نکالی اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا مین روڈ پر آ گیا۔ ”نیکم ہاؤس کے سامنے ایک فقیر ہے۔ کل تک میاں پر نہیں تھا۔“

”یہ یقیناً پولیس کا خیر ہو گا“ میں نے کہا ”کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔“

رئیس نے دو تین بار کار کو مختلف سڑکوں پر موڑا اور مطمئن ہو کر بولا ”اب اٹھ جاؤ کی نہیں ہے۔“

میں لپک کر اٹھ لی نشست پر آ گیا۔ رئیس نے گاڑی پاسپورٹ آفس کے سامنے روکی۔ آفس تو بند ہو چکا تھا لیکن ایکٹ گھوم رہے تھے۔ کئی لوگوں سے پوچھ کر رئیس نے با آخرا اس ایکٹ کو تلاش کر لیا جس سے وہ یہ کام کرائے چاہتا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا پائے کھا رہا تھا۔ اس نے رئیس

کو گرم جوشی سے گلے لگایا۔ ”خان صاحب کدھر تھے آکھیں ترس گئیں۔“
”موصوف تھا۔ قدر تم سناؤ۔“

”بس جی آپ کی دعا میں ہیں رب کا کرم ہے۔“ اس نے کہا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود کھانے کا کدہ دیا۔ بائے اتنے لذت تھے کہ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں خاصا کھا گیا۔ رئیس نے کھانا نہیں کھایا تھا لہذا اس نے ڈٹ کر کھایا۔ قدر خالص لاہوری تھا۔ ہنسنے ہنسنے والا اور کھانے کا شوقین۔ کھانے کے بعد اس نے لسی منگوائی۔ میں نے کہا۔

”ہمیں ایک کام ہے۔“
”علم کو بی۔ آپ رئیس خان صاحب کے دوست ہو تو ہمارے بھی سر ہو گے۔“

”میں نیا پاسپورٹ بنوا چاہتا ہوں۔“
”شوق سے بنواؤ۔“ اس نے لسی کا ٹنگ سائز گلاس اپنے پیٹ میں اٹھ لٹنا شروع کر دیا۔
”یہ کام تم نے کرنا ہے۔“ رئیس بولا۔

”آفس جی۔ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ میاں تو سب ویلے بیٹھے ہیں۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

ہم آفس کے سامنے والے پارک میں آ بیٹھے۔ میں نے اسے اپنا پاسپورٹ دیا۔ ”یہ ابھی باقی ہے لیکن میں نے گیٹ اپ بدل دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاسپورٹ اس کے مطابق اپ ڈیٹ ہو جائے۔“

اس نے پاسپورٹ پر لگی تصویر سے میرا موازنہ کیا اور مطمئن ہو کر بولا ”کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ نیا پاسپورٹ کب تک چاہیے۔“

”جتنی جلدی مل جائے۔“ رئیس بولا۔
”پیر سون تک مل جائے گا۔ لیکن میں دیکھتی ہو گی۔“
”فیس اتنی ہی ملے گی۔“ رئیس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”بس پیر سون پاسپورٹ لینے آؤں گا۔“

”بھئی خان صاحب کی مرضی۔“ اس نے کہا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

”فیس تمہیں دینی ملے گی۔“ میں بولا ”لیکن پاسپورٹ ہر لحاظ سے درست ہونا چاہیے۔ اصل اور اس کا ہر جگہ پر ریکارڈ ہو۔“

”فکری نہ کریں جی بالکل قانونی کام ہو گا۔ کوئی مانی کا لال اس پر شک نہیں کرے گا۔“

میں نے اسے ہزار روپے دیے۔ پھر اس کے ساتھ جا کر

ایک چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی فوٹو گرافی کی شاپ سے چار عدد تصویریں بنوائیں۔ قدر سے رخصت ہو کر ہم نے شاہ عالمی کا رخ کیا۔ وہیں ایک عمارت کے دوسرے فلور پر جنم نے میرے لیے دفتر کے اسے خصوصی طور پر ڈیکورٹ کرایا تھا۔ یہ کوئی کاروباری دفتر نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا پرائیویٹ آفس تھا۔ میں یہاں لوگوں سے ملاقات کر سکتا تھا اور وہ بھی سکتا تھا۔ جنم نے بلاشبہ ایک ایک چیز کا خیال رکھا تھا۔ شاہ عالم کے لیے دیوانی اس عورت نے اس کے لیے خود کو مثالیا تھا اور محبت میں ایسی مثال قائم کر دی تھی جس کا تصور بھی محال تھا۔

”کہاں کھو گئے؟“ رئیس نے میرے چہرے کے آگے ہاتھ لہرایا۔

”یار میں جنم کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کس قدر بد نصیب ہے۔ ماں باپ بچپن میں ساتھ چھوڑ گئے۔ آزاد صاحب نے پرورش کی۔ اسے صحافت کے اسرار و رموز سکھائے۔ وہ بے حد ذہین ہے لیکن محبت کے معاملے میں عام عورت ثابت ہوئی۔ محبت بھی کی تو شاہ عالم جیسے بندے سے۔ جو کسی کا نہیں ہو سکتا تھا اسے صرف جنم کے خوب صورت بدن سے دلچسپی تھی۔ پھر جنم اس کے لیے بہترین بی آر اڈ ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس سے دونوں طرح فائدے اٹھاتا رہا۔ محبت میں دیوانی جنم اس پر سب کچھ بھجوا دیتی رہی۔ اس سے کچھ مانگے بغیر۔ جب شاہ عالم اپنی ہی بچائی ہوئی سازشوں کے جال میں پھنس کر مارا گیا تو جنم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اگر اسے میری صورت میں شاہ عالم دوبارہ واپس نہ ملتا تو وہ سچ پچا پگل ہو جاتی۔ مجھے شاہ عالم سمجھ کر میرے پیچھے دیوانی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میرا اس سے دل بھر گیا ہے اور میں پرانی زندگی کی طرح اس سے بھی پیچھا چڑھانے کی فکر میں ہوں۔ لیکن اس کے پاگل پن میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس نے میری خاطر وہ تشدد بھی برداشت کر لیا جسے کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔“

”اس کی قوت برداشت نے ہم جیسے مردوں کو شرمندہ کر دیا۔“ رئیس نے سر آہ بھری۔

”کاش کے وہ لوگ میرے سامنے آجائیں جنہوں نے جنم پر انسانیت کو شرمادینے والا تشدد کیا۔“

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اپنا یا ر جبراً لایڈ لاہور کے ہر تھانے میں آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی کو ضرور پہچان لے گا۔“

”لیکن یار مسئلہ ویڈیو دکھانے کا ہے۔ وہ اتنی شرمناک ہے کہ میں اسے دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔“

”مگر یار کسی نہ کسی کو تو اسے دیکھنا ہو گا۔ ورنہ اس کے ذمے دار کیسے سامنے آئیں گے۔“ رئیس بولا۔

”میرا خیال ہے نیلم سے مشورہ کر لیں۔“ میں نے کہا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف نیلم تھی۔

”کہاں تھے تم دونوں۔ میں نین بار فون کر چکی ہوں۔“

”پاپورٹ کے چکر میں تھے۔“ میں نے کہا پھر بھجوتے ہوئے اس سے ویڈیو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا ”میرا خیال ہے کہ اس ویڈیو کو دکھانے میں حرج نہیں ہے لیکن صرف اس شخص کو جو جنم پر تشدد کرنے والوں کو شناخت کر سکے۔“

”رئیس کہہ رہا ہے کہ اس کا دوست جبراً لایڈ میرا مطلب ہے۔ نذیر احمد لاہور کے اکثر تھانوں کی فہرست کو جانتا ہے۔ یہ ویڈیو اسے دکھائی جاسکتی ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن میرا خیال ہے ایک بار جنم سے پوچھ لینا چاہیے۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”مگر اسے علم ہو گیا کہ میں اس پر ہونے والے ظلم کی قلم بھی بنائی گئی ہے اور وہ ہم دیکھ چکے ہیں تو اس کی ذہنی حالت دوبارہ خراب ہو جائے گی۔ یمن ممکن وہ پھر ساری عمر ہم سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکے۔ بہتر ہو گا کہ اسے ویڈیو کے بارے میں سرے سے نہ بتایا جائے۔“

”اگر ان لوگوں کے خلاف کارروائی ہوئی تو اسے معلوم ہو ہی جائے گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے جب ہم انہیں تلاش کر لیں گے تو ان پر الزام لگائیں گے۔ انہیں شافی پریڈ کے لیے جنم کے سامنے لایا جائے گا۔“ وہ انہیں شناخت کر لے گی۔

”چلو تم ایسا بھی کر کے دیکھو۔“ نیلم نے بے دلی سے کہا

”رئیس کہاں ہے؟“

”بلا وجہ مجھ غریب کو بدنام کر رہی تھیں یہ لکھو کہ اصل میں جنمیں رئیس کی فکر تھی۔“

”فضول کم بولا کرو۔“ اس نے خفگی سے کہا۔ میں نے رئیس کو فون پکڑا دیا تو وہ ہولکھلا کر بولا۔

”میں نے کیا فضول کہا ہے۔“ پھر اس نے کہا جانے والے انداز میں مجھے گھورا اور سر ہلکا کر بولا ”بس نکلے ہی والا تھا۔“

اس نے فون بند کیا تو میں نے اسے چھیڑا ”بے وقافی

سے جو رو کا غلام بن گیا ہے۔ ہمت ہوتی تو صاف کہہ دیتا آج رات گھر نہیں آسکتا ہو جو کر سکتی ہے کر لے۔“

”یارے اگر بیوی نیلم جیسی ہو تو جو رو کا غلام بننا ہی پڑتا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ یہ کار کی چابی ہے۔ میں نے ڈکی کی سیٹ کے نیچے دو جعلی نمبر پیلٹس بنوا کر رکھ دی ہیں اگر چاہے تو انہیں لگا لیتا۔“

”تو کیسے جائے گا۔ ابھی کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔“

”حل جائے گی یار۔ ذرا پلٹنا پڑے گا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”چل میں تجھے ٹیکسی دلا کر آتا ہوں۔“ میں نے چابی ہاتھ سے پکڑ لی۔

آفس بند کر ہم نیچے آئے۔ میں نے رئیس کو تھوڑی دور تک چھوڑا۔ ٹیکسی لے کر وہ روانہ ہو گیا تھا۔ مجھے خند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں ایک معیاری کینے میں جا بیٹھا جہاں ادب سے تعلق رکھنے والے افراد اکٹرا کر آتے تھے۔ وہاں کی چائے لا جواب ہوا کرتی تھی۔ اب بھی اس کا ذائقہ خاصا بہتر تھا۔ چائے پی کر باہر نکلا تو اچانک دیوار کے سامنے سے ایک وجود میرے سامنے اٹھ اٹھا۔ ”شاہ عالم صاحب۔“ اس نے کہا۔

میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ روشنی میں آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو نہ جانے کب سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کا باپ آٹے کا کارنگر تھا اور رب نواز کے لیے جعلی نوادرات تیار کرتا تھا۔ جب نابینا ہونے کے بعد غم نے اس کا پیچھا لیا تو اس نے رب نواز سے اپنی زندگی بھر کی محنت کا صلہ مانگنے کی جرات کی۔ انکار پر اسے دھمکی دی اور نتیجے میں صفحہ ہستی سے یوں نابود ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس لڑکے کی ماں شاید بتا رہی تھی اس کے علاج کے لیے ماہانہ دو ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے کچھ دن پہلے ہی دو ہزار روپے دیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ اسے یہ رقم باقاعدگی سے ملتی رہے گی۔

”حق آدمی۔ اس طرح سرعام پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ اور بازو سے پکڑ کر ایک ویران گوشے کی طرف لے گیا۔ ”ہاں بولو۔ کیا بات ہے۔ کیا اور رقم کی ضرورت ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا ”جس کے لیے رقم کی ضرورت تھی وہی نہیں رہی بلکہ کوئی بھی نہیں رہا۔“ وہ روئے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اوپر کوئی سانحہ گزر چکا تھا۔

”کیا بات ہے۔ مرد ہو کر روئے ہو۔ خدا کے لیے کوئی بلا وجہ آجائے گا۔“ میں نے کہا ”خاموش ہو جاؤ۔“

میں اسے کار تک لے آیا۔ کار میں نے تاریکی میں کھڑکی کی تھی اس لیے امید تھی کہ اس کی نمبر پلٹ نہیں دیکھ سکے گا۔ میں نے کار شاہ عالمی کی طرف موڑ دی۔ ہاں اب بولو کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔“

”ان حرامیوں نے میرے سارے گھروالوں کو مار دیا۔ چار بہنیں۔ مارنے سے پہلے ان کے ساتھ۔“ وہ دھڑکیں مار کر روئے لگا۔ لیکن بند کار سے اس کی آواز باہر جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اس کے کئے بغیر سمجھ گیا۔ رب نواز کے کتوں نے اس کی بہنوں کو مارنے سے پہلے پالیا کیا ہو گا۔

”ایا کیوں ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”میری وجہ ہے۔ میں نے رب نواز کو فون پر دھمکی دی تھی۔“ اس نے آنسو صاف کیے۔

میں دنگ رہ گیا۔ ”تم نے اپنے باپ سے سبق حاصل نہیں کیا تھا۔“

”ابا کی گشتی نے میرے حواس خراب کر دیے تھے۔ میں اس حرامی کو چھوڑوں گا نہیں۔ اس کے خاندان کے ایک ایک شخص کو مار دوں گا۔“

”اب آ رہی ہے جراثیم۔“ میں نے تلخی سے کہا ”میرا خیال ہے تم ان کا پال بھی بن گیا نہیں کر سکتے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں۔ یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو میں ایک کام سے آپ کی تلاش میں تھا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی نوادرات کے ڈیلر سے مجھے ملوائیں گے۔“

”یہ سودا تمہارے ذہن سے نکلا نہیں؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے سر آہ بھری۔ ”بلکہ اب تو مجھے رقم کی اور بھی ضرورت ہے لیکن میرا مقصد وہ نہیں ہے جو پہلے لکھی ہوا کرتا تھا۔“

باہر سے آتی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ ایک عزم بھی جھلک رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ یہ پورا خاندان ہی رب نواز کی ہوس اور انانیت کا شکار ہو گیا تھا۔ زمین پر خدا بن جانے والے یہ فرعون کسی کی ذرا سی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیے موسیٰ کی ضرورت تھی۔ ممکن تھا یہ نوجوان ہی ان کے لیے موسیٰ ثابت ہو تا۔ مجھے یاد تھا کہ بچپنی ملاقات میں اس نے اپنا نام اطمینان کیا تھا۔

"اسلم میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ لیکن فی الوقت میرا کسی ڈیڑے رابطہ نہیں ہے۔ میں اپنے ہی مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا کام بھی ضرور کروں گا۔"

"نہیں جناب۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ گزارنا دشوار ہے۔ ایسا کریں یہ سب آپ ہی خرید لیں۔ آپ جو دیں گے مجھے منظور ہو گا۔ میں مزید ممبر نہیں کر سکتا۔ اگر کچھ وقت اور گزارا تو میں چوری ڈیٹنگ کرگزروں گا۔"

"ایسا کر کے سوائے تم جیل جانے کے کچھ نہیں کر سکو گے۔ جہاں رب نواز کے اشارے پر تم برائے کیس ڈال دیے جائیں گے کہ تا عمر جیل سے باہر نہیں آ سکو گے اور اگر آئے بھی تو تمہارا سارا جوش و ولولہ ختم ہو چکا ہو گا۔"

"اسی چیز نے تو مجھے روکا ہوا ہے۔" اچانک مجھے خیال آیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے۔"

"اتفاق سے۔ آپ جس ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی وہاں تھا۔ میں نے آپ کا پیچھا کیا۔ لیکن رکشاوی خراب ہو گیا۔ میں ان سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ خوش قسمتی سے دوبارہ آپ پر نظر پڑ گئی جب آپ ہوٹل میں جا رہے تھے میرا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اندر جا کر آپ سے ملتا اسی لیے میں باہری انتظار کرتا رہا۔"

"اس وقت تم کہاں ٹھہرے ہو؟" "دیکھیں نہیں۔ دو راتیں میں نے پارک میں سو کر گزار دی ہیں۔"

"تم نے کھانا کھایا؟" "میری جیب میں جو رقم تھی اس سے میں نے کھانا کھا لیا تھا۔ باقی دس روپے بیچے تھے جو میں نے رکشے والے کو دے دیے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تب تم میرے ساتھ چلو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اعتراض بھی نہیں کیا۔ میں اسے دفتر لے آیا۔ مجھے تسلیم ہے کہ اس کی وجہ اس سے ہمدردی سے زیادہ یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ اپنی کسی حماقت سے رب نواز کے پیچھے چڑھ گیا تو اسے میرے بارے میں اگلے نفاذ دیر نہیں ملے گی۔ جان جائے گا کہ میں نہ صرف رئیس بلکہ ڈاکٹر عائشہ سے بھی رابطے میں ہوں اور وہ کیسے شخص کچھ بھی کر سکتا تھا اسلم کے خاندان کے ساتھ ہونے والی برصیت اس کی سفاکی کا نازہ شاہکار تھی۔

میں اسے لے کر دفتر تک آیا۔ اس نے حیرت سے کہا "آپ کسی گھر میں نہیں رہتے۔"

"میں ان دنوں کسی ایک جگہ نہیں رہتا۔" میں نے گول مول سے انداز میں کہا "آج یہاں توکل وہاں۔"

رات خاصی ہو گئی تھی لہذا اسے آفس میں دانیس طرف رکھے صوفے پر سونے کا کہہ کر میں بیڈ روم میں چلا آیا۔ آفس میں کوئی شے ایسی نہیں تھی جسے وہ چھین سکتا۔ احتیاطاً میں نے بیڈ روم اندر سے بند کر لیا۔ بستر پر لیٹ کر بھی مجھے فوراً پیند نہیں آتی تھی۔ سوچوں میں گھرا نہ جانے کب میں سو گیا تھا۔ صبح فون کی گھنٹی نے مجھے جگایا تھا۔ دس بج رہے تھے حسب توقع دوسری طرف ٹیلم تھی۔

"رات کیسی گزری؟" "خیریت سے۔" میں نے جمائی لی۔ "یہاں تو کوئی بیڈنگ دینے والا بھی نہیں ہے۔"

"بس کچھ دن کی بات ہے پھر ہم لندن غلامی کر جائیں گے۔ اس بار تم ناصر عظیم کی حیثیت سے جاؤ گے جسے لندن میں کوئی نہیں جانتا ہے۔" اس نے تسلی دی۔ کچھ دیر بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ اسلم صوفے پر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سترے چہرے اور سرخ آنکھوں سے ظاہر تھا کہ رات اسے کم ہی پیند آئی تھی۔ شاید وہ ساری رات ہی جاگتا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس پر جو سانحہ گزرا تھا اور اس کا دل جس طرح انتقام کی آرزو سے لبریز تھا، سکون کی نیند اس کے نصیب میں کہاں تھی۔

"سوری مجھے خیال نہیں رہا کہ تم بھوکے پیٹے ہو گے۔" میں نے شرمندگی سے کہا اور اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔

"ایسا کرو کہ نیچے کسی پاس کے ہوٹل سے حلوا پوری اور چھوٹے لے آؤ۔ جب تک میں چائے بنا تا ہوں۔"

وہ سعادت مندی سے نوٹ لے کر چلا گیا۔ میں نے جلدی سے ایک مختصر شاور لیا اور چائے چڑھا دی۔ تولیہ باندھ کر میں راگ لہرا گاتے ہوئے جو میں نے فلم تان سین میں سنا تھا چائے بنا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھا کہ اسلم لوٹ آیا ہے۔ "تیا بھائی۔" میں نے چلا کر کہا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے چندا کو کھڑا دیکھ کر میں اتنا ہلکا ہوا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر بلاؤں یا روک کر خود بخا سے میں آؤں۔ وہ مسکرا کر خود اندر آ گئی۔ میں نے سر کھجا کر کہا۔ "وہ میں سمجھا تھا کہ اسلم ہے۔"

"یہ اسلم کون ہے؟" "یہ اسلم وہ ابھی آگیا تھا ہوں۔" میں نے کہا اور بیڈ روم

میں... اگر کپڑے پہنے۔ جب واپس آیا تو حیران پریشان اسلم چندا کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ مجھے چائے آئی۔ "آف چائے تو کھول کھول کر خشک ہو گئی ہو گی۔" میں لیٹن کی طرف بھاگا۔ چندا میرے پیچھے چلی آئی۔

"ادھر بنو۔" اس نے لیٹن کی چائے سنک میں ڈال کر اس میں تازہ پانی ڈالا اور دوبارہ چوڑھے پر چڑھا دی۔ "تم جا کر ناشتا کرو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ حسب معمول سفید بے داغ لباس میں تھی۔ ڈھیلے سے بندھے بالوں کے ساتھ وہ جان لیوا حد تک معصوم اور دلکش لگ رہی تھی۔ میری تحویت دیکھ کر وہ سرخ ہو گئی تھی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اپنا مستقبل۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں مستقبل میں یونی تھیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی تمہیں فرصت ملے گی؟" "میرا اسنے خدا پر ایمان ہے کہ آزمائش کی یہ گھڑیاں بالآخر گزر جائیں گی۔ سب کچھ پھر سے ویسا ہی ہو جائے گا۔" "یہ ناممکن ہے۔ خان جی کو کہاں سے لاؤ گے؟" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"خان جی اس دنیا میں نہ سہی لیکن اس دنیا میں ضرور ہمارے ملن سے خوش ہوں گے۔"

ایک دم اس کی آنکھوں میں خوابوں کے پل جل اٹھے تھے۔ "کیا یہ ممکن ہے ناصر؟" "کیوں نہیں میری جان۔" کتنے عرصے بعد میں نے جسارت سے کام لیا تھا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا خاموشی سے میری باتوں میں سمٹ آئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزرتی پھر آہٹ نے ہمیں الگ ہو جانے پر مجبور کر دیا یہ اسلم تھا جو اپنے آجائے پر شرمسار تھا۔ "وہ۔" میں ناشتے کا کٹنے آیا تھا۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

"جھایا دلا دیا۔" میں نے ہنس کر کہا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ناشتا چھی کرنا ہے۔"

چند اچھینچی گئی..... "تم چلو میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

میں نے برتن لے جا کر رکھے اور اسلم نے ناشتا نکالا پھر ہم چندا کا انتظار کرنے لگے۔ وہ چائے لے کر آئی۔

"تم لوگوں نے اب تک ناشتا شروع نہیں کیا؟"

"تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "میں تو صبح ہی ناشتا کرتی ہوں۔ ابھی صرف چائے لوں گی۔"

چند ایک بار پہلے بھی اسلم سے مل چکی تھی۔ اس کے خاندان پر گزرنے والی چٹان کر اس نے رسمی عزیمت کی۔ میں نے تجسس کیا کہ وہ اسلم کے آنے سے خوش نہیں تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب ناشتا کے بعد میں بیڈ روم میں آیا۔ اس نے کہا "اس شخص کو کہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہمارا خفیہ ٹھکانا ہے اور تم دوسروں کو لا کر دکھا رہے ہو۔"

"میرے خیال میں اسلم قابل بھروسا ہے۔"

"جب رب نواز کے آدمی اس کی قوت برداشت آزمائیں گے تو یہ سب اگل دے گا۔"

"اسی خدشے کی وجہ سے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ یہ جوش انتقام میں پاگل ہو رہا ہے اور مجھے ڈر تھا کہ یہ کیس رب نواز کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس کا جوش ذرا ٹھنڈا ہو تو اسے نیلم کے گھر بھجوا دیں گے۔"

"میرا خیال ہے اسے فوراً وہاں بھیج دو اور نیلم سے کہو کہ اسے کیس آنے جانے نہ دے۔ مجھے ڈر ہے یہ تمہارے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"ابھی نہیں۔ فی الوقت میں اس کے ساتھ جا کر نوادرات دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" چندا نے مخالفت کی۔ "ناصر تم بلا دو کہ معاملوں میں ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس طرح تو تم اچھے چلے جاؤ گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ اسلم رب نواز کے خلاف ایک اہم گواہ ہے اس کی مدد سے ہم اس کے خلاف دباؤ بڑھا سکتے ہیں دیکھو چندا میں تم سب کو بار بار سمجھا چکا ہوں کہ کیس چھپ کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس سے دشمنوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ جی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔"

"لیکن اس سے شاہ عالم والا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ جتنی تلاش رب نواز کو ہے اس سے کہیں زیادہ تلاش پولیس کو ہے تمہاری۔ اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمہیں پلاک کر کے پولیس مقابلے میں مارے جانے کا اعلان کر دیں گے۔"

"تم دیکھ رہی ہو... کہ میرا حلیہ کس قدر بدل چکا ہے۔"

دوسرے میں اسلام کے ساتھ جاتے ہوئے اپنے طے میں مزید تبدیلی کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“
اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ ”تم ہمیشہ اپنی کرتے ہو۔ اسی وجہ سے اس حال کو پہنچے ہو۔“

”چند ایہ سب تقدیر کے مکمل ہیں۔ اس سے کوئی بھاگ نہیں سکتا ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری اور ان اٹھا کر نیکام نبر ملا دیا۔ وہ اسنو ڈبو جا چکی تھی۔ میں نے اس کے موبائل پر کال کی۔ کال ریس نے ریسو کی۔ نیکم میک اب کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”یار مجھے ایک میک اب مین کی ضرورت ہے جو میرے طے میں اتنی تبدیلی کر دے کہ میں آزادی سے باہر گھوم پھر سکوں۔“

”مجھے باہر گھومنے کی ضرورت کیا ہے۔ چین سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔“ اس نے کہا۔

”جین سے بیٹھنے کے لیے ہی تو یہ سب کر رہا ہوں۔ میرا پانے کے بجائے یہ بتا کہ کام کر سکتا ہے یا نہیں؟“
”ایسا کر میں مجھے ایک شخص کا نبر دے رہا ہوں۔ کسی زمانے میں مشہور میک اب کرنے والا تھا لیکن زبان بے قابو تھی اب کوئی کام نہیں دیتا۔ اس سے بات کر لے۔ نیکم کی عزت کرتا ہے اس کا نام لے گا تو تیرے پاس آنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گا۔“

میں نے ریس کا دیا ہوا نبر ملا دیا۔ ”ہاں کون ہے یہاں؟“ ایک بڑا سی آواز آئی۔

”میں ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔ میڈم نیکم کے حوالے سے۔“

”چھا۔“ آواز سے بے زاری عتاب ہو گئی۔ ”حکم کریں جناب۔“

”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے میک اب کے معاملے میں اگر آپ میرے آفس تک آسکیں؟“

”آجائیں گے میاں۔ آپ نے میڈم نیکم کا نام جو لے دیا ہے۔“

میں نے اسے بتا سمجھا کر فون بند کر دیا۔ چند ابہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”تو تم نہیں مانو گے؟“

”بات ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے یہ بتاؤ کہ میں کب تک منہ چھپا کر بیٹھا رہوں گا۔ آخر ایک دن مجھے باہر کے حالات کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔“

”انچھا“ اس نے ماؤسی سے کہا۔ ”میں چلتی ہوں۔ آج سی نی اسکیں مٹھین نصب کی جائے گی۔ خاصا نام ہے۔ میں اب شام کو آؤں گی۔“

چندا کے جانے کے بعد میں نے اسلم سے پوچھا۔ ”تو اورات کا ذخیرہ تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”میرے ایک رشتے کے ماں کے گھر ہے۔ اپنے گھر تو کیا میں گاؤں بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں کا نبر دار رب نواز کے چچوں میں شامل ہے۔“

”میں وہ نوازات دیکھنا چاہوں گا۔“ میں نے کہا تو وہ کھل اٹھا۔

”کیوں نہیں جناب۔ صرف دو گھنٹے لگیں گے۔ اگر ہم ابھی نکلیں تو شام تک واپس آسکتے ہیں۔“ اس نے جوش سے کہا۔

”مہر! اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ مجھے کسی کا انتظار ہے۔“

میک اب مین عیسیٰ خان ایک گھنٹے بعد آیا تھا وہ مختصر سے قد کا دلا سا بوزھا تھا اس کی عمر شاید ساٹھ برس کے قریب تھی۔ چہرے سے سخت مزاج نظر آتا تھا۔ اس نے ایک میلا سا کرتہ غلوار پہن رکھا تھا جس کے اوپر کے بن غائب تھے سر کے بالوں میں شاید مینے بھر سے کٹھکھی نہیں کی مٹی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک شاندار قسم کا میک اب بس ضرور تھا۔ میں اسے بندروم میں لے گیا۔

”کس کام کا میک اب کرنا ہے؟“ اس نے بلا تسمیہ پوچھا۔

”میرا۔ لیکن میک اب نہیں کرنا ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے گیٹ اپ بدلنے کی تھوڑی سی تربیت دو تاکہ میں جب چاہوں فوری طور پر اپنا طیلہ بدل لوں۔“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ بالوں میں لے کر میرے چہرے کا معائنہ کرتا رہا پھر بولا ”کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ چھوٹی موٹی چند تبدیلیوں کی مدد سے آپ کے طے میں اتنی تبدیلی آجائے گی کہ قریبی جاننے والے بھی نہیں پہچان سکیں گے۔“ اس نے اپنا بکس کھولا۔ اس میں سے ایک مختصر سی ڈیپا برآمد کی۔ اس میں سے اس نے لینس نکال کر میری آنکھوں میں فٹ کیے پھر شاندار قسم کی گھٹی موچیں نکال کر میرے بالائی لب پر چسکا دیں۔ موچیں میری فریج تکٹ سے بیچ کر رہی تھیں۔ آخر میں اس نے ریز جیسے کسی مادے سے بنی مصنوعی پتی نما دو چیزیں نکالیں اور انہیں میرے دونوں طرف کے پچھلے جڑوں میں لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں خود کو یہ مشکل شناخت کر لیا۔ میری ہلکی براؤن آنکھیں اب سیاہ رنگ کی ہو گئی تھیں۔ گھٹی موچوں کے لگنے سے بالائی لب چھپ گیا تھا اور دونوں طرف سے جڑے نکل آئے تھے۔ جن کی وجہ سے میرا چہرہ مجموعی طور پر

انتا تبدیل ہو گیا تھا کہ جاننے والوں کے لیے بھی غور سے دیکھنے بغیر مجھے شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

”بالکل آسان میک اب ہے۔ صرف لینس لگانے اور نکالنے کی تھوڑی سی پریکٹس کرنا ہوگی۔ بہتر ہو گا آپ بائیو لینس لے لیں انہیں اتارنا ضروری نہیں ہوتا۔ ایک مینے کے بعد انہیں پچینک کر دوسرے لگا لیں۔ یہ ذرا مہنگے پڑتے ہیں۔“

”ہروا نہیں۔ کیا تمہارے پاس ہیں؟“ میں نے کہا۔

”اتفاق سے ایک جوڑی بڑی ہے۔ اس کے قسم ہونے کے بعد آپ کو دوسری لینس ہوگی۔“

”ابھی تو ایک ہی کافی ہے۔“ میں نے اس سے لینس لے لیے۔ اس نے کئی بار مجھے لینس نکالنے اور لگانے کی سبق کرائی، موچیں لگانا اور اتارنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ خاص قسم کے میٹرکس سے بنی موچیں تھیں جو انسانی جلد پر چپک جاتی تھیں اور انہیں آسانی سے اتارا جا سکتا تھا۔ یہی معاملہ جڑوں میں لگائی جانے والی مصنوعی پتی کا تھا۔ اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ عیسیٰ خان کے مطابق اسے لگا کر کھانا بھی کھایا جا سکتا تھا۔ یہ شرط کے کھانے میں کوئی سختی نہ ہو۔ اس نے میرا مسئلہ اتنی آسانی سے حل کر دیا تھا کہ میں نے شکر گزار ہو کر اسے معاوضے میں دس ہزار روپے دیے۔ وہ ضرورت مند تھا۔ اسی لیے خوش نظر آ رہا تھا۔ اسے رخصت کر کے میں نے اسلم سے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں تم ہمیں رکو۔ فون آئے تو اینڈ کرنا اور میرے بارے میں بتانا کہ کھانا کھائے گیا ہوں۔ سمجھ گئے۔“

”سمجھ گیا جی۔ آپ تو بالکل بدل گئے ہیں۔ شاہ جی لگ ہی نہیں رہے۔“

”ایک بات اور یاد رکھو۔ اب میرا نام ناصر عظیم ہے۔ کبھی بھول کر بھی مجھے شاہ عالم نہ کہنا۔“

”بالکل سمجھ گیا۔“ اس نے مستعدی سے کہا۔

شاہ عالمی ایک معروف علاقہ تھا۔ لہذا میں نے ماڈل ٹاؤن کے پاس چنچ کر ایک پارک کے ویران کنارے پر کار کی نبر پٹیں تبدیل کیں۔ یہاں سے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ احتیاطاً میں نے کار کو ذرا دور پارک کیا تھا اور پیدل ہی کلینک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ اپنے دفتر میں تھیں۔ انہوں نے مجھے شناخت کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے موچیں اتار کر اور ریز پٹ نکال کر دکھائے تو اسے یقین آیا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے فحشی سے کہا۔

”ضرورت تھی ڈاکٹر عائشہ میرے خون کے پیاے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اگر خلیج کا معاملہ نہ ہوتا تو اب تک میں ملک سے باہر جا چکا ہوتا۔“

”خشبہ“ اس نے آنکھوں سے عینک اتار دی۔ ”مجھے اس کی قوت برداشت پر رشک آتا ہے۔ اس نے خود کو اس شاک سے بچا لیا ہے کوئی اور عورت ہوتی تو شاید عمر بھر کے لیے ذہنی توازن کھو دیتی۔“

”کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔ بلکہ تم سے ملنا اس کے لیے بہتر ہو گا۔ وہ کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہے۔ وہ تمہارے لیے فکر مند ہے۔ اس کی فکر دو بار ہو جائے گی اور اس کی ری کوری کی رفتار تیز ہو جائے گی۔“

میں ڈاکٹر عائشہ کی رہنمائی میں اس کے اسپتال نما کلینک کے عقی جسے میں پشیمان جہاں مریض رکھے جاتے تھے یہاں کا ماحول کلینک کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ دیواروں پر ہلکا آسمانی یا سی گرین نظر تھا۔ جا بجا پھول دار پودوں کے گٹے رکھے تھے دیواروں پر خوبصورت مناظر کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ راہداری میں اوپر سیلنگ لائٹس تھیں ڈاکٹر عائشہ نے ایک کمر کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ”خشبہ جاگ رہی تھی اور کھڑکی میں بیٹھی باہر سرسبز باغ کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک مصنوعی پہاڑی کے اوپر سے چشمہ ابل رہا تھا اور پتھروں پر بیٹا نیچے آ کر غائب ہو جاتا تھا۔“

”خشبہ“ میں نے آہستہ سے پکارا تو وہ تڑپ کر اٹھی پھر سامنے ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

”لگ۔ کون ہو تم؟ تم شاہ عالم ہو؟“

میں نے موچیں اتار دیں اور جڑوں سے ریز پٹ بھی نکال لیے تو وہ والمان انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا۔ سلا تا رہا۔ ان چند دنوں میں وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری رخت زرد پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ طے نمودار ہو گئے تھے اسے ذرا سکون ہوا تو وہ سر اٹھا کر بولی ”کیا وہ کتنے بوسنی آزاد رہیں گے؟“

اس کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا جنہوں نے اس پر وحشیانہ ظلم کیا تھا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے ”نہیں ہم سب مل کر انہیں کیفر کو مار تک پہنچائیں گے انہیں عدالت سے ان کے کڑو توں کی سزا ملے گی۔“

ایسا صرف رب نوازی اس کا بیٹا دلوا کر سکنا تھا۔ میں نے ان کو بے حد نقصان پہنچایا تھا۔ آخری بار ان کی کوٹھی سے فرار ہوتے ہوئے ایک گاڑ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا پھر میں نے دلوازی کی بیوی کو پرغال بنا لیا تھا۔ یہ سب باتیں ان کے غیظ و غضب کو بھڑکانے کے لیے کافی تھیں مجھے ڈاکٹر عائد کے بارے جاننے کا افسوس تھا لیکن جس کی جہاں قضا آتی ہوتی ہے وہ وہیں مرنے لگتا ہے۔

اب مجھے خشم کی فکر ہو رہی تھی۔ رب نواز کے ہر کارے اسے اٹھا کر لے گئے تھے اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ میری ذات کا سارا بدلہ وہ خشم سے چکا دیتا۔ میں نے کار ایک پی سی او کے سامنے روکی اور خشم کے دفتر کا نمبر ملایا۔ آزاد صاحب نہیں تھے لیکن میں نے ایک جوئیئر ایڈیٹر کو خبر پہنچا دی۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ خبر دے دی کہ اخبارات تک پہنچانے کو کہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کل کے اخبار میں صحافی اتنا اوپر چلیں کہ رب نواز ڈر جائے۔ پہلے بھی پریس کے ذریعے ہی پولیس والوں نے خشم پر جسمانی تشدد یا جبری زیادتی سے گزرنا دیکھا تھا۔ میں واپس آؤں تو اسلم پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”میں دوبار کسی کا فون آچکا ہے۔ شاہ عالم کو پوچھتا ہے اور پھر فون بند کر دیتا ہے۔“

اچانک میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ دشمن یہاں تک بھی آپہنچا تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ ”فورا تیار ہو جاؤ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔“ میں نے اندر جا کر رقم والا پرس لیا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ وقت ضرورت میرے پاس کوئی ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔ آج مجھ پر دوبار گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اگر خوش قسمتی اور میری حاضر دماغی ساتھ نہ دیتی تو میں آں جاتی ہو چکا تھا۔ جوانی کا ردوائی کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے کوئی ایسی شے نہیں چھوڑی تھی جس سے میری نشان دہی ہو سکتی۔ اسلم کے ہمراہ میں نے آفس بند کیا۔

”تمہیں کار چلانی آتی ہے۔“
”بھئی سیکھی تھی کیسی چلانے کے لیے۔ پر میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے تمہیں صرف اتنا کرنا ہے میری کار لے کر چھپی سڑک پر آ جاؤ۔“ میں نے اسے چابی دی اور زینوں سے عقبی طرف ہولیا۔ شام کے وقت یہ عمارت ویسے ہی سنسان ہو چالی تھی۔ عقبی حصے تک جاتے جاتے کسی سے مذہب نہیں ہوتی تھی۔ اس طرف کوئی تھا بھی نہیں۔ بجلی کے

میزوں کے ساتھ لٹکتے کھلے تاروں سے بچتا ہوا میں باہر نکلا تو ابھی تک اسلم کار لے کر نہیں آیا تھا۔ عقبی سڑک جو ایک کھیل کے میدان کے ساتھ تھی۔ یہ ظاہر وہاں کوئی مشکوک فرد یا گھرائی کرنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے میدان میں باکی فٹ بال اور کرکٹ کے میچز تک وقت جاری تھے۔ جتنے کھلاڑی تھے اتنے ہی تماشاچی تھے۔ ان میں کسی گھرائی کرنے والے کو تلاش کرنا دشوار تھا۔ جب دس منٹ گزر گئے تو میرا اضطراب عروج پر پہنچ گیا۔ ممکن ہے کہ دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہو اور اس نے اسلم کو چھاپ لیا ہو اس صورت میں وہ یہاں آنے ہی والے تھے۔ میں غائب ہونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسلم گاڑی سمیت آتا نظر آیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی روکی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسلم کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اس سے پہلے میں کچھ سمجھتا ایک سردی شے میری گردن سے آگئی۔

”لہنا مت ورنہ مارے جاؤ گے۔“ کسی نے بھاری لہجے میں کہا۔
”رب نواز کے کہتے تم صرف بھوک سکتے ہو مجھے مار نہیں سکتے۔“ میں نے پُر سکون لہجے میں کہا ”کیا رب نواز تمہاری ولادت میں شریک ہے۔“

اس کا رد عمل میری توقع کے مطابق تھا۔ جیسے ہی پستول کی ٹال ہتی میں نے سر معمولی سا سر کیا۔ اس کی وجہ سے چوٹ کی شدت کم ہو گئی تھی۔ میں فوراً نشست سے ٹیک لگا کر اٹھ اٹھتا ہوا گیا۔ ”مکتا بھوکے جا رہا تھا۔“ اس نے مشتعل لہجے میں کہا پھر کسی سے موبائل پر بات کرنے لگا۔ وہ شاہ عالم کی گرفتاری کی رپورٹ کر رہا تھا۔ میں نے کن آنکھوں سے دیکھا۔ اسلم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ضرب کی شدت سے ایک لمحے تو مجھے جکڑ گیا تھا لیکن..... میں ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے بے ہوش نہیں ہوا۔ رب نواز اس وقت ناقابل بیان پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ایک بار اسلم نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت نمودار ہوئی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں بے ہوشی کا تاثر دے کر موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ شخص اسلم کو جس طرف کار لے جانے کو کہہ رہا تھا اس طرف کچھ ہی آباد ہونے والی کالونیاں تھیں۔ یہ علاقہ ملتان روڈ سے متصل تھا۔ جہاں ایک زمانے میں ویرانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب وہاں سیٹ زمین پر شاندار عمارتیں سر اٹھ رہی تھیں۔

”اس سڑک پر موزلو۔“ اس نے حکم دیا۔ یہ ذیلی سڑک ویران تھی۔ میں نے لیوں کی مدد سے آواز نکالے بغیر اسلم سے کہا ”بریک۔“ کئی بار کہنے پر وہ سمجھ گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ تو میں تیار ہو گیا۔ میرا منصوبہ تھا کہ اچانک بریک لگانے کی صورت میں وہ آگے گئے گا اور میں اسے چھاپ لوں گا۔ اگرچہ یہ خطرہ تھا کہ وہ فائر کرے گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ گولی مجھے یا اسلم میں سے کسی کو لگ جاتی لیکن میں رب نواز کی قید میں جانے کی نسبت خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ رب نواز اب مجھے کوئی رعایت نہ دیتا۔ اسلم نے کار کی رفتار تیز کر دی تھی۔ جیسے ہی اس کے پیرنے بریک دیا۔ میں نے دونوں پاؤں ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے خود کو پیچھے اچھالا۔ اس لمحے وہ دونوں سیٹوں کے درمیان سے گزرا۔ اچانک بریک لگنے سے وہ خود کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میں نے یہ آسانی اس سے پستول چھین لیا اور اس سے پہلے وہ اٹھتا میں نے اس کے پستول سے اس کا سر بجا دیا۔ اس نے چلا کر ماں کو پکارا اور ساکت ہو گیا۔ بے ظاہرہ بے ہوش ہو گیا تھا لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ابھی توڑی دیر پہلے ایسا ہی ڈراما میں خود بھی کر چکا تھا۔ میں نے دوبارہ پستول اسے زیادہ قوت سے مارا اس نے ایک بار پھر ماں حضور کو پکارا اور اس بار چہرے پر ہوش ہو گیا۔ بد معاش میرا جوتا میرے ہی سر پر مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ مر گیا؟“ اسلم نے تشویش سے کہا۔
”انتا غیرت مند نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”کار روکو۔“ اسلم نے کار روک دی۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے پستول کے تین عدد کلپ اور لے تھے۔ یہ ایک شاندار قسم کا اعشاریہ پالیس کا بریٹ تھا۔ اس قسم کے پستول بہت کم نظر آتے تھے اور اسی وجہ سے بہت قیمتی تھے سیاہ فامبر گلاس کے دستے کے ساتھ اس کی ٹال والا حصہ نیکیوں دھات کا تھا۔ بڑے کبلی ہمر کا پستول ہونے کے باوجود یہ خاصا کم آواز تھا۔ اس کی مزید تلاشی لینے پر اس کی پتلون کی جیب سے پستول کا ساٹھسبھی نکل آیا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے ساٹھسبھی نہیں لگایا تھا۔ شاید اس لیے کہ پستول کی ٹال خاصی لمبی ہو جاتی اور اسے لباس میں چھپانا مسئلہ بن جاتا۔ اس کا بوا تھا اور اس میں اس کا شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس کا نام اکرام الدین تھا۔ مجھے پھر حیرت ہوئی اس قسم کے کاموں میں وہ شناختی کارڈ لے کر جاتا تھا۔ میں نے اس کا پرس اور سوائے پستول گولیوں کے کلپ اور ساٹھسبھی سب کچھ اسلم کے حوالے کر دیا۔

”اسے رکھو یہ مال قیمت ہے۔“

اس نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ چیزیں رکھ لیں۔ ”یہاں کوئی ویران اور ذریعہ تعمیر مکان تلاش کرو۔ آج ذرا ہم بھی تفتیش کریں گے۔“

اسلم نے کار آگے بڑھائی۔ ذرا سی جتو کے بعد ایک ذریعہ تعمیر مکان نظر آیا۔ اس کا احاطہ کھلا تھا۔ اسلم کار اندر لے گیا۔ یہ ظاہر کوئی نظر نہیں رہا تھا لیکن میں نے احتیاطاً پورے مکان کا معائنہ کیا۔ تیار کیے جانے والے حصوں پر نالے لگے تھے البتہ ذریعہ تعمیر حصے کھلے تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ ”تم جا کر ایک لائسنس ڈرائیج موم بتیاں دے کھانا اور سردی کوئی دوا لے آؤ۔“

اس نے سر ہلایا اور جانے لگا۔ میں نے آواز دی۔ ”پیسے تو لیتے جاؤ۔“

”میرے پاس ہیں جی۔“ اس نے کہا۔
”اور ماں کار کی نیکی بھی فل کرواتے آنا۔“ مجھے یاد آیا۔ میں نے صبح سے کار میں پستول نہیں ڈالو تھا اور اس کی نیکی خالی ہونے کے قریب ہو گئی۔ اسلم کے جانے کے بعد میں نے بے ہوش شخص کا معائنہ کیا۔ بھاری بھر کم آواز کے برعکس وہ عام سی جسامت کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر حالات کی سختی تحریر تھی۔ اس میں ذہانت کی بھی کمی تھی ورنہ وہ اپنا شناختی کارڈ لے کر نہ گھومتا اور نہ ہی اتنی آسانی سے میرے داؤ میں آتا۔ مجھے خشم کا خیال آیا۔ وہ بے چاری اب تک نہ جانے انہیوں کے کن مراحل سے گزر چکی ہوگی۔ میرا خون کھیلنے لگا تھا۔ رب نواز جہ سے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اسے اپنا خاندان عزیز تھا اور دشمنی کی یہ آگ اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ بے ہوش شخص کی طرف سے اطمینان کر کے میں نے مکان کے عقبی احاطے میں گئے پنڈ پپ سے منہ ہاتھ دھویا جس سے مجھے خاصا سکون ملا تھا۔ سر کے درد میں کمی ہوئی تھی۔

اسلم کو گھسے ہوئے ایک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور کمرے میں تاریکی چھا چکی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ اس شخص کی مجھے فکر نہیں تھی کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ یہ دروازہ تھا۔ اس کی کڑکیوں پر لوہے کی گرل نصب کی جا چکی تھی۔ میں کمرے کے سامنے ریت کے ڈھیر پر نیم دراز ہو گیا۔ آرام کرنے کے ساتھ میں کمرے کی گھرائی بھی کر رہا تھا۔ پستول پر ساٹھسبھی لگا کر اسے میں نے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اسلم سورج غروب ہونے کے آگے کھٹے بعد آیا تھا۔ وہ

تمام سامان لے آیا تھا اور کار میں بیٹھ کر بھی بھڑک رہا تھا۔ اسی لمحے کمرے میں موجود شخص کراہا۔ میں اور اسلم تیزی سے لپکے۔ میں نے تارچ روشن کرتے ہوئے اسلم کو لائٹیں جلائے تو کہا۔ اکرام الدین جلی رہا تھا اور ہوش میں آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسلم نے لائٹیں جلا کر دیوار سے لٹکی ایک گیل سے لٹکا دی۔ میرے کہنے پر اس نے باہر سے پانی لا کر اکرام کے منہ پر بھونکا۔ وہ تیزی سے ہوش میں آیا۔ میرے ہاتھ میں اپنا پستول دیکھ کر اس نے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ "میرا خیال ہے تم ہوش میں آ چکے ہو۔" میں نے اس کے پیروں کو مارا۔ "اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور میں جو پوچھوں اس کا درست جواب دیتے رہو۔ یاد رکھنا جواب میں آخر ہوتی تو ایک گولی تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔" اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"تم رب نواز کے لیے کام کرتے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے گولی چلا دی۔ نشانہ احتیاط سے لیا تھا اس لیے گولی بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے دل خراش چیخ ماری۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔

"آواز نہیں کتنے۔ ورنہ اگلی گولی حلق میں اتار دوں گا۔" میرے لیے میں سفاکی محسوس کر کے اس نے چیخ و پکار ایک دم بند کر دی تھی لیکن دہلی دہلی آواز میں رو رہا تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ہاں ملک صاحب کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"اسے کتنا کہہ۔" میں نے پھر اس کے منہ پر جوتے کی نوک ماری۔ وہ منہ ہاتھ سے دبا کر لوٹ پوٹ ہونے لگا پھر اس نے تھوکا تو خون کے ساتھ اس کے دو دانت بھی منہ سے نکلے تھے۔

"تم مجھے کہاں لے جاتے۔" میں نے اگلا سوال کیا اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"مقام روڈ کے ساتھ ایک آبادی میں۔ ملک۔۔۔ کتے نے آپ کو وہاں لانے کو کہا تھا۔"

اس نے بتایا۔ میں نے وہ نمبر پوچھا جس پر اس نے موبائل سے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا تو میں نے اسلم سے موبائل لے کر تصدیق کی۔ میرے جارحانہ اور سفاک رویے نے اس کے سارے کسٹل نکال دیے تھے۔

"اب اہم ترین سوال۔ وہ لڑکی کہاں ہے جسے ڈاکٹر عائشہ کے ٹیکٹک سے اغوا کیا گیا تھا؟" میں نے نظر جمایا کر کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے گولی چلائی جو اس کے سر کے پاس سے گزر گئی۔ وہ مارے خوف کے چلائے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میں نہیں جانتا۔"

"تم جھوٹ بک رہے ہو۔" میں نے تیسری بار اس کے منہ پر جوتے سے رب نواز جس کینکین پر اتر آیا تھا اس کے بعد میرے دل میں اس کے پاس کے گروہوں کے لیے ذرا بھی رحم نہیں رہا تھا۔ تعویذ ہی اور مار کھانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ وہ شبنم کے اغوا کے بارے میں جانتا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ رب نواز کے کسی اور ٹھکانے سے ملاؤ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا اسے مزید علم نہیں تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ "اسے باندھ دو اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ اس کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے اگر اس نے ایک لفظ بھی جھوٹ کہا ہو گا تو اسے مار کر پتلیں ڈال دیں گے۔"

اکرام الدین نے خاموشی سے ہاتھ پیر بند حوالے۔ بازو کا زخم معمولی سا تھا۔ اس نے خود ہی منہ کھول کر کپڑا لے لیا۔

صبح ناشتے کے بعد سارا دن صرف دھکے نصیب ہوئے تھے۔ بھاگ دوڑنے بیٹھ کے چوبیسوں تک کو نڈھال کر دیا تھا۔ اسلم ٹان کیباب لے کر آیا تھا۔ اسے کھانے کے لیے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا کھا کر میں نے پانی پیا۔ اسلم پلاسٹک کا ایک گلاس بھی لے آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا اس مکان کا معائنہ کر آؤں جس کا پتا اکرام الدین نے بتایا تھا۔ میں نے اسلم سے کہا "تم یہیں رو کر اس کی نگرانی کرو میں ذرا اس مکان تک ہو کے آتا ہوں۔"

"وہاں جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔" اسلم بولا "رب نواز سفاک آدمی ہے آپ اس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ذرا موبائل دینا۔"

میں نے مکان سے باہر نگر نہیں کو کال کی جس نے میری آواز سننے ہی پر ہی ہے کہا۔ "الو کے پچھے کچھ کہا تھا کہ اکرام سے بیٹھ۔"

"یار میں کیا کروں شبنم سے ملنے گیا تھا۔ وہیں سے ساری خرابی ہوئی۔ اطلاع یہ ہے کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا پھر میں نے اغوا کرنے والے کو اغوا کر لیا۔ اب وہ میرے پاس ہے اس نے خاصی مفید معلومات اگلی ہیں تو فوراً میرے پاس

"جا۔" میں نے اسے پتا سمجھایا اور اس کی بات سے بغیر فون بند کر دیا۔

رہیں صرف میں منٹ میں آگیا۔ میں نے اسے اکرام الدین اور اس کے بتائے ہوئے بچے کے بارے میں بتایا۔

رہیں بولا "تو وہاں جانا چاہتا ہے؟"

"ظاہر ہے اگر شبنم کو آزاد کرانا ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو بیٹھے نہیں رہ سکتے ہیں۔"

"لیکن خالی ہاتھ۔" اس نے اعتراض کیا۔

"میرے پاس پستول ہے ساٹنر سمیت۔"

"میں خالی ہاتھ ہوں۔" اس نے کہا۔

"تیرا ساتھ ہی کافی ہے۔" میں نے کہا "تو اپنی کار میں چھوڑو اسے کا نظر میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

مذکورہ مکان تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ خاصی دور سے واضح تھا۔ اس کی قطعہ نما فصیل اور اوپر لگے خاردار تار سب کو متوجہ کرتے تھے۔ رہیں نے معائنہ کیا۔ "اس میں تو کئیں جانے کا راستہ نہیں ہے۔"

"راستے ہوتے نہیں ہیں نکالے جاتے ہیں۔" میں نے تشفیانہ انداز میں کہا۔

یہ ظاہر مکان ویران نظر آ رہا تھا۔ مین گیٹ پر کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی فرد ضرور ہو گا۔ اچانک رہیں نے اشارہ کیا "وہ دیکھ۔" اس کی انگلی کی سیدھ میں ایک درخت تھا۔ جس کی شاخیں مکان کی فصیل کے اندر تک جا رہی تھیں۔

"سوچ لے ایسا نہ ہو کہ اندر کتے ہوں۔" میں نے رہیں سے کہا۔

"تو پھر دروازے سے چلے ہیں۔" رہیں نے بھنا کر کہا "وہ خود کچھ کندھے پر بٹھا کر اندر لے جائیں گے۔"

مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ جوتے اتار کر ہم نے جیبوں میں ٹھونسے اور درخت پر چڑھ گئے۔ نیم کا یہ درخت خاصا مضبوط اور گھٹنا تھا اس کی ایک شاخ اندر تک جا رہی تھی۔ یہ خاردار تاروں کے عین اوپر سے گزر رہی تھی۔ میں نے رہیں کو اشارہ کیا۔ "حضرت پہلے آپ۔"

رہیں سرکتے ہوئے شاخ کے کنارے تک پہنچا اور اندر کود گیا۔ میں اس کے پیچھے تیار تھا۔ نیچے گرتے ہی میں نے پستول نکال لیا تھا اور کسی کتے یا انسان سے منسنے کے لیے تیار تھا لیکن کوئی نمودار نہیں ہوا۔

"گلتا ہے مکان میں سچ کچھ کوئی نہیں ہے۔" رہیں بولا۔

پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ یہ حصہ روشن تھا لیکن عقبی برآمدے میں فرش پر بھی گرد سے اندازہ تھا کہ کسی نے کم از کم ہفتے بھر سے یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ میں نے ایک دروازے پر طبع آزمائی کی لیکن وہ لاک نکلا۔ رہیں اور ادرادھر زمین پر کچھ دیکھتا پھر رہا تھا پھر اس نے زمین سے کوئی نکالنا مٹا اٹھائی۔ "لاؤ میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ نکلا دراصل ایک فولادی تار تھا۔ اس نے تار موڑ کر تالے میں داخل کیا۔ پانچ منٹ میں تالا کھل گیا۔ میں نے پیٹھ تھک کر رہیں کی مہارت کی داد دی اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ رہیں نے ہتھیار کے طور پر وہیں پڑا ہوئے کا ایک باپ اٹھا لیا تھا۔ اندر سے مکان خاصا نشان دار تھا۔ ہم نے ایک راہداری عبور کی جب پہلی بار کوئی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی بچے نے غول کی آواز نکالی ہو۔ میں اور رہیں مقام ہو کر اس طرف بڑھے۔ جس طرف سے آواز آئی تھی۔ یہ جگہ راہداری کے آخر میں تھی اور بیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ آواز دوبارہ اور واضح طور پر آئی تھی پھر کسی کی مردانہ ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے اشارے سے رہیں کو وہیں ٹھہرنے کو کہا اور خود نیچے اتر گیا۔ یہ کھلی بیڑھیاں تھیں حداثہ بھی خفیہ نہیں تھا۔ بیڑھیاں اتر کر ایک طرف کھڑا تھا جس کے سامنے والی دیوار صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ ایک شخص کرسی پر بیٹھا تھا اور اس نے بچے کو گود میں لے رکھا تھا۔ کرسی کا رخ دوسری جانب تھا۔ مرد کا عقبی سراور بچے کے پلٹے پھر نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا آگے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ کسی اور خود سے خالی تھا۔ البتہ ذرا آگے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر میں نے پستول اس شخص کی گردن سے لگا دیا۔

"ہلنا مت۔ ورنہ گردن میں سوارخ ہو جائے گا۔" میں نے آواز نیچے رکھی۔

وہ واقعی ساکت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کون ہو تم؟"

"وہی جسے یہاں لانا تھا۔" میں نے پستول اس کی گردن پر دباتے ہوئے کہا "کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ آہستگی سے کھڑا ہوا تو میں نے ہاتھ مار کر اس کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ کی جیب سے ایک ربو الوور برآمد کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اس کے پاس مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے حکم دیا "اب میری طرف گھوم جاؤ۔"

آہستہ سے۔ کوئی مکاری مت دکھانا۔

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ میری طرف گھوما تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا تھا اس کی گود میں ایک چار پانچ ماہ کا بچہ تھا۔ جو ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بچے کو دیکھتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ انسان کا بچہ تھا لیکن اس کے خدو خال سے ایک نوع کی حیوانیت جھلکتی تھی۔ جیسی لٹالی اور اس کے ہزاروں بچوں کے چہرے پر جھلکتی تھی۔

”کیا یہ بچہ بھی تمہارے تجربات کا نتیجہ ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے اطمینان سے بچے کو سامنے میز پر لٹا دیا تھا۔ ”یہ میرا ایک اور شاندار تجربہ ہے۔“

”تم اسے شاندار کہتے ہو۔“ میں نے اسے گھورا۔

”درحقیقت تم انسانوں پر انسانیت سوز تجربات کر رہے ہو۔“

”تمہاری نظر میں یہ تجربہ انسانیت سوز ہوں۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”لیکن تجربات تو صرف تجربات ہوتے ہیں۔“

”تو یہ تجربات تم نے اپنے خاندان کی عورتوں پر کیوں نہیں کیے؟“ میں نے طنز لہجے میں کہا۔

”کیوں کہ مجھے تجربات کے لیے دوسری عورتیں مل جاتی ہیں۔“

”کوئی عورت اپنی خوشی سے جان دینا نہیں چاہتی؟ تم جان بوجھ کر انہیں دھوکے میں رکھتے ہو۔ تم قائل بھی ہو۔“

”تمہارے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ مجھے انہیں مارنے کے لیے جس شخص کو بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس مکان میں لایا جانا تھا۔ کیوں؟“

”میں نہیں جانتا۔ یہ جگہ ملک رب نواز کی ہے اور میں نے یہاں پر اپنی سب بنا رکھی ہے اگر رب نواز اسے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو میں اسے نہیں روک سکتا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے نہیں یہاں لانے کو کہا تھا۔“

میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ ”تو اس مت کرو۔ شرافت سے بنا دو۔ ورنہ مجھے تمہیں مار کر ڈرا بھی افسوس نہیں ہو گا۔ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تم پہلے ہی موت کی سزا کے مستحق ہو چکے ہو۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کی لیکن ہاشم رضا کے بوڑھے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ اپنا گلا چھڑا سکتا۔ اس نے یہ مشکل کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے مار کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”کوئی میں اوپر کون کون ہے۔ درست بتانا۔“ میں نے دباؤ ڈرا کم کیا۔

اسی لمحے میز پر لیٹے ہاتھ پاؤں مارنے لپٹے۔ ایک تیز آواز نکلی۔ وہ مجھے سے مجھے گھور رہا تھا۔ ایک دم وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے بندر کی سی پھرتی سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے غلت میں پروفیسر ہاشم رضا کا گلا چھوڑ کر اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔ اس سے پہلے میں اسے جھٹکتا وہ میرے بازو میں دانت گاڑ چکا تھا۔ اس کے دانت کسی بندر کی طرح ہی تیز اور کٹکتے تھے۔ میں نے کراہ کر اسے دور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ چونک کی طرح چبٹ گیا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ میری بوٹی کاٹ لے۔ مجبوراً میں نے پستول کا دانت اس کے سر پر مارا۔ کھٹ کی آواز آئی۔ اس کے سر کی ہڈی کسی جوان آدمی سے بھی زیادہ مضبوط تھی لیکن اس ضرب نے اس کی گرفت کمزور کر دی تھی دوسری ضرب پر اس نے ایک حیوانی چیخ مٹا دی۔ آواز نکلی اور میرا بازو چھوڑ کر چھلانگ لگائی اور میز کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میرے بازو سے خون چھلک آیا تھا۔ میری چیخ سن کر ریشم دوڑا چلا آیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے تشویش سے کہا۔

میں نے اسے مختصر پروفیسر ہاشم رضا اور اس کی نئی تخلیق کے بارے میں بتایا۔ ”اس سے ہوشیار رہنا۔ بندر سے زیادہ خطرناک ہے۔“ میں نے میز کے عقب میں جھانکنا ہاشم رضا پہلے ہی موقع سے فائدہ اٹھا کر دروازے سے غائب ہو چکا تھا۔ اب بچہ بھی غائب تھا۔ میز کے عقب میں دیوار کے ساتھ ایک گڑھی کا تختہ لگا تھا۔ جیسے لوگ کتے بلیوں کے لیے گھر میں آنے جانے کے لیے بنا دیتے ہیں۔ بچہ اسی سے نکل گیا تھا۔ لیکن میں نے احتیاطاً میز کے نیچے دیکھ لیا۔ ریشم دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”ہاشم رضا یہاں گیا ہے تو اس طرف فرار کا کوئی راستہ ضرور ہو گا۔“

یہ بات میرے ذہن میں تھی لیکن احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں اندھا دھند اس کے پیچھے جانے سے گریز نہ کروں۔ ”جانے دوسری جانب ہاشم رضا کون سی توبہ لیے میرے استقبال کے لیے تیار ہو۔“ تو نے اوپر دیکھا۔

”ہاں راہداری کے سارے کمرے دیکھ لیے لیکن وہاں کوئی نہیں ہے۔“

”ہمیں اندر جانا ہو گا۔“ میں نے فیصلہ کیا۔ ”ہاشم رضا اہم آدمی ہے رب نواز اس کے بدلے ختم کا سودا کرنے کے

لیے تیار ہو جائے گا۔“ میں نے ہاشم رضا کا رپو اور ریشم کے حوالے کیا۔ ”شد ضرورت کے بغیر استعمال نہ کرنا اور ہاں تو یہاں رک کر اوپر والوں کا خیال رکھ۔ شاید ہاشم رضا نے انہیں بتا دیا ہو گا۔“

ریشم نے سر ہلا دیا۔ میں نے دوڑ کر دروازے کو نکل ماری۔ وہ کھلا تھا اور میں لڑھک کر اندر جا پہنچا۔ زمین پر لڑھکتے ہوئے میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا۔ یہ تجربہ گاہ تھی جہاں میزوں اور شیٹ پر بے شمار مرتبان رکھے تھے مختلف شیشے کی صراحیوں میں مختلف کیمیکلز کی ایکشن جاری تھی ایک طرف جدید نوعیت کی مشینری رکھی تھی میرے لڑھکتے لپٹے میری جان بچائی۔ ایک گولی میرے اوپر سے گزری اور پیچھے شیشے پر کھٹا ایک مرتبان چکنا چور ہو گیا۔ اسی اثنا میں ’میں لڑھک کر ایک میز کے نیچے جا پہنچا تھا۔ ہاشم رضا مشینری کے پیچھے دھکا ہوا تھا وہیں سے اس نے فائر کیا تھا۔ میں نے جواب میں ایک گولی چلائی۔ جو اس کے سین اوپر رکھے مرتبان کو لگی۔ اس میں رکھا کیمیکل نیچے گرا تو عجیب سی بو پھیل گئی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ہاشم رضا چلا یا۔

”جواب دے رہا ہوں۔ آغاز تم نے کیا تھا۔“

”منسو میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“

”میرا رب نواز سے جھگڑا ہے اور تم اس کے اتحادی ہو۔ فارمولا ہے دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور ایک اور مرتبان کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ”اگر تم نے ہتھیار نہیں چھینکے تو میں اس طرح ایک ایک کر کے تمہارے سارے کیمیکل ضائع کر دوں گا۔“

”خدا کے لیے۔“ ہاشم رضا کی آواز کانپ رہی تھی۔

”کیا کر رہے ہو۔ ان میں سے بعض بہت خطرناک ہیں کچھ آتش گیر ہیں۔ یہ جل کر راکھ ہو جائے گی۔“

”اس لیے کو تباہ ہو جانا چاہیے جہاں اس قسم کے شیطانی تجربات ہوتے ہیں۔“ میں نے ایک اور مرتبان اڑا دیا اس کے نیچے گرتے ہی وہی حیوانی چیخ سنائی دی۔ جو اس نیچے کے منہ سے نکلی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ زمین پر اچھلتا اور پھرتا نظر آیا۔ کیمیکل اس کے جسم پر گرا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ کیمیکل شاید تیزابی اثر رکھتا تھا اس کی کھال پر آٹے نمودار ہو گئے تھے اور اس کی کھال گل رہی تھی۔ کیمیکل نے اس کے جسم کے اکثر حصے کو جھونکا تھا۔ ایک لمحے تو مجھے افسوس ہوا کہ حیوانی سہی۔۔۔ وہ بچہ تھا لیکن اس کا مر

جانا بہتر تھا۔ بڑا ہو کر وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں کھلوتا بن کر نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کا سبب بن جاتا۔ مجھ سے اس کا پھڑکننا نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے ٹانگ کر گولی چلائی اور وہ ایک بار بھڑک کر ساکت ہو گیا۔ ہاشم رضا نے چلا کر مجھے گالی دی اور روئے لگا۔

”شاہ عالم۔ حرام زادے یہ میری تین سال کی محنت تھی۔“

”تمہاری محنت کے ساتھ میں تمہیں بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔“ میں نے اس کے سین اوپر رکھے ایک اور مرتبان کو اڑا دیا۔

اس بار ہاشم رضا کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنا پستول پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر سامنے آگیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اسے لے کر اوپر آگیا۔ ریشم وہاں نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکا مگر ریشم اوپر صحیح سلامت مل گیا۔ اس نے دو افراد کو پینڈر اپ کر رکھا تھا۔ یہ صورت اور طے سے عام سے ملازم نہ تھے۔ ریشم نے ان کی خاصی مرمت لگا دی تھی وہ روتے ہوئے گڑگڑا رہے تھے کہ اسیں نہ مارا جائے ان کے بیوی بچے ہیں۔ ریشم نے کہا۔

”کوئی میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ شاید ختم بھی یہاں مل جائے۔ اب میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رب نواز کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا ہو اور وہ اپنی فورس کے ساتھ اپنی ہی کوئی پرچہ جالی کی تیاری کر رہا ہو۔ میرے اشارے پر ریشم نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ کر ایک کمرے میں دھکیلی کر باہر سے کنڈی لگا دی ہاشم رضا بہ ظاہر تعاون کر رہا تھا لیکن میں اس پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ سامنے والے احاطے میں ذہن زیادہ خطرناک تھا۔ کوئی کے سامنے والے احاطے میں ایک جپ کھڑی تھی۔ ہاشم رضا سے معلوم ہوا کہ یہ اس کی جپ ہے۔ ریشم نے اس کی تلاشی لی تو اس کی عجیب سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹی ٹال والی خود کار رائفل اس کے میگزین اور ایک تھملا ملا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ان کی مایت کسی طرح پانچ لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ تم یہاں کیوں رکھی ہے؟“

”سوال جواب بعد میں کرتے رہنا۔ ابھی یہاں سے نکلو۔“ ریشم جھلا کر بولا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ واپسی کے وقت ہم صدر

علیم الحق حق کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اسے بلاتے بے درماں کے کہانی جس کا
نام عالمی دہشتہ کے علامت ہے۔
انہ بھلے ہوؤں کے داستان جو اپنے
ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں۔

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہا کر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں سبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۲۲۲۴۱۲

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہنپتال لاہور
فون: ۲۲۳۸۵۳

”میرے بند روم میں۔“ اس نے ایک فحش بات کی۔
”رب نواز میں سمجھتا ہوں کہ میری طرف سے جتنے تحمل
کا وہی ہر وہ ہو سکتا تھا جو کہ اب تم اپنے خاندان والوں کی خیر
مناد میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔“
اس نے پُر غور تفتہ لگایا۔ ”کسی مالی کے لال میں اتنی
جرات نہیں ہے کہ رب نواز کے گھر کے کسی فرد کی طرف
تک تو اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔“

”کیا انیس سات تالوں میں چپا کر رکھو گے وہ باہر
نہیں نکلیں گے۔“ میں نے طنز لہجے میں کہا۔ ”اس ایک گولی
کو صد کیکنڈی کے محافظ بھی نہیں روک پاسے تھے جس پر
اس کا نام لکھا تھا۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ اس بار اس کا لہجہ مختلف تھا۔
”یہ تو نہیں بتانا چاہیے۔ میرے درپے تم ہو۔ جہنم کو
اس حالت تک پہنچانے اور اسے دوبارہ اغوا کرنے والے
بھی تم ہو۔“

”ہاشم رضا کو چھوڑ دو۔ اس کا اس معاملے سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔“
”تعلق تو جہنم کا بھی نہیں ہے لیکن تم نے اس کے
ساتھ جو کیا ہے وہ شیطان بھی نہیں کر سکتا تھا۔“ میں نے سختی
سے کہا۔

”جہنم آرام سے ہے۔“
”اس میں تمہاری بہتری ہے۔ ہاشم رضا کی دایس کے
بے تمہیں جہنم کو رہا کرنا ہوگا۔ تم ضمانت دو گے کہ آئندہ بھی
تمہاری طرف سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حادثہ تو کسی تو جی پیش آسکتا
ہے۔ کیا تم اس کا ذمہ دار بھی مجھے ہی قرار دو گے۔“
”صحیح کہا تم نے اگر تمہارے خاندان کے کسی فرد کو کوئی
خارجہ پیش آجائے تو تم یقیناً مجھے الزام نہیں دو گے۔“

”اوکے میں ضمانت دیتا ہوں۔“ اس نے گہری سانس
لے کر کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم ہاشم رضا کو کب رہا کر رہے ہو؟“
میں نے تفتہ لگایا۔ ”رب نواز تمہاری ضمانت پر
شیطان بھی اعتبار نہ کرے۔“

وہ گالیاں اور دھمکیاں دینے لگا۔ ”شاہ عالم یاد رکھو جو
میں نے تمہارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔“
اس لمحے مجھے مکان کے گیٹ کے آگے ایک گاڑی رکتی
نظر آئی جس کے اوپر سرخ اور نیلی روشنیاں گھوم رہی
تھیں۔

وہ جگہوں کے پتے دے دیتا تو میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہر
جگہ کو فرداً فرداً چیک کرنا۔ لہذا میں نے ہاشم رضا سے اس
کے کام کے بارے میں سوال شروع کر دیے۔
”یہ بچہ بھی تمہارے تجربات کا نتیجہ ہے اس کی ماں
کہاں ہے؟“

”وہ اسے جہنم دیتے ہوئے ہلاک ہو گئی۔“ ہاشم رضا نے
سپاٹ لہجے میں کہا۔
”تو کیا تم نے ایک اور انسان کو اپنے تجربات کی جھٹ
چڑھا دیا۔“ میں نے اسے ملامت کی۔

”کچھ بنانے کے لیے کچھ کھوتا پڑتا ہے۔“ اس نے بے
بروائی سے جواب دیا۔ ”میرے تجربات مستقبل میں نسل انسانی
کے بہت کام آئیں گے۔ انسانی ڈی این اے میں حیوانی
معلومات شامل کرنے سے آج سے زیادہ ذہنی اور طاقت ور
انسان وجود میں آئیں گے۔“

”میرا خیال ہے کہ انسان کو اللہ نے جتنی طاقت دی ہے
وہ کافی ہے۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو۔ مستقبل کے طالع آزمائوں
کے لیے جسمانی طور پر مضبوط فوج تیار کر رہے ہو۔ مستقبل
کے صنعت کاروں کے لیے انسانی ردیوٹ مہیا کر رہے ہو۔
تمہاری کارکردگی کے دو نمونے لائی اور جوب کی کارگزاری میں
دیکھ چکا ہوں۔ رب نواز جیسا شخص انیس انسانیت کی فلاح و
بہبود کے لیے استعمال نہیں کر رہا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔

”تم جو چاہو کوئی لیکن یہ تجربات مستقبل کے لیے ہیں۔“
”پروفیسر ہاشم رضا تم بول بول کر مبالغہ کی آس لگانے
والے احمقوں میں سے ہو۔“

اسلم پر نیند سوار تھی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ میں باہر آیا
اور موبائل پر رب نواز کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے
اطلاع مل چکی ہوگی کہ پروفیسر ہاشم رضا غائب ہے۔ فون اس
کے کسی ملازم نے اٹھایا۔

”کون بات کر رہا ہے؟“
”رب نواز کا باپ جلدی سے اسے بلاؤ گے۔ اسے بھی
جہنم بلانوں گا۔“

ملازم سمجھ گیا کہ اس لہجے میں بات کرنے والا سر پھرا
رب نواز سے بات کر کے ہی رہے گا۔ ایک منٹ بعد رب
نواز لائن پر تھا۔ یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو شاہ عالم؟“ اس
نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”مجھے تسلیم ہے لیکن میں اچھا کرنے کی کوشش ضرور کر
رہا ہوں۔ یہ بتاؤ جہنم کہاں ہے؟“

دروازے سے نکلے تھے یہ علاقہ تو ویسے ہی سنسان رہتا تھا۔
رات کے بارہ بجے نہ آدم زاد اور نہ ہی کوئی جانور نظر آ رہا
تھا۔ ہماری کار کچھ دور کھڑی تھی۔ ہاشم رضا کے ہاتھ اس کی
ٹائی سے باندھ دیے تھے۔ اسے کار کی عقبی نشست پر لٹا کر ہم
دونوں آگے آگے۔ دس منٹ بعد ہم دوبارہ اپنے ٹھکانے پر
تھے اسلم بدستور اکرام الدین کی گھرائی کر رہا تھا۔ میں نے
رکش سے کہا۔

”اس کی فکر نہ کرنا۔ یہ بتا کہ تمہارا ارادہ ہے؟“
”صبح بتاؤں گا۔ چھ سات بجے تک آجانا یہ نہ ہو کہ تجھ
سے پہلے یہاں کام کرنے والے مزدور آجائیں۔“

رکش چلا گیا۔ میرا تھکن سے برا حال تھا لیکن اس
سے پہلے ہاشم رضا سے کچھ پوچھ کچھ ضروری تھی۔ اس کے
اعتماد میں کمی آئی تھی اور وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ خاص طور
سے اکرام الدین کی صورت دیکھ کر جسے میں نے بد صورت بنا
دیا تھا میں نے کہا۔ ”دیکھو پروفیسر تم ایک ایجوکیٹڈ شخص ہو۔
میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا۔ بہتر ہوگا جو میں پوچھوں اس کا
جواب دیتے رہو۔“

”تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے خشک لبوں پر زبان
بھیری۔
”رب نواز کہاں ہے؟“
”ظاہر ہے اپنے گھر میں ہوگا۔“

”جہنم کہاں ہے؟“
”میں بتا چکا ہوں رب نواز کے ان معاملات سے میرا
کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں زیادہ تر اپنے کاموں میں مصروف
رہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ رب نواز نے جہنم کو کہاں
رکھا ہے۔“

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔
”رب نواز کے اور کتنے ٹھکانوں سے تم واقف ہو؟“

”زیادہ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور وہ بھی رب
نواز کے مستقبل ٹھکانے نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسی ہی آبادیوں
میں کوئی زیر تعمیر مکان اونے پونے داموں خرید لیتا ہے۔ جس
کو مالک مجبوری میں بیچ رہا ہو۔ وہاں مجھے یہ بتا کر دے دیتا
ہے۔ اس قسم کی جگہوں پر میں سکون سے دنیا والوں کی نظروں
میں آئے بغیر کام کر سکتا ہوں۔ جب وہ جگہ کسی وجہ سے
مشکوک ہو جاتی ہے تو رب نواز مجھے کسی دوسرے ٹھکانے پر
منتقل کر دیتا ہے۔“

میں نے مزید نہیں پوچھا۔ اس کا فائدہ نہیں تھا اگر وہ
میں سے زیادہ نہیں پوچھا۔ اس کا فائدہ نہیں تھا اگر وہ

پولیس کی وین دیکھتے ہی میں "موبائل بند کرو یا تھا۔ پولیس وین میں سے ایک سونا سا اے" ایس آئی اترا اگر اس کے وزن میں سے اس کی توند کا گنبد نکال دیا جاتا تو اس میں خاصی کمی آسکتی تھی۔ اس سے پہلے وہ احاطے میں آتا میں خود گیت سے باہر گیا "تیس اے ایس آئی" میں نے انگریزی میں کہا "اس وقت تمہاری یہاں آمد کا مقصد؟" میرے چلے اور انگریزی نے اسے خاصا مرحوب کیا تھا لیکن اس نے توند کے گنبد پر چلون کے ساتھ خودی کو بھی بلند کرتے ہوئے کہا "سرچی آنا پڑتا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ یہاں پر مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔"

"مجھے بھی کسی سڑک کے بچے نے فون پر یہی اطلاع دی تھی۔" میں نے بھی آتش زریا کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ "آدھی رات کو بستر سے اٹھ کر اس طرف دوڑنا۔ بڑی رقم خرچ کر رہا ہوں اس مکان کی تعمیر پر۔"

"اچھا جی آپ مالک ہو اس کے؟" اس نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے۔ ورنہ مجھے پاگل کہتے تو نہیں کاتا تھا کہ اتنی رات کو بچہ بنی ٹولی دس کو چھوڑ کر یہاں آئے۔"

اے ایس آئی کے ساتھ آنے والے سپاہی باوجود دانت نکالنے لگے تھے۔ اے ایس آئی بھی مسکرایا۔

"پھر جی۔ یہاں کوئی ملا؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "کسی نے شرارت کی تھی۔ اندر بند کمروں میں خاصا سینٹ اور سربراہا ہے۔ مجھے اس کی فکر تھی لیکن کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔"

بظاہر میں پوری طرح با اعتماد تھا لیکن اندر سے میری حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ اندر دو عدد منوی موجود تھے اور اگر انہیں احساس ہو جاتا کہ باہر پولیس آئی ہے تو وہ اسے متوجہ کرنے کی کوشش ضرور کرتے اور ایسا ہوتا تو میں خاصی مشکل میں پڑ جاتا۔ گرفتار ہونا تو مجھے کسی بھی حالت میں قبول نہیں تھا لیکن اگر میں پولیس سے مار پیٹ کر کے فرار ہو جاتا تو اس سے بھی میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جاتے۔ مجھے امید تھی کہ اندر اسلم نے انہیں اچھی طرح قابو کر رکھا ہوگا۔ اکرام الدین کے منہ میں کپڑا تھا اور پروفیسور شمس رضا سمجھ دار آدمی تھا۔ کسی امید کے بغیر وہ کوئی حافقت نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ کون ہیں جناب؟" اے ایس آئی نے ہلکا خروچہ ہی لیا۔

"رانا بشیر احمد۔" میں نے روانی سے ایک فرضی نام بتا

دیا "ہال روڈ پر میری دکانیں ہیں۔"

"جناب کوئی شناختی کارڈ ہے؟" آپ کے پاس۔" کایاں اے ایس آئی اپنے ٹک کا اظہار کیے بغیر اپنی تپلی کر رہا تھا۔

"یار آدمی رات کو آتے ہوئے مجھے شناختی کارڈ کا خیال نہیں رہا۔" میں نے مزید انداز میں کہا "مجھے تو اپنی بیوی کی فکر تھی کہ اتنی رات گئے یوں اٹھ کر دوڑنے پر وہ نہ جانے کیا سمجھے۔ ان عورتوں کا کوئی بھروسہ بھی نہیں ہوتا۔"

اے ایس آئی مع پارٹی کے دوبارہ مسکرایا تھا لیکن وہ اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ "کسی بھی طریقے سے آپ اپنی شناخت کرا سکتے ہیں جناب؟"

"میں کس طریقے سے اپنی شناخت ثابت کروں؟" میں نے التماس کیا۔

"کوئی معروف بندہ جو آپ کو جانتا ہو۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے اس بار فٹکی دکھائی تھی "کیا مطلب آدمی رات کو میں اپنے کسی جانتے والے کو اٹھا کر کھوں کہ وہ میری شناخت کرا دے۔"

"مجبوری سے جناب اگر ہم ایسے ہی ہر شخص کی بات کا یقین کر لیں تو کام کر لیا۔ کوئی اپنے منہ سے نہیں بولتا ہے کہ میں بد معاش ہوں۔"

"میں چلے اور باتوں سے بد معاش نظر آتا ہوں؟" میں نے مزید غصہ دکھایا۔

"سرچی غصہ نہ کریں۔ مطمئن کرنے کے سو طریقے ہیں۔" اے ایس آئی معنی خیز لہجے میں بولا۔

تب میری سمجھ میں اس کا مطلب آیا۔ اتنی جرح وہ صرف اسی لیے کر رہا تھا کہ میں اس کا مقصد پورا کروں۔ یعنی رقم سے اس کا منہ بند کروں۔ اس کی یہاں آمد میں فرض شناسی سے زیادہ مسئلہ زر ملوث تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا "آئیے اس طرف جناب اے ایس آئی صاحب!"

وہ جیسے کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا تھا۔ ایک طرف آنے کا مطلب ہماری پولیس سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے ایک طرف لے جا کر پانچ سو کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا "اب میں کہاں دو سڑکوں کو ٹنگ کر آپھروں گا اس سے بندے کی رپویشن بھی خراب ہوتی ہے۔ آپ یہ رکھ لیں۔"

"میرے ساتھ تین بندے اور بھی ہیں رانا صاحب!" اس نے دھمائی سے کہا۔

مجھے افسوس ہوا کہ حرام اس حد تک اس کے منہ لگ

چکا تھا کہ اب وہ مانگنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ میں بادل ناخواستہ اس کا مطالبہ پورا کر رہا ہوں۔ میں نے پانچ سو کا ایک نوٹ اور دیا جو اس نے اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ حالانکہ یہ نوٹ اس نے اپنے ساتھیوں کے نام پر لیا تھا مگر اس کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ نوٹ انہیں دے گا۔ شاید وہ پچاس پچاس روپے پر غر خا دے۔ یہ جنگل کے بادشاہ کے موڈ پر ہو رہا ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے لیے کتنا حصہ چھوڑتا ہے۔ اے ایس آئی بھی اپنی حد میں شیر تھا۔ وہ گاڑی میں جا بیٹھا "چلو اوئے" ابھی تھا نہ بھی جانا ہے۔"

موبائل وین کے ڈرائیور نے گاڑی اشارت کی تھی اسی لمحے مکان کے اندر سے کھٹ کی آواز آئی۔ جو کھلی نضا اور خاموشی میں مجھے واضح سنائی دی تھی۔ میں نے پولیس واپس کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے اے ایس آئی نے میری طرف دیکھا "یہ آواز کیسی بھی جناب؟"

اے ایس آئی تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ہونے کی وجہ سے اس نے آواز سننی تھی لیکن انجین کے شور میں اسے کم ہی سنائی دی تھی۔ بالآخر اس نے اسے کان کا وتر دیکھا اور گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ان کے جیسے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اندر کی طرف لپکا۔ اسلم نے مارج دوبارہ بدلی تھی۔

"یہ آواز کیسی تھی؟" میں نے برہمی سے کہا "ابھی پولیس والے ٹنگ میں پڑ جاتے تو مصیبت آ جاتی۔"

"یہ خرابی پن کر رہا تھا۔" اسلم نے اکرام الدین کی طرف اشارہ کیا "میں نے اس کے سر پر پستول کا دست مارا تھا۔ اس کی آواز آئی تھی۔"

میں نے اکرام الدین کو ہلکا جلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ اس کی سانس رکی سے مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ اس کی نبض بے ترتیب تھی۔ اسلم نے ہاتھوں کا دست زیادہ زور سے مارا تھا۔ وہ مر بھی سکتا تھا۔

اگرچہ اکرام الدین رب نواز جیسے شیطان کا گرگ تھا اور اس کے جرائم اس کی حرکتوں سے عیاں تھے پھر بھی وہ انسان تھا اور اسے یوں بے کسی کی موت نہیں مرنی چاہیے تھا۔ اسے کسی اسپتال تک پہنچانا ضروری تھا مگر اتنی رات گئے میں اسے کہاں لے کر جاتا۔ کسی بھی اسپتال میں لے جاتا تو اس کے علاج سے پہلے مجھ سے سوال و جواب شروع ہو جاتے۔ پانچ بجے ابھی والوں کا خیال آیا۔ میں نے مکان روڈ پر ان کا ایک سینئر دیکھا تھا۔ میں اکرام الدین کو وہاں لے جا سکتا

تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اسے کسی نہ کسی اسپتال تک پہنچا دیتے اور ان کی وجہ سے اس پر توجہ بھی دی جاتی۔

اگرچہ کھٹن سے میرا حال تھا اور نیند بھی پکوں پر نکلی تھی لیکن ان حالات میں سونا ممکن نہیں تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب میں نے اسلم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ متحیر نظر آنے لگا تھا۔

"دیکھ لیں جی کہیں آپ کسی جگہ میں نہ آجائیں اس نصیحت کے پتھر کے لیے۔"

"کچھ نہیں ہوگا یار۔ بس میں اسے ایمر می سینٹر کے سامنے ڈال کر آ جاؤں گا۔ باقی وہ خود دیکھتے رہیں گے۔ اگر اس کی زندگی بانی ہے تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اسپتال بھی پہنچ جائے گا اور ڈاکٹر بھی مل جائے گا۔"

اسلم کی مدد میں نے اکرام کو گاڑی کی ڈکی میں ڈالا۔ کسی قدر مشکل سے وہ ڈکی میں ساسکا تھا۔ اس میں ہوا کی آمد و رفت کے راستے تھے اس لیے مجھے یہ غصہ نہیں تھا کہ وہ دم کھٹنے سے مر جائے گا۔ اسلم کو ہوشیار بننے کا کہہ کر میں فوری طور پر روانہ ہو گیا۔ میں اکرام کو جلد از جلد طبی امداد دلانے کا خواہش مند تھا مگر بد قسمتی اسی موبائل کی صورت میں میرے سامنے آئی۔ جو مکان پر تکی تھی۔ وہ غالباً خراب ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اسے دیکھ رہا تھا اور توندل اے ایس آئی بیزار سی سے ایک طرف مڑنے ہوئے گاڑی اور اس کے بنانے والوں کے شرعاً نسب میں زیادتی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھرتی سے سڑک کے درمیان میں آ گیا بادل ناخواستہ میں نے کار روکی۔

"اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔" میں نے جھلے ہوئے انداز میں کہا "مجھے پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں جی چند منٹ کی اور سہی۔" اس نے بے تکلفی سے کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا "مجھے تھانے پڑا آ رہا۔ راستے میں پڑا ہے۔"

جزیر ہوتے ہوئے میں نے سر ہلایا۔ اے ایس آئی نے چلا کر اپنے ماتحتوں سے کہا "اوئے کوئی گاڑی پکڑ کر اس ماں کی۔ کو تھانے لے آؤ۔"

"خیرت گاڑی بھی پولیس کی ہے۔" میں نے کہا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا لیکن بے غیرتی سے ہنس دیا۔

"ہنس جی کام چلا رہے ہیں۔ ورنہ باہر کی پولیس کو کیسی شان دار گاڑیاں ملتی ہیں۔"

"ان کی کار کوئی بھی شان دار ہوتی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"میں جی جیسی گاڑی ویسی کار کرو گی۔" اس نے دانتوں میں خنایا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے توڑے کی بو آ رہی تھی۔ غالباً گاڑی خراب ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کھانا کھایا تھا جو یقیناً بال قیمت میں کسی ہوٹل سے مار لیا گیا تھا۔ میں ہر ممکن خیر فکاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے اکرام الدین کی فکر بھی کہ کہیں وہ مری نہ جائے مگر اے ایس آئی کو اچانک سگریٹ یاد آگئے۔ اس نے ٹوکوں کے ایک ہوٹل پر گاڑی رکوائی اور اندر آدس منٹ بعد سگریٹ کے ساتھ پان بھی بنوا کر لوٹا تھا۔ میرا خون اس دوران میں کھولنا رہا تھا۔

اے ایس آئی کو تھانے کے سامنے اتار کر میں ہر ممکن تیزی سے روانہ ہوا تھا۔ ایڈھی سینٹر کے سامنے روشنی کم تھی۔ سینٹر کے احاطے میں دو ایڈھی سینٹر کھڑی تھیں۔ میں نے گاڑی سائڈ میں روک کر ڈکی کھولی۔ اندر اکرام الدین کو ساکت دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا لیکن اس کی بغض نے تصدیق کر دی تھی۔ حیات اس کے جسم سے نانا توڑ چکی تھی۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود میں اسے نہیں بچا سکا تھا۔ موت اپنے اصل وقت پر آئی تھی۔ میں نے اسے اتارنے کا ارادہ ملتوی کیا اور گاڑی اشارت کر کے واپس چل رہا تھا۔ راستے میں ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اکرام الدین کی لڑائی بونی لاش نکال کر سڑک کے کنارے ڈال دی۔

جب میں واپس پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسلام بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا "وہ کہاں ہے؟" "میں نے ایڈھی سینٹر کے سامنے ڈال دیا تھا۔" میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس نے ایک انسانی جان لے لی تھی۔ وہ بلاوجہ ضمیر کی خنک میں گرفتار ہو جاتا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اس نے وہی کیا تھا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ دو گھنٹے بعد ریس آجاتا۔ ہاشم رضا قید میں بھی سکون سے گھوڑے سچ کر سو رہا تھا۔ سوا تو اسلام بھی نہیں تھا لیکن اسے آرام کا موقع مل گیا تھا۔ لہذا جب اس نے مجھے سونے کے لیے کہا تو میں نے ہجرت نہیں کی۔ کمرے میں پڑی بچری نرم تھی۔ میں لیٹے ہی سو گیا تھا۔ حتیٰ کہ ریس نے لات مار کر اٹھایا۔

"اٹھ جائیے عالم پناہ!" اس نے کہا "دو دن میں دوسری لات ماروں گا۔" "یہ کیا گدھا ہیں؟" میں نے فحشی سے کہا۔ سات بج رہے تھے گویا میں صرف تین گھنٹے سو رہا تھا لیکن اس سے جسم کسی قدر تروتازہ ہو گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیڈ پپ پر

جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ ریس ناشتا لایا تھا۔ میں نے اور اسلام نے ناشتا کیا۔ ہاشم رضا کو ناشتا نہیں دیا کیونکہ ریس اسے لینے آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے اسے باہر لے جا کر رات کے واقعات سنائے۔ اکرام الدین کی موت کا اسے بھی افسوس ہوا تھا لیکن ہاتھوں کی لڑائی میں مینڈک ہی مارے جاتے ہیں "اب تیرا کیا پروگرام ہے؟" "میں اسلام کے ساتھ جا کر نوادرات کا جعلی ذخیرہ دیکھوں گا۔ ممکن ہے اسے ہم رب نواز کو چھانسنے کے لیے استعمال کر سکیں۔ پان تو ذرا بینک لاکر کے بارے میں معلوم کر اور ممکن ہو تو جا کر اس کا معائنہ بھی کر لے۔ دلاور شاہ نے اجازت نامہ لکھ کر ہم پر احسان بھی کیا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا اس سے پہلے کہ اس کا ہنسنی بھان شاہ کام دکھا جائے۔ مجھے یقین ہے اس لاکر میں رب نواز کے خلاف ثبوت ہوں گے جو دلاور شاہ نے جمع کر رکھے ہیں۔"

"یہ میں کروں گا۔" ریس نے سر ہلایا "اور کچھ۔" "ہاں یہ راقظ اور پانچ لاکھ روپے بھی لے جا۔ ابھی میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ ایک پستول کافی ہے اور غلام کے دیئے لاکھ دو روپے بھی ایسے ہی پڑے ہیں۔ پان لے جا کہ گاڑی کس نے خریدی ہے۔"

"میں نے لیکن اوپن لیٹر ہے۔ کافدات سارے موجود ہیں۔" "میں ات بدلتا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا "میں کوئی جیپ لینا چاہتا ہوں۔ دھاتی علاقوں میں وہ زیادہ کام آتی ہے۔"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ گاڑی آرام سے ڈھائی لاکھ میں نکل جائے گی۔ جیپ اس سے کم قیمت میں مل جاتی ہے۔" ریس ہاشم رضا اور دوسری چیزیں لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے تیزی سے وہاں موجودگی کی ہر نشانی مٹائی۔ سارا سامان گاڑی میں رکھا جیپ ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ موسم میں گرمی کی شدت کم ہوئی تھی۔ گاڑیوں کے شوروم کھلنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کچھ دیر کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیے۔ آرام کے بعد ہی ہم اسلام کے ماموں کے گاؤں تک سفر کے قابل ہوں گے۔ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں بغیر کسی سوال و جواب کے ہمیں ایک ڈبل بینہ والا روم مل گیا۔ میں نے فوری طور پر غسل کیا اور جب باہر نکلا تو اسلام بے خبر سو رہا تھا۔ کاؤنٹر

کلرک کو میں نے دو بجے اٹھانے کو کہا اور میں خود بھی سو گیا۔ دو بجے ایک ویٹر نے دروازے پر دستک دے کر ہمیں بٹکایا۔ میں نے اسے لچا لانے کو کہا۔ اسلام بھی اتنی دیر سو کر تازہ دم ہو گیا تھا مگر کھانا کھانے کے بعد وہ دوبارہ سو گیا اور میں سڑا لاک کر کے بیچے گیا۔ لاہور میں گاڑیوں کی خرید و فروخت کا مرکز کھل چکا تھا۔ میں نے ایک شوروم کے سامنے کار روکی تو بیک وقت دو سٹار میں میری طرف لپکے۔ پہلے پچھتے دانا کا سیلاب رہا "فرمائیے سر کیا خدمت کریں۔ گاڑی بیچنی ہے یا خریدنی ہے۔"

"دونوں کام کرنے ہیں۔" میں نے گاڑی سے اتر کر کہا۔ "بھئی اندر آئیں۔" اس نے کہا اور مجھے اندر لے آیا۔ ایک بچے کو اس نے ٹھنڈی بوتل لانے کے لیے کہا "جی اب بتائیے آپ کون سی گاڑی پسند کریں گے۔"

میں نے اس شوروم کے سامنے گاڑی اس لیے روکی تھی کہ وہاں مجھے ایک سیاہ رنگ کی سنگل کین جیپ کھڑی نظر آئی تھی۔ اس کا پچھلا حصہ کورڈ تھا اور عقب میں کھلنے والا ڈبل ڈور بھی تھا۔ وہاں ڈور پر فاضل مائزگ تھا اور جیپ اچھی حالت میں نظر آ رہی تھی "مجھے کوئی مناسب جیپ چاہیے۔ بے ٹنگ ماڈل پرانا ہو لیکن کنڈیشن اچھی ہوئی چاہیے۔" وہ مکمل اٹھا تھا "تیس جی آپ کے مطلب کی شے ہر سہ پاس ہے۔"

وہ مجھے جیپ کے پاس لایا "یہ مشوبہشی کا ماڈل ہے۔ چار سال پہلے کا ہے لیکن بہترین حالت میں۔ اتر کنڈیشن اور ڈیک بھی لگا ہے۔ انجن پانی کی طرح چلتا ہے۔ پیٹرول انجن ہے اس کی ریس آپ چلا کر ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے مجھے زبانی کرائی۔ واقعی جیپ بہترین حالت میں تھی۔ فور ویکل ڈرائیو ہونے کی وجہ سے نامور اور راستوں کے لیے مثالی تھی۔ عقبی حصے کورڈ ہونے کی وجہ سے ہم اپنا سامان بھی رکھ سکتے تھے۔ اندر سے بھی جیپ کی حالت بہترین تھی اور نائرس تھے لیکن اس نے قیمت ذرا زیادہ بتائی تھی۔ وہ اس کے ساڑھے تین لاکھ مانگ رہا تھا۔ جبکہ میری کار کے اس نے دو لاکھ چالیس ہزار لگائے تھے۔ یعنی مجھے مزید ایک لاکھ تین ہزار روپے دینا تھے اور میرے پاس تقریباً اتنی ہی رقم تھی۔ خاصی بحث کے بعد طے پایا کہ میں گاڑی کے علاوہ رزرو سے ہزار روپے دوں گا تو وہ کانڈی کارروائی انجی "ادارے گا۔ پانچ بجے میں شوروم سے جیپ لے کر نکلا تھا۔ اسلام جاگ گیا تھا اور میرا خنجر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم اس کے ماموں کے گاؤں جا رہے ہیں تو وہ خوش ہو گیا۔

تھا۔ وہ دو دن سے ایک ہی جوتا پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ہم نے ایک ریڈی میڈ کار خنشل سینٹر کا رخ کیا۔ اسلام شلوار قمیض پہنتا تھا۔ اس نے دو سوٹ لیے۔ میں نے بھی دیہاتی علاقے کی مناسبت سے شلوار کر لے لی تاکہ نمایاں نہ لگوں۔ سر پر میں نے کڑھی ہوئی سندھی اسٹائل کی ٹوپی لی اور آنکھوں پر بڑے سیاہ شیشوں کی عینک لگائی۔ اس سے میرا حلیہ خاصی حد تک مختلف ہو گیا تھا۔

اسلم میری ہیبت کڈائی دیکھ کر ہنسنے لگا تھا "آپ تو سندھی دؤیرے لگ رہے ہیں۔" "بابا ہم مذاق پسند نہیں کرتے۔" میں نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ دو دن کی شیو نمایاں ہونے سے فرج کٹ کا تاثر کم ہو گیا تھا اور میں جی جی کسی سندھی دؤیرے سے مشابہ لگ رہا تھا۔

راوی کاہل پار کر کے ہم نے فیروز پور روڈ کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہ سڑک سیدھی بھارت کے شرفیروز پور تک جاتی تھی۔ اسلام کے ماموں کا گاؤں اسی سڑک پر واقع تھا۔ جب ہم لاہور سے نکلے تو سورج خوب ہو چکا تھا اور قریبی چھا رہی تھی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ رات کو ہماری طرف کوئی توجہ نہ دیتا اور میں رات میں ہی نوادرات دیکھ کر واپس آسکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اگر ان نوادرات میں سے کچھ ان نوادرات سے مشابہہ نکل آتے جو لندن میں عامل کے پاس تھے تو میں بھان شاہ اور رب نواز کو آپس میں سکون کی طرح لٹوا سکتا تھا۔ دونوں ہی چھ لاکھ پاؤنڈ کے ان نوادرات کے پیچھے پاگل ہو رہے تھے۔ میں ان کے پاگل بننے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رات نو بجے کے قریب ہم اسلام کے ماموں کے گاؤں پہنچے۔ یہ مختصر سا گاؤں تھا جس میں بیشکل سو سا سو گھر تھے اور یہ پکی سڑک سے کوئی دو میل مغرب میں تھا۔ گاؤں تک کا راستہ بے حد خراب تھا۔ اگر جیپ نہ ہوتی تو جھنکوں سے ہمارا برا حال ہو جاتا۔

اسلم نے موقع پا کر راستے میں مجھے اپنی داستان حیات سنائی تھی۔ اس کا باپ تانبے کے ترن بنایا کرتا تھا اس کا بھتر دیکھ کر رب نواز نے اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ لاہور میوزیم میں موجود قدیم دور کے تانبے کے برتنوں اور نوادرات کی وہ ہو بہو نقل تیار کر لے گا تھا۔ بعد میں اس نے برتنوں اور نوادرات کو قدیم بنانے کے کچھ دسی کئے ایجاد کیے تھے۔ وہ برتنوں کو زمین میں دبا کر اور بعض اقسام کے تیزابوں کی مدد سے ایسی صورت دے دیا کرتا تھا کہ وہ صدیوں پرانے نظر آتے تھے۔ نوادرات کی بین الاقوامی مارکیٹ میں

ان کی قیمت بہت زیادہ مل جاتی تھی۔ اسلام کے باپ نے پورے میں بڑے رب نواز کے لیے کام کیا تھا اور رب نواز نے اسے بھرپور معاوضہ تو ایک طرف رہا اتنا بھی نہیں دیا تھا کہ اس کا خاندان ان دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکا۔ مسلسل بھیجی کے زہریلے دھوکے میں کام کرنے سے رفتہ رفتہ اس کی چٹائی جواب دہی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا یعنی اسلام۔ اب کا شہر دیکھ کر اس نے اپنا آبائی کام کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ عرصے اس نے ایک دو جگہوں پر ملازمتیں بھی کیں مگر زیادہ تر سب روزگاری رہا تھا۔ جب خاندان میں قانون کی نوبت آگئی تو اسلام کے باپ نے زندگی میں پہلی بار جسارت سے کام لیا۔ رب نواز بغیر مطلب کے کسی کو دو روپے دینے والا نہیں تھا۔ دو لاکھ روپے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر اسلام کے باپ نے حقت کرتے ہوئے ملک رب نواز کو دھکی دی تھی اس کے بعد وہ یوں غائب ہو گیا۔ جسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ ملک رب نواز نے اسلام کو بلا کر دھکی دی کہ وہ اس معاملے کو پولیس تک لے جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کا بھی اس کے باپ جیسا انجام ہو گا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ باپ کا انجام دیکھ کر اسلام کو عقل آجاتی مگر انتقام نے آتے بھی پاگل کر دیا۔ اس نے ملک رب نواز کے خلاف باپ کے اغوا اور قتل کی ایف آئی آر درج کرانے کی کوشش کی ایف آئی آر تو درج نہیں ہوئی مگر اس رات رب نواز کے کتے اسلام کے گھر آئے پیچھے۔ اس کی ماں اور چار بیٹیں گھر میں تھیں۔ ان کے ساتھ درندگی آمیز سلوک کرنے کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔ اسلام اس رات نوادرات کے پتھر میں ماموں کے گھر تھا اس لیے بچ گیا۔ اگلے روز وہ گاؤں گیا تو ماں اور بہنوں کی لاشیں دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ اگر اس کا ماموں اسے وہاں سے نہ لے جاتا تو وہ بھی رب نواز کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اگلے روز وہ ماموں کے گھر کو چھوڑ کر لاہور آ گیا تھا تاکہ مجھے تلاش کر سکے۔ "ناصر صاحب! اس کتے کے پیچھے نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔" وہ دباؤ میں مار کر رونے لگا تھا۔ "میں اس کے پورے خاندان کو ختم کر دوں گا۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کا شانہ تھپا "تم اس صورت میں بدلے لے سکو گے جب خود کو اس کے قاتل بنا لو۔ ابھی تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

اس نے آنسو پونچھ لیے تھے۔ اسلام کے ماموں کے گھر کی طرف جانے والا رات قبرستان کے چچ سے گزر رہا تھا۔

رات ہوتے ہی شیر خوشاں میں گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ماحول بھوت اور چڑیلوں کے شو کے لیے نہایت سازگار تھا۔ پس نظر میں کوئی اور بار اس طرح آواز نکال رہا تھا جیسے گاؤں کا چوکیدار "جانتے رہو" کی صدا میں دیتا ہے۔ مٹا میری نگاہ وائیں طرف کسی سفیدی سے پر پڑی جو تیزی سے کسی قبر کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ میں نے یک دم بریک لگا لے تو اسلام نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب گاڑی کیوں روکی ہے؟"

"اس طرف کوئی ہے۔" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے جناب! یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ قبرستان ویسے ہی آسپ زہ ہے۔"

"دیکھنے میں کیا حرج ہے ممکن ہے کوئی کفن چور ہو۔" میں جب سے اتر آیا تھا۔ اسی لمحے کوئی تیزی سے اچھل کر بھاگا تھا۔ میں نے ہانک لگائی "خبردار گولی مار دوں گا۔" لیکن وہ رکا نہیں۔ وہ بے فکر سے قبریں پھلتا ہوا جنوب کی طرف جا رہا تھا جس طرف گاؤں تھا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی طرح قبروں کے درمیان بھر رکھ کر اس کا تعاقب کرتا اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے جیب اشارت کی اور آگے بڑھا دی۔ قبرستان سے باہر آتے ہی میں نے جیب اس طرف موڑ دی جس طرف وہ شخص بھاگا تھا۔ روشنی میں وہ کوئی فزنگ بھر آگے نظر آیا تھا مگر ریس میں جیب سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک منٹ میں چالیا تھا اسے۔ جیب سر پر دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔

"تو۔ تو۔ میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔" اس نے باپنچے ہوئے کہا۔

"تمہاری صورت دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔" میں نے کہا اور اسلام سے بولا "اس کی تلاش تو۔"

"خبردار میرے نزدیک نہ آنا۔" اس نے چلا کر کہا لیکن پستول کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

اسلم نے اس کی تلاش لی۔ اس کا جیب سے ایک گمراری والا خبردار چمچ رقم نقلی تھی لیکن اہم ترین شے ایک ننھا سا پستل کا حقہ تھا۔ بمشکل چھ انچ لمبا یہ حقہ کاریگری کا شاہکار تھا۔ حقہ دیکھتے ہی اسلام پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ اس نے اس نوجوان کا کھلا دلوچ لیا تھا "یہ تیرے پاس کہاں سے آیا۔ بول؟" اور پھر جواب کا انتظار کیا۔ پھر اس کی راتوں کے درمیان گھٹنا ہوا تھا۔ وہ تڑپ کر زمین پر گر کر

اور لوٹ پوٹ ہونے لگا تھا۔

"ہائے میرے رہا۔" اس نے واویلا مچایا تو میں نے پستول کی نال اس کے گلے منہ میں گھسیڑی۔

"اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے" میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اگر جواب نہ ملے تو گولی مار دیتا ہوں۔ جلدی سے بگو۔ یہ حقہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" میں نے پستول منہ سے نکال کر اس کی پیشانی سے ٹکادی۔

"بتانا ہوں۔ بتانا ہوں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا "خدا کے لیے پستول تو بتاؤ۔"

"میں صرف تین تک گنوں گا۔" میں نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں اور کتنی شروع کر دی۔

"بتانا ہوں۔" اس نے بولے کرا کر کہا "یہ مجھے شو کے نے دیا ہے۔"

"اسلم چوکا، کون شوکا، شوکت علی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "اکرم علی کا بچہ۔"

"یہ شوکا کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے ماموں کا بیٹا۔" اس نے فکرمندی سے کہا اور اس سے پوچھا "یہ حقہ لے کر کہاں جا رہے تھے؟"

وہ اب بھی مزاحمت کر رہا تھا لیکن میرے ہاتھوں تھوڑی سی مار کھا کر اس نے اگل دیا کہ شوکے نے اس کی مدد سے اپنے ہی گھر میں نصب لگائی تھی اور نوادرات کا ذخیرہ اڑا لیا تھا۔ بے چارہ اکرم علی سمجھ رہا تھا کہ اس کے گھر چچ چوری ہو گئی ہے اور وہ پریشان تھا کہ اسلام کو کیا منہ دکھائے گا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ چوری گھر کے بھیدی نے کی ہے۔

"نوادرات کہاں ہیں؟" اسلام نے اس کو ٹھوکر ماری۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شوکے نے کہیں رکھے ہیں۔"

"جھوٹ مت بول۔" اسلام نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی تھی "تو قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔ اپنی ماں کی قبر تو دگر رہا تھا؟"

اس نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی کہ وہ وہاں پیشاب کرنے گیا تھا لیکن بالا خرا اسلام کی ٹھوکروں سے اپنے دو دانت اور ناک تڑوانے کے بعد اس نے زبان کھول دی تھی۔ پوری شدہ نوادرات انہوں نے ایک پرانی قبر میں چھپا دیئے تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ رات کو اس وقت وہ قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔ یہ بات اس نے اپنی ایک پہلی ٹونے کے بعد بتائی تھی۔ وہ شوکت علی کو بھی قتل کر اس کر رہا تھا اور اس نے نوادرات چرا کر ایک دوسری قبر میں چھپا دیئے تھے۔ یہ حقہ اس نے نمونے کے طور پر پاس رکھ لیا تھا۔ اس کا نام علی احمد

تھا اور اس کے روابط سرحد پار کے جرائم پیشہ عناصر سے تھے اس نے ان سے ان نوادرات کا سودا کر لیا تھا۔

"تم یہ حقہ انہیں دکھانے کہاں لے جا رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"درا آگے چوہدری رحمت الہی کا ڈیرا ہے۔ وہ لوگ وہیں ٹھہرے ہیں۔"

اسلم بے حد غصے میں تھا۔ وہ اسے گولی مار دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا "اس کا حساب بھی شوکت علی کے ساتھ ہی کریں گے ابھی تو اس کے ساتھ چل کر نوادرات نکالتے ہیں۔"

علی احمد مستحکم خیر آواز میں دو تباہیل ناخواست ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوا تھا اسے یقین تھا کہ ہم جیسے سفاک لوگ قبر سے نوادرات نکال کر اسے دفن بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے چال چلنے کی کوشش کی تو ہم ایسا ہی کریں گے کھدائی کے اوزار اس نے قبرستان میں ہی ایک جگہ چھپا دیئے تھے۔ نوئی پہلی کے ساتھ اس کے لیے کھدائی مشکل کام تھا لیکن اسلام نے اسے برابر کام میں شریک رکھا۔ نوادرات ذرا ہی نیچے پوروں میں بھر کر دفن کیے گئے تھے۔ یہ کل چار پوریاں تھیں۔ اسلام نے انہیں اٹھا کر جیب کے عقبی حصے میں رکھا۔ کھدائی کے دوران وہ مٹی میں اٹ گیا تھا۔ علی احمد کا وہشت سے برا حال تھا۔ جب میں نے مذاق میں کہا۔

"چل بھی اب قبر میں خالی جگہ لیٹ جا۔ اسے پونہی خالی تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"خدا کے لیے مجھے مت مارو۔" اس نے چلا کر کہا تاکہ نوٹ جانے کے بعد اس کی آواز میں مشابہت نہ لگے۔

"ہم کہاں سے اریں گے یہ تو خدا کا کام ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

جب میں نے اسے جیب میں بیٹھنے کے لیے کہا تو اس کی جان میں جان آئی تھی۔ میرا ارادہ اب اسلام کے ماموں کے گھر جانے کا تھا۔ میں احمد علی کا سامنا شوکت علی سے کرانا چاہتا تھا۔ خود اسلام کا بھی یں خیال تھا۔ اس کے ماموں کا گھر گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ کوئی تباہی آمد سے واقف نہیں ہو سکتا تھا جیب کی آواز سن کر گاؤں کے کتے استقبال کے لیے دوڑے تھے لیکن ان سے پہلے ہی اسلام کا ماموں باہر نکل آیا تھا۔ اس نے لاٹھی اٹھا رکھی تھی۔ اسلام جیب سے اترتا تو وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کتوں کو ڈانٹ کر رکھا گیا۔

"اسلم پڑاں ویلے۔"
 "ہاں ماما۔ میں نے سوچا اپنی امانت لے جاؤں۔"
 "امانت! وہ مزید پریشان نظر آنے لگا۔ "پتھر تو آؤ امانت بھی لیتے رہتا۔"
 "امانت میں پہلے ہی لے چکا ہوں۔" اسلم نے اس بار زہریلے لہجے میں کہا "شو کا کہاں ہے؟"
 "وہ تو سو رہا ہے۔" مامے نے کہا "اور یہ تو کس انداز میں بات کر رہا ہے؟"
 "اسے جگاؤ۔ اس کے ایک یار کو لے کر آیا ہوں۔"
 اسلم نے علی احمد کو جیب سے باہر کھینچا۔
 "یہ تیرے ساتھ کہاں سے آیا؟" مامے نے حیرت سے کہا "یہ تو زخمی بھی ہے۔"
 "چاچا مجھے ان لوگوں سے بچاؤ۔ یہ مجھے مار دیں گے۔" اس نے چلا کر کہا۔
 "ابھی کہاں مارا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "ابھی سب مل کر ماریں گے۔"
 شور سن کر اندر سے ایک لمبا ترنگا نوجوان باہر آیا۔ اس کے لمبے بال اور چہرے پر زخموں کے نشانات اس کے بد معاش ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اس نے اسلم کو دیکھ کر کہا "کیا بات ہے یہ آدھی رات کو کیا رولا پایا ہے۔"
 "رو لے کی اولاد۔" ایک دم اسلم نے اسے گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرادیا اور اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسائے لگا۔
 "اوئے یہ کیا کر رہا ہے اسلم۔" مامے نے چلا کر آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے پستول دکھا کر اسے روک لیا۔
 "آرام سے ماما جی۔ ابھی میں تمہیں اس کے کتوت اس کے دوست کی زبانی سنوا تا ہوں۔ شروع ہو جاؤ۔" میں نے پستول کا رخ علی احمد کی طرف کیا تو اس نے لائق طالب علم کی طرح زفر فریق سنائے کے انداز میں بولنا شروع کر دیا۔
 ماما جی کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ پوری بات سن کر اس نے اپنے بد معاش بیٹے کی طرف دیکھا جس کی ساری بد معاشی اسلم نے نکال دی تھی۔ اب وہ زمین پر لوٹتے ہوئے اس کی ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اسلم کی تبدیلی پر حیرت بھی کل تک وہ مسکین سا اور کمزور نوجوان تھا لیکن اس وقت وہ پوری دل جی سے اپنے ماموں زاد کی مرمت لگا رہا تھا۔ اس سے زیادہ لمبا ترنگا شوکا اس کے سامنے بے بس نظر آ رہا تھا۔ احمد کی زبانی اپنے بیٹے کے کتوت سن کر ماما بھی غصے سے بے قابو ہو گیا تھا اس نے ہاتھ میں پکڑی لاشی سے

اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاشی کی مار زیادہ سخت تھی اس کی چھوٹا بکار سن کر اندر سے اس کی ماں نکل آئی۔ اس نے شور مچا روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے دور جھٹک دیا تھا۔
 "مجھے مت روک" اس خبیث نے مجھے اسلم کے سامنے شرمندہ کیا ہے آج میں اس کے ہاتھ پر توڑ دوں گا۔"
 میں دیکھ چکا تھا کہ شوکت کو اس کے کیے کی خاصی سزا مل چکی ہے۔ لہذا میں نے ماما جی کو روک دیا "ابھی نہیں ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ بعد میں بے شک تم اس کی ٹانگیں توڑتے رہتا۔"
 "آپ کا کیا ارادہ ہے؟" اسلم نے میری طرف دیکھا۔
 میں اسے ایک طرف لے گیا "میں ذرا چوہدری رحمت الہی کے سرحد پار مسلمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"
 "وہ کیوں؟"
 "اگر وہ یہ نوادرات خرید لیں تو ہمارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" میں نے کہا "تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔"
 "چھانچال ہے جی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔
 "ہم شوکت کو آگے رکھیں گے۔" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں میں سوچ چکا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں نے دائیں آکر شوکت علی اور علی احمد کو اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔ احمد بلبل کر بولا "نہ جی رحمت الہی خطرناک آدمی ہے اپنے ساتھ دھوکا کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑتا۔"
 "ہم اس سے سودا کریں گے دھوکا نہیں۔" میں نے جواب دیا "بس رقم تمہاری جیب میں نہیں جائے گی۔ اس کا اصل حق دار اسلم ہے۔"
 وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بادل ناخواست انہوں نے چلنے پر رضامندی ظاہر کی۔ شوکت نے خبردار کیا "دیکھیں جی چوہدری اور اس کے مہمان آپ کو نہیں جانتے۔ اگر انہوں نے سو سے انکار کیا تو ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔"
 "تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔
 "ہم نوادرات دائیں لے جائیں گے لیکن تم نقصان میں رہو گے اگر کسی آدمی کے گھنے پر کوئی ماری جائے تو وہ باقی ساری عمر کٹھنچے کی طرح جیتا ہے۔"
 "آپ۔ آپ۔ مجھے گولی۔ مار دو گے؟" اس نے ہلکا کر کہا۔
 "اگر سودا نہ ہوا۔ ورنہ تم دونوں بھر سلامت لے کر اپنے گھر آؤ گے۔"

"دیکھیں جی اس سے تصور ہوا ہے پر اسے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔" مامے نے کہا۔ اس کی بیوی اندر جا چکی تھی ورنہ میری دھمکی سن کر وہ زیادہ دوا دیا کرتی۔
 "سزا اسے ملے گی کام نہ کرنے کی۔ جہاں تک چوہدری کا تعلق ہے تو اس کی معافی کا اختیار اسلم کو ہے۔ اگر یہ چاہے گا تو معاف کر دے گا۔"
 "مگر یہ رحمت الہی سے سودا کر دے تو میں اسے معاف کروں گا۔" اسلم نے ماما کی طرف دیکھا۔
 ان دونوں کو جیب میں لا کر ہم چوہدری رحمت الہی کے ڈیرے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ جھیتوں کے بچوں بچ ایک نیم پختہ سی عمارت تھی۔ جیب کی آواز سن کر ایک مسلح شخص سامنے آیا "کون ہے؟" اس نے کڑک کر کہا۔
 شوکت علی جیب سے نیچے آڑا "چوہدری صاحب کو بولو شوکا آیا ہے مال لے کر۔"
 "چوہدری صاحب سو رہے ہیں۔ تم صبح نہیں آ سکتے تھے۔" پھر سے دار نے دیکھ کر انداز میں کہا۔
 "اوہ یار اس قسم کے دھندے دن کی روشنی میں نہیں ہوتے۔ تیری مرضی نہ بگا چوہدری صاحب کو بعد میں خود ہی جواب دیتے رہتا۔"
 "ایک منٹ!" پھر سے دار تذبذب میں پڑ گیا تھا "میں دیکھتا ہوں۔" شوکت علی باہر کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ مسلسل میرے نشانے پر رہے گا۔ اگر اس نے گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ اس کا سر اڑا دوں گا۔ خوف سے اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ جب میں نے سائنسبرگے پستول سے فائر کر کے اس کے گھر کی منڈیر پر رکھے پانی کے پیالے کو اڑا دیا تھا۔ اس نے مجھے تابعداری کا یقین دلایا تھا۔ علی احمد جیب میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اندر سے پھر سے دار کے ساتھ ایک اوجیز عمر شخص برآمد ہوا۔ اس نے لائسنس اٹھا رکھی تھی۔ صحت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن بھاری بھرکم موچھوں سے اس نے خود کو کسی قدر بارعب بنا رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔
 "کیا بات ہے شوکے" اب تو مجھے سوتے سے اٹھانے لگا ہے۔"
 "چوہدری صاحب۔ میں مال لے آیا ہوں۔ سودا آج رات ہی کرنا ہے۔"
 مال کے نام پر اس کے چہرے پر کسی قدر نرمی آئی تھی "اندر آ جاؤ اور جیب کو احاطے میں لے آؤ۔" پھر اس کی نظر

ہم لوگوں پر پڑی "یہ کون ہیں؟"
 "میرے ساتھی ہیں جی۔ مال اصل میں انہی کا ہے۔"
 چوہدری کے چہرے پر کتنی نمودار ہوئی تھی "تو نے تو کچھ اور ہی کہا تھا۔"
 "ان کے کہنے پر ہی کہا تھا۔ پہلے یہ سامنے نہیں آتا چاہے تھے اب خود چلے آئے۔"
 "ہم انہیں نہیں جانتے۔" چوہدری کے لہجے میں برہمی تھی "تو ہر ایرے غیرے کو اٹھا کر لے آتا ہے۔"
 میں جیب سے اتر کر چوہدری کے سامنے جا کھڑا ہوا "رحمت الہی اگر تمہیں مال نہیں لینا ہے تو مت لو مگر لوبہ سنبھال کر بات کرو۔"
 وہ میرے انداز سے دب گیا تھا "دیکھو جی" اس کام کے کچھ طریقے ہیں۔"
 "میں طریقے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ چھوٹی سی کھپ ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ مال یورپ اور امریکا بھیج چکا ہوں۔"
 "چھا اچھا غرض مت ہو اندر آ جاؤ۔ جیب بھی اندر لے آؤ۔" اس نے دوسری بار کہا تو میں کھٹک گیا تھا۔ آخر وہ جیب کے اندر لے جانے پر اتنا اصرار کیوں کر رہا تھا۔
 "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ مال دیکھ لو اور سودا کر لو۔" اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکنا میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے جیب کے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ دو واڑہ کھول کر میں نے علی احمد سے مال نکالنے کو کہا۔ اس نے پوری سے تانے کے برتن نکالنا شروع کر دیے اور شوکت علی انہیں چوہدری رحمت الہی کو دکھانے لگا۔ اس نے ابھی تک اصل خریداروں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ خود ان کا سودا کر کے انہیں آگے بیٹنا چاہتا تھا۔ رحمت الہی جس ماہرانہ انداز میں تانے سے بے ان جعلی نوادرات کا معائنہ کر رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ اسے اس کام کی شد مد ہے۔ اسلم نے اسے بتایا کہ یہ کل ایک سو بارہ ہیں ہیں۔
 "بین الاقوامی منڈی میں ان کی قیمت کم سے کم پچاس ہزار ڈالر ہوگی۔ ایک لاکھ ڈالر بھی مل سکتے ہیں۔ اگر تم مقامی طور پر بیچو تو کم از کم پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔"
 "یہ سب خبر دو ہیں۔" اس نے سیٹ سے لہجے میں کہا "میں تمہیں اس کے دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔"
 "دو ہیر مال۔" میں نے طنز کیا "ذرا ان کی غفلت دیکھو۔ دس ہزار سے زیادہ تو ان کی بخائی پر خرچ ہوئے ہیں۔ شاید تمہیں لپٹا نہیں چاہئے۔" میں نے علی احمد اور شوکت سے

انہیں واپس رکھنے کو کہا۔

"ایک منٹ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں میں ہزاروں گا۔"

"دو لاکھ روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اس سے زیادہ تو لاہور میں مل جائیں گے۔"

"چلو پچاس ہزار لے لو۔" چوہدری رحمت الہی بولا۔ اسی لمحے ذہیرے میں سے تین افراد نمودار ہوئے ان میں سے آگے والے نے ایک خطرناک راکٹفل انٹارکھی تھی۔

"کوئی جرورت نہیں ہے چوہدری۔" راکٹفل بردار نے کہا "ہم یہ سب ایسے ہی لے جائیں گے۔"

"ایک منٹ مجھے بات کرنے دو۔" رحمت الہی گھبرا گیا تھا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ لوگ اپنی اوقات سے آگے بڑھ رہے ہیں۔" راکٹفل بردار نے جواب دیا "چلو ہاتھ اپنی منڈی پر رکھ لو۔"

"تم اچھا نہیں کر رہے ہو چوہدری۔" میں نے ہاتھ سر پر رکھ لیے تھے میری دیکھا دیکھی اسلم نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے تھے "کاہرہ میں اس طرح کی بے ایمانی ہونے لگے تو پھر کاہرہ نہیں چلا۔"

"ہمیں اس کی جرورت بھی نہیں ہے۔" راکٹفل بردار کے لہجے میں مکاری تھی۔ وہ واضح طور پر بھارتی باشندہ تھا اس کے لہجے سے واضح تھا "تم لوگ باقی ہی نہیں رہو گے جو کسی کو بے ایمانی کے بارے میں معلوم ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے چوہدری۔" شوکت گھبرا گیا تھا۔ "آگے آؤ۔" راکٹفل بردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ان کی تلاشی لو۔"

اس کا ایک ساتھی اسلم کی طرف بڑھا اور دو سرا میری طرف آیا تھا۔ دونوں بد معاش تھے لیکن زیادہ عقل مند نہیں تھے۔ میری طرف آنے والے نے میرے اور راکٹفل بردار کے درمیان میں حائل ہونے کی حماقت کی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی طرف کھینچا اور راکٹفل بردار پر دے مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ دونوں زمین پر جا گرے تھے۔ چوہدری رحمت الہی کا پرے دار اپنے شانے سے ٹنگی راکٹفل اتار رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے پستول نکال کر اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی "بس۔" میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا "اب کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

پہرے دار بازو پکڑ کر واہل کر رہا تھا۔ اسلم نے بھرتی سے اس کی سیون ایم ایم ایم اٹھالی تھی استعمال تو اسے کرنا نہیں آتی تھی لیکن وہ دوسروں کو دھمکا ضرور سکتا تھا۔ راکٹفل بردار کی راکٹفل اس سے صرف دو گز دور ہی تھی لیکن میری دھمکی اور پہرے دار کے دواہلے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ساکت رہے۔ میں نے اس کی راکٹفل بھی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ چوہدری اور اس کے بھارتی مسلمانوں سے زیادہ خراب حالت شوکت اور علی احمد کی ہو رہی تھی۔ وہی ہمیں یہاں لائے تھے ہم انہیں چھوڑ بھی دیتے تو چوہدری نہ چھوڑتا۔

راکٹفل لے کر میں نے پستول جبب میں رکھ لیا تھا۔ یہ بھارتی ساختی تھی تو آؤٹریک تھی جو عام طور سے فوج کو دی جاتی تھی ایک جرائم پیشہ شخص کے پاس اس کی موجودگی حیران کن تھی۔

"اندھ چلو۔" میں نے کہا "اندھ اور کون ہے؟"

"صرف دو نوکر ہیں۔" چوہدری بولا "ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے اسے دھمکایا "اگر کوئی اور نکلا تو سب سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

ذہیرا نکل میں کمروں پر مشتمل تھا۔ درمیان میں ایک ہال نما کمرہ تھا جس میں نصف درجن چارباٹیاں چمچی ہوئی تھیں۔ اس پر دو افراد بیٹھے تھے اپنے آقا کو بے بس دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ باقی دو کمرے ذرا اچھے انداز میں سجے ہوئے تھے اور خالی تھے، وہاں واقعی کوئی اور نہیں تھا۔

میرے اشارے پر شوکت نے رسی تلاش کی اور باری باری ان سب کو باندھ دیا۔ چوہدری اور اس کے راکٹفل بردار بھارتی مسلمان نے خاصی مزاحمت کی اور شور مچانے کے ساتھ دھمکیاں بھی دی تھیں مگر انہیں ہاتھ بندھوانے ہی پڑے تھے۔ میں ذرا آرام سے ان لوگوں سے پوچھ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس راکٹفل نے مجھے چونکا دیا تھا۔ عام اسلم اس قسم کے فوجی ہتھیار حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسلم کو ان کے سر پر چھوڑ کر میں نے کمروں کی تلاشی لی۔ چوہدری کے تینوں بھارتی مسلمان ہال کے مشرقی رخ پر بیٹے ہوئے کمرے میں ٹھہرے تھے۔ وہاں چارباٹیوں کے علاوہ ایک الماری تھی لیکن خالی۔ ایک چارباٹی کے نیچے سے مجھے ایک بڑا سا بریف کیس ملا۔ یہ لاک تھا۔ اسے لے کر میں واپس ہال میں آیا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے راکٹفل بردار سے پوچھا۔ "اس میں کچھ نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

میرے ہاتھ میں بریف کیس دیکھ کر وہ کسی قدر بے چین نظر آنے لگا تھا "میرا مطلب ہے تمہارے کام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"اچھا۔" میں نے استہزاء سے لہجے میں کہا "اسے کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ ذرا نمبر بتانا۔" بریف کیس نمبریکل لاک والا تھا۔

"یہ کسی اور کا ہے اس کا نمبر مجھے نہیں معلوم!"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" میں نے سائنس دانوں کے پستول کی نال بریف کیس کے تالے پر رکھی۔

"بھگوان کے لیے!" وہ چلا اٹھا تھا "ایسا مت کرنا یہ دھماکے سے بچت جائے گا۔"

"چلو اچھا کیا کہ بتا دو۔" میں نے بریف کیس اٹھا کر اس کے پاس رکھ دیا اور دروازے جا کر اس کا نشانہ لیا۔

"اگر تمہیں خبر معلوم ہے تو بتا دو۔ ورنہ کیا فائدہ اس کے ساتھ تمہارے فکروں کے بھی اڑ جائیں گے۔"

"میں نے کہا ناں مجھے خبر نہیں معلوم۔" اس نے نہیانی انداز میں کہا۔ میں نے احتیاط سے گولی چلائی جو بریف کیس کے پاس ہی زمین میں جا گئی۔

"معاف کرنا نشانہ اب اتنا اچھا نہیں رہا ہے۔" میں نے دوبارہ پستول سیدھا کیا تھا کہ وہ چلائے لگا۔

"گولی مت چلاتا ناں ہوں بتاتا ہوں۔"

میں نے شوکت علی کو اشارہ کیا جو ایک کونے میں سہا ہوا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے اور علی احمد کے ہاتھ پیر بندھوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ویسے ہی مزاحمت ترک کر چکے تھے "اس کے بتائے ہوئے نمبر ملا کر ہاک کھولو اور یہ کام تم بریف کیس کو اس کے سینے پر رکھ کر سناپی سے کر لو گے۔"

اچانک راکٹفل بردار کے دوسرے ساتھی نے اسے کسی ایسی زبان میں کچھ کہا جو سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یہ غالباً اصل یا بنگالی تھی۔ جواب میں راکٹفل بردار نے غصے سے کچھ کہا تھا۔ غالباً دوسرا فرد اسے خبر بتانے پر لعن طعن کر رہا تھا۔

شوکت نے بریف کیس اس کے سینے پر رکھا۔ وہ رک رک کر نمبر بتانے لگا جسے شوکت ملاتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اس لیے ایک ایک نمبر کو ملانے میں وہ خاصی دیر لگا رہا تھا۔ بالآخر اس نے دونوں تالے کھول لیے۔ لاک کا نمبر ایک ہی تھا۔ یعنی انہیں سینتالیس بند رہے یہ بھارت کا یوم پیدائش بھی بننا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ لوگ اسلم نہیں لک رہے تھے اسلم اس طرح کے بریف کیس لے کر نہیں

گھومتے شوکت نے بریف کیس کھولا۔ ایک خطرے کے احساس نے مجھے ذرا پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ میں نے آگے جا کر دیکھا۔ بریف کیس میں اوپر ایک سیل شدہ خاکی لفافہ تھا۔ اس کے نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں جھانک رہی تھیں۔ میں نے لفافے کے کراس کی سیل توڑی۔ اندر سے ایک تہ شدہ کاغذ اور ایک نسخی سی ڈی ملی۔ اس میں مائیکرو فلم رکھی جاتی ہے۔ کاغذ پر نقش سا بنا تھا۔ جو پاکستان کے بالائی علاقے کا تھا۔ اس پر جا بجا سرخ رنگ کے نشان لگے تھے۔ ممکنہ طور پر یہ فوجی اہمیت کا نقش تھا جس کا تعلق وطن کے دفاع سے ہو سکتا تھا۔ مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بھارت کے جاسوس تھے اور چوہدری پاکستانی غدار تھا جو ان کی مسلمان نوازی کر رہا تھا۔ ان کے دل کا چور ان کی صورتوں سے عیاں تھا۔ میں نے نقش ان کے سامنے لرایا "یہ کیا ہے؟"

"مہم مجھے نہیں معلوم۔" چوہدری رحمت الہی نے ہکلا کر کہا اور پھر جیغ اٹھا گولی اس کے گھٹنے پر لگی تھی۔ وہ تڑپنے لگا۔ باقی سب گے چروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ میں نے پستول کا رخ راکٹفل بردار کی طرف کیا۔

"اس نقش میں کیا ہے؟"

اس نے نوٹوں پر زبان پھیری "یہ یہ عام سا نقش ہے اس میں کوئی خاص۔"

اس بار میں نے اس کے گھٹنے پر گولی چلائی تھی۔ ان بھارتی جاسوسوں اور پاکستانی غدار کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کرناک انداز میں چلائے لگا۔ شوکت اور علی احمد کی حالت خراب تھی اور وہ ہر تھر کانپ رہے تھے۔ جب میں نے پستول دوسرے بھارتی کی طرف کیا تو وہ ٹھکپٹے لگا۔

"بھگوان کے لیے مجھے مت مارو۔" میں بتاتا ہوں۔ "اس کی آواز لرز رہی تھی "یہ اسلام آباد کے آس پاس پاکستان کی دفاعی تنصیبات کے نقشے ہیں۔"

"اور اس فلم دول میں کیا ہے؟"

"اس میں بھی ان تنصیبات کے اندرونی حصوں کے نقشے ہیں۔"

"اور یہ تمہیں کہاں سے ملے؟"

"چوہدری سے۔" اس نے رحمت الہی کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہلکانے لگا تھا۔

"بگم بگم اس کرتا ہے۔ یہ بھولتا ہے کتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔"

”جھوٹ مت بولو۔ اگر یہ بھارت کے جاسوس ہیں تو تم ان کے ساتھی ہو اور ان کے ساتھ ہی کیفر کردار تک پہنچو گے۔“

یہ سن کر ان کے چہرے تاریک ہو گئے تھے۔ میں شوکت علی کی طرف دیکھا ”یہ علاقہ سرحد کے پاس ہے۔ یہاں پر پاک فوج کے مورچے اور چوکیاں ہوں گی؟“

”نہاؤں سے دو میل دور فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔“ علی احمد نے جواب دیا پھر وہ گڑگڑانے لگا ”ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں پولیس کے حوالے نہ کرنا۔“

”یہ بعد کی بات ہے اپنی صفائی تم خود پیش کرتے رہنا۔“ میں نے رکھائی سے جواب دیا ”چلو میرے ساتھ۔“

میں اسلم کو باہر لایا۔ میں نے اسے آؤٹریک رائل چلانے کا طریقہ سمجھایا ”یہ اب فائر کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر تم کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو بے دریغ فائر کرو۔ جب تک میں آتا ہوں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں۔“ اس نے تشویش سے کہا۔ ”فوج کے ہیڈ کوارٹر تک ان لوگوں کو قانون کے حوالے کرنا ضروری ہے۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا۔ میں نے علی احمد کو لایا اور اس کی رہنمائی میں روانہ ہو گیا۔ واقعی فوجی ہیڈ کوارٹر وہاں سے بمشکل دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا لیکن درمیان میں سر کی وجہ سے طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا۔ ہیڈ کوارٹر شاید کھینی کا تھا۔ نصف درجن بیرسٹریں جن کے گرد غاردار نادوں کی ناؤھ تھی۔ گیٹ پر دو سپاہی مستعدی سے پرادے رہے تھے۔ میں نے جیب روٹی تو ایک گارڈ قریب آیا۔

”کیا بات ہے جناب؟“

”مجھے تمہارے کسی اعلیٰ افسر سے ملنا ہے۔ ایمر جنسی ہے۔“

”یہاں میجر شاہد ہوتے ہیں۔“ اس نے آگاہ کیا ”میں انہیں کھلوادیتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”ناصر عظیم۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن جلدی کریں۔“

ویر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ معاملہ بھارتی جاسوسوں کا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور تیزی سے اندر بیر کوئی کی طرف چلا گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تھا ”آپ اندر آئیں لیکن جیب نہیں چھوڑ دیں۔“

میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے مجھے ایک

بیرک تک پہنچا دیا۔ وہاں ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے کہا۔

”آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو مجھے دے دیں۔“

میں نے سوچا اور پستول نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ میجر شاہد ایک نوجوان آدمی تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی اور آنکھوں میں چٹک۔ وہ یقیناً ایک اچھا افسر تھا۔ رات کے اس پر بھی وردی میں تھا ”یہیں مسٹر ناصر عظیم۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”آئی ایم میجر شاہد حفیظ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اسے مختصر الفاظ میں چوہدری رحمت الہی اور بھارتی جاسوسوں کے بارے میں بتایا۔ میجر شاہد صبح معنوں میں پیش در سپاہی تھا اس نے مجھ سے سوال وجواب میں وقت ضائع کیے بغیر اپنے ادوی کو بلا کر اسے ہدایات دیں۔ اگر میں غلط بیانی کرتا تو اسے اطمینان تھا کہ وہ بعد میں مجھے پکڑ سکتا تھا اور سوال وجواب بعد میں بھی ہو سکتے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہم واپس چوہدری رحمت الہی کے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے میری جیب آگے تھی۔ عقب میں دو فوجی جیپوں میں میجر شاہد کے ساتھ ایک دست تھا۔ ڈیرے پر صورت حال اسلم کے قابو میں تھی۔ سوائے ایک بات تک اس نے برست مار کر ایک بھارتی کی ٹانگیں چٹائی کر دی تھیں۔

”اس نے مجھنے کی کوشش کی تھی۔“ اسلم نے وضاحت کی۔

میجر شاہد نے فوری طور پر معاملے کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اس نے اسلم سے بھی رائفل لے لی۔ اس کے سپاہی زخمیوں کو ایک جیب میں لے گئے۔ فیلڈ اسپتال نزدیک ہی پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی افراد کو بھی روانہ کر دیا گیا۔ انہوں نے ڈیرے کی تلاش کی کہ ہر شے اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اس اثنا میں مقامی پولیس بھی آگئی تھی۔ میجر شاہد نے تھانے دار کو ہدایات دیں کہ ڈیرے کو پھیل کر دیا جائے اور بغیر اجازت کے اسے کوئی نہ کھولے۔

”تھینک یو مسٹر ناصر عظیم۔“ اس نے کہا ”آپ کی خدمت اور حب الوطنی کو میری طرف سے سیلیوٹ!“

اس نے بیچ بیلیوٹ کیا تو میں شرمندہ ہو گیا ”نہیں۔ میجر صاحب۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب تم مجھے اجازت دو۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے اور تھکن بھی ہو رہی ہے۔“

”اس صورت میں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ اس

نے شائستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا ”میں کھانا کھلائے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

وہ بڑی خوب صورتی سے مجھے گھیر کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے گیا تھا۔ اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ وہ مجھے سوال وجواب کے بغیر جانے نہیں دے گا۔ میں مناسب سی کمانی سوچ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے تانبے کے نوادرات ابھی تک جیب میں تھے اور ابھی تک میجر شاہد ان سے بے خبر تھا لیکن میں ممکن تھا ہیڈ کوارٹر میں جیب کی تلاش کی جاتی اور یہ نوادرات بھی سامنے آجائے۔ میرے لیے ان کے بارے میں سوال و جواب مشکل ہو جاتے۔

صبح کے چار بجے کا وقت تھا جب ہم نے کھانا کھایا۔ میجر شاہد کا ادنیٰ بلاشبہ اچھا باور ہی تھا۔ کھانے کے بعد وہ چائے لے آیا چائے پیتے ہوئے میجر شاہد نے سرسری سے انداز میں کہا ”یہ بد معاش مجھے تمہارے ہاتھ لگے۔“

میں نے اپنا تعارف ناصر عظیم کی حیثیت سے کرایا تھا۔ غلط بیانی کر کے میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں لاہور کا ایک کاروباری ہوں کچھ عرصے پہلے تک میرا کنسٹرکشن کارپوریشن تھا جسے اب میں دوبارہ شروع کر رہا ہوں۔ درمیان میں ”میں کچھ معاشرتی اور سماجی خدمت میں مصروف رہا تھا۔ میں نے ایک ٹرسٹ کے لیے کام بھی کیا اور میں اسی کے تحت ایک یتیم خانہ قائم کر رہا تھا۔ میجر یہ سب سن کر متاثر ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ اسلم میرا ڈرائیور ہے اور وہ اپنے ماموں کے گھر آیا تھا۔ اس نے ماموں کے پاس کچھ امانتیں رکھوا رکھی تھیں۔ اس کا باپ جیل کا کارڈر تھا اور اس کا کام لاہور کا تھا لیکن یہاں آتے ہوئے ہمیں قبرستان میں ایک شخص کھدائی کرنا نظر آیا۔ ہم نے اسے کھن چور سمجھ کر پکڑا یا تو معلوم ہوا کہ وہ قبر میں وہی تانبے کے برتن دفن کر رہا تھا جو اسلم نے اپنے ماموں کے پاس امانت رکھوائے تھے جوڑے نے انکشاف کیا کہ یہ برتن اسلم کے ماموں زاد بھائی شوکت نے چھپائے تھے اور وہ انہیں چوہدری رحمت الہی کے ڈیرے پر چھپے کچھ بھارتیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ باقی کمانی بلا کم و کاست وہی تھی۔

”تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔“ میجر شاہد نے تعریفی لہجے میں کہا ”تمہیں تو کوئی اعزاز ملنا چاہیے۔“

”ہرگز نہیں۔ میں نے یہ سب شہرت کے لیے نہیں کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مجھے اس معاملے میں قطعی شامل نہ کیا جائے باقی تم جیسے چاہو یہ معاملہ نکلنا۔“

”تھمر کیوں؟“ میجر شاہد نے سنجیدگی سے کہا ”لوگ تو اپنی

پہلنی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔“

”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں چوہدری رحمت الہی اور بھارتی ایجنٹوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ یہ تو اتفاقی معاملہ تھا۔ ورنہ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میری درخواست ہوگی کہ مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھا جائے۔“

اس نے بغور مجھے دیکھا ”ناصر عظیم کیا یہ بات عجیب سی نہیں ہے کہ تم اپنے ڈرائیور کے لیے اتنی دیر چلے آئے۔“

میں نے گہری سانس لی ”نہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسلم میرا اچھا ملازم ہے اور مجھے اس کا خیال رہتا ہے۔ اس کے ساتھ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ذرا آؤٹنگ چاہتا تھا۔ کچھ عرصے سے مسلسل مصروف رہ کر میرے اعصاب ٹھک گئے تھے۔“

میجر شاہد نے اپنی میز کی دراز سے میرا برٹا نکال کر سامنے رکھا ”یہ خاصا قیمتی برٹل ہے کیا تمہارے پاس اس کا لائسنس ہے۔“

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا ”یہ میں نے کب کہا کہ یہ میرا برٹل ہے۔ اسے میں نے جی ٹورا نقل کی طرح انہی سے چھینا تھا۔“

اس نے ایک بار پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا ”خوب یعنی تم نے تین سال بھارتی جاسوسوں کو نیتے ہونے کے باوجود بے بس کر کے رکھ دیا۔“

”ہیں میرا داؤ چل گیا تھا۔ میں سیلف ڈیفنس سے واقف ہوں۔ اس سے پہلے وہ بھٹکتے میں ان کے سرخ کو قابو کر چکا تھا۔ اس کے بعد سب آسان ہوتا چلا گیا۔“

غالبا یہ بات مبہم کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا ”ناصر عظیم ایسا تو عام طور سے فکروں میں ہوتا ہے۔“

”دیکھو میجر۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”اگر تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے تو کھل کر کہو۔ میں جواب دینے سے نہیں گھبرانا باقی حقائق میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم چاہو تو میرے بارے میں تفصیل کر سکتے ہو۔“

میجر شاہد کے چہرے پر چمک آگئی تھی ”کس سے؟“

”ایک تو مشہور فلم انڈیا ٹیلیک ہے اس سے میرے جذباتی مراسم ہیں۔ آج ہاں غلط مت سمجھاؤ میرے لیے بڑی بہن اور ماں کی طرح ہے۔ دوسرا مشہور کمال ٹرسٹ اسپتال کا مالک ڈاکٹر کمال ہے۔ بیڑا بچپن کا دوست ہے۔ تم چاہو تو ان سے بات کر کے اطمینان کر سکتے ہو۔“

”معاف کرنا یا رہ۔“ اس نے معذرت کی ”بمبوری ہے

ڈیوٹی میں آدمی کو سب کرنا پڑتا ہے۔
 وہ اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ غالباً فون کرنے مجھے شدت سے نیند آ رہی تھی اور میری خواہش تھی کہ مجھے ایک بستر مل جائے، اسلم پہلے ہی میجر شاہد کے اردلی کے پاس سونے کے لیے جا چکا تھا۔ جب میجر شاہد واپس آیا تو میں اونگھ رہا تھا۔ اس بار اس کے تاثرات عقلی مختلف تھے۔ اس نے آتے ہی میرے شانے پر ہاتھ مارا۔
 ”معاذ گرنایار میں بھول گیا تھا کہ تمہیں نیند آ رہی ہے ورنہ پہلے ہی بندوبست کر دیتا۔“
 اس نے سونے کے لیے مجھے اپنا کمرادے دیا اور میں لیٹنے ہی سو گیا تھا۔ جب میں اٹھا تو سپر بھی داخل چکی تھی۔ طویل نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ ساتھ ہی سب کھایا پیا بھی، منعم ہو چکا تھا۔ میجر شاہد کا کمرادہ ساتھ تھا۔ اس کے بستر کے سرانے میجر ایک تصویر لگی تھی۔ تصویر میں میجر شاہد کے ساتھ ایک خوب صورت سی لڑکی سرخ جوڑے میں شرمیلی سی مسکان کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اس کی بیوی لگتی تھی۔ میں تصویر دیکھ رہا تھا کہ میجر شاہد اندر آیا۔
 ”اٹھ گئے تپ۔“ اس نے کہا۔
 ”ہاں، یہ غالباً تمہاری بیوی ہے۔“
 ”غالباً نہیں یقیناً۔“ اس نے تصدیق کی ”پہلے تم اٹھ کر غسل کرو۔ کھانا تیار ہو رہا ہے۔“
 ہیرک کا غسل خانہ عام سا تھا۔ شاور نہیں تھا بلکہ بالٹی اور گھٹے سے نہانا پڑا تھا لیکن کنوئیں سے نکلا پانی بے حد فرحت بخش تھا۔ لچ جو بریک فاسٹ کے وقت کھا گیا تھا۔ اس میں ساوہ چاولوں کے ساتھ بھی ہوئی مرقی تھی کچھ عجیب سا مینو تھا لیکن کھانا مزے دار تھا۔ اسلم ایک طرف میدان میں جمع سپاہیوں سے گپ شپ کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس نے وہی جواب دیے ہوں گے جو میں نے دیئے۔ میں نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا جواب دینا ہے وہ خوش نظر آ رہا تھا۔ کھانے کے بعد میجر شاہد خود کافی بنا کر لایا تھا۔ بقول اس کے اس پورے ہیڈ کوارٹر میں صرف اسے ہی کافی بنانے اور پینے کا فن آتا تھا۔ کم از کم اسے بنانے کا فن ضرور آتا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور فضا میں موجود خشکی سے رچے ہوئے ماحول میں کافی بہت مزہ دے رہی تھی۔
 ”اوکے میجر اگر تمہاری فیشیش مکمل ہو چکی ہے تو اب مجھے اجازت دو۔“ میں نے کہا ”پانی دی دے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کا کیا ہوا؟“
 ”رحمت اُمی اور تین بھارتیوں کو صبح ہی فوج کی انٹلی

جنیں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ شوکت علی اور علی احمد کو میں نے مقامی پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ ممکن ہے شوکت علی چھوٹ جائے مگر اسٹوروں سے تعلقات کی وجہ سے علی احمد ضرور نیل جائے گا۔“
 ”گنڈ۔“ میں نے سکون کا سانس لیا۔
 ”میں نے پتیل کے وہ برتن دیکھے ہیں۔“ میجر شاہد نے کچھ دیر بعد کہا ”مجھے وہ نوادرات لگتے ہیں۔“
 ”وہ نوادرات میں ہی شامل ہیں لیکن بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ تو ان کی ساخت اور شکل سے ظاہر ہے کہ یہ زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ ان کی وجہ سے میرے ذرا نیو کو کچھ رقم مل جائے گی۔“
 میں سمجھ رہا تھا کہ اس معاملے میں میجر مشکوک تھا لیکن ہم نے جو کیا تھا اس کی وجہ سے وہ ہمیں چھوٹ دینے پر مجبور تھا۔ وہ ہمیں رخصت کرنے باہر نک آیا تھا۔ جب وہ مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے کرتے کی جب میں اس نے کچھ ڈالا ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں خود مجھے بھی اتنی سی دیر میں اس فوجیوں سپاہیوں سے کچھ انیسیت ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اگر وہ زندہ رہا اور فوج میں رہا تو بہت آگے تک جائے گا ”وش پو گنڈ لک!“
 اس نے آہستہ سے کہا ”تمہیں کسی بھی معاملے میں کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک میاں مجھے فون کر سکتے ہو۔“ اس نے مجھے اپنا فون نمبر کھسکوا دیا۔
 میں جب میں بیٹھا تو اسلم نے گاڑی اشارت کی۔ جب جب ہیڈ کوارٹر کے خاردار تاروں میں گھرے گیٹ سے نکل رہی تھی تو میجر شاہد اپنی ہیرک کے آگے کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ جب جب سڑک پر آئی تو میں نے جب میں ہاتھ ڈالا۔ اندر سے وہی سائنسٹر لگا پتول نکلا۔ جس کی ملکیت سے انکار کرتے ہوئے میں نے اسے بھی ان لوگوں کے سر چھوٹ دیا مگر جب میجر شاہد نے ان سے بیانات لیے ہوں گے تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا ہوگا۔ میجر میرا جھوٹ عیاں ہو گیا تھا لیکن اس نے مجھ سے دوبارہ اس پر کوئی بات نہیں کی کبھی بلکہ جاتے جاتے یہ پتول میری جیب میں ڈال کر مجھ پر احسان کیا تھا۔ اسلم نے بڑی ہوشیاری سے اپنا پتول پہلے ہی چھپا کر رکھا تھا اور میجر شاہد کو اس کی جھجک بھی نہیں لگی تھی لیکن نہیں وہ جتنا ذہین تھا اس سے کچھ بعد نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں جان بھی گیا ہو۔ البتہ اس نے مجھ کا نہیں تھا۔ فیوز پور روڈ پر آکر میں نے اسلم سے کہا ”تم شاید افسردہ

ہو کہ ان نوادرات کا سودا نہیں ہو سکا۔“
 ”نہیں جناب بلکہ میں خوش ہوں کہ اس ملک کے دشمن اور غدار پکڑے گئے۔“ اس نے جواب دیا ”البتہ مجھے مائے کافوس ہے۔ وہ شوکت کی وجہ سے پولیس کے چکر میں نہ آجائے۔“
 ”تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی ”میجر شاہد اچھا آدمی ہے وہ خیال رکھے گا کہ اس معاملے میں کسی بے گناہ کو نہ گھسیٹا جائے۔“
 رات نو بجے ہم لاہور میں داخل ہوئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں آفتوں کی دنیا سے نکل کر امن کی جگہ میں آ گیا ہوں۔ حالانکہ لاہور میرے لیے خطرناک تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے پی سی او سے ٹیکم کے گھر کال کی ”موباٹل فون کی بیٹری ڈسچارج ہو گئی تھی۔ فون خالی بانو نے ریسیو کیا۔“ میں ناصر عظیم بول رہا ہوں۔“
 ”ناصر ٹیکم جی تو شوٹنگ پر مگی ہے۔ رئیس بھی اس کے ساتھ ہے۔“
 ”اچھا سننے میں آ رہا ہوں گیٹ کے گارڈز کو ہدایت کروں کہ ایک سیاہ جپ آئے گی۔“ میں نے نہرتایا ”اسے اندر آنے دیں۔“
 ”میں کہہ دوں گی۔“ خالد بانو خوش ہو گئیں ”تم جلدی سے آ جاؤ۔“
 ٹیکم ہاؤس کے پاس آکر میں جپ کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ تاکہ اگر کوئی ٹیکم ہاؤس کی عمرانی کر رہا ہو تو اسے میری صورت نظر نہ آئے۔ ٹیکم ہاؤس کے گارڈز نے جپ کا نمبر دیکھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ اندر آکر میں نے اسلم کو وہیں رکھنے کا کہا اور اندر چلا آیا۔ خالد بانو ٹیکس میں انتظار کر رہی تھیں۔
 ”ناصر میاں تم تو چھلاوہ ہو گئے ہو آتے ہو اپنی جھجک دکھاتے ہو اور غائب ہو جاتے ہو۔“
 ”میں خالد اپنے مقدر میں دھکے لکھے ہیں۔ اس وقت تو میرے ساتھ ایک بندہ بھی ہے اسے کسی سرونٹ کو آرڈر میں ٹھہراؤں۔ اب یہ یہیں رہے گا۔ اس کی کوئی ذمہ داری بھی لگاؤں۔“
 خالد بانو چلی گئیں۔ میں نے موباٹل کو چارج پر لگایا اور پیر سجان کا نمبر لادیا۔ ایک منٹ بعد وہ لائن پر تھا۔
 ”ناصر عظیم بات کر رہا ہوں پیر صاحب!“
 ”تم کہاں غائب ہو؟ دلاور شاہ کے قتل کے بعد پولیس تمہاری بوسو چھتی پھر رہی ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”آپ جانتے ہیں اور میں بھی اپنی مقامی پیش کر چکا ہوں۔ دلاور شاہ کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ سفید ذراچ میں سوار مسلح لوگوں کی فائزنگ سے مارا گیا تھا اور وہ سب میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کیا ان کی شناخت کے بارے میں معلوم ہوا؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔“ سجان شاہ کے لیے میں مایوسی تھی ”سارے حرام زادے جل کر مر گئے جس کی وجہ سے لاشیں ناقابل شناخت ہو گئی تھیں اور ان کے پاس سے کوئی ایسی چیز بھی نہیں نکلی جس سے ان کی شناخت میں مدد ملتی۔“
 ”اور کار؟“
 ”وہ چوری کی تھی اور ملتان سے چوری ہوئی تھی۔“
 ”اوہ۔“ میں نے مایوسی سے کہا ”شاہ صاحب میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ لوگ مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شبہ کیوں کر رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میری شکل اس سے ملتی ہے۔“
 ”ملتی نہیں تم بالکل اس جیسے ہو۔ میں نے شاہ عالم کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“
 ”کیا آپ کو میری آواز اور انداز میں بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود غرض اور مفاد پرست آدمی تھا جس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میرے بے شمار دوست ہیں۔“
 ”شاہ عالم اچھا بڑا ہو رہا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاسکتا مگر کچھ بات یہ ہے کہ تم نے مجھے ابھرنے میں ڈال دیا ہے۔“
 ”یعنی آپ کو میری سچائی کا یقین آنے لگا ہے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا ”شاہ صاحب وہ وقت دور نہیں ہے جب میں ثابت کر دوں گا کہ میرا شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
 ”جب کرو گے تب کرو گے ابھی تو تمہیں شاہ عالم ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے پولیس اور رب نواز کو شدت سے تمہاری تلاش ہے۔“
 ”وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ میں نے کہا ”آپ نے کچھ نوادرات کا ذکر کیا تھا۔ کیا آپ کے پاس ان کی کوئی لسٹ ہے؟“
 ”لسٹ بھی ہے بلکہ مکمل کیٹلاگ ہے۔“
 ”کیا اس کی ایک کاپی مجھے مل سکتی ہے؟“
 ”وہ چونکا ”تم کیا کرو گے؟“
 ”شاہ صاحب میں نے کہا تھا کہ میرے بھی کچھ ذرائع

ہیں۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں لیکن ایک مضبوط کاروباری ضرور ہوں۔ ممکن ہے ان نوادرات کی تلاش میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔

”تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“ اس کے لیے میں شک تھا۔ ”شاہ صاحب“ مجھے آپ کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں نے گویا صاف گوئی سے کہا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے کام اگر مجھے آپ سے مدد ملے گی جس سے میں شاہ عالم کا ٹھیکہ خود پر سے صاف کر سکوں گا۔

”اگر تم واقعی نوادرات کے سلسلے میں میری مدد کر سکو گے تو میں بھی تمہارے لیے کوشش کروں گا“ اس نے گول مول انداز میں کہا۔ وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا لیکن میں خود بھی اسے دھوکا دے رہا تھا۔

”میں تو آپ اسی کیٹلاگ کی ایک کاپی مجھے بھجوا دیں۔“

”کہاں پر؟“ اپنا پتا تو بتاؤ بابا! اس نے مکاری سے کہا۔

”کیٹلاگ آپ اپنی لاہور والی کوٹھی پر بھجوا دیں وہاں سے میرا آدمی اسے حاصل کر لے گا“ میں نے کہا اور اسے

کچھ کہنے کی مصلحت دیکھتے بغیر موبائل بند کر دیا۔ موبائل چارج پر لگا کر میں باہر آیا۔ بالو خانہ کا اسٹینٹ ایک نوجوان انتظار

تھا۔ وہ مستعد اور کام کے سلسلے میں سنجیدہ رہنے والا شخص تھا جو بھی کام سونپا جاتا اسے پوری جاں فشانی سے کرتا تھا۔ میں

نے اسے بلا کر چپ سے نوادرات انارکے کے لیے کہا۔

”احتیاط سے لاتا“ یہ سب قیمتی سامان ہے“ میں نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں جناب! کسی چیز کو نقصان نہیں ہوگا۔“

”نہیں لیونگ روم میں لے آنا لیکن اس سے پہلے ان کی صفائی وغیرہ کر لینا۔“

لیونگ روم میں بالو خانہ نے چائے مع لوازمات کے پینچاری بھی مگر ابھی میرا کھانے کا موڑ نہیں ہو رہا تھا۔

میں خشم کے لیے رب نواز سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے رئیس سے رپورٹ لینا ضروری تھا۔ میں نے اس کا

موبائل نمبر ملائے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل بڑی جارحانہ تھا۔ شاید خراب ہو گیا تھا یا آؤٹ آف ریج تھا۔ جب تک

چائے سے فائدہ ہوتا تھا یا زانے کے بچے ان نوادرات کو صاف کر کے لے آیا تھا۔ بلکہ اس نے انہیں زیادہ ہی صاف

کر دیا تھا۔ اب یہ سننے پر غل کی طرح جھک رہے تھے۔ میں نے احتیاطی مدد سے انہیں ترتیب سے رکھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا

کہ رب نواز نے لندن جو نوادرات بھیجے تھے ان میں سے کچھ نمونے بالکل اسی جیسے تھے اس کا مطلب ہے کہ اسلم

کے باپ نے ان نوادرات کے دو دو بیس بنائے تھے۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو میں ان نوادرات کو رب نواز کے گنگے کا پھندا بنا سکتا تھا لیکن پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ تصدیق کے لیے ہی میں نے پیر سیمان شاہ سے اس کی تیار کی ہوئی کیٹلاگ مانگی تھی۔

رہیں اور نیم رات دس بجے آئے تھے۔ رئیس آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ ”قسم اللہ کی دو دن تیری صورت نہ دیکھوں تو زندگی پریشان لگنے لگتی ہے۔“

”ویران“ میں نے ہنسی کی۔

”ابے ہاں وی۔“ رئیس بولا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ نیم نے قالین پر بچے نوادرات کا معائنہ کیا۔

میں نے مختصر آواز سے ان کے بارے میں بتایا۔ نیم بولی ”یہ بتاؤ کہ تم نے آرمی کے ساتھ کیا پکڑ چلایا ہے؟ رات کو کسی

بیچر شاید قانون آیا تھا وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ آرام سے سناؤں گا۔“ رئیس یہ

بتاؤ تو پتہ پڑے گا کہ کیا رہا ہے اور کیا رب نواز سے دوبارہ رابطہ ہوا؟“

”ہاں“ ایک بار میں نے فون کیا تھا اور اسے کہا تھا کہ خشم کو آرام سے رکھو۔ پروفیسر کو میں نے جیرا لیلے کے پاس

رکھوایا ہے۔

”نہیں وہ نکل نہ جائے“ میں نے پریشان ہو کر کہا ”وہ

ہاتھ سے نکل گیا تو خشم کی رہائی خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”تو جیرا لیلے کو نہیں جانتا۔ اس کے پھنسے سے پروفیسر کی

روح بھی نہیں نکل سکتی۔ احتیاطاً میں نے اسے بتا دیا ہے کہ یہ

بندہ بھاگ گیا تو بڑی مصیبت آجائے گی۔ وہ بھی مارا جائے گا۔ وہ اب اس کی پوری طرح نگرانی کرے گا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس قصے کو ختم کیا جائے۔“

”مجھے اسے اخبارات نے برا اثر چلایا ہے۔ خشم کے انوا

اور عائشہ کلینک پر ہونے والے حملے کی وجہ سے پولیس حصار اور سرگرم ہو گئی ہے“ اسی لیے رب نواز کی کوٹھی پر چھاپا بھی

مارا گیا۔

”لیکن خشم وہاں نہیں ملی“ میں نے سختی سے کہا ”خود پولیس نے خیروار کر دیا ہوگا کہ ملک صاحب ہو شیوار! بندی

غائب کر دو“ چھاپا پڑنے والا ہے۔

”ایسا ہی ہوا۔“ مجھے میں کچھ نہیں ملا۔ اخبارات نے

اعلان کیا ہے کہ اگر خشم کو جلد از جلد بازیاب نہیں کرایا گیا تو

وہ حکومت کے خلاف مم چلا سکتے ہیں۔“

”اس سے حکومت کا کیا بکڑے گا۔ رب نواز کو صرف ہم مجبور کر سکتے ہیں۔“

میں نے دوبارہ موبائل لیا۔ وہ چارجر پر لگا تھا، ابھی

بیشی اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ چارجر سے ہٹا کر استعمال

کر سکتا۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملا یا۔ کسی ملازم نے فون

اٹھایا تھا ”جی کس سے بات کرنی ہے؟“

”ملک رب نواز سے“ اسے کو شاہ عالم بات کر رہا

”ہے۔“

”فوری رب نواز لائن پر تھا“ شاہ عالم، ہاشم رضا کہاں

”ہے؟“

”خشم کہاں ہے؟“ میں نے ان کا سوال کیا۔

”میں اس کے لیے پریشان ہوں“ رب نواز واقعی

پریشان لگ رہا تھا۔

”میں بھی خشم کے لیے پریشان ہوں۔ وہ عورت ہے

اسے زیادہ خطرہ ہے۔“

”یقین کرو وہ بالکل محفوظ ہے۔“

”ہاشم رضا بھی بالکل محفوظ رہے گا۔ جب تک تم خشم

کو انگلی نہیں لگاؤ گے۔ ہم ہاشم رضا کو ہاتھ نہیں لگائیں

گے۔“

”سنو“ ہم ان کا تبادلہ کر سکتے ہیں“ بالآخر رب نواز

مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

”اسے اتنا آسان مت سمجھو“ میں نے کہا ”خشم کے

ساتھ تم جو کچھ کر چکے ہو“ اب اس سے زیادہ اور کیا کرو گے

لیکن ہاشم تمہارے لیے اہم ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ خاصی دیر بعد اس نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گرد گھیرا تنگ کرنا بند

کر دو۔ میرے خلاف مقدمات میں دخل اندازی نہ کرو۔“

”تم نوادرات والا معاملہ بھول رہے ہو۔ اس میں مجھے

ساڑھے چار لاکھ پاؤنڈز کا نقصان ہوا ہے اسے کون پورا

کرے گا؟“

”تم جانتے ہو کہ یہ سب جی کا حرامی پن تھا اور وہ اپنے

کے کی سزا بھگت رہا ہے۔ اگر تم اس سے ٹکرا سکتے ہو تو

ٹکراؤ۔ میرے ذریعہ لاکھ پاؤنڈز بھی نہیں ملے“ نقصان میرا

بھی ہوا ہے۔“

”لیکن میں تو دونوں طرف سے مارا گیا ہوں“ اس نے

کہا۔

”دیکھو“ پیر سیمان کے ساتھ تم نے جو کیا وہ اس کا اور

تہمیدارا معاملہ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر

ہوگا کہ تم پیر سیمان کو کہہ دو کہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ

کرے“ میں دیکھے بھی پاکستان سے جا رہا ہوں۔ ایک چھوٹے

سے پیر اس ملک میں میں نے خاصی جائیداد اور حیثیت بنائی

ہے“ اب میں ساری عمر وہیں رہوں گا۔“

”خشم کو چھوڑ جاؤ گے؟“ اس نے معنی خیز انداز میں

پوچھا۔

”مجبوری ہے“ میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

بہر حال میں اس کی ساری عمر کی خدمت کا صلہ دے جاؤں گا“

میں نے شاہ عالم کے نقطہ نظر سے کہا۔ وہ عیاش آدمی خشم کو

صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ”میں اسے ایک

اچھا اخبار اشتیابش کر کے دے جاؤں گا اور تمہارے لیے

بھی بہتر ہوگا کہ اس سے مخالفت کر کے یہ جھگڑا ختم کرو“ پہلے

ہی تمہاری سیاسی ساکھ کو نقصان ہو رہا ہے۔ رب نواز اور

بدل رہا ہے۔ عوام سیاسی طور پر ہاشمور ہو رہے ہیں۔ آنے

والا دور گروپس کا ہوگا۔ انفرادی سیاست کرنے والوں کی کوئی

اہمیت نہیں رہے گی۔ اس وقت کے آنے سے پہلے بے شک

ظاہری طور پر کسی لیکن اپنا طرز عمل بدل لو۔“

”خیریت۔ آج بڑے خیر خواہ بنے ہوئے ہو۔“

میں نے سر دھڑکھڑی ”رب نواز“ میرے ساتھ گذشتہ

عرصے میں جو ہوا ہے“ اس کے بعد میرے خیالات میں بھی

بڑی تبدیلی آئی ہے۔ میں نے سیاست ترک کر دی“ کا دوبارہ

ختم کر دیا۔ اب میں سکون سے اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا

ہوں۔ دولت کی میرے پاس کی نہیں ہے۔ میں یوں غائب

ہو جاؤں گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اپنا نام بھی بدل لوں گا۔“

”اور چہو بھی بدل لو گے؟“ اس نے طنز کیا۔

”اچھا یاد دلایا“ میں ہنسا ”ہاں میں مستقل طور پر جانے

سے پہلے اپنی پلاسٹک سرجری سے ایک نئے منہ کو پیش کے

لیے اپنالوں گا۔ یہ چہو بھی پیش کے لیے غائب ہو جائے گا۔“

اسے چند لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی پھر اس نے کہا۔

”تم پروفیسر کو کب چھوڑ رہے ہو؟“

”اس کا انحصار تمہارے طرز عمل پر ہے“ میں نے

جواب دیا ”تم جتنی جلدی خشم کو صحیح سلامت رہا کرو گے“

اتنی ہی جلدی ہاشم کو بھی رہائی مل جائے گی۔“

”میں اسے ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں“ اس نے فوراً

کہا۔

”میں پہلے تصدیق کروں گا کہ خشم پر ذہنی اور جسمانی

طور پر کوئی تشدد تو نہیں ہوا ہے پھر میں پروفیسر کو رہا کروں

گا۔“

”دیکھو“ پیر سیمان کے ساتھ تم نے جو کیا وہ اس کا اور

تہمیدارا معاملہ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر

ہوگا کہ تم پیر سیمان کو کہہ دو کہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ

کرے“ میں دیکھے بھی پاکستان سے جا رہا ہوں۔ ایک چھوٹے

سے پیر اس ملک میں میں نے خاصی جائیداد اور حیثیت بنائی

ہے“ اب میں ساری عمر وہیں رہوں گا۔“

”خشم کو چھوڑ جاؤ گے؟“ اس نے معنی خیز انداز میں

پوچھا۔

”مجبوری ہے“ میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

بہر حال میں اس کی ساری عمر کی خدمت کا صلہ دے جاؤں گا“

میں نے شاہ عالم کے نقطہ نظر سے کہا۔ وہ عیاش آدمی خشم کو

صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ”میں اسے ایک

اچھا اخبار اشتیابش کر کے دے جاؤں گا اور تمہارے لیے

بھی بہتر ہوگا کہ اس سے مخالفت کر کے یہ جھگڑا ختم کرو“ پہلے

ہی تمہاری سیاسی ساکھ کو نقصان ہو رہا ہے۔ رب نواز اور

بدل رہا ہے۔ عوام سیاسی طور پر ہاشمور ہو رہے ہیں۔ آنے

والا دور گروپس کا ہوگا۔ انفرادی سیاست کرنے والوں کی کوئی

اہمیت نہیں رہے گی۔ اس وقت کے آنے سے پہلے بے شک

ظاہری طور پر کسی لیکن اپنا طرز عمل بدل لو۔“

”خیریت۔ آج بڑے خیر خواہ بنے ہوئے ہو۔“

میں نے سر دھڑکھڑی ”رب نواز“ میرے ساتھ گذشتہ

عرصے میں جو ہوا ہے“ اس کے بعد میرے خیالات میں بھی

بڑی تبدیلی آئی ہے۔ میں نے سیاست ترک کر دی“ کا دوبارہ

ختم کر دیا۔ اب میں سکون سے اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا

ہوں۔ دولت کی میرے پاس کی نہیں ہے۔ میں یوں غائب

ہو جاؤں گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اپنا نام بھی بدل لوں گا۔“

”اور چہو بھی بدل لو گے؟“ اس نے طنز کیا۔

”اچھا یاد دلایا“ میں ہنسا ”ہاں میں مستقل طور پر جانے

سے پہلے اپنی پلاسٹک سرجری سے ایک نئے منہ کو پیش کے

لیے اپنالوں گا۔ یہ چہو بھی پیش کے لیے غائب ہو جائے گا۔“

اسے چند لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی پھر اس نے کہا۔

”تم پروفیسر کو کب چھوڑ رہے ہو؟“

”اس کا انحصار تمہارے طرز عمل پر ہے“ میں نے

جواب دیا ”تم جتنی جلدی خشم کو صحیح سلامت رہا کرو گے“

اتنی ہی جلدی ہاشم کو بھی رہائی مل جائے گی۔“

”میں اسے ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں“ اس نے فوراً

کہا۔

”میں پہلے تصدیق کروں گا کہ خشم پر ذہنی اور جسمانی

طور پر کوئی تشدد تو نہیں ہوا ہے پھر میں پروفیسر کو رہا کروں

گا۔“

”دیکھو“ پیر سیمان کے ساتھ تم نے جو کیا وہ اس کا اور

تہمیدارا معاملہ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر

ہوگا کہ تم پیر سیمان کو کہہ دو کہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ

کرے“ میں دیکھے بھی پاکستان سے جا رہا ہوں۔ ایک چھوٹے

سے پیر اس ملک میں میں نے خاصی جائیداد اور حیثیت بنائی

ہے“ اب میں ساری عمر وہیں رہوں گا۔“

”خشم کو چھوڑ جاؤ گے؟“ اس نے معنی خیز انداز میں

پوچھا۔

”مجبوری ہے“ میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

بہر حال میں اس کی ساری عمر کی خدمت کا صلہ دے جاؤں گا“

میں نے شاہ عالم کے نقطہ نظر سے کہا۔ وہ عیاش آدمی خشم کو

صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ”میں اسے ایک

اچھا اخبار اشتیابش کر کے دے جاؤں گا اور تمہارے لیے

بھی بہتر ہوگا کہ اس سے مخالفت کر کے یہ جھگڑا ختم کرو“ پہلے

ہی تمہاری سیاسی ساکھ کو نقصان ہو رہا ہے۔ رب نواز اور

بدل رہا ہے۔ عوام سیاسی طور پر ہاشمور ہو رہے ہیں۔ آنے

والا دور گروپس کا ہوگا۔ انفرادی سیاست کرنے والوں کی کوئی

اہمیت نہیں رہے گی۔ اس وقت کے آنے سے پہلے بے شک

ظاہری طور پر کسی لیکن اپنا طرز عمل بدل لو۔“

”خیریت۔ آج بڑے خیر خواہ بنے ہوئے ہو۔“

میں نے سر دھڑکھڑی ”رب نواز“ میرے ساتھ گذشتہ

عرصے میں جو ہوا ہے“ اس کے بعد میرے خیالات میں بھی

بڑی تبدیلی آئی ہے۔ میں نے سیاست ترک کر دی“ کا دوبارہ

ختم کر دیا۔ اب میں سکون سے اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا

ہوں۔ دولت کی میرے پاس کی نہیں ہے۔ میں یوں غائب

ہو جاؤں گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اپنا نام بھی بدل لوں گا۔“

”اور چہو بھی بدل لو گے؟“ اس نے طنز کیا۔

”اچھا یاد دلایا“ میں ہنسا ”ہاں میں مستقل طور پر جانے

سے پہلے اپنی پلاسٹک سرجری سے ایک نئے منہ کو پیش کے

لیے اپنالوں گا۔ یہ چہو بھی پیش کے لیے غائب ہو جائے گا۔“

اسے چند لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی پھر اس نے کہا۔

”تم پروفیسر کو کب چھوڑ رہے ہو؟“

”اس کا انحصار تمہارے طرز عمل پر ہے“ میں نے

جواب دیا ”تم جتنی جلدی خشم کو صحیح سلامت رہا کرو گے“

اتنی ہی جلدی ہاشم کو بھی رہائی مل جائے گی۔“

”میں اسے ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں“ اس نے فوراً

کہا۔

”میں پہلے تصدیق کروں گا کہ خشم پر ذہنی اور جسمانی

طور پر کوئی تشدد تو نہیں ہوا ہے پھر میں پروفیسر کو رہا کروں

گا۔“

”دیکھو“ پیر سیمان کے ساتھ تم نے جو کیا وہ اس کا اور

تہمیدارا معاملہ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر

ہوگا کہ تم پیر سیمان کو کہہ دو کہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ

کرے“ میں دیکھے بھی پاکستان سے جا رہا ہوں۔ ایک چھوٹے

سے پیر اس ملک میں میں نے خاصی جائیداد اور حیثیت بنائی

ہے“ اب میں ساری عمر وہیں رہوں گا۔“

گل۔ ”تم جہاں کو میں اسے پہنچاؤں گا۔“
میں نے سوچ کر کہا ”تم اسے اس کے اخبار کے دفتر
پہنچاؤ۔ میں ایک گھنٹے بعد تصدیق کر لوں گا۔“
”اور تم پروفسر کو کتنی دیر بعد رہا کرو گے؟“
”تم تین چار گھنٹے کا وقت رکھو۔ اتنا وقت تو لگے گا“ میں
نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے حیرت تھی کہ رب نواز زیادہ
یہ تک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہاشم رضا اس کے لیے کچھ زیادہ ہی
اہمیت کا حامل ہو گیا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کیوں کا جواب الحام
کی طرح میرے ذہن میں آیا تھا۔ رب نواز ہاشم رضا سے کوئی
خاص کام لے رہا تھا۔ وہی کام جو وہ کرتا آیا تھا۔ یعنی ایسے
تجربات جن میں انسان اور جانور کے مشترکہ ملاپ سے ایک
نئی مخلوق پیدا کی جاتی تھی جو انسانی عقل اور جانوروں جیسی
طاقت رکھتی تھی۔ لالی اور جو اس کی بہترین مثال تھے۔
ایسے جانداروں کی تحقیق بلاشبہ ہاشم رضا کا کارنامہ تھا لیکن
انسانی قابل نفرت بھی جتنا کہ انہم کی ایجاد شاید ان دنوں
پروفیسر ایسا ہی کوئی کارنامہ انجام دے رہا تھا اور رب نواز کو
اس کی اشد ضرورت تھی۔ تب ہی وہ میرے آگے جھکنے اور
جھک کر رہا کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ رب نواز جیسے آدمی سے کچھ
بچیدگی نہیں تھا۔ وہ پروفسر کے کام کو کمالی کا ذریعہ بنا سکتا کالی اور
جو جیسے حیوان بنا کر دنیا کو بچ سکتا تھا بلکہ وہ ایسا ہی کر رہا ہو گا
اور پروفسر کے کام پر سرمایہ کاری اس نے خود نہیں کی ہوگی۔
ایسے کاموں کے اخراجات کے لیے کتنے ہی جاں نثاریے گاہے
بگاہے مل جاتے تھے۔ اسے اتنی رقم خرچ کرنے کی ضرورت
نہیں تھی۔

میں الاقوامی سطح پر انسان اور حیوان کے ملاپ سے پیدا
ہونے والی مخلوق کے لیے نہ جانے کہاں کہاں تجربات نہیں
ہورے ہوں گے مگر سب سے پہلے یہ کام ایک ترقی پذیر
ملک کے سائنس دان نے کیا۔ جیسا کہ آرمی کے خواب
دیکھنے والی سہ طاقتیں پروفسر کو بڑی سے بڑی قیمت دینے کو
تیار ہو جائیں گی کیونکہ جن ملکوں میں لالی اور جو جیسے
جانداروں پر مشتمل فوج ہوگی اس کی قوت بھی ظاہر ہے کہ
بے پناہ ہو جائے گی۔ بے شک جدید ترین ہتھیار وسیع پیمانے
پر تیار ہونے والے کے لیے موثر ہیں لیکن زمین اور انسانوں پر
قبضے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے انسان بہترین ہیں جن میں
بڑے گی اور اس کام کے لیے ایسے انسان بہترین ہیں جن میں
جسمانی خوبیاں تو ہوں لیکن ذہنی اعتبار سے وہ پسماندہ ہوں

اور ان کی ذہنی سطح اتنی ہی ہو کہ وہ اپنے آقاؤں کے احکام
سمجھ کر ان کی بہ خفیہ قیادت کر سکیں۔
میں سوچ رہا تھا کہ رئیس کیا بات ہے پیارے میرا
فون چپک گیا ہے؟“
میں چونکا اور جھپٹ کر فون کو واپس رکھ دیا۔ وہ ابھی
تک چار بج رہا تھا۔ ”صاف کرنا یا رہا میں سوچ رہا تھا۔“
”نیلیم کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔ تیرے پکڑ میں اس
نے مجھے بھی نہیں کھانے دیا۔“
میں جیتے ہوئے اس کے ساتھ ہوا۔ کھانا ہنسی مذاق
کرتے ہوئے کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد نیلیم اپنی اگلیے روز
کی شوٹنگ کا شیڈول چیک کرنے لگی۔ میں موقع پا کر رئیس کو
باہر بھیج دیا۔ ”یار میں ہاشم رضا سے ملنا چاہتا ہوں۔“
”اس وقت۔“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو سوا
بارہ بج رہی تھی ”میرا مطلب ہے نیلیم۔“
”اب اتنا ہی جو بد کاغذام نہ بن“ میں نے جھٹکا کر کہا ”وہ
ابھی تیری جو بدی نہیں ہے۔ ہم ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں
گے۔“
باہر بلا خواستہ رئیس رضامند ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ
ہم جیب میں جائیں گے۔ تاریکی کے باعث مجھے اپنا چہرہ
چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رئیس کا یا جیرا بلینڈ بھائی
تحریک کے پاس ہی رہتا تھا۔ وہاں کی تنگ گلیوں کی وجہ سے
جیب ہمیں باہر ہی چھوٹی پڑی تھی۔ رئیس نے ایک تنگ
تاریک سے مکان کا بوسیدہ دروازہ بجایا۔
”مکوں سورا پڑے اس ویلے؟“ جیسی طرف سے کسی
تنگ مزاج بڈھے نے دریافت کیا۔
”چاچا چپ کر کے سو جا“ رئیس نے بلند آواز سے کہا
”جوانی میں تو بھی اسی وقت آیا کرتا تھا۔“
اس پر چاچا نے بلند آواز سے رئیس کے بارے میں کئی
ناقابل بیان انکشافات کیے اور کھٹاک سے گھڑی بند کر دی۔
اسی کے دروازہ چرچا کر کھلا اور اندر سے ایک بھوت نظر
آنے والے بڑے میاں نے جھانکا۔
”چاچا۔ جیرا کہاں ہے؟“
”سورہ ہے“ اس نے کھر کھرائی آواز میں کہا۔
”اسے بگاڑے!“ رئیس اندر داخل ہو گیا۔ میں اس
کے پیچھے تھا۔ باہر سے چھوٹا سا نظر آنے والا یہ مکان اندر
سے خاصی کشادہ حویلی ثابت ہوا تھا۔ اس کے وسط میں صحن
تھا جس کے چاروں طرف والائوں کے بعد کمرے تھے۔
پرانے لاہور میں اس قسم کی حویلیاں آج بھی بے شمار ملتی

ہیں۔ صحن کے وسط میں پانی کا ایک حوض بھی تھا۔ گرمیوں
میں لوگ اس قسم کے ٹالاؤں کے گرد چارپائی بچھا کر سو یا
کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد جیرا بلینڈ آنکھ ملتا اندر سے نمودار
ہوا۔ وہ بارعب موچوں والا خوش شکل شخص تھا۔ جلی
اشپکڑیں کر اس نے بے شمار لوگوں کو بے وقوف بنایا تھا۔ وہ
انتا دیدہ دلیر تھا کہ پولیس کے ساتھ بھی ہاتھ کر جاتا تھا۔ مگر
ذہین آدمی تھا اس وجہ سے آج تک گرفت میں نہیں آیا تھا۔
”ہاشم صاحب!“ اس نے گرم جوش سے ہاتھ ملایا۔
”بڑے دنوں بعد درشن ہوئے۔“

”یہ آج کل دور درشن ہو گیا ہے“ رئیس نے کہا ”یہ
تاکہ پرندہ خیریت سے ہے؟“
”جی“ خیریت کا کیا سوال۔ اس کی مجال نہیں کہ جال کو
بلا بھی سکے۔ دانہ دکان دے دیا تھا ”اب سورہا ہے۔“
”اسے بگاڑے۔ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں“
میں نے کہا۔

جیرا بلینڈ نے سرٹ سلگایا۔ ایک رئیس کو دیا۔ میں نے
انکار کر دیا۔ وہ ہمیں لے کر دالان کے پار کونے والے کمرے
کی طرف گیا۔ جس کے دروازے پر موٹا سا ٹالا جمول رہا تھا۔
اس نے ہانک لگائی۔ ”چاچا بھوت!“
وہ کسی بھوت کی طرح نمودار ہوا تھا۔ اس کی اندر
دھنسی آنکھیں اور سفید لیوڑے چہرے سے بھوت کا اثر ہی
ملتا تھا۔ جیرا بلینڈ نے اس کا بالکل درست نام رکھا تھا۔ ”جی
سرکار!“ اس نے کھر کھرائی آواز نکالی۔
”ٹالا کھولو“ جیرا بلینڈ نے حکم دیا۔

اس نے جیب سے چابیوں کا ایک ذہنی چھانٹا نکالا اور
اس میں سے جن کر ایک چابی تالے میں داخل کی۔ ٹالا اور
دروازہ کھول کر وہ ایک طرف ہو گیا۔ ”اوپر کا خیال رکھنا“
اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اسے حکم دیا۔ کرا
نظار پر خالی تھا۔ وہاں سوائے بڑی بڑی قدیم طرز کی الماریوں
کے کچھ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے ایک الماری کے پیچھے ہاتھ
ڈال کر نہ جانے کیا کیا اور پھر الماری کو دھکا دیا تو وہ آرام سے
ایک طرف سرکتی چلی گئی۔ اس کے نیچے سے بیڑھیاں نمودار
ہوئی تھیں۔ میں اور رئیس اس کے پیچھے نیچے اترے تھے۔
بیڑھیاں تنگ تھیں۔ ان کے اختتام پر جالی دار سستے والی
گرل لگی تھی جیسی کہ عام طور سے لغزوں میں ہوتی ہے۔
جیسے نے اس بار اپنی جیب سے چابی نکال کر گرل میں لگا
ٹالا کھولا۔ میں جالی سے دلچسپ رہا تھا۔ پروفیسر ہاشم رضا ایک
چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ گرل سستے کی آواز نے اسے چونکا دیا

تھا۔ بیڑھیوں پر تاریکی تھی لیکن کمرے میں سواٹ کا بلبل
جل رہا تھا۔
”میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا“ اس نے دبی
آواز میں کہا اور پلٹ کر اوپر چلا گیا تھا۔
تالاب اپنی شناخت چھپانے کے لیے جبراً اب تک
اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ہمارے لیے وہ رب نواز کا
مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ رئیس سے پرانی دوستی کے ناتے وہ
انتا کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ کی توقع کرنا صحیح نہیں تھا کیونکہ
آخر اسے اس دریا میں رہنا تھا جس کا کھر کچھ رب نواز تھا۔

پروفیسر ہاشم رضا بہتر بیڑھیاں چھائی ہوئی آنکھوں سے
ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار
تھے۔ اس نے خانے میں سوائے لوہے کی اس چارپائی کے اور
کچھ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا
کہ وہاں کوئی ایسی شے نہ رہے جس سے قیدی خود کو یا کسی
اور کو نقصان پہنچا سکے۔ ہاشم رضا نے مجھے پہچان لیا ”شاہ عالم
تم کیا چاہتے ہو؟ اس طرح قید میں رکھ کر تمہیں کیا ملے گا؟
میں کام کرنے والا آدمی ہوں“ یوں بیکار رہ کر مر جاؤں گا۔“

”اتنی آسانی سے نہیں مرو گے تم“ میں نے آگے بڑھ کر
اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ سے پٹل
اس کے سر سے لگا دیا تھا ”البتہ تم چاہو تو میں ایک گولی میں
تمہاری مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ ویسے تم بھی جیسے شخص کا
مرحمانہ انسانیت کے لیے اچھا ہی ہو گا۔“
میرے لہجے میں سفاکی محسوس کر کے وہ کانپنے لگا تھا۔
”خدا کے لیے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”تم نے انسانوں کی نسل بگاڑی ہے“ یہ کیا کم عظیم جرم
ہے؟“

”میں نے صرف تجربات کیے ہیں“ اس نے ہٹ دھرمی
سے کہا۔ خوف کے باوجود وہ یہ باتنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ
اس کے تجربات اور ان کے نتائج انسانیت سوز ہیں۔
”ہاشم رضا“ اگر تمہاری کوئی بہن یا بیٹی ہو تو کیا تم ان
پر بھی یہ تجربات کر گزرتے؟ جبکہ تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو
کہ اس تجربے کا نشانہ بننے والی عورت کے صدمے میں صرف
موت آتی ہے۔“

اس کی مجرمانہ خاموشی ہی اس کا اعتراف تھی۔ میں نے
اچانک اس کے سر پر پتولی کی ٹال ماری تو وہ جھج اٹھا تھا۔ اس
کے سر کی کھال پھٹ گئی تھی اور اس سے خون پھینک لگا تھا۔ وہ
بستر پر گر پڑا اور کراہتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم مجھ پر تشدد کیوں
کر رہے ہو؟“

”پروفیسر! اس دیران مکان میں مجھے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے تم سے پوچھ کر کچھ نہیں کی لیکن تم نے خود ہی بہت ساری باتیں چھپا کر اپنے انجام پر سر مثبت کر لی“ میں نے خوف ناک انداز میں کہا۔

”میں نے کوئی بات نہیں چھپائی“ اس نے سسے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”بکومت“ میں نے اس بار اس کی پہلی پر جوتے کی ایزی ماری۔ وہ جج کر بستر ترے لگا تھا۔ وہ ایک غلطی محض تھا اور ساتھ ہی غمزدہ بھی لیکن اس نے اپنے کرتوتوں سے خود کو ہر طرح کی عزت اور ہمدردی سے محروم کر لیا تھا۔ ”تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان دونوں تم کچھ اور تجربات بھی کر رہے ہو جو اپنے آخری مراحل میں ہیں۔“

وہ مارے حیرت کے تڑپا بھول گیا تھا۔ ”حت۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”تمہارے آگے ولی نعمت نے خود بتایا“ میں نے دوسری ٹھوکرا اس کے بازو پر ماری۔

”رب نواز نے؟“ اس نے کراہ کر بازو تھام لیا ”میں نہیں مان سکتا۔“

”لیکن ہم متواستے ہیں“ میں نے اس بار اس کے منہ پر ایک لگ ماری۔ میں نے خیال رکھا تھا کہ اسے نقصان نہ ہو مگر اس کے لیے یہ بھی بہت تھا۔ وہ ایک بار بستر ترے تڑپے لگا۔

”وہ تمہارے لیے تڑپ رہا ہے“ میں نے زہرے لیے میں کہا ”کیوں کہ اسے تم سے ابھی بہت سارے کام لینے ہیں لیکن جس دن اس نے تمہارے تجربات کو کیش کر لیا“ اسی دن تمہارا وجود اس کے لیے بے معرف ہو جائے گا اور تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ رب نواز بے معرف چیزوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔“

اس نے سراٹھا کر بڑی مشکل سے کہا ”تم مجھے اس کے خلاف ورغلا نہیں سکتے۔“

”میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک تم دونوں برابر کے مجرم ہو“ میں نے ایک بار پھر پاؤں اور کیا تو وہ قسم کر ٹھٹھری ساہن گیا تھا۔ اس نے رو دینے والے لمحے میں کہا۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے تجربات کے بارے میں ایک ایک لفظ بتاؤ۔ ان دونوں تم کتنے نئے تجربات کر رہے ہو اور کن بد نصیبوں پر کر رہے ہو؟ ملک سے باہر تمہارا ملن لوگوں سے رابطہ ہے؟“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ اس نے کہا۔

”یہ تو صرف ایک نمونہ ہے“ میں نے اس کی حالت کی طرف اشارہ کیا ”ورنہ میرے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ

خادوے کے مطابق چتر بھی بول جائے۔“

”تم شاید جینم کو فراموش کر رہے ہو“ وہ رب نواز کے پاس ہے۔“

میں نے سواکل پر آزاد صاحب کے اخبار کے دفتر کا نمبر ملا دیا۔ یہ بڑی مصوفیت کا وقت تھا۔ اخبار کی آخری کاپی جاری تھی۔ پس مچھر میں جج دیکار سے لگ رہا تھا جسے قیامت کا فیر نکل رہا تھا اور شاید اس کے بعد اخبار نہیں چھپے گا۔

”مشکل فون آپریشن میری بات سمجھ سکا۔ اس نے آزاد صاحب سے لائن مل گئی۔“

”شاہ عالم عرض کر رہا ہوں“ میں نے چلا کر کہا۔ میں ہاشم رضا کے سامنے ناصر عظیم کا نام استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آزاد صاحب بولے۔

”جھا جھا۔ عالم بلا سے بات کر رہے ہو گویا؟“

”جینم غلطی ہے کیا؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ہاں۔ یہاں آئی بھی اور جلی گئی۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے۔“

”سے آپ ڈالے بھاڑ میں“ یہ باتیں کہ وہ ٹھیک تھی؟

”میاں“ یہ ظاہر تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی ”بائی ڈاکٹر کا چیک کرنا اور یہ ہوتا ہے اچھا میاں“ اجازت دو“ اخبار کا

معرکہ دوڑوں ہے۔“

آزاد صاحب نے فون بند کر دیا۔ میں نے اطمینان کی طویل سانس لی تھی۔ جینم ٹھیک تھی ورنہ آزاد صاحب مجھ سے نہ چھپاتے۔ میں نے فاختانہ نقیوں سے ہاشم رضا کی طرف دیکھا۔ ”جینم اب رب نواز کے پاس نہیں ہے۔“

اس کا نہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا ”اس نے اسے کیسے رہا کر دیا؟“

”شاید اسے تمہاری اتنی روانہ ہو چکا کہ تم خیال کرتے ہو“ میں نے کہا ”کیا خیال ہے تم میرے حوالوں کے جواب دے رہے ہو یا میں دوسرے طریقے آزماؤں؟“

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر شکست خوردہ لمحے میں بولا ”پوچھو گیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”ان دونوں تم مزید کتنے تجربات کر رہے ہو؟“

وہ جواب دینے سے پہلے ہچکچایا ”نہیں۔“

”گویا تم تین عورتوں کو مزید موت کے گھاٹ اتار رہے

جار ہے ہو؟“ میں نے ٹھکر کیا۔

اس نے ٹپٹی میں سر ہلایا ”میں نے ان مشکلات پر قابو پایا ہے جن کی وجہ سے زچگی کے دوران میں یہ عورتیں ہلاک ہو جاتی تھیں“ مجھے یقین ہے وہ زندہ رہیں گی۔

”تم اب تک کتنے حیران نما انسان تخلیق کر چکے ہو؟“

”ایک درجن کے قریب“ اس نے جواب دیا۔

”ایک درجن؟“ میں چونکا تھا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں“ ان کی تعداد چھ سے زیادہ نہیں ہے؟“

”ان میں سے دو بچپن میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ دو رب نواز کے پاس ہیں اور باقی دو میں نے ایک غیر ملکی کے حوالے کر دیے تھے۔“

”یعنی بچ دیے؟“ میں نے سختی سے کہا۔

”تم جاہلو تو ایسا ہی سمجھ لو۔“ اس نے شانے ہلائے۔

اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پایا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

”سنو ہاشم رضا“ تم ان تجربات کے لیے رقم کہاں سے حاصل کرتے ہو“ یقیناً رب نواز تمہارا واحد فنسر نہیں ہے؟“

”میں کچھ غیر ملکی این جی اوز سے بھی مدد لیتا ہوں۔ آیا کرنا میری مجبوری ہے۔ تجربات کے لیے سامان اور مشینری بے حد مشکل ملتی ہے۔“

”تم جو کرتے ہو یہ جینٹل سائنس میں آتا ہے“ پھر تم آثار قدیمہ میں کہاں سے مجھے ہوئے ہو“ ایک بالکل ہی مختلف شعبہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس میں بھی ڈگری لی ہے“ اس نے سیاہ لہجے میں کہا ”ہیون ملک۔ حیثیت ماہر آثار قدیمہ میری ایک ساکھ ہے۔ تم اسے ایک گور بھی کہہ سکتے ہو“ میری دوسری حیثیت کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔“

”تم رب نواز کے ان ٹھکانوں کے بارے میں بتاؤ“ جو تم نے دیکھے ہوئے ہیں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ تم وہاں کھس بھی نہیں سکتے“ اس نے اطمینان سے کہا اور کچھ پتے لکھ دیے جو

رہائش کے نوٹ کر لیے تھے۔

”اب ایک آخری سوال“ تم جن تین عورتوں پر تجربات کر رہے ہو وہ کہاں ہیں؟“

”وہ تینوں ان ہی میں سے ایک ٹھکانے پر تھیں“ اس کا اشارہ اس پر پتے کی طرف تھا جس پر پتے لکھے تھے ”لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے غائب ہوتے ہی رب نواز نے انہیں وہاں

سے ہٹا لیا ہو گا۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اسے خبردار کر دینے والے انداز میں کہا ”پروفیسر ہاشم رضا ایک بار پھر سوچ لو۔ ابھی تم ہمارے پاس ہو“ تمہاری کسی ہوئی ایک بھی بات غلط ثابت ہوئی یا مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کچھ چھپایا ہے تو تم مجھ سے رحم کی توقع مت رکھنا۔ میں خود احمس شوٹ کر دوں گا۔ یوں سمجھو کہ میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں اور تمہیں مار ڈالنے کا بہانہ تلاش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے بہانہ نہیں دو گے۔“

”مم۔ میں نے ایک بھی بات غلط نہیں بتائی ہے“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”اسی میں تمہاری عافیت ہے“ میں نے کہا اور رئیس کو اوپر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

”میرا خیال ہے اب اسے چھوڑنا چاہیے“ میں نے اوپر اُٹھ کر کہا۔

”اتنی آسانی سے“ رئیس نے حیرت سے کہا ”میرا خیال ہے کہ اس غیبت کو مار کر کہیں گاڑ دینا اچھا ہو گا یہ انسانوں کے لیے فطرت ہے۔“

”نہیں یار۔ اگر اسے نہ چھوڑا تو رب نواز پھر کینکسی پر اتر آئے گا۔“

”وہ ویسے ہی کینہ بن دکھا سکتا ہے“ رئیس بولا ”اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف بھڑک جائے۔“

”مگر پھر ہاشم رضا ہمارے لیے بے کار ہے۔“

”مگر یار“ اسے ایسے بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔“ رئیس نے اصرار کیا ”خود اسوج کوئی ترکیب کہ ہم ہاشم رضا کو چھوڑ بھی دیں اور وہ رب نواز کو بھی نہ ملے۔“

”یہ کیوں سا مشکل کام ہے“ میں نے غور کیا۔

”کوئی مشکل نہیں ہے“ جبرائیل یعنی مذہر احمد نے دخل در معقولات کیا ”اگر رب نواز کا کوئی اور دشمن ہے تو اسے درمیان میں لے آؤ۔ اس طرح تمہاری بچت ہو جائے گی۔“

میں نے حیرت سے مذہر احمد کی طرف دیکھا۔ اس نے واقعی بے بات کی تھی۔ میرے ذہن میں خود اچیر بھان شاہ کا نام آیا تھا۔ وہ رب نواز کا جانی دشمن ہو رہا تھا۔ اگر ہاشم کو رضا اس کے حوالے کر دیا جاتا تو رب نواز ایک بڑے پتھر میں پھنس سکتا تھا۔ ”واللہ!“ میں نے مذہر احمد کی پشت پر ہاتھ مارا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ اسے مجھ سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہیں تھی ”کمال کر دیا تم نے۔“

”بس جی! اپنے رئیس بھائی کی صحبت میں سب سیکھنا

ہے "اس نے انکساری دکھائی۔
"اپنی بد معاشیاں میرے کھاتے میں نہ ڈال" رئیس خفا ہو گیا۔

"یار! آئیڈیا برا نہیں ہے" میں نے کہا "میرا خیال ہے پہلے مجھے ہر بھان شاہ سے بات کرنی چاہیے۔"
ہم مال روڈ تک آئے وہاں ایک ساری رات کھلا رہنے والا پی سی او مل گیا تھا۔ میں نے بھان شاہ کا نمبر لخواہ۔ اس کے ملازم نے بتایا کہ شاہ صاحب سو رہے ہیں، میں نے کہا "انہیں فوراً جگاؤ، اہم معاملہ ہے۔"
"سرکار معافی دیو۔ ہم شاہ صاحب کو نہیں اٹھا سکتے۔ وہ ناراض ہو گئے تو کھال اتار لیں گے۔"

"دیکھو، تم نے اگر انہیں نہیں جگایا تو ان کا برا نقصان ہو گا پھر وہ ضرور تمہاری کھال اتار لیں گے" میں نے اسے خبردار کیا۔ "میں یقین دلاتا ہوں، میرا نام سن کر وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے ان سے کہو کہ شاہ عالم ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

ملازم غائب ہو گیا اور میں بے تابی سے انتظار کی گھڑیاں گنتے لگا تھا۔ خدا خدا کر کے بھان شاہ لائن پر آیا۔
"شاہ عالم!" اس نے پوچھا۔
"ہاں شاہ صاحب! میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

"بیلے یہ بتاؤ، تم کہاں ہو؟"
"شاہ صاحب، آپ کو علم ہو گا کہ رب نواز نے کینکری دکھاتے ہوئے ایک بار پھر جہنم کو اغوا کر لیا تھا۔ جواب میں میں نے اس کے ایک اہم آدمی کو اٹھا لیا۔ وہ جہنم کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا مگر اس نے جو کینڈہ پن دکھایا ہے، میں اسے اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" اس نے پوچھا۔
"میں رب نواز کے اس اہم آدمی کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ رب نواز کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جان سکیں گے۔ آپ کے سامنے اس کے کئی اور کمزور چہرے سامنے آئیں گے۔"
"اگر اسے ہمارے حوالے کر دو گے تو رب نواز کو کیا جواب دو گے؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں، اگر آپ رضامند ہیں تو میں اس شخص کو آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یقین کریں یہ شخص آپ کے لیے ایک خفہ ہو گا۔ اس کے بدلے رب نواز آپ کے سارے نقصان پورے کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا جو اس نے کیے تھے۔"

ہو جائے گا جو اس نے کیے تھے۔
"تم اس آدمی کو جیسے پہنچاؤ گے؟" اس بار بھان شاہ کے لیے میں دلچسپی لگی۔

"میں اس بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ آپ صرف اپنے آدمیوں کو تیار رکھیں۔ ممکن ہے رب نواز کے آدمیوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑے۔"

"اس صورت میں تو سوجنا پڑے گا یا! "
"سوچنے کا وقت نہیں ہے شاہ صاحب!" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "میں اس شخص کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اگر آپ اسے اپنے قبضے میں نہیں لینا چاہتے تو مجبوراً مجھے اسے رہا کرنا پڑے گا۔"

اس نے کچھ دیر سوچا "اچھا بابا۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں بتا ہوں، تمہارا نمبر کیا ہے؟"
"میں پی سی او سے بات کر رہا ہوں" میں نے جواب دیا "ایک گھنٹے بعد میں خود فون کروں گا۔"

میں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ پی سی او والے کو ادا کیلنگی کر کے ہم باہر آ گئے۔ نزدیک ہی ایک رات بھر کھلے رہنے والے کینے میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے رئیس کو اپنی اور بھان شاہ کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہاشم رضا کو رب نواز کے حوالے کرنے کے بجائے اسے بھان شاہ کے سر منٹھ دیا درست ہو گا۔ اس سے ان دو پرانے حریفوں کے درمیان دشمنی کے کئی نئے باب کھل جائیں گے۔

"رب نواز سیاسی اور دولت کے لحاظ سے کتابی طاقت ور سہی لیکن وہ بھان شاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، وہ ایک سلسلہ گدھی یقین پیر ہے، جس کے پاس دو ٹوں کی طاقت سے بڑھ کر اس کے مریدوں کی طاقت ہے۔ یہ فوج اس کے اشارے پر اپنی جان قربان کر سکتی ہے اور کسی کی جان لے سکتی ہے۔ رب نواز کے پاس صرف کرائے کے آدمی ہیں جو وفاداری سے زیادہ اس کے خوف سے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر بھان شاہ کھل کر اس کے سامنے آ گیا تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔"

"درست ہے۔ لیکن مکاری اور کینکری میں رب نواز کہیں آگے ہے" رئیس نے اتفاق کیا۔ "وہ کھل کر بھان شاہ کا مقابلہ نہیں کرے گا بلکہ چھپ کر اسے نقصان پہنچائے گا۔"

"بھان شاہ اس کا مقابلہ بھی کرے گا۔"
"اسے دلاور شاہ کی موت کا نقصان ہوا ہے اور تو نے

خود بتایا تھا کہ پولیس شاہ عالم کی تلاش میں اس کی حویلی تک پہنچی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رب نواز سیاسی طور پر اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔" آج رئیس بحث پر آمادہ تھا اور دلیل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی باتوں میں جان تھی۔

"یار! ہمارا مقصد تو انہیں آپس میں کتوں کی طرح لڑانا ہے۔ اب جس کا بھی نقصان ہو گا فائدہ ہمارا ہی ہے۔"
"یہ درست ہے لیکن تو خوش قسمی میں مت آ، ممکن ہے بھان شاہ اور رب نواز آپس میں ملاقات کر کے صلح کر لیں کیونکہ لڑائی ان دونوں کو تباہ کر دے گی۔ جس طرح تو بھان شاہ کو رب نواز کے خلاف بگاڑ رہا ہے، اسی طرح وہ بھی بھان شاہ کو تیرے خلاف کر سکتا ہے۔"

"شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو مگر پروفیسر کو بھان شاہ کے حوالے کرنے کا ایک مقصد اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پروفیسر اپنے تجربات کو کامیاب نہ بنا سکے۔ اگر اسے روک لیا تو یہ بھی ہماری کامیابی ہوگی۔"

"بھیس اس سے کیا لینا۔" رئیس جھنجھلایا "یار! تیری اپنی ہی مشکلات کم نہیں ہیں تو اور چکروں میں ہاتھ ڈال رہا ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو رئیس تو سوچ نہیں رہا کہ پروفیسر انسانوں پر کس قسم کے تجربات کر رہا ہے۔ وہ جو حقوق تیار کر رہا ہے انسانوں کے لیے وہ کتنی خطرناک ہے۔ رب نواز جیسے فرعونوں کے ہاتھ اس قسم کے ہتھیار نہیں آتے چاہئیں۔"

"یار! اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے" رئیس نے بے زاری سے کہا "اب کیا کرتا ہے" ابھی گھر جا کر نیکم کا سامنا بھی کرنا ہے وہ سخت غصے میں ہوگی۔

"ہوئے دے یار!" میں ہنسا "عورت کا غصہ ہی کیا، پل میں چڑھتا ہے پل میں اتر جاتا ہے۔ چل اٹھ جا، اب بھان شاہ کو فون کر لیں، یہ تو آج ہی ٹھنڈا ہے۔"

"لگتا ہے ساری رات تیرے ساتھ خوار ہوئے مگر رے گی" رئیس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"بٹنا مزے کرے، کچھ عرصے بعد تو ان ہی راتوں کو یاد کر کے ٹھنڈی سانس لیا کرے گا۔"

پی سی او والا نوجوان وقت گزاری کے لیے ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا۔ ظاہر ہے رات کے اس پیرکرم ہی لوگ آتے تھے اس کا زیادہ وقت قانع مقرر تھا۔ اس نے خاموشی سے بھان شاہ کا نمبر ملا یا اور کہیں میں مجھے فون اٹھانے کا اشارہ کر کے خود دوبارہ ڈائجسٹ میں کم ہو گیا۔

"شاہ صاحب، آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"
"تم نے اس بندے کا کیا نام بتایا تھا؟ تم اسے کہاں میرے آدمیوں کے حوالے کر دو گے؟"

"ملا روڈ پر ایک شاہنگ سینٹر ہے" میں نے ایک مشہور شاہنگ سینٹر کا نام لیا۔ "اپنے آدمیوں سے کہیں کہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں۔ میں خود سامنے آئے بغیر ہاشم رضا کو چھوڑ دوں گا۔ اگر وہ آپ کے آدمیوں کے ہاتھ نہ آیا تو میری ذمہ داری نہیں ہوگی۔ اپنے آدمیوں کو مسلح کر کے بھیجیں۔" وہ پہنچ جائیں گے لیکن بابا۔ "میں نے اس کی پوری بات سننے بغیر فون رکھ دیا۔ نوجوان نے میرا دیا ہوا دو سرا نمبر ملا یا۔ میں نے رب نواز سے بات کرنے کو کہا۔ وہ ایک منٹ بعد ہی لائن پر تھا۔ لگتا تھا کہ ہاشم رضا کی فکر نے اس کی نیند بھی جھین لی تھی۔ "شاہ عالم، میں نے جہنم کو رہا کر دیا ہے۔ تم نے مظلوم کر لیا ہو گا۔"

"ہاں" میں نے سروسے میں کہا "اور اب میں ہاشم رضا کو رہا نہ کروں یا کوئی مار کر اس کا قصہ ہی پاک کر دوں تو؟"

یہ سننے ہی رب نواز اپنی اصل زبان پر اتر آیا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "شاہ عالم! تمہیں یہ دھوکا بہت مٹا کر دے گا۔ میں تم سے تعلق رکھنے والے ایک ایک فرد کو مٹا دوں گا۔"

"مثلاً کون؟" میں نے ہنس کر کہا "سوائے جہنم کے کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس سے تم میرا تعلق ثابت کر سکو۔ باقی تمہاری مرضی، جس کے خلاف جو چاہے کرتے رہو بلکہ اب مجھے جہنم کی پروا بھی نہیں ہے۔"

"کیوں؟" اس نے شک زدہ لہجے میں کہا۔

"میں دیسے ہی ہوں کہ جھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے، میں ساری عمر تو جہنم کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا اور پھر میرا خیال ہے کہ تم جہنم کے خلاف کچھ نہیں کر سکو گے۔ اس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔"

"کتنی ہی مضبوط ہو جائے، رہے گی تو ایک عورت ہی" رب نواز نے منظر پر سے کہا "شاہ عالم! اگر تم نے ہاشم رضا کو نہ چھوڑ دیا اسے مار دیا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا پیچھا کروں گا چاہے تم جہنم میں کیوں نہ جا چکو۔"

"جہنم میں جانے کے لیے تمہیں میرا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لیے تمہارے اعمال ہی کافی سے زیادہ ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"شاہ عالم!" رب نواز دہاڑا تھا "میں پاگل ہو رہا ہوں۔"

"ارے نہیں" میں نے سننے کی اداکاری کی "مجھے

پاگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بہر حال میں مذاق کر رہا تھا۔ ہاشم رضا کا کیا میں نے اچار ڈالنا ہے۔ میں اسے پون گھنٹے بعد مال روڈ کے اس شاہنگ سینٹر کے سامنے چھوڑوں گا۔ "شاہنگ سینٹر کا نام بتاتے ہوئے میں نے بات جاری رکھی۔ "تم اپنے آدمی بھیج کر اسے وہاں سے منگو سکتے ہو" یہ کہتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ پی ای او والے کو سو کا ایک نوٹ دے کر میں بقیہ لیے بغیر واپس مڑا۔ رئیس جیب میں تیار بیٹھا تھا۔ "حزرت میں آج وقت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں ہاشم رضا کو لے کر وہاں پہنچنا ہے۔"

محض دس منٹ میں ہم نے ہاشم رضا کو جزا المیہ کے ٹھکانے سے اٹھایا۔ احتیاطاً اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے جیب تک لائے۔ رئیس نے جیب کی سبرٹیش تبدیل کیں اور ہم مال روڈ کے اس شاہنگ سینٹر کی طرف روانہ ہو گئے جس کا پتا میں نے بیک وقت سبحان شاہ اور رب نواز کو دیا تھا۔ جیب میں نے شاہنگ سینٹر سے ذرا پہلے روڈ کے دوسری طرف ٹھکڑی کی تھی۔ یہاں تاریکی تھی اور جیب میں کسی کی موجودگی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً سر پہنے کر لیا تھا اور کبھی کبھی سر اٹھا کر باہر کا جائزہ لے لیتا تھا۔ رئیس عقبی نشست پر پودیسر کو سن پوائنٹ پر لے بیٹھا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔

ٹھیک تین بجے ایک بڑی کار آکر شاہنگ سینٹر کے سامنے رکی اور اس میں سے کئی سائے نکل کر اوپر اڑھ بھر گئے۔ کار ذرا آگے جا کر رک گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہو سکتے تھے۔ رب نواز کے گرگے یا سبحان شاہ کے مرید۔ بہر حال وہ مسلح تھے۔ اس کے پانچ منٹ بعد مخالف سمت سے دو چیمپین نمودار ہوئیں اور محوم کر شاہنگ سینٹر والی روڈ پر آ گئیں۔ جب وہ میری جیب کے پاس سے گزریں تو مجھے اس میں دلواز کی پیمبر کو پہچانتے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گویا پہلی بارنی سبحان شاہ کے آدمیوں کی تھی۔ دونوں چیمپین آکر شاہنگ سینٹر کے سامنے رکیں اور اس میں سے نصف درجن کے قریب افراد نکل کر اوپر اڑھ بھر گئے تھے۔ افراد کے لحاظ سے رب نواز کی پارٹی کو برتری حاصل تھی لیکن سبحان شاہ کے آدمیوں کو یہ فائدہ تھا کہ رب نواز کی پارٹی ان کی موجودگی سے واقف نہیں تھی۔ میرے خیال میں یہ حرکت میں آنے کا بہترین وقت تھا۔ میں پہلے ہی رئیس کو فرار کے راستے کے بارے میں سمجھا چکا تھا۔ میں نے جیب اشارت کرتے ہوئے کہا۔

"رئیس ہوشیار! میں جیسے ہی جیب روکوں اسے باہر

دھکا دے دوں گا۔"

"نہیں" ہاشم رضا چلایا "تم لوگ مجھے ملو دینا چاہتے ہو۔"

"جیب لے" رئیس نے اسے جھاڑا "تجھے مارنا ہوتا تو یہاں تک لائے کی زحمت کیوں کرتے؟"

میں نے جیب تیزی سے چلا کر اسے شاہنگ سینٹر کے سامنے روڈ کے دوسری طرف روکا۔ جیب کی آواز سن کر وہاں موجود افراد میں الجھن مچ گئی جیسے ہی میں نے جیب روکی فضا ایک خوفناک دھماکے سے گونج اٹھی کسی نے بڑے کبلی بر کا ہتھیار چلا دیا تھا لیکن نشانہ ہم نہیں تھے اس کے ساتھ وہاں ایسے فائرنگ شروع ہو گئی جیسے کسی عمارت پر جنگ چھڑی ہو۔ میں نے چلا کر رئیس سے کہا "اسے باہر دھکا دے۔"

میرے کہنے سے پہلے ہی رئیس ہاشم رضا کو باہر دھکا دے چکا تھا جو گھٹکیاٹے ہوئے انداز میں رئیس سے جیب میں رہنے کی درخواست کر رہا تھا۔ باہر جاری گھبراہٹ کی جنگ میں اسے اپنے مارے جانے کا خدشہ تھا۔ مگر رئیس نے اس کے دواہیے پر توجہ دے بغیر اسے باہر دھکا دے دیا۔ میں نے جیب چلا دی۔ عقبی آئینے میں مجھے ہاشم رضا زمین پر گرتا، اٹھتا اور جیب کے پیچھے دوڑتا نظر آیا تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر جیب ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس سے پہلے رب نواز کی پارٹی کی ایک جیب حرکت میں آچکی تھی۔ وہ ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ اسے موڑنا کر اسی طرف آتے ہوئے خاصی دیر لگے گی۔ مگر یہ دیکھ کر میرا اطمینان عمارت ہو گیا تھا کہ جیب درمیان میں گرین بیٹ پر چڑھ کر اس طرف ہٹ آئی تھی اور اب تیزی سے ہماری جیب کے پیچھے آ رہی تھی۔

"رئیس ہوشیار!" میں نے چلا کر کہا "رب نواز کے کتے آ رہے ہیں۔"

"تو ذرا نیوٹک کہہ ان کو میرے لیے چھوڑ دے" رئیس نے کہا تو میں نے اپنی پوری توجہ ذرا نیوٹک پر لگا دی۔ یہ ایک سیدھی روڈ تھی۔ اس پر آگے جا کر بھائی گیٹ کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے ایکسپریس پر دباؤ ڈالنا تو جیب چیتے کی طرح جست لگا کر بھاگی تھی۔ بلاشبہ یہ ایک برق رفتار گاڑی تھی اور اس کی روڈ گرپ بھی شاندار تھی۔ میں نے عقب سے گولیاں چلتے کی آواز سن تو جیب کو لہرانے لگا۔ رئیس نے اپنے پستول سے جواب دینا شروع کر دیا لیکن رب نواز کے آدمیوں کے پاس بڑا اسلحہ تھا ان کی چلائی گولیاں جیب کے آس پاس سے گزر رہی تھیں جبکہ ان کی جیب پستول کی دھج

اس کا ساتھی گمن میں شدید زخمی ہوئے تھے بعد میں گمن میں بھی ہلاک ہو گیا تھا البتہ ڈاکٹروں نے دنو نوا کو بچایا تھا۔ جیلن کی طرح لڑھکتے ہوئے میرا سرا چاک کسی شے سے ٹکرایا تھا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

○*○

"اسے ہوش آرہا ہے" کسی نے خوشی سے چلا کر کہا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلی آواز میں سے سی تھی۔ غالباً میں کرا رہا تھا۔ میرے سر میں جیسے روڈ رو لپل رہا تھا اور مجھ میں آگے کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سر میں ایسا درد تھا جیسے میرا سر پھٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہو۔

"نامر۔ نامر۔ میری آواز سن رہے ہو یاں" اس بار نیلم کی آواز آئی۔ میں نے یہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ تھا۔

"میں زندہ ہوں؟" میں نے کرا کر کہا۔

"اب تک تو ہو۔ بڑے ذہیت آدمی ہو این کی طرح" دائیں طرف سے رئیس کے سینے کی آواز آئی۔

"فضول مت بولا کر" نیلم نے نفی سے کہا "اب طبیعت کیسی ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"پاس گلی ہے پانی پلاؤ" میں نے آہستہ سے کہا۔ نیلم نے لپک کر گلاس اٹھایا "اس میں پانی ڈال پھر نہایت محبت سے میرا سرا اپنے بازوؤں میں لے کر لہنہ کیا۔ میں اس کے وجود کی نری اور گرمی محسوس کر رہا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کی آغوش میں۔ اس نے گلاس میرے لبوں سے لگایا اور میں گھونٹ گھونٹ کر کے اس کے حیات بخش قطرے حلق سے اتارنے لگا۔ پانی پلا کر اس نے میرا سر نہایت احتیاط سے واپس نیچے پر رکھ دیا تھا۔

"کاش" میں بھی اپنا سر تروا کر آیا ہوتا" رئیس نے شرارت سے کہا تو نیلم جھینپ گئی۔

"تجھے سر تروا نے کی ضرورت نہیں پڑے گی" میں نے مسکرا کر کہا تو نیلم غصا ہو گئی۔

"ہیں ہوش میں آتے ہی بک بک شروع کر دی" وہ کمرے سے چلی گئی۔

میری حالت کسی قدر بہتر ہو گئی۔ میرے سر پر بندھی پٹی ظاہر کر رہی تھی کہ مجھے باقاعدہ ڈاکٹر دیکھ چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں نیلم ہاؤس تک آیا کیسے۔ یہی سوال میں نے رئیس سے کیا تو وہ بولا "ابھی آرام کر۔ مجھے اور بھی کچھ کرنا ہے۔" واپس آکر بتاؤں گا۔" رئیس چلا گیا وہ پریشان لگ رہا تھا۔

سے باہر تھی۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ان سے دور رہیں۔ سیدھی روڈ پر وہ ہمیں پکڑی لیتے یا ان کی چلائی کوئی گولی مجھے نہیں یا جیب کے بازو کو بھی لگ سکتی تھی۔ میں نے جیب ایک گلی میں موڑ لی۔ اس علاقے میں وسیع دیرپا بیٹنگے بنے ہوئے تھے۔ جن کے سامنے کشادہ سڑکیں تھیں۔ دوسری جیب بدستور ہمارے پیچھے تھی۔ اس کا ڈرائیور باہر تھا اور اس نے اب تک موقع نہیں دیا تھا کہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہو سکیں۔ ایک سڑک سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ایک عمارت کے کھلے کپڑے پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ آگے جا کر میں نے جیب کو بائیں طرف گھمایا "اس کے بعد جو پہلی سڑک آئی اسی پر پھر بائیں طرف گھماؤ اور جب آخری بار جیب گھومی تو ہم اسی سڑک پر تھے۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" رئیس چلایا "بھانجے کی فکر کر۔"

"تو دیکھتا رہ" میں نے کہا اور جیب عمارت کے کپڑے میں محسوس۔ میں نے روکنے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائی۔ جیب پھسلی اور محوم کر اس کا رخ کپڑے کے گیٹ کی طرف ہو گیا تھا۔ میرے کانوں نے دوسری جیب کے آنے کی آواز سنی۔ ایک خود کار کے سے انداز میں میرے ذہن نے حساب کتاب کیا۔ میں نے چلا کر رئیس سے کہا "رئیس نیچے اتر جا۔"

"تو کیا کر رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نیکو اس مت گڑبگڑ" میں نے دہاڑ کر کہا۔ میرے لیے میں وحشت محسوس کر کے وہ پچھلا دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔ اس لمحے میں نے ایکسپریس پر بازو کا پورا زور ڈالا تھا۔ جیب ٹاپ گیسر میں تھی۔ وہ زخم خوردہ درندے کی طرح گیٹ کی طرف لپکی۔ گیٹ کے قریب آتے ہی میں نے دروازہ کھولا اور نیچے لڑھک گیا۔ جیب خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ بکے فرش پر بینن کی طرح لڑھکتے ہوئے میں نے جیب کو گیٹ سے نکلنے اور پھر رب نواز کی پارٹی والی جیب کو پوری قوت سے اس سے ٹکراتے دیکھا تھا۔ دھماکے کا حد شدید تھا۔ دونوں چیمپین چشم دوزن میں تر مڑ کر رہ گئی تھیں۔ جب دوسری جیب کے ڈرائیور نے ہماری جیب کو غائب پایا ہو گا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا ہو گا۔ اتنی جلدی کوئی غائب نہیں ہو سکتا تھا۔ اضطرابی طور پر اس نے رفتار بدھائی ہوئی اور اسی لمحے میری جیب کپڑے کے کھلے گیٹ سے نفی تو اسے بچتے کی سہلت بھی نہیں ملی ہوگی بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ جیب میں سوار چار میں سے دو موقع پر مر گئے تھے جبکہ دلواز اور

☆ 289 ☆ گیارہواں حصہ

میں نے محسوس کیا کہ صبح ہو چکی تھی۔ گویا میں تین چار گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیکم ناشتے کی ٹرے اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ پہلے اس نے کپلے تولیے سے میرا منہ صاف کیا پھر سلیٹ سے تینکون بچایا اور پیچ سے دودھ ملا دیا کھلانے لگی۔ میں نے جھلا کر کہا "میں مریض نہیں ہوں" بس ذرا زخمی ہوا ہوں۔ یہ سب کیا ہے" مجھے برا تھا تو اس اور آلیٹ دو۔"

"فضول باتیں نہیں۔ ڈاکٹر نے یہی کچھ کھلانے کو کہا ہے۔" اس نے ولیہ کھانا جاری رکھا۔

اس نے زبردستی مجھے پورا پالہ کھلایا۔ اس کے بعد میری کافی کی قربانیاں نظر انداز کر کے ایک گلاس دودھ پلایا اور آخر میں کچھ گولیاں کھلائیں جن میں اس نے چالاک سے نیند کی گولیاں بھی شامل کر دی تھیں۔ ایک نلٹ میرے اعصاب سکون میں آ گئے اور میں غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اگلی بار جاگا تو کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ رات ہو چکی تھی صبح کیا ناشتا کب کا ہضم ہو چکا تھا اور میرے پیٹ میں عماروں کے مطابق جو ہوں کی ریس جاری تھی۔ دواؤں کے اثر سے میرا جسم سن ہو رہا تھا۔ درد کے بجائے پورے جسم میں ہلکی سی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھا پھر بستر سے اتر آیا۔ نہ تو جگر آئے اور نہ ہی قدم لڑکھڑکے۔ یعنی چوٹ زیادہ بھین نہیں تھی۔ میں نے ہاتھ روم میں جا کر اپنا جائزہ لیا۔ سوائے سر کے کہیں خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ مجھے اور کنبیوں پر چند معمولی سی خراشیں تھیں جو زمین پر لڑھکنے کی وجہ سے آئی تھیں۔ مجھے شدت سے نمائے کی خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے ٹب میں نیم گرم پانی بھرا۔ اس میں ڈینڈل اور ایک کولون ملا یا۔ پھر اس نیم گرم پانی میں کپڑے اتار کر بیٹھ گیا۔ اس غسل نے مجھے بے حد سکون دیا تھا۔ اس دوران میں میں سوچتا رہا کہ ہاشم رضا کا کیا ہوا ہوگا۔ وہ کس کے ہتھے چڑھا ہوگا۔ رب نواز کی باری کے سببان شاہ کے آدمیوں کے یا پھر ملک الموت کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔ وہاں جس طرح اندھا حد فائرنگ ہو رہی تھی ہاشم رضا کا مارا جانا ممکن تھا۔ اس صورت میں رب نواز کو ناقابل طمانی نقصان ہوتا۔ بے شک پروفیسر ہاشم رضا ایک عظیم سائنس دان تھا لیکن وہ اپنی صلاحیتیں منفی معنوں میں استعمال کر رہا تھا۔

"ناصر اب باہر آ جاؤ۔" نیکم نے دروازے پر چلا کر کہا "کھانا تیار ہے۔"

"نوف" کیا یاد دلایا "میں نے کہا اور جلدی جلدی باہر نکل کر جسم سکھا کر کپڑے پہنے۔ ریس اور نیکم کھانے کے

کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پر پلاؤ اور قورے کی خوشبو بری طرح میرے حواس پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں ریس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا تھا۔ نیکم مسلسل مجھے تیز سے کھانے کے لیے کہہ رہی تھی اور میں اس کی ایک نہیں سن رہا تھا۔ پیٹ میں کچھ گیا تو میرے حواس ذرا ٹھکانے آئے تھے۔ کھانے کے بعد میں نے دودھ پینے کا حکم مسترد کر دیا اور کافی کا مطالبہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر مجھے کافی نہ ملی تو میں ریس کو لے کر کسی رستوران میں چلا جاؤں گا۔

"اچھا بابا! پو کانی" اپنی صحت خراب کرو مجھے کیا" اس نے جل بھی کر کہا تھا۔

"یہ خواتین شرافت کی زبان سمجھتی ہی نہیں ہیں۔" میں نے نیکم کے جانے کے بعد ریس سے کہا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے اتفاق کیا اور مجھے دو اوقات سناٹے جو میرے بے ہوش ہونے کے بعد پیش آئے تھے۔ دونوں گھنٹوں تک کھلے طور پر تیار ہو گئی تھیں اور میں بے ہوش تھا۔ ریس نے اس موقع پر اپنے حواس بحال رکھے اور اس عمارت کے کپاندہ میں کھڑی کار میں مجھے ڈال کر وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ مال روڈ کے شاہنگ سینٹر کے سامنے ہونے والے اس بنگلے میں تین افراد مارے گئے تھے اور تین افراد جیپوں کے تصادم میں ہلاک ہوئے تھے۔ جبکہ رب نواز کا بیٹا دونوں اسی حادثے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ رب نواز مجھ سے پاگل ہو رہا ہوگا۔ اس وقت میں اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ اپنے ہاتھ سے میرا تھم کر ڈالنا چاہتا تھا۔ جب کا خیال آیا۔

"یار ریس" ایک گز بڑ ہو گئی۔ رب نواز جیب کے نمبر سے پتلا چالے گا کہ اسے ناصر عظیم نے خرید لیا تھا۔

"مجھے پہلے ہی احساس ہو گیا تھا اس لیے میں صبح سویرے جا کر اس کارڈیٹر کو پکارتا آیا ہوں۔ تو نے جس سے جیب خریدی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اول تو کارڈیٹر مل کرنے کا ذکر نہ کرے اور دوسرے یہ کہ تیرا حلیہ بھی غلط بتائے میں اسے بھی دھمکی دے آیا ہوں۔ اگر بات خراب ہوئی تو اس کی صورت خراب ہو جائے گی اور اس کے شو روم میں آگ لگا دی جائے گی۔"

"یہ دھمکی تو اسے رب نواز بھی دے سکتا ہے بلکہ رب نواز نے اسے اٹھوایا تو اسے حقیقت اگلتے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے" میں نے اعتراض کیا۔

"میں نے جیب کی نمبر پلٹیں بھی بدل دی تھیں۔ پیس

اور انجن نمبر کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح کام بن جائے۔ میں نے جبرالیم سے کہہ دیا ہے کہ دس بیس ہزار کھلا کر پولیس والوں کی مدد سے ہی جیب کے یہ نمبر ملواوے۔ اگر ایسا ہو گیا تو رب نواز کا باپ بھی جیب کا پتا نہیں چلا سکتا۔

"اتنا زیادہ خوش فہمی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مجھے فکر لاحق ہو گئی ہے۔ اگر رب نواز ناصر عظیم کے بارے میں جان گیا تو اس سے میرا تمام لوگوں سے تعلق بھی چھپا نہیں رہے گا اور وہ چندا، کمال، نمر اور نیکم کے بارے میں بھی جان جائے گا۔"

"یار" ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رب نواز نے تجھے اس وقت بھی دیکھا تھا جب تو شاہد کے ساتھ ہوا کرتا تھا کیا اسے یاد نہیں رہا کہ تیری صورت شاہ عالم سے کس قدر ملتی ہے۔"

"ممکن ہے اسے یاد نہ رہا ہو" یسے بھی وہ کر کے بھول جانے والوں میں سے ہے" اسے یاد بھی نہیں ہو گا کہ اس نے دو نو عمر لوگوں پر کتنا خوف ناک تشدد کیا تھا اور ایک فقیر زادی کو ہرن کیا تھا۔ مگر ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تو چندا اور کمال کو خبردار کر دے بلکہ اسپتال کی حفاظت کے لیے کسی بیکیورٹی ایجنسی سے گارڈز رکھوالے۔"

"نیکم پہلے ہی ایسا کر چکی ہے۔ اس کے کسی جاننے والے ریٹائرڈ کرٹل کی بیکیورٹی ایجنسی ہے" اس نے سارے بندے جن جن کر رکھے ہیں۔ شاہ سابق آرمی کمانڈر ہیں۔ چار گارڈز نیکم نے اپنے لیے ہار کیے ہیں اور چار کمال کے اسپتال کے لیے۔ ان میں سے دو چندا، کمال یا قمر کے اسپتال سے باہر جانے کی صورت میں ان کے ساتھ رہا کریں گے۔"

"کیا نیکم عباسی اور رخصتی کو بھول گئیں۔

"نہیں یار" اس نے انیس بھی کہا تھا لیکن ان دونوں نے انکار کر دیا۔ عباسی نے کہا ہے" اسے گارڈز کی ضرورت نہیں ہے اس نے مقامی قاتلانے میں رپورٹ لکھوا دی ہے کہ اسے رب نواز سے خطرہ ہے اگر اسے کچھ ہو جائے تو رب نواز کو اس کا ڈوٹے دار سمجھا جائے۔"

"کچھ ہونے کے بعد رب نواز کو ڈوٹے دار بنانے سے فائدہ؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"رخصتی نے اس سے کہا ہے وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ایک دو دن میں وہ بیکیورٹی گارڈز رکھ لے گی۔"

"میں نے سر ہلایا "دراصل عباسی پیسے کے معاملے میں

کمزور ہے اور خوددار بھی ہے" وہ ہم میں سے کسی کی مدد لینا پسند نہیں کرے گا۔ مگر رخصتی اسے قابو کر لے گی۔ اس کے پاس دولت بھی ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

رخصتی گھر پر ہی تھی "ناصر" کیسے ہو تم؟" اس نے خوش سے کہا۔

"رخصتی" ہم سب خطرے میں ہیں" میں نے اسے خبردار کیا اور پھر سارے حالات سے آگاہ کیا۔ "گزشتہ رات کا واقعہ بھی سنایا "ان حالات میں رب نواز کی کیفیت باؤلے کتے کی سی ہو رہی ہوگی؟ تم سب احتیاط کرو اور فوراً سیکیورٹی گارڈز رکھ لو۔ اگر اس سلسلے میں کوئی مسئلہ ہو تو نیکم کا ایک کرٹل جان بچان والا ہے" اس نے سیکیورٹی ایجنسی کھول رکھی ہے اور اس کے پاس ایشیے گارڈز ہیں" اس سے بات کر لیتا۔"

"میں عباسی سے بات کروں گی" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"دیکھو رخصتی" یہ عمل کرنے کا وقت ہے بات کرنے کا نہیں۔ عباسی اس وقت خودداری کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ بے شک خودداری اچھی چیز ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم چیز جان کی حفاظت ہے۔ اگر خدا نخواستہ تمہیں یا عباسی کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو میں ساری عمر تم لوگوں کو مٹ دھکانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"یہ بات نہیں ہے" رخصتی بولی "دراصل ایک دو دن میں ہم جارہے ہیں۔ پہلے اسلام آباد جائیں گے وہاں عباسی کے کچھ رشتے دار ہیں" ان سے ملنا ہے پھر مری اور سوات کا ایک چکر بھی لگائیں گے شادی کے بعد ہمیں ہتی مون منانے کا موقع ہی نہیں ملا" وہ شرطیں انداز میں ہی "دوس بارہ دن کا چکر ہے اس کے بعد اگر دو تیس گے بس یہ وجہ تھی عباسی فوری طور پر سیکیورٹی گارڈز نہیں رکھ رہے ہیں۔"

"شکر ہے۔ میرے اوپر سے ایک فکر تو کم ہوگی" میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن جب تک تم لوگ چلے نہیں جاتے محتاط رہنا۔"

"اوکے بابا" وہ ہنسی "مج شاید میں اور عباسی آئیں تمہاری طرف" یعنی نیکم باؤس۔"

"فون بند کر کے میں ریس کی طرف گھوما۔" تو نے لاکر کا کیا کیا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"میں نے معلوم کر لیا تھا لیکن لاکر والا افسر بیاری کی وجہ سے چھٹی پر ہے۔ وہ وہاں آئے گا۔ تب ہی کچھ ہو سکے گا۔" ریس نے جواب دیا۔

"اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔" میں نے مایوسی

سے کہا "سبحان شاہ یا دلاور کے وارثوں کو لاکر قہقہے کا موقع مل جائے گا۔ یقیناً اس لاکر میں قیمتی اور اہم اشیاء رکھی ہوں گی۔"

"بلکہ مٹی!" رئیس بولا "اندھی رشوت کی کمانی۔ احتساب کے دُور سے اب راشی افسران جائیدادیں بنانے کے بجائے اپنی رقم دار دنیا پاؤنڈز میں بدل کر لاکھوں میں رکھ رہے ہیں۔ ممکن ہے دلاور شاہ نے بھی ایسا ہی کیا ہو؟"

"یاد سبحان شاہ! اسے بات کرنی ہے۔ اس سے معلوم کرنا ہے کہ ہاشم رضا اس کے ہاتھ لگایا نہیں؟" آباہر چل کر اسے فون کرتے ہیں۔

"نیلیم کمرے میں آئی" خبردار جو گھر سے قدم باہر نکلا۔

"نیلیم یہ کام ضروری ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس گھر میں بھی دس فون ہیں۔ تم ان سے کیوں نہیں کال کرتے؟"

"اس لیے کہ سبحان شاہ ایک بار سوخ آدی ہے" اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر بیٹھے معلوم کر لے کہ آنے والی کال کس نمبر سے کی جارہی ہے؟" میں نے اسے سمجھایا "تمہارے گھر کے لیے میں کوئی رسک نہیں لیتا چاہتا۔ یہ میری بلکہ ہم سب کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔"

"تم باہر جاؤ گے اور پھر کل کی طرح کوئی حرکت کر جاؤ گے۔ تم نے اپنی جان داؤ پر لگا کر ہم سب کے ساتھ نا انصافی کی تھی۔ جانے ہو رہی نہیں جب اٹھا کر لایا تو میں سمجھی کہ خدا نخواستہ تم۔" اس کی آواز بھرا ہوا تھا۔ "بس میں نے کہہ دیا تم نہیں جاؤ گے۔"

میں چہمیا "مجھے بھی اپنی جان پیاری ہے اور مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ اسے خطرے میں ڈالتا پھروں۔ آخر تم مجھے اتنا غیر زتے دار کیوں سمجھتی ہو؟ کل قیمتی موت ہمارے پیچھے تھی۔ اس سے اپنی اور رئیس کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ خطرہ مول لینا پڑا تھا اور میں نیلیم ہاؤس میں قید ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس صورت میں باہر کے مسئلے کون منٹائے گا؟"

"تم بھی تو سستے پھیلانے رہے ہو" نیلیم نے تیز لہجے میں کہا "اور انہیں سیٹھ کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا میں شوقیہ مسائل مول لے رہا ہوں؟"

میرے غصے سے وہ ڈھنکی "میرا یہ مطلب نہیں ہے لیکن دیکھو نا صراہم پہلے ہی بہت سارے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں" آج مون دین۔"

"اس کا مسئلہ بعد میں بیان کرنا" رئیس نے جلدی سے اس کی بات کاٹی "نا صراہم کب رہا ہے۔ عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھنے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔"

"گھر" نیلیم نے کہنا چاہا۔

"کوئی اگر گھر نہیں" رئیس دھاڑا اور مجھ سے بولا "چلو نا صراہم!"

نیلیم کا منہ پھول گیا تھا وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی "لو کے چلے! ابھی یہ جا کر روئے گی" میں نے کہا۔

رئیس بھٹا گیا "تو بھی یہیں بیٹھ کر رو۔"

"ہمارا رخ کیوں ہوتا ہے میرے یار!" میں ہنسا "میں نیلیم کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"دیکھ تو میں بھی نہیں سکتا" اس نے سر آہ بھری "لیکن یار! عورتوں کی زیادہ مانتے لگو تو یہ سر چڑھ جاتی ہیں" اور پھر تپانے لگتی ہیں۔"

موبائل چارج ہو چکا تھا۔ اسے میں نے ساتھ لے لیا مگر فون مجھے لی سی او سے کرنا تھا۔ اس زمانے میں سی ایل آئی نہیں آئی تھی لیکن موبائل فون پر آنے والی کال کا نمبر آجاتا تھا۔ اس کے باوجود میں نیلیم ہاؤس سے سبحان شاہ یا رب نواز کو فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کے لیے عین ممکن تھا کہ یہ آنے والی کال کا پتا چلا لیتے اور اس طرح نیلیم ہاؤس ان کی نظروں میں آجاتا۔ بلکہ میری کوشش تھی کہ نیلیم کا لیا موبائل بھی کم سے کم استعمال کروں۔ اگرچہ رئیس نے اسے کسی سے منع کنکشن کے خرید لیا تھا۔ لیکن اگر رب نواز یا سبحان شاہ اس شخص تک پہنچ جاتے تو رئیس ان کی نظروں میں آجاتا اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔

راستے میں میں نے آزاد صاحب کے دفتر فون کیا۔ وہاں حسب معمول میدان حشر کا ساں تھا۔ جب میں نے چو بھی بار پلا کر آزاد صاحب سے ملانے کو کہا تو آپریٹر کی سمجھ میں آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دفتر میں خاصی جگہ ہونے کے باوجود آخر بے چارے فون آپریٹر کو ایک الگ کمپن کیوں مہیا نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں وہ سکون سے کام کر سکتے اس طرح چھ دیکار کے درمیان بیٹھ کر اسے اپنا کام کرنا دشوار ہو جاتا ہو گا۔ خدا خدا کر کے آزاد صاحب لائن پر آئے۔ اس وقت بھی وہ فون لے کر اپنے کسی کاب کو اسٹو رہے تھے جس نے ایک سیاست داں کے نام میں فاش غلطی کرتے ہوئے اخبار پر حملہ کا خوار مہیا کر دیا تھا۔

"میاں! اگر کسی نے یہاں حملہ کیا تو نہیں آگے کروں گے کہ یہی ہے وہ نا بجا جس نے ہوتی کو کوئی بتا دیا یہ سمجھے

بغیر کہ اس سے گدھے کے جذبات پر کیا گزرے گی؟"

میں نے یہ مشکل اپنی ہی ضبط کی۔ بالآخر آزاد صاحب کو میرا خیال آگیا "ہاں بھی کون ہے؟ اس نامعلوم وقت۔"

جب ہم ملک الموت کے ہاتھ بھی نہ آئیں۔

"سلام عرض کرتا ہوں" میں نے ہنس کر کہا "میں بھی نام بدل جانے والا ایک کیس ہوں۔"

"ارے تم۔" میاں بڑے موقع سے یاد کیا ہے۔

ہمارے اخبار کی ایک تازہ سرخی کے مطابق کل کی مار دھار میں تم بھی ملوث تھے اور گویا مقتول ہوتے ہوئے رہ گئے؟"

"یہ غصہ مت کیجئے گا" میں نے گھبرا کر کہا "خودا خبر سے میرا نام نکال دیجئے۔"

"یہ تو نہیں ہو سکتا صاحب زادے" ہم پورا چ چھاتے ہیں اس لیے آج تک یہیں بیٹھے ہیں۔ دوسرے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ پریس ریلیز ہے" ایف آئی آر میں تمہارا نام بھی آیا ہے یعنی شاہ عالم!"

میں سانس میں رہ گیا تھا۔ میں جتنا شاہ عالم کے کردار کو لوگوں کے ذہن سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اتنا ہی یہ نام بار بار لوگوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ حرکت رب نواز کی تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ پریس ریلیز کے ساتھ خبر اپنی بھی دے سکتے ہیں۔"

"ہاں" یہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں بلکہ ہم نے کئی اور اخباری مدیروں سے بات کی ہے اور اسے کھینچنے والے تازے کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ اُمید ہے کہ سب اخبارات پریس ریلیز سے ہٹ کر بھی اپنی خبریں لے سکیں۔"

"شبم کہاں ہے؟"

"وہ وہاں ہے جہاں اسے اپنی بھی خبر نہیں ہے" اس بار آزاد صاحب کے لہجے میں تھنی تھی "صاحب زادے کیا تم اس کا پیچھا چھوڑ نہیں سکتے؟ میں سمجھتا ہوں اس لڑکی نے تمہاری خاطر ضرورت سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں اور ان کا اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا۔"

"میں آپ کی بات سمجھتا ہوں آزاد صاحب! میں نے بار بار شبم کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن۔"

"میاں! جب تک دیوانگی کا سبب سامنے آتا رہے گا دور سے بھی پڑتے رہیں گے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ تم اس کے سامنے آنا چھوڑ دو۔ ابھی تو میں نے اسے ایک خاص جگہ رکھا ہے جہاں محاورے کے مطابق پرنڈہ بھی پڑ نہیں مار سکتا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یہ آپ نے اچھا کیا کیونکہ کل رات کے واقعے کے بعد رب نواز پاگل ہو رہا ہے اور اس سے کوئی بید نہیں ہے کہ وہ اوجھی حرکتوں پر اتر آئے" آپ بھی محتاط رہنے کا۔"

"ہم احتیاط کریں تو اخبار کیسے چلائیں گے" وہ ہنسنے لگا "اچھا میاں خوش رہو۔ یہاں ابھی بہت سارے کام ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور چونکا۔

"بھڑی کیوں روک دی ہے؟"

"حضور والا ہم پی سی او تک آگئے ہیں۔" رئیس نے طنز کیا "اب سواری ہیچ آنا رہیے۔"

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ وہی کل والا پی سی او تھا۔ اگرچہ دوبارہ یہاں آنا حفاظت کے نقطہ نظر سے درست نہیں تھا لیکن اب آئی گئے تھے تو میں نے سوچا فون کر لیا جائے یہاں سبحان کا نمبر لی سی او والے نوجوان کو بھی یاد ہو گیا تھا اس نے پھرتی سے نمبر ملا کر لائن میرے حوالے کر دی۔

"شاہ صاحب آپ کا غلام شاہ عالم عرض کر رہا ہوں۔"

میں نے سبحان شاہ کے لائن پر آتے ہی کہا۔

"سنوکل تمہاری وجہ سے میرے دو قیمتی آدی مارے گئے۔"

"شاہ صاحب مجھے افسوس ہے لیکن اس کے بدلے جو آدی آپ کے پاس آیا ہے اس کی قیمت کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ رب نواز اس کے بدلے آپ کے سارے نقصان کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"مجھے تو یہ عام سا آدی لگا ہے۔" سبحان شاہ نے ہنسی سے بتایا "الحق یہ تو فیروز دہرے سا ہوا بیٹھا ہے۔"

"شاہ صاحب آپ نے کچھ عرصے پہلے لاہور میں محرم الحقل قسم کے بندر بننا بچوں کے کھلونے کے بارے میں سنا ہوگا۔"

"ہاں پڑھا تو تھا یا لیکن اخبار والے اس قسم کی اسٹوریاں چھاپتے رہتے ہیں۔"

"انہوں نے ان آفٹ بچوں کے بارے میں کم چھاپا تھا۔ اخبار رپٹے کے دوران ایک بچہ ہلاک بھی ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا معاملہ ہوتا اس کی افش غائب کر دی گئی تھی۔"

"یہ سب بتانے کا مقصد کیا؟"

"آپ نے صرف سنا اور اخبار میں پڑھا ہے۔ میں نہ

صرف انہیں دیکھ چکا ہوں بلکہ اس قسم کی مخلوق کے دو نمونے میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں میں نے اسے جہو اور لالی کے بارے میں بھی بتایا۔

”مگر ان سب باتوں کا اس پروفیسر سے کیا تعلق ہے؟“

سبحان شاہ جھنجھلا گیا تھا۔
”اس مخلوق کا خالق یہی شخص ہاشم رضا ہے۔ اس نے حیوانی اور انسانی جڑوں کے ملاپ سے انہیں بنایا ہے۔“
میں نے انکشاف کیا۔ بات سبحان شاہ کی سمجھ میں ڈرا دیر سے آئی تھی۔

”یہ کیا بکواس ہے؟ خالق صرف اللہ کی ذات ہے۔“
”درست مگر اس نے انسان کو بھی کچھ اختیارات اور علوم دے رکھے ہیں۔ پروفیسر ہاشم رضا سائنس کی اس شاخ کا ماہر ہے جسے جینٹک سائنس کہتے ہیں۔ اب تو سائنس داں بشر نطفے کے بھی ایک عام خلیے سے پورا جاندار بنانے پر قادر ہو گئے ہیں۔ اسے ٹکونگ کہتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن انسان اور حیوان کے ملاپ سے ایک نئی مخلوق۔“

”مگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو آپ اس کو بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رب نواز کے لیے یہ اس قسم کے تین تجربے اور بھی کر رہا ہے اس وجہ سے وہ اس کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔“

سبحان شاہ شدید رہ گیا تھا ”شاہ عالم تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟“

”اس میں ایک فیصد شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے پروفیسر کو جہاں سے اغوا کیا تھا۔ وہاں اس کے پاس ایک ایسا ہی بندہ تھا انسانی پچہ تھا۔ بیشکل چند مہینے گا۔ کیا آپ یقین کریں۔ مگر کہ اس بچے نے مجھ پر حملہ کیا اور اس کے دانت کے نشان ابھی تک میرے بازو پر ہیں۔ بعد میں جب میں پروفیسر کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس بچے پر ایک تیزاب نما مائع گر گیا تھا اور وہ ہلاک ہو گیا تھا۔ آپ پروفیسر سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اور پھر بھی کوئی شک رہ جائے تو رب نواز اس کی تصدیق کرے گا۔ پروفیسر کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے دل نواز کو بھیجا تھا جو میرا چچا کرتے ہوئے حادثے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے یہ بات پروفیسر کی اہمیت بتانے کے لیے کافی ہے۔“

”مگر ایسی بات ہے تو شاہ عالم تم نے اپنی طرف سے میرا دل صاف کر دیا ہے۔ اب میں اس ملک رب نواز کو دیکھ لوں گا۔ اگر تمہیں میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بلا جھجک

مجھ سے کہو۔“
”سبحان شاہ صاحب“ میں جانتا ہوں کہ پولیس پر آپ کا اثر رسوخ دلاور شاہ مرحوم تک محدود نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس میری تلاش کے لیے جاری کم کو ترک کر دے یا یہ کم سے کم دھیمی پر جائے اس سے مجھے آسانی رہے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میں یہاں سے اپنا کام سمیٹ رہا ہوں۔ ایک آدھ مہینے کے اندر میں ملک سے چلا جاؤں گا۔“

”میں وعدہ نہیں کرتا لیکن میری کوشش ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ یہ معاہدہ تو تم رب نواز سے بھی کر سکتے تھے۔ پروفیسر کو اس کے حوالے کر کے اس سے ضمانت حاصل کر لیتے تم جانتے ہو پولیس تو صرف ایک مہر ہے اصل میں رب نواز کو تمہاری تلاش ہے۔“

میں ہنسنا ”شاہ صاحب“ میں رب نواز کی ضمانت پر اعتبار نہیں کر سکتا کیونکہ میں اسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ مجھ سے کیا وعدہ پورا کرے۔ وہ مجھ سے بے دریغ جھوٹے وعدے کر سکتا ہے لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے آپ سے وعدہ کر کے یا معاہدہ کر کے وہ اتنی آسانی سے نہیں پھر سکتا۔ آپ اسے مجبور کر سکتے ہیں۔ دوسرے میں نے پروفیسر کو صرف جہنم کو رہا کرانے کے لیے اغوا کیا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔“
اچانک بات کرتے کرتے میری نظریاں ہر گئی۔ ”رہیں پاگلوں کی طرح اشارے کر رہا تھا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا ”اچھا شاہ صاحب آپ سے پھر بات ہوگی۔“ میں نے فون بند کر دیا اور پی سی او والے نوجوان کو ایک سو کاؤٹ پلا دیا۔

میں تیزی سے باہر نکلا تو رہیں نے گاڑی اشارت کر رکھی تھی۔ اس نے میرے پیچھے ہی کار دوڑا دی تھی۔ اس نے پرہی سے کہا ”لو کے پیچھے کیا تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ جو فون پر اتنی لمبی بات کر رہا تھا۔“
”یار سبحان شاہ لاہور سے باہر ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”وہ خود یہاں نہیں ہے لیکن اس کے گھر سے تو موجود ہیں۔“ اس نے بتائے ہوئے انداز میں کہا ”میں نے ابھی کار میں گاسے شیخ کو گزرتے دیکھا ہے۔“

”یہ گاسے شیخ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”اسے رب نواز کا خاص آدمی سمجھ۔ کل تو نے جو یہاں سے کال کی تھی۔ لگتا ہے رب نواز نے اس کا پتا چلایا ہے۔ اس کے آدمی پی سی او کی گھرائی کر رہے ہیں۔“
”اس طے میں وہ مجھے نہیں پہچان سکتے۔“ میں نے

چہرے پر ہاتھ پھیلا۔ میں نے فریج کھٹ صاف کر دی تھی اور مونچھیں بیٹھا رہا تھا۔ بالوں پر کیا گیا براؤن کلر اب اتر رہا تھا اور نیچے سے سیاہ رنگ دوبارہ جھلکتا شروع ہو گیا تھا۔ کالے رنگ کے لینس اور جڑوں میں دسے ریڑیڈز کی وجہ سے میری شخصیت میں مجموعی طور پر اتنی تبدیلی آئی تھی کہ مجھے شاہ عالم یا ناصر عظیم کے طور پر شناخت کرنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو گیا تھا۔

رہیں مسلسل عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا ”مجھے شبہ ہو رہا ہے نیلے رنگ کی ٹیوٹا ہمارے تعاقب میں ہے۔“
اس نے کماؤت میں سے مڑ کر دیکھا۔ ٹیوٹا ٹانگی گاڑیوں کے پیچھے تھی۔ اچانک رہیں نے کار ایک ذیلی سڑک پر گھمادی۔ قورای میں نے ٹیوٹا کو قطار سے الگ ہو کر اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ مجھے رہیں کا شبہ درست لگنے لگا۔ اس میں آگے دو افراد بیٹھے تھے۔ فاصلے کی وجہ سے ان کی صورتیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔

”رہیں ہماری کار رفتار میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی انہیں پکڑ دینے کی کوشش کر۔“ میں نے کہا۔

”اور کیا کر رہا ہوں۔“ رہیں نے کار ایک اور گلی میں ڈال دی۔ نئے لاہور کے اس علاقے میں گاؤں پلاننگ کے اصولوں کے تحت کشادہ اور سیدھی گلیاں بنائی گئی تھیں اور یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی گلی آگے سے بند نہ لے گی۔ ہزار رہیں پوری بے فکری سے کار کو مسلسل گلیوں میں گھسا رہا تھا مگر ایک جگہ ہم پچھس ہی گئے۔ گلی تو بند نہیں تھی لیکن وہاں شامیانہ لگا کر اور کرسیاں رکھ کر کسی تقریب کی تیاری جاری تھی۔ رہیں ایک لمبے کو بولکھایا تھا لیکن خوش قسمتی سے تقریب اب تک شروع نہیں ہوئی تھی اور کرسیاں خالی تھیں۔ غالباً یہ کوئی جلد تھا۔ رہیں نے بے فکری سے کار کرسیوں میں گھمادی۔ کار کی ٹکر سے کرسیاں اچھل اچھل کر دائیں بائیں گر دی تھیں کچھ لوگ شور مچاتے ہماری طرف لپکے لیکن اس سے پہلے ہی ہم شامیانے سے نکل چکے تھے اور جب ہم گلی میں مڑ رہے تھے تو میں نے نیلی ٹیوٹا کو شامیانے میں پھنسنے دیکھا۔ اتنی پڑی کرسیوں نے راستہ بند کر دیا تھا اور رہیں کسی کسر لوگوں نے پوری کر دی تھی۔

”رہیں وہ پچھس گئے ہیں بھاگ لے۔“ میں نے خوشی سے چلا کر کہا۔

رات گیارہ بجے ہم نیلم ہاؤس میں داخل ہوئے تو نیلم بے قراری سے لان میں ہی ٹھل رہی تھی ہمیں صبح سالم دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن فوراً ہی اس کی نظر کار

کے اگلے حصے پر پڑی ”یہ کیا ہوا؟“ اس نے تشویش سے کہا۔
”کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟“
”ایک بچے کو بچاتے ہوئے فٹ پاٹھ کے ساتھ رکھی کچھ کرسیاں کار کی زمین پر گئی تھیں۔“ رہیں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ جس پر میں نے اسے دل ہی دل میں شاباشی دی۔ وہ مستقبل میں کامیاب شوہر بننے جا رہا تھا۔

”سچ کہہ رہے ہوں؟“ اس نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔
”نہیں دراصل رب نواز کے آدمی ہمارے پیچھے بڑھے تھے۔ ان سے بچتے ہوئے کار کی کئی چڑوں سے ٹکر چکی خوب گولیاں چلیں اور رب نواز کے گھر کے جہنم رسید کر کے ہم سیدھے ہمیں آ رہے ہیں۔ جب تک ایک آدھ ہنگامہ نہ ہو ہمیں کھانا ہضم نہیں ہوگا۔“
”کیوں اس کرتے ہو۔“ نیلم کا لہجہ نرم تھا ”ایک منٹ میں کافی کا کہہ کر آتی ہوں۔ آج سو سم ذرا خشک ہے۔ ہمیں پیٹھ کر کافی پیئیں گے۔“

”یار یہ عورت کیا چیز ہے؟“ اس کے جانے کے بعد رہیں تہقہ لگا کر بولا ”اس سے جھوٹ بولو تو ج سمجھتی ہے اور ج بولو تو اسے جھوٹ قرار دیتی ہے۔“
معاذ مجھے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا یہ اسلم تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا ”اور کیسے ہو؟“
”ٹھیک ہوں ناصر صاحب لیکن۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا تھا ”میں ادھر آتا گیا ہوں جی۔ کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ بس سارا دن بیٹھے رہو۔ گاڑز مجھے باہر جانے بھی نہیں دیتے۔“

”انہیں میں نے کہہ رکھا ہے تمہارا باہر جانا درست نہیں ہے۔ رب نواز کے کتے پورے شرمیں میری بوسٹھتے پھر رہے ہیں۔ اگر تم پر نظر پڑی تو مفت میں مارے جاؤ گے۔“
”کیا فرق پڑتا ہے جی۔ جہاں میرے سارے گھر والے مارے گئے وہاں میں بھی سی۔“ اس نے ہزاروں سے کہا۔ اس پر قنولیت کا دورہ پڑا تھا۔

”یہاں اگر میرے پاس بیٹھو۔“ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے آکر ٹھک گیا۔ میں نے کہا۔ ”دیکھو اسلم تمہاری زندگی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی کہ میری۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اس وقت کس حد سے سے گزر رہے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہمت ہار جاؤ۔ ابھی تمہیں رب نواز سے اپنے گھروالوں کا انتقام لینا ہے اور

انتقام لینا آسان نہیں ہوتا اس کے لیے آدمی کو بڑی تیاری کرنا پڑتی ہے۔
”کیا تیاری کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ تم خود سوچو کہ رب نواز سے انتقام لینے کے لیے تمہیں کس قسم کی تیاری کرنی چاہیے؟“ میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔
”آپ مجھے پتہ تو چلا سکتا ہیں۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”صرف پتہ تو چلانے سے کام نہیں چلے گا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ ہمارے ساتھ رہو اور دیکھو کہ ہم رب نواز سے کس طرح نمٹتے ہیں۔ وہ صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ ہمارا بھی دشمن ہے کل رات ایک مقابلے میں اس کا بیٹا زخمی ہو کر اسپتال جا پہنچا۔ اس کے تین بندے بھی مارے گئے۔ اس وقت وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔ یہ ہے ہمارا انتقام کیا سمجھو۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا ”رب نواز نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟“
اسی اثنا میں نیلم ملازمہ کے ساتھ کافی لے کر آئی۔ کافی پیٹے ہوئے میں نے اس کو انتظار سے بتایا کہ رب نواز سے ہماری کیا دشمنی ہے۔ اس نے ہمیں کیا کیا نقصانات پہنچائے ہیں اور جواب میں ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اسلم دم بخود سا سنتا رہا۔ اس نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ رب نواز سے ہماری دشمنی کے مقابلے میں اس کی دشمنی کسی قدر ہلکی تھی۔ آخر میں اس نے کہا ”دیکھو جب آدمی ہاتھی کا شکار کرنے جاتا ہے تو ایسے ہی منہ اٹھا کر نہیں چلا جاتا بلکہ ساری تیاری کے ساتھ جاتا ہے۔ اس کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں اور انہیں چلانے کی تربیت کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی کی کمزوریاں کیا ہیں۔ اسے آسانی سے کس طرح اپنا شکار بنایا جاسکتا ہے۔ رب نواز کو بھی تم ایک طرح کا ہاتھی سمجھو۔ اس سے نمٹنے کے لیے چالاک لانا لازمی ہے۔ یہ بات یاد رکھو۔ رب نواز کے بے شمار دشمن ہیں اس نے بے شمار لوگوں پر ظلم ڈھائے ہیں اس کے باوجود آزاد پھر رہا ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔“

”یعنی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ اسلم کے لیے میں مایوسی تھی۔
”اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر تم حقیقت کو تسلیم کر کے رب نواز کے خلاف لڑو گے تو تم کامیاب رہو گے۔“

اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کوئی راقول لے کر تم رب نواز کے گھر چڑھ دوڑو گے اور اسے اس کے خاندان کے ساتھ ختم کر دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم گیت میں داخل ہونے سے پہلے ہلاک کر دیے جاؤ گے۔“

”مجھے آپ بتائیں میں کیا کروں؟“ اس نے بے بسی سے کہا ”جب مجھے اپنی ماں بہنوں کی لاشیں یاد آتی ہیں تو میری رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑنے لگتی ہے۔“
”ابھی تو تم مبرا کو اور انتظار کرو۔ ابھی نہ کبھی وقت تمہارے ساتھ ہوگا اور تم اس سے انتقام لے سکو گے۔“

”آپ نے ان برتنوں کے بارے میں کیا سوچا؟“
میں نے صاف گوئی سے کہا ”اسلم یہ نوادرات میں رب نواز کو پھانسنے کے لیے استعمال کروں گا۔ میں تمہیں اس کی قیمت دے دیتا ہوں۔“ میں نے جب سے چیک بک نکال کر اس کے ایک چیک پر سائن کیے اور چیک اس کی طرف بڑھا دیا ”اس پر تم جو رقم لکھو مجھے منظور ہوگی۔“
اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور سرگوشی نما آواز میں بولا ”جو رقم بھی لکھ لوں؟“

میں مسکرایا ”مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم اس پر اپنی مرضی کی رقم لکھنے کے لیے آزاد ہو۔ کل تک یہ رقم بینک سے ابھی جائے گی۔“
”لیکن میں رقم کا کیا کروں گا؟“ اس نے کہا ”جب میں رب نواز سے انتقام بھی نہیں لے سکتا۔“

”انتقام کے لیے وسائل کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ مبرا ہوگا کہ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ میں نے کہا ناں ایک وقت ایسا آئے گا جب رب نواز تمہارے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس وقت تم اس سے انتقام لے سکو گے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم جانا چاہو تو تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی لیکن اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی۔ دیکھو اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا لیکن دو آدمی مل کر بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے ایک اکیلا اور دو گیارہ تو یہ بالکل درست ہے۔ ہم تو دس زیادہ ہیں۔ اس جدوجہد میں میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ میرے بہت سارے ساتھی ہیں۔“

”میں۔ میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔
”بالکل سوچو اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو تاکہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی ”تم آرام سے سوچ سکتے ہو۔“

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نیلم نے کہا ”تیرے شخص مجھے خطرناک لگتا ہے۔“

”تمہیں نے اس کی بات کی؟“ میں نے دماغ کے بجائے دل سے سوچتا ہے میں ڈرتا ہوں کہ یہ جذباتی ہو کر رب نواز تک نہ جانچے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مبرا دے۔“

”اس کے ساتھ جو ہوا ہے اس کا جذباتی ہونا فطری امر ہے۔“ میں نے کہا ”اگر ہمارے بارے خدا انخواستہ ایسی برہنہ کا شکار ہوں تو ہمارا رد عمل بھی یہی ہوگا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ ہمارا اچھا ساتھی بن سکتا ہے اتحاد بڑی قوت ہے۔ میں رب نواز کے مخالفوں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سبحان شاہ مکمل کر نہ سہی لیکن ہمارے ساتھ ہے۔ وہ رب نواز کو برا نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ رب نواز کسی طرح سبحان شاہ سے کم نہیں ہے بلکہ لاہور شہر میں وہ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے اور ہمیں لاہور میں ہی رہنا ہے۔“

”میرا رب نواز کے خلاف کچھ نہ کیا جائے۔“ میں نے غصے سے کہا ”اسے کھلا چھوڑ دے کہ وہ جب چاہے جہنم کو اٹھا کر لے جائے اور جب چاہے تمہارے گھر پر حملہ کر دے۔ مائی ڈیئر نیلم ہمارے یہی مدد ہے رب نواز جیسے لوگوں کو فرعون بنا دیتے ہیں۔ اندر سے یہ ظالم اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ایک نپتا شخص ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے تو یہ لرز جاتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں تب بھی رب نواز اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔“

”مبرا ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رنیں نے اس بار میری حمایت کی ”اس جیسے لوگوں کو تکمیل نہ ڈالی جائے تو یہ بے نتیجہ کاتل بن جاتے ہیں موج دین کی طرح۔“
میں چونکا ”میرا خیال ہے تم لوگ موج دین کے بارے میں مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو؟“

نیلم اور رنیں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نیلم بولی ”ورا مکمل ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ برسوں موج دین اسٹوڈیو میں آتا تھا اس نے سختی سے شوٹنگ کی ڈنٹیں مانگیں۔ اس پر میں نے ایڈوائس کی کہ تم اس کے منہ پر دے ماری۔“

”اس کا کیا رد عمل تھا؟“
”اس نے آگے سے بد تمیزی کی اور میری کلائی تھام لی۔ اس پر رنیں کو غصہ آگیا۔“
”اور یہ رنیں غیبت بن گیا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بالکل برائے نہیں۔“
”قسم اللہ کی اگر نیلم نے نہ روک رکھا ہوتا تو میں بہت پہلے اس کی ایسی کی ایسی کرچکا ہوتا۔“

نیلم بولی تو اس کی آنکھیں فخر سے چمک رہی تھیں۔ ”رنیں نے اس کا وہ ہاتھ توڑ دیا جس سے اس نے میری کلائی پکڑی تھی۔“

میں نے سر تھام لیا ”میرے خدا تم لوگوں نے معاملہ خراب کر دیا ہے۔ تم دونوں ہی جانتے ہو کہ موج دین رب نواز سے زیادہ خطرناک دشمن ہے وہ کھلابد معاش ہے جسے حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے اگر موج دین اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی ہم ساری انتظامیہ سے نہیں لڑ سکتے۔ رنیں تم نے اچھا نہیں کیا۔“

”تو کیا بے غیرت بن کر دیکھنا رہتا۔ وہ نیلم کے ساتھ کچھ بھی کرتا رہتا۔“ رنیں بگڑ کر بولا۔
”یہ پولیس کیس بن سکتا ہے۔“

”میں نہیں جانتے گا کیونکہ موج دین نے بیان دیا ہے کہ وہ پھسل کر گر اٹھا اور اس کی کلائی میز کا سراٹھنے سے ٹوٹی ہے۔“ نیلم بولی ”ورنہ اس کی جگہ ہنسائی ہوتی۔“
”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب ہمیں ایک اور غضب ناک دشمن سے نمٹنا پڑے گا۔ یہ اچھا نہیں ہوا جبکہ رب نواز پہلے ہی بالکل ہو رہا ہے۔“

”چل یار جہاں ایک ہے وہاں دو سرا بھی سہی اور مجھے اکیلا مت سمجھ۔ زیر زمین دنیا میں یہ بات بھیل چکی ہے کہ موج دین کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے اس کے بعد سے بہت سارے پرانے جاننے والے میرے پاس آ رہے ہیں یا ان کے بیٹیاں آ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ موج دین کے خلاف میرے ساتھ ہیں۔ ان میں لاہور کا ایک نامی گرامی صنعت کار بھی ہے جس کا بھائی موج دین کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔“

”رنیں اس چکر میں نہ پڑ۔ یہ لوگ تجھے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔“ میں نے اسے خیر وار کیا ”بعد میں یہ تجھے بچانے سے بھی انکار کر دیں گے۔“
”ابھی تو تم ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات کر رہے تھے۔“ نیلم نے مجھے یاد دلایا ”رب نواز کے خلاف سارے مخالفوں کو جمع کر رہے تھے اور اب رنیں کو انٹی پی پڑھا رہے ہو۔“

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا۔ واقعی میں اس سارے معاملے کو صرف اپنے مفاد کی عینک سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے

صرف رب نواز کی فکر تھی جو اصل میں میرا دشمن تھا۔
رہیں، نیلم یا میرے کسی ساتھی کی اس سے کوئی دشمنی نہیں
تھی۔

موج دین نیلم اور رہیں کا دشمن ہو رہا تھا لیکن مجھ سے
اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ اللہ میں فکر مند تھا کہ وہ
میرے پیچھے بھی نہ پڑ جائے شاید اسی وجہ سے میں ان دونوں
کو اس سے الجھنے سے منع کر رہا تھا۔ رہیں نے میری صورت
پر پھٹی اندامت بھانپ لی تھی۔ اس نے غیر متوقع طور پر میری
حمایت کی۔

”ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس وقت جذباتی ہو گیا
اور موج دین کا ہاتھ توڑ بیٹھا مگر میں اس سے بات بڑھانے
سے گریز کرنا چاہیے۔“ اس حمایت پر میں نے اسے شکر گزار
نظروں سے دیکھا۔

”وہ کینہ آدمی ہے چھپ کر بھی وار کر سکتا ہے۔“ نیلم
شکر تھی۔

”میرا خیال ہے تم دونوں اب لندن روانہ ہو جاؤ۔“
میں نے کہا۔ ”تمہارا کتنا کام رہ گیا ہے فلموں میں؟“

”بس دو فلمیں ہیں سیٹ پر۔ ان میں بھی تھوڑا بہت کام
رہ گیا ہے۔“

”تو کثرت بھیجو اس پر۔“ میں نے کہا۔ ”تم اور رہیں پہلی
فلائٹ سے روانہ ہو جاؤ۔ فلموں والے ڈیلی۔“ رہیں کی مدد
سے فلمیں مکمل کرائیں گے اور نہ بھی کرائے تو اس سے فرق
نہیں پڑے گا۔ جب تک یہاں کے معاملات ٹھنڈے نہیں
پڑ جاتے تم واپس مت آؤ۔ بلکہ میرا مشورہ ہے وہیں انگلیفٹ
میں سیش ہونے کی کوشش کرو۔ یعنی اور عاقل پہلے ہی وہاں
ہیں۔ تم لوگ ساتھ رہو گے تو ان کی تنہائی بھی کم ہوگی۔ ویسے
جی ان دنوں یعنی کو کسی عورت کی ضرورت ہوگی۔“

”اس کی منت ہوئی ساس ہے ناں؟“ رہیں ہنسا۔
”لیکن تمہ۔“ نیلم نے میری طرف دیکھا۔

”میں۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”میں بھی جلد از جلد
وہاں آنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے میں بھی وہیں بس
جاؤں اور چندا کو بھی ساتھ لے آؤں۔“

”شبنم کا کیا ہوگا؟“ نیلم نے فوراً ہی میرے اور چندا کے
ساتھ کو قیول کر لیا تھا۔

”شبنم بیس رہے گی۔ ویسے بھی آزاد صاحب نے اس
سے دور رہنے کا حکم دیا ہے مجھے۔ میرے خیال میں شبنم کی
بہتری اس میں ہے کہ میں اس سے دور ہو جاؤں۔ وہ شاہ عالم
کو چاہتی ہے اور میں ناصر عظیم ہوں۔“

”دوسرے اگر تو اس کے ساتھ لگا رہا تو تجھ پر سے کبھی
شاہ عالم کا ٹھپا نہیں اترے گا۔“ رہیں نے کہا۔ ”یہ خود
غرض ہی سہی لیکن اب ناصر کی زندگی میں شبنم کی کوئی گنجائش
نہیں ہے۔“

”رہے فرید اور رخشی تو ان سے میرا دور رہنا بھی
ضروری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رخشی شاہ عالم کی بیوی ہے
اور اگر میں ان سے روابط رکھتا ہوں تو یہ بات میرے دشمنوں
کو بھی چونکائے گی اور اس سے ان کی زندگی بھی متاثر
ہوگی۔“

نیلم بولی ”ہم اتنے اچھے دوستوں سے کٹ جائیں
گے۔“ اس کے لیے مجھے مایوسی ہی تھی۔

”ہم نہیں۔ صرف میں۔ تم لوگ بدستور ان سے رابطے
میں رہو گے۔ میں بھی ان سے بالکل ہی دور نہیں ہوں گا۔
فون پر اور دوسرے طریقوں سے میں ان سے رابطہ رکھوں
گا۔ دشمن فہم اور کمال سے واقف نہیں۔ لہذا وہ خود
ان سے محفوظ رہیں گے۔ چند سال بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا
پڑ جائے گا تو ہم واپس آئیں گے اور ان سب سے ملیں
گے۔“

”ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ نیلم یکایک پرجوش ہو گئی تھی
”بلکہ ناصر بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ میں ابھی سیٹ کے
لے اپنے ایجنٹ سے بات کرتی ہوں۔“

”ہاں لیکن میرے لیے نہیں۔ میں کچھ عرصے اور یہاں
رہوں گا۔“

”مگر کیوں؟“ نیلم نے تیریاں چڑھائیں ”آخر ایسی کون
سی ضرورت ہے جو تم یہاں رکنا چاہتے ہو؟“

”مجھے بعض معاملات نمٹانے ہیں۔“ میں نے نرمی سے
کہا۔ میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا لیکن یوں میدان
چھوڑ کر جانا مجھے اچھائی کے اور اپنی کی فکر رہی تھی۔ حق
ہمیشہ رہنے کے لیے ہے اور باطل کو جانا ہی ہوگا۔

”میں قانع ہوتے ہی سیدھا لندن کا رخ کروں گا۔“
”ہرگز نہیں۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تمہارا
پاسپورٹ بھی بن کر گیا ہے۔“ نیلم نے فیصلہ کن لہجے میں
کہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا اور
تیل سے ہرگز نہیں کھوں گا کہ وہ مجھے آکر سینک مارے۔“

”ہرگز نہیں۔“ نیلم نے دوبارہ کہا اور واپس بیٹھ گئی۔
”اس صورت میں ہمارا جانا بھی اتنا ضروری نہیں ہے میں
اپنی بقیہ فلمیں مکمل کرا کے جاؤں گی۔“

میں نے بے بسی سے رہیں کی طرف دیکھا۔ ”یار تو اس کو
نہا۔ آخر تو اس کا مستقبل کا مجازی خدا ہے۔“
”میں کسی کی نہیں سنوں گی۔“ نیلم نے دوسری طرف
جھٹکے ہوئے کہا۔

”یارے تو نے بے عزتی ہوتے ہوئے خراب
ادی۔“ رہیں نے سردانہ بھری ”آخر تو اتنا اصرار کیوں
رہا ہے۔ تیرے بغیر یہاں کے کون سے معاملات ادا ہو رہے
ہیں؟“

”اوکے ٹایا۔“ میں نے بار مانتے ہوئے کہا ”تم لوگ
بٹ بٹ کر آؤ۔ میں ذرا رب نواز سے بات کرتا ہوں۔“
میں نے موبائل نکال کر رب نواز کا نمبر لایا۔ میری
راز سنتے ہی وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ اس نے
میں نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں ”شاہ عالم میں
اپنی ٹانگیں چر کر۔ میں تیری بولی بولی کروں گا۔ تیری لاش
ان کوؤں کو کھلاؤں گا۔“ اس کا سانس جواب دیتے لگا۔

”فی الوقت تو تمہیں پانی پینے کے لیے بھی کسی ملازم کی
ضرورت ہے۔“ میں نے غصے سے کہا ”اور مجھے اس سے کیا کر
لے مارنے کے بعد تم میری لاش سے کیا سلوک کرتے ہو۔“
میں نے اسے کئی جوابی گالیوں سے نوازا۔ شکر ہے نیلم اٹھ کر
در چل گئی تھی ”رب نواز کتنے کی اولاد تو نے اس نقطہ تا
نقین کو سمجھا تھا۔ جو اب اسپتال میں پڑا ہے۔ شکر کر کہ اس
بات وہ اپنی قبر میں نہیں پڑا۔ تو نے شاہ عالم کو کھلونا سمجھ رکھا
تو اب میں تجھے بتاؤں گا۔ رب نواز اپنے خاندان والوں کی
خفاقت کر لے۔ ایک ایک کر کے میں ان کا یوں شکار کروں
گا۔ جیسے جنگل میں شکاری جانوروں کا شکار کھیلتے ہیں۔ میں
پہلے کو ختم کروں گا تیری باری سب سے آخر میں آئے گی۔
تجھے میں زخم دے دے کر ماروں گا۔“

پہلے تو میرے اس لہجے پر رب نواز حیران رہ گیا تھا پھر
اس نے اشتعال میں آکر ایک بار پھر گالیاں کا دیریا باریکا ”شاہ
عالم تو میرے کسی گھر والے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں
تجھے کچھ لوں گا۔“

میں نے قلمی ولن نما قہقہہ لگایا ”دل نواز کے بارے میں
کیا خیال ہے۔ ابھی تو وہ مرتے مرتے بچا ہے لیکن ممکن ہے
فرشتہ اجل اسے اسپتال سے آکر لے جائے۔ موت کا تو کوئی
بہانہ ہو سکتا ہے۔ اب میں کسی ڈاکٹر کو یا کسی نرس کو ایک
لاکھ روپے دوں گا تو تمہارے بیٹے کو خالی انجکشن کیوں نہیں
لگائے گا۔ تمہیں معلوم ہے ناں کہ کسی آدمی کی رگوں میں ہوا
کا ٹھسا سا بلبہ بھی چلا جائے تو اس کی فوری موت ہو جاتی ہے۔“

اس موت کا الزام تم کسی کو نہیں دے سکتے۔ مگر دل نواز
کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ پتا نہیں آئے والے کو باپ کا
سایہ نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔“

”تمہ۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ رب نواز خوف زدہ ہو گیا
تھا ”تم نے دل نواز کو انکی بھی لگائی تو۔“
”تو تم تو بے جلاؤ گے۔“ میں ہنسا ”لیکن کس پر؟ کیا
تمہیں میرا پتا لگنا معلوم ہے؟ میرے کسی رشتے دار کے
بارے میں جانتے ہو۔ خیر میرا کوئی ہے ہی نہیں مگر تم اپنے
اتنے بڑے خاندان کو لے کر کہاں جاؤ گے؟ تمہارے بیٹے ہیں
اور بیٹیاں بھی ہیں۔ شاید تین یا چار بیویوں سے کوئی درجن بھر
اولاد تو ہوگی اور اب تو خیر ہے تم راواٹا بھی بن چکے ہو۔ کتنے
ہیں سودا اصل سے پارا ہوتا ہے۔ اب کل کو تمہارے
نواسے نواسیاں یا پوتے پوتیاں اسکول جانے کے لائق ہوں
گے تو تم ان کی بھی حفاظت کرو گے۔ اپنی دشمنی کی آگ سے
انہیں بھی بچاؤ۔ نہیں رب نواز تم خدا نہیں ہو۔ تم فرعون
بھی نہیں ہو۔ تم ایک معمولی سی حقیر چیز ہو جو خود اپنی
خفاقت بھی نہیں کر سکتی ہے۔ دوسروں کی حفاظت تم کیسے کرو
گے۔ بے شک ابھی تم ان کے گرد کرائے کے گوریلوں کی
دیوار کھڑی کرو گے مگر سوال ہے کہ کب تک؟ فرض کرو میں
ابھی کچھ کرتا ہی نہیں ہوں۔ خاموشی سے اس ملک سے چلا
جاتا ہوں۔ جہاں میں نے اپنے لیے بدوبست کر لیا ہے۔ سال
دو سال وہاں عیاشی سے گزار کر میں واپس آتا ہوں تو میرا
جلد اتنا بدل چکا ہوگا کہ فرشتے بھی مجھے نہیں شناخت کر سکیں
گے۔ اس وقت میں اپنی انتقامی کارروائی کا آغاز کروں گا۔ تو
کیا تم مجھے روک لو گے۔“

”تمہ۔ تم ایسا کیوں کرو گے؟“ اس نے لکنت زدہ لہجے
میں کہا۔

میں نے ایک بے رحم قہقہہ لگایا ”یہ سوال تم خود سے
کرو کہ رب نواز تم اب تک ایسا کیوں کرتے آئے ہو۔ حیرت
ہے اپنے عمل کا جو از تم دوسروں سے طلب کر رہے ہو۔“

”سنو شاہ عالم میری بات سنو۔ ہم میں مفاہمت کا کوئی
راستہ نکل سکتا ہے۔ میں ماضی کو فراموش کرنے کو تیار
ہوں۔ تم ویسے بھی اس ملک سے جا رہے ہو تو بہتر ہے دشمنی کا
یہ باب بند کر کے جاؤ۔“

”دشمنی کا باب مجھے نہیں تم کو بند کرنا ہے۔ رب نواز تم
وہ زہریلے سانپ ہو جس کا واحد حل اس کا ٹکڑا دینا ہے۔
تمہیں موقع دے کر یہ توقع کرنا حماقت ہے کہ تم زہر گئے نہیں
کیونکہ تم اپنی فطرت سے مجبور ہو اسی طرح میں اپنی حفاظت

کے لیے مجبور ہوں۔ یہ طاقت کا کھیل ہے۔ اگر میں نے تمہیں نہیں مارا تو تم مجھے مار دو گے۔ انہی تم صلح کی بات کر رہے ہو لیکن میں یا میری کوئی کمزوری تمہارے ہاتھ آئی تو تم سب کچھ بھول کر فرعون بن جاؤ گے۔

”میں تمہیں ضمانت دوں گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو شاہ عالم ہم پارتھنر رہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو خوشگوار طریقے سے اس دشمنی کو ختم کر سکتے ہیں۔“

”اور اس کا سب سے خوشگوار طریقہ یہ ہے کہ تم کسی طرح مجھ پر قابو پا کر میرا غائب کر دو۔“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے اس دشمنی ختم کرنے کے انداز سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ آغاز تم نے کیا لیکن انجام میں کروں گا۔ پروفیسر شام رضا اس کی پہلی قطع سے مگر میں نے تمہیں ایک اور اطلاع دینے کے لیے زحمت کی ہے۔ ایک زمانے میں میں نے فاح عالم فورس بنائی تھی جس کا ہر رکن مجھ پر اپنی جان بچاؤ کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔“

رب نواز کا حوصلہ ایک بار پھر خواب دے گیا تھا۔ اس نے ناقابل اشاعت الفاظ میں مجھے بتایا کہ اب مجھ پر کیا بھاری چھوڑا گیا جائے گا۔ میں نے مزید ایک عدد قلعہ اور رسید کیا۔ ”رب نواز اب میں ایک اور فورس بنا رہا ہوں۔ رب نواز ہٹاؤ فورس۔ اس کا ہر رکن تمہارے خون کا پیاسا ہو گا اور اس کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے صرف ان لوگوں کو جمع کیا ہے جو کبھی تم لوگوں کے ظلم کے شکار ہوئے لیکن اپنی کمزوری کو صبر کا نام دے کر بیٹھ گئے تھے۔ میں انہیں جمع کر رہا ہوں۔ انہیں طاقت دے رہا ہوں۔ تم جانتے ہو آج کے دور میں سب سے بڑی طاقت روپیہ ہے اور اس کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔ میں اس سے سب کچھ خرید سکتا ہوں۔ جدید ترین اسلحہ بھی اور اسے چلانے کی تربیت دینے والے۔ بہت جلد یہ فورس اسلحہ اور تربیت سے لیس ہو کر میدان میں آئے گی تو تمہارے لیے اس ملک میں کہیں پناہ نہیں ہوگی۔“

”بکو۔ بکو اس۔ کرتے ہو غپ۔ کتے بھونکتے ہو۔“ اس بار رب نواز کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے قہقہوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”ارے یا ملک تم تو ذرا سی بات سے سسم گئے۔ غالباً تمہاری شلوار کیلی ہو چکی ہے۔ لہذا میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ابھی یہ فورس آئی نہیں اور تم خوف زدہ ہو گئے۔ ذرا سوچو رب نواز سب یہ اندھیرے کے تیر اپنی کارروائی شروع کریں گے تو تمہارا کیا

حال ہوگا۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ رہیں نے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”دل خوش کرو یا پارسے۔ قسم اللہ کی اس کی شلوار کچھ کیلی ہو گئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں اندر سے یہ بالکل ہے۔“

رہیں نے رب نواز کو ایک وزنی کالی سے نوازا تھا۔ لیکن تو نے اتنی دیر بات کر کے ٹھک نہیں کیا۔ رب نواز نے اپنے فون پر آہرودیش لگوائی ہوگی۔ اس نے معلوم کر لیا ہو گا کہ فون کس نمبر سے کیا جا رہا ہے۔

”رب نواز مجھے پتا نہیں لگا سکے گا کیونکہ یہ موبائل تو نے کسی اور سے لیا ہے۔ کیا تو نے اسے اپنا نام بتایا تھا؟“

”نہیں۔ بس ایک ہوش میں وہ آدمی بچ رہا تھا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی۔ میرے پاس پیسے تھے لہذا میں نے غیب لیا۔ اسے میں نے اپنا نام رہیں احمد خان بتایا تھا لیکن وہ فون پریشان تھا کہ اس نے شاید نام سنا بھی نہیں اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس کا بچہ اسپتال میں داخل تھا۔ اسے اس کے ظلم کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تب رب نواز کا باپ بھی نہیں معلوم کر سکتا کہ موبائل فون میرے پاس کہاں سے آیا۔ البتہ وہ رہیں کے نام سے ضرور جو گئے گا۔ رہیں تیرا بھائی سے چلا جاتا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔“

”نیلیم سیٹ بک کرانے لگی ہے۔ کل دیر ابھی لگوائے گی۔ بلکہ اس کا دیر لگا ہوا ہے صرف تیرا اور میرا دیر لگا پڑے گا۔“

میں ہچکچاہٹا۔ ”یا رانیلم کے سامنے تو میں نے اقرار کیا لیکن تجھ سے میں نہیں چھپا سکتا۔ میرا ابھی جانے کا کافی ارادہ نہیں ہے۔ میں عین موقع پر کوئی بہانہ کروں گا۔ آپ تیرا کام ہے کہ اسے راضی کر کے لے جا۔“

رہیں نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تو کیوں رکھتے پر اصرار کر رہا ہے۔“

میں نے رہیں کو اپنے احساسات سے آگاہ کیا تو وہ حنفی میں بیٹھ گیا۔ ”میں نے اتنے بڑے جوعو دے کیے ہیں مجھے ان کی لاج بھی بھانا ہے۔ میں رب نواز کو کوئی نہیں چھوڑ سکتا۔ تاکہ تو نے جبراً بلینڈ نہ ہو جائے۔“

”میں نے کہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ہے۔“ رہیں نے جواب دیا۔ ”دراصل یا رب جب سے میں اس دنیا سے نکلا ہوں میں نے محسوس کیا ہے کہ پرانے لوگ اب مجھ سے ویسے گرم جوئی سے نہیں ملتے جبراً بلینڈ بھی موت میں کام آ رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے معاملے میں وہ ٹانگ نہیں اڑاتا چاہتا۔ اس

کا سارا کام ہی پولیس کی مدد سے چلتا ہے۔“

”چل یا جبراً بلینڈ نہ سہی۔ میں خود یہ کام کروں گا۔ لاہور میں تھانے ہی کتنے ہیں۔ ان میں تلاش کروں گا تو کوئی نہ کوئی سامنے آئی جائے گا۔ بس ایک آدمی ہاتھ آجائے تو باقی لوگوں کے نام وہ خود بتائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ خود بخود سفاک ہو گیا۔ ”انہیں جینم پر کیے جانے والے ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔“

رہیں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”تو خواہ مخواہ جہاں جاتی ہو رہا ہے۔ یہ پولیس والے صرف میرے تھے جن کی ذوری رب نواز ہلا رہا تھا۔ اصل مجرم تو وہ ہے سزا دینی ہے تو اسے دے۔“

”وہ بھی نہیں بچے گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کچ بچ اپنے عزیز بچے پر عمل کروں۔ رب نواز کے خلاف ان سب کو جمع کروں جن پر کبھی اس نے ظلم کیا تھا۔“

”احتقانہ باتیں مت سوچ۔“ رہیں جھلکا۔ ”تو شیخ علی کے سے منصوبے بنا رہا ہے۔ ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ یعنی دیر رہیں گے فحشرات اسے ہی بڑھیں گے۔“

”میں جانتا ہوں۔ میں ہاتھ پر بجا کر کام کروں گا۔“ میں نے اسے تسلی دی لیکن رہیں مطمئن نہیں تھا۔ وہ مسلسل مجھ سے کتا رہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے نیند کے ہانے اس سے جان چھڑائی۔ رات کا ایک بج رہا تھا مگر نیند مجھے بستر پر لٹ کر بھی نہیں آئی تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے میرے جو معمولات تھے پھر پور نیند میرے لیے خواب و خیال بن گئی تھی۔ اب تو مسلسل جاگنے کی عادت سی پڑی تھی۔ سارا دن جاگنے اور پھر پور معمولات کے باوجود رات کو سکون کی نیند میرے نصیب میں نہیں تھی۔ رہیں اور نیلم اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ میں چپکے سے اٹھا اور باہر گیا۔ وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن میرے پاس کسی کی چابی نہیں تھی۔ میں پیدل ہی باہر نکل آیا۔ رات کے گاڑوں نے میرے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

خاصی دیر تک پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک چوک سے ٹیکسی مل گئی تھی۔ میں نے اسے کمال اسپتال کا پتا بتایا۔ ٹیکسی والا حشمت لاہوری تھا۔ اس کی زبان اس کی کھٹارا ٹیکسی سے بھی زیادہ تیز چل رہی تھی لیکن جب منڈیل مقصود پر پہنچ کر میں نے میٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رفتار میں اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سفر کا تھوکانہ اور اکر کے میں اندر گیا۔ اسپتال کے مین گیٹ پر دو گاڑوں تھے لیکن یہ

کمال نے خود رکے تھے۔ اصل گاڑی جو کرکلی کی انجینی کے تھے ان سے مجھے واسطہ اسپتال کے ساتھ بنے کوارٹرز میں پڑا۔ جب کسی نے تاریکی سے مجھے لگا دیا۔

”ہینڈ زاپ سناکت ہو جاؤ۔“

میں نے رگ کر دوں ہاتھ اٹھا لیے۔ مجھ پر نارنج کی روشنی پڑی پھر کسی نے میری تلاش کی اور مطمئن ہو کر مجھے ہاتھ نیچے کرنے کو کہا۔ ”میں تو تم اور رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میرا نام ناصر عظیم ہے۔ اس اسپتال کا مالک کمال احمد میرا دوست ہے۔ وہ میری بہن کا شوہر بھی ہے۔ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔“

”ایک منٹ!“ اس نے کہا۔ جس نے مجھے ہینڈ زاپ کرایا تھا۔ اس نے شاید کوئی واک ٹاک نکال کر کمال سے رابطہ کیا۔ ”سب میں ششاد بات کر رہا ہوں۔ ایک شخص خاموشی سے آیا تھا۔ اپنا نام ناصر عظیم بتا رہا ہے۔ اچھا آپ خود آ رہے ہیں۔ اوکے سب۔“ اس نے واک ٹاک آف کر دیا۔ کمال نے اسے میرے بارے میں بتا دیا تھا لیکن اس کی عقابانی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر سے نہیں ہٹیں۔ وہ پوری طرح مستند تھا۔ وہ ایک عام گاڑی نسبت میں زیادہ تربیت یافتہ لگ رہا تھا اس کا وہ سرا سرائی جس نے میری تلاش کی تھی اب وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ پھر سے اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ مجھے ان کا طریقہ کار پسند آیا تھا۔ وہ سامنے سہرا دینے کے بجائے خاموشی سے تاریکی میں چھپ کر اپنا کام کر رہے تھے۔ اس طرح آنے والے دشمن کے لیے انہیں نشانہ بنانا آسان نہ رہتا۔ چند منٹ کے بعد کمال گاؤں کی ڈوریاں کستا نمودار ہوا۔

”لو کے بیٹھے یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں سوا تھا۔“

”بس یا تیری منہوس صورت دیکھنے کو دل چاہا تو گالیاں کھانے چلا آیا۔“ میں اسے صبح کرانڈ لے گیا۔

قرسوری تھی لہذا ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جو ایک طرح کی نشست گاہ تھی لیکن یہاں فرنیچر معمولی سا تھا۔ کمال بذات خود کڑو پتی ہونے کے باوجود دو بیٹات زندگی گزار رہا تھا لیکن وہ بھول رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک بیوی تھی جس کے کچھ ارمان تھے۔ کچھ خواہشات تھیں۔ اس کا ایک بچہ تھا جو ابھی سولہویں اور آسٹھویں سے نا آشنا تھا کہ اس کی سب سے بڑی سولت اور آسائش اس کی ماں کی گود تھی لیکن کل کو وہ بڑا ہو گا تو اسے سب کچھ درکار ہو گا۔ کمال میرے لیے

"یار تیرا گزارا ہو جاتا ہے اسنے سے کو ار نہیں؟" میں نے کہا "ابھی تیرا ایک بچہ ہے کل کو دوسرا بھی ہو گا۔" "تجھے بھی بس والا دور ہو رہا گیا۔" اس نے عمری سانس لی "کیا برائی ہے اس کو ار نہیں۔"

"دیکھ کمال پہلے تو میرا یار ہے پھر ہنوی۔ لہذا برا مت مانتا ورنہ جھانپڑ ماروں گا۔ اسے سب تیری طرح نہیں سوچتے اور قہر تیری بیوی ہے اپنے لیے اور اپنے بچے کے لیے تجھ سے وہ طلب کرتا اس کا حق ہے جو تو اسے دے سکتا ہے۔ وہ تجھ سے عالی شان کو بھی نہیں مانگتی ہے۔ مریدہ کی کار کی خواہش نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی گھر میں ہر سہولت چاہتی ہے لیکن وہ جتنا مانگتی ہے تو اسے دے سکتا ہے پھر یوں چکی ترشی میں رہنے کا کیا فائدہ چند ہزار یا چند لاکھ بچا کر تو کیا تیرے مارے گا۔"

"میں نے قہر کو شروع سے واضح کر دیا تھا کہ زندگی گزارنے کے بارے میں میرے کیا نظریات ہیں۔"

"اس وقت اس نے ہان لیا۔ لہذا تو خوش تھا۔ اب وہ خوش نہیں ہے تو تجھے اس کی پروا نہیں ہے کیا یہی تیری محبت ہے۔ میرے یار دنیا پر اپنے نظریات نہ ٹھونس۔ اگر وہ پیار و محبت سے تیرا ساتھ دیتی ہے تو میں بھی خوش ہوں لیکن اگر وہ تجھ سے اپنا حق مانگتی ہے تو یہ تیرا فرض ہے کہ اسے دے۔ اس نے تیری محبت میں اتنا عرصہ صبر شکر سے کاٹ دیا تو اب اس کا حق بنتا ہے کہ تو اس کی بات مانے۔ محبت میں اور شادی میں یک طرفہ فریضہ نہیں چلتا۔"

کمال سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے پھر کہا "ذرا سوچ ایک مشین بھی مسلسل ایک ہی کام کرے تو ٹھس جاتی ہے اس کے پرزے جواب دے جاتے ہیں۔ اسے تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے پھر تو اور تیرے بیوی بچے انسان ہیں۔ وہ اگر ٹھس گئے تو آرام مانگیں گے زندگی گزارنے کے لیے انہیں آسائش کی ضرورت بھی ہوگی۔ اگر تیری زندگی اور تیرا گھر پریشانی میں ہو گا۔ تو تو کیسے دل جیتی ہے اپنا کام کر کے گا۔"

"یار میں ڈرتا ہوں۔" اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا "یہ آسائش مجھے میرے مشن سے ہٹا نہ دیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تو خود کو اتنا کمزور سمجھتا ہے؟"

"میں کمزور نہیں ہوں لیکن بیوی بچے مل کر آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس سے وہ کرا لیتے ہیں جو وہ کرنا نہیں

چاہتا ہے۔ میں کمزور نہیں ہونا چاہتا۔"

"دیکھ بھائی۔ یہ تیرا گھر ہے تو زیادہ بستر چاہتا ہے کہ اس کس طرح چلانا ہے لیکن میں اتنا مشورہ دوں گا کہ گھر میں اتفاق رائے سے چلتے ہیں۔ ورنہ یہ جبر کی ایک قسم بن جاتی ہے۔" میں نے چائے کا خالی کپ رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا صوفے میں چلتا ہوں۔

"کیا تو ناراض ہے؟" کمال نے فکر مندی سے کہا "تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھا۔"

میں ہنس دیا "سوز کے بچے میں ناراض ہوا تو تجھے دے لوں گا۔ ابھی تو میں ذرا چننا اسے مل لوں۔"

"اس وقت!" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا "وہ سن رہی ہو۔"

"اسے بچا لوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا "آخر میں ایک آخر شادی کیوں کروں۔"

کمال کے کو ار سے نکل کر میں چندا کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس کی شمار ذہ آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"دیدار حسن کا ایک طلبکار۔" میں نے آواز بدل کر کہا۔

"کیا بد تمیزی ہے۔" اس نے گماڑ کر کہا۔

"اگر یہ بد تمیزی ہے تو میں بد تمیز ہوں۔" اس بار میں نے اصل آواز نکالی۔

"بامصر!" وہ لپک کر آئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ میں اندر آیا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس وجہ سے شب خوانی کے دودھیا سفید لباس میں تھی۔ جو اس کے مرمریں بیکر کے

تاسب میں اس خوبی سے ڈھل رہا تھا کہ میں سحر زدہ رہ گیا۔ میری نظروں کو محسوس کر کے وہ شرابی اور اس نے جلدی سے دوپٹہ لے لیا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے پوچھا "خیریت اپنی رات گئے آنے کی وجہ؟"

"بس اچانک تمہیں دیکھنے کو دل چاہا تو چپکے سے غلام ہاؤس سے نکل آیا۔"

وہ ہنسی "ہیلن نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔"

"ہاں وہ میری اماں جان بننے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔" میں نے کہا "بات یہ ہے کہ جب کوئی عظیم اکیلا بن جائے تو سب اس کے مہرست بننے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔"

وہ ہنسی "تو کیوں ہوا کیلے؟"

"کوئی ایسی ملتی نہیں جو مستقل طور پر اپنا لے۔"

"علاش بھی نہیں کی؟"

"نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "کیونکہ وہ پہلے سے میرے پاس ہے۔"

اس نے اپنے سمنے لیے بال سمیٹ کر ان کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا "بامصر صرف باتوں سے زندگی نہیں گزرتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "لیکن حالات فی الوقت تجھے باتوں کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ میں ایک نظر تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ دیکھ لیا اب اجازت دو۔"

"کچھ دیر رکو۔ میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔" خود میرا دل بھی چاہ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور اس عمارت گریبان کے سامنے رہوں۔ کو ار میں ایک چھوٹا سا

بچہ بھی تھا۔ چندا اسی میں فٹ ہو گئی تھی میری اندر کوئی مٹی اٹھ نہیں سکتی۔ لہذا میں دروازے سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پانی چڑھایا اور کافی چھیننے لگی۔ کریم کا ذبا

کالا۔

"چندہ۔ تم نے ان زیورات کا کیا کیا جو میں لندن سے لایا تھا؟" خان جی کی لمانت جو ایک چور نے سنبھال کر رکھی تھی؟ میں نے پوچھا۔

"وہ میں نے اسپتال کے ٹرسٹ میں دے دیئے۔"

میں حیران رہ گیا "چندہ۔ وہ زیورات تمہارا واحد اثاثہ تھے خان کی وراثت تم پہلے ہی کمال اسپتال کو دے چکی ہو۔

کمال نے یہ زیور لے لیے کیسے؟" میرے لمحے میں غمی آگئی۔

"وہ انکار کر رہا تھا۔ اس نے زیور بیچ کر ایک اور طریقے سے اسے ڈونٹ کر دیئے۔ کمال کو اس کے بارے میں کچھ پتا

نہیں ہے۔ میں نے سوائے تمہارے کسی کو نہیں بتایا۔"

"پاگل لڑکی۔" میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا "کیا میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ نرمی سے میری ہانسیوں میں سمٹ آئی تھی "میں نے تمہارے ایک ہی چیز مانگی ہے اور مجھے یقین ہے وہ مجھے مل جائے گی اس کے سوا مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ چیز کیا ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا "کیا تم نہیں جانتے؟"

جواب اس کی شفاف آنکھوں میں بے حد واضح تھا "شکر یہ میری جان۔" میں نے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے "اب زیادہ دیر کی بات نہیں ہے۔"

"بامصر مجھے دلا سے مت دو۔ میں میرے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ میرے بازوؤں سے نکل گئی۔

"چندہ میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مجھے صرف کچھ دن دو۔ اس کے بعد میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گا اور ہم یہاں سے دور چلے جائیں گے۔"

"یہاں سے؟ کہاں؟" وہ چوڑی۔

"انگلینڈ؟ وہاں جتنی اور عامل ہیں۔ غلام اور رئیس بھی وہیں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہاں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہو گا۔"

"لیکن کمال اور قہر پھر خوشی اور فریب بھی ہیں۔ یہ لوگ یہیں رہ جائیں گے ہمارے حصے کی دشمنیاں سمجھنے کے لیے۔"

"دشمن اصل میں شاہ عالم کی ذات ہے اور لوگ میری طرف اس سے مشابہت کی وجہ سے متوجہ ہوتے ہیں۔ میں یہاں نہیں ہوں گا تو یہ لوگ بھی محفوظ رہیں گے اس کے برعکس اگر میں یہاں رہتا ہوں اور ان لوگوں سے ملتا ہوں تو ان کے لیے خطرہ ہے۔"

چندہ کسی حد تک میری بات کی قائل نظر آنے لگی "لیکن اپنی سر زمین جہاں میں ساری عمر رہی۔ اسے میں چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں۔ خان جی کی مٹی بھی تو میں ہے۔ ان کی قبر کون کون جائے گا۔ ان کے لیے فاتح خوانی کون کرے گا؟"

میں نے نرمی سے کہا "قبر بنانا ضروری نہیں ہے۔ ہاں فاتح خوانی اور ایصال ثواب ہم نہیں سے بھی کر سکتے ہیں۔ سننے والا دنیا میں ہر جگہ موجود ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے۔"

"جہنم تم نے اس کے بارے میں سوچا۔"

"اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا اس کی زندگی سے نکل جانا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ اس پر سارے عذاب میری وجہ سے آئے ہیں۔"

"جہنم، تو واضح طور پر شاہ عالم سے انتہی ہے۔ کیا تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد تمہارے دشمن اس سے حساب نہیں چکا نہیں گے وہ عورت ہے۔ غیر محفوظ ہے۔"

"آزاد صاحب نے اسے فی الوقت کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا ہے جہاں دشمن تو کیا میں بھی نہیں جاسکتا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ جب میں اسے اپنا نہیں سکتا تو بہتر ہے اس کی زندگی سے نکل جاؤں۔"

"بھگواؤ وہ بے چاری اکیلی رہ جائے گی۔"

"اتنا خیال ہے اس بے چاری کا تو اسے بھی لے چلے ہیں۔ بس تمہیں دل میں ذرا منجھناش پیدا کرنا ہوگی۔" میں نے شرارت سے کہا "میرے دل میں تو۔"

ماں اور بہن کی جگہ پاتا ہوں۔ ان حیثیتوں میں وہ اس قابل ہے کہ میں اس کا احترام کروں۔“

چند اے کو اتر سے نکلا تھا کہ سیکورٹی گارڈ سامنے آگیا۔ اس نے میرے چہرے پر تاج کی روشنی ڈال کر اطمینان کیا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ باہر خاصی خشکی تھی اور میں کوئی گرم شے پینے بغیر ہی آگیا تھا۔ سواری کا دور دور تک پتا نہیں تھا لہذا میں نے بظلوں میں ہاتھ دے کر ڈبل مارچ شروع کر دی۔ ایک جگہ کنوں نے میری رفتار کے لیے ایکس لریٹر کا کام کیا اور ایک جگہ مجھے پولیس سے چھنا ہوا۔ بالآخر ایک ٹیکسی والے نے جو اپنی ٹیکسی میں ہی سو رہا تھا۔ سو روپے کے عوض مجھے ٹیلیم باؤس تک چھوڑنے کی حامی بھری۔ جو اب صرف دو میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے راستے میں دلائل سے ثابت کیا کہ وہ کرائے کے بجائے اپنی نیند حرام کرنے کا ہرجانہ لے رہا تھا جو جائز تھا۔ اتر کر کرایہ دیتے ہوئے میں نے کہا۔

”تم اپنے بچوں کو حرام کھانا چاہتے ہو۔ شوق سے کھاؤ لیکن اسے حلال تو نہ قرار دو۔“

”تمناؤں تمہارے دل کو۔“ اس نے مسکراہٹ جوابتے ہوئے کہا پھر میرے سینے سے لگ مٹی ”تمہیں معلوم نہیں جب تم رخصتی کے شو پر رہے ہوئے تھے تو میں دن رات انگلیوں پر ہوتی تھی۔ جینم کے ساتھ تمہارا نام آیا تو میں ضبط کی کن کن منٹروں سے نہیں گزری۔“

”کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟“ میں نے کہا۔
”نہیں۔“ سچی بات ہے میں اپنی ذات کا اعتبار کھوبھلی تھی کسی اور پر کیا اعتبار کرتی۔ میں نے کوشش کی کہ تم سے نفرت کروں لیکن نہ کر سکی۔“

اس کے ریشمی وجود کی ساری حرارت اور نرمی مجھ میں جذب ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے تپش کا احساس ہوا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کر دیا ”چند اے ہمیں اتنا قریب نہیں آنا چاہیے۔ رات کی یہ تنہائی ہمیں ہکا سکتی ہے۔“
اس کا چوکھٹا ہوا گہرا ”مجھے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا۔“

”اب میں چلتا ہوں۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا ”ٹیلیم کو پتا چلا تو وہ ہنگامہ کرے گی۔“

”اتنا ڈرتے ہو اس سے مراد ہو کہ۔“ چندا مسکرائی۔
”ٹیلیم کے لیے میں مرد نہیں ہوں۔ میں اسے بیک وقت

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات بارہویں آخری حصے میں ملاحظہ فرمائیں

یہ کہانی وطن کے پُر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔

آسمان تھہ مسرے اور دیکھو ذرا جس دنیا میں اُٹھ رہا تھا ہے
یہ دنیا اک تماشا ہے اور سب انسان ماری ہیں
کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیا کیا کھیل کھاتے ہیں
یہ لیڈر، ووٹر، پیر مرید، شاگرد استاد ماری ہیں
آؤ دیکھو آنگھوں سے انہیں، ان سب کے ہاتھوں میں بھڑو ہے
یہ قوم کے خادم، دانشور، فن کار، وزیر ماری ہیں
ان چہرہ بدلنے والوں کو ایمان اصول و فاسے کیا
یہ فالو تاجر، پورا افسر، عاشق معشوق ماری ہیں
آنکھیں، الیکشن، یو این او، انصاف، حقوق انسانی
لے پچھتہ ہو رہا ہے باتیں ہو کرتے ہیں وہ ماری ہیں

احمد اقبال

PDFBOOKSFREE.PK